گھر کے ہر فرد کے لیے

پاکیزہ

کراچی

اکتوبر 2014

مدیرِ اعلیٰ

معراج رسول

نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے نئے ناول

بصرہ حیات بنیں ہماری بزم کی مہمانِ خاص











Gesto
fill



Gesto
fill
120 ml







Care
Oil Free
Fairness Honey
Lotion

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: آمنہ کریم .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 42 • شمارہ 07 • اکتوبر 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com





اسلامی عبادات میں حج بڑی نرالی اور امتیازی شان والی عبادت ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب، کوئی تہذیب اس کی نظیر اور مثال پیش نہ کرسکے گی کہ دنیا کے ہر خطے کے مسلمان جو مختلف قومیتوں، تہذیبوں، موسموں، مزاج، زبان اور مختلف رہن سہن کے حامل ہوتے ہیں۔ بیت اللہ شریف میں آتے ہی ان کا رنگ و نسل کا امتیاز مٹ جاتا ہے، زبان و قوم کا فرق دم توڑ دیتا ہے، لباس اور نظریے کی تفریق کافور ہوجاتی ہے۔ امیر و غریب، شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں اور مسلمانان عالم بتان رنگ و بو کو توڑ کر ایک ہی ملت ابراہیمی میں جذب ہوجاتے ہیں۔ وحدت انسانی، وحدت ملی، اتحاد، اتفاق، ہم آہنگی، یک جہتی اور یگانگت کا بے مثال مظاہرہ صرف حج کے موقع پر ہوتا ہے۔ حج میں دیگر تمام عبادات کی حقیقت کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر عبادت کا جوہر اور ہر عبادت کی روح اس میں زندہ و تابندہ ہے اور وہ اس طرح کہ اس میں نماز بھی ہے اور روزے کا مجاہدہ اور اس کی مشقت بھی...... زکوٰۃ سے کہیں زیادہ مالی ایثار بھی ہے...... جہاد کی طرح سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کی جھلک بھی ہے اور یہی اس کی شان جامعیت ہے۔ بفضل اللہ تعالیٰ اس سال بھی ہمارے ملک سے حاجیوں کی جانے والی تعداد بہت زیادہ ہے...... اس سال بھی پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ دیگر تمام اسلامی ممالک میں سے پاکستانی حجاج کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی اور یہ بات ہم سب کے لیے بہت خوش نصیبی کی ہوگی کہ ماشاء اللہ اتنی بڑی تعداد اس پاک اور متبرک مقام پر اپنے ملک و ملت کے لیے دعاؤں میں مصروف ہے...... اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کا حج مقبول فرمائے اور تمام مسلمانوں میں آپس میں اتفاق و اتحاد اور یگانگت، محبت و بھائی چارہ رکھے، جو مسلمانوں کی اصل پہچان ہے، آمین ثم آمین۔

مدیرہ
انجم انصار



علم... معرفتِ الٰہی

مخالفین اسلام کے عالم کا تیسرا سوال یہ تھا کہ...... ''بتاؤ خدا کہاں ہے؟''
جواب میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا...... ''کہ تم بتا سکتے ہو کہ روح کہاں ہے؟ حالانکہ خود تمہارے جسم میں موجود ہے۔ وہ روح جو اس اللہ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے اور ہر ذی روح میں موجود ہے تو جناب جب اسے نہیں بتا سکتے تو کسی دوسرے کی کیا مجال ہے کہ وہ خالقِ روح کو بتا سکے۔'' یہ سن کر بھی وہ حیران ہوا۔

چوتھا سوال...... ''خدا سے پہلے کیا تھا؟''
امام ابوحنیفہؒ نے اس سے جواباً پوچھا کہ ''کیا گنتی تم کو معلوم ہے؟''
اس نے کہا۔ ''ہاں......'' آپؒ نے فرمایا...... ''اچھا گنو''...... وہ ایک دو تین کہنے لگا...... آپؒ نے اسے روک کر فرمایا۔ ''نہیں، نہیں یہ میں نہیں سننا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ایک سے پہلے کی گنتی مجھے سنائیں۔'' اس نے کہا۔ ''حضرت ایک سے پہلے تو گنتی ہی نہیں ہے...... سناؤں کیا......؟'' جب وہ ایک سے پہلے کی گنتی سے عاجز ہوا تو آپؒ نے فرمایا۔
''افسوس! جناب کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ مجازی گنتی میں جب ایک سے پہلے کچھ نہیں تو اس ایک حقیقی خدائے واحد سے پہلے کیا ہو سکتا ہے۔'' یہ جواب سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور اس نے صدقِ دل سے کلمۂ طیبہ پڑھا...... یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی علمیت کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔

☆☆☆

حضرت امام شافعیؒ رات کے تین حصے کیا کرتے تھے...... ایک حصہ علم کے لیے...... دوسرا حصہ نماز کے لیے...... تیسرا حصہ سونے کے لیے...... آپؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے کبھی سچی یا جھوٹی قسم نہیں کھائی۔'' آپؒ کس قدر خدا تعالیٰ کی تعظیم کرتے تھے اور جلالِ خداوندی کا انہیں کس قدر علم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔
عبداللہ کہتے ہیں کہ میں ایک روز نہر کے کنارے نماز کے لیے وضو کر رہا تھا کہ ایک صاحب میرے قریب سے گزرے اور فرمانے لگے۔ ''بیٹے...... وضو اچھی طرح کرنا...... دنیا و آخرت میں خدا بھی تمہارے ساتھ اچھی طرح پیش آئے گا۔'' میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں جن کے پیچھے بہت سے لوگ ہیں...... میں بس وضو سے فارغ ہو کر ان کے پیچھے چل دیا...... انہوں نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا...... ''کیا تمہیں کچھ کام ہے......؟'' میں نے عرض کیا...... ''جی ہاں، میں چاہتا ہوں کہ اللہ نے جو علم آپ کو عطا کیا ہے اس سے مجھے بھی کچھ سکھلا دیجیے۔''
آپؒ نے فرمایا...... ''جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے نجات پاتا ہے...... جو شخص اپنے دین کا خوف رکھتا ہے وہ تباہی سے بچا رہتا ہے...... جو شخص دنیا سے محبت نہیں رکھتا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا اجر و ثواب دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔''
مزید فرمایا...... ''جس شخص میں تین عادتیں ہوں اس کا ایمان کامل ہے...... ایک یہ کہ لوگوں کو اچھی باتیں سکھلائے...... اور خود بھی عمل کرے دوسرے یہ کہ لوگوں کو برائی سے باز رہنے کی تلقین کرے اور خود بھی باز رہے...... تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو حد و مقرر فرمادی ہیں ان کی حفاظت کرے......'' یہ کہہ کر آپ تشریف لے گئے...... میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ امام شافعیؒ تھے...... یہ زہد، یہ خوفِ خدا علم الٰہی کی معرفت کے بغیر نہیں پیدا ہوتا...... امامؒ نے یہ آخرت کے علوم سے حاصل کیا تھا...... یہ علوم قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں کیونکہ اولین و آخرین کی تمام حکمتیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

☆☆☆

حضرت امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا...... طلبِ علم کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا...... ''طلبِ علم سے بہتر کیا مشغلہ ہو سکتا ہے...... تم یہ دیکھا کرو کہ کون شخص صبح سے شام تک طلبِ علم میں مشغول ہے...... اگر ایسا کوئی شخص مل جائے تو اس کا ساتھ نہ چھوڑو......'' حضرت امام مالکؒ علمِ دین کی بے حد تعظیم و توقیر فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث بیان کرنے کا ارادہ فرماتے تو پہلے وضو کرتے، مجلسِ درس کے صدر مقام پر تشریف رکھتے، داڑھی کے بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے، پُروقار طریقے پر بیٹھتے...... پھر حدیث بیان فرماتے...... لوگوں نے اس اہتمامِ حدیث کے متعلق پوچھا...... تو آپؒ نے فرمایا کہ میں حدیث رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کرتا ہوں۔'' آپؒ کا قول ہے کہ علم ایک نور ہے...... اللہ جسے چاہتا ہے یہ نور عطا کرتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا...... کہ مجلسِ علم میں حاضر ہونا ہزار رکعت پڑھنے، ہزار بیماروں کی عیادت کرنے اور ہزار جنازوں میں شرکت کرنے سے افضل ہے۔'' کسی نے پوچھا یا رسول اللہ قرآن پاک کی تلاوت سے بھی افضل ہے؟ فرمایا......'' کہ قرآن کی تلاوت بھی علم ہی سے مفید ہے۔''

☆☆☆

بعض علما صرف اعمالِ ظاہری کو اہم بتاتے ہیں...... لیکن علمائے آخرت باطن کی صفائی کے طریقے بتاتے ہیں تاکہ شرک کی جڑیں اکھڑ جائیں، دل و ذہن کی صفائی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جب دل برائیوں سے پاک ہوتا ہے تو اچھائیاں خود بخود جگہ بنا لیتی ہیں اس کے لیے علم حقیقی حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اچھائی اور برائی میں تمیز کی جا سکے۔ زمین سے جب خود رو گھاس صاف کر دی جاتی ہے تو پھل پھول اُگتے ہیں اور بہار آجاتی ہے۔

(جاری ہے)

قسط 2

اُعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا . . . گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے . . . کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے . . . لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے . . . اور مان لیا جائے . . . کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے . . . اور وفا کے غُنچے وہیں کِھلتے ہیں . . . جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں



وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں اتر کر ڈوبتے دل کو سنبھالتے لاؤنج میں آئے تھے جہاں عظام صوفے پر بیٹھا تھا اور رواحہ خدا بخش کو کچھ کہہ رہا تھا۔

”رواحہ بیٹا، وہ باہر......“ انہوں نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”کیا ہوا بابا؟“ رواحہ گھبرا کر مڑا اور عظام بھی جو اُن کے احترام میں کھڑا ہو گیا تھا۔ پریشانی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

”آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں بابا پلیز بیٹھ جائیں اور بتائیں کیا ہوا ہے؟“ رواحہ نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے انہیں بازو سے پکڑ کر بٹھایا۔

”میں اوپر ٹیرس پر تھا بیٹا تو میں نے دیکھا کہ تمہاری گاڑی کے اندر داخل ہوتے ہی ایک اور گاڑی وہاں آکر رکی اور اس میں سے دو مسلح شخص اتر کر گیٹ کے پاس کھڑے ہو گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔“

”اوہ مائی گاڈ! انکل آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ عظام نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”پاپا نے گارڈ بھیجے ہوں گے وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے پیچھے گارڈ بھیج رہے ہیں۔ میں نے منع بھی کیا تھا پھر بھی شاید انہیں تسلی نہیں ہوئی۔ میں دیکھتا ہوں، امید ہے وہ چلے گئے ہوں گے۔“ وہ الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”ایک منٹ انکل میں ابھی آکر آپ کو تفصیل بتاتا ہوں۔“ عظام باہر جانے لگا تو انہوں نے بے اختیار اسے روکا۔

”رکو عظام بیٹا رکو ایسے باہر مت جاؤ۔ پتا نہیں کون ہیں ضروری تو نہیں وہ تمہارے پاپا کے ہی بھیجے ہوئے گارڈ ہوں۔ ایک دم سے گیٹ مت کھولنا۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ آج کل کے حالات کا تو پتا ہے ناں تمہیں۔“

”انکل پلیز، مجھے یقین ہے کہ وہ پاپا کے ہی گارڈ ہوں گے اور پاپا نے ہماری حفاظت کے خیال سے بھیجے ہوں گے، آپ پلیز بیٹھیں۔“ وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے رواحہ کی طرف دیکھا۔

”بابا ویسے تو عظام کو دو تین دن بعد آنا تھا میرے ساتھ لیکن اس کے پاپا کا اچانک پروگرام بن گیا خانیوال جانے کا۔ آج عظام کی مما کی برسی تھی اور انہیں ان کی قبر پر جانا تھا۔ ویسے تو وہ عظام کے ہاسٹل جانے کے بعد جاتے وہاں لیکن پھر ڈنر کرتے ہوئے اچانک انہوں نے کہا کہ وہ اگر ابھی چلے جائیں رات میں تو صبح فجر کے وقت وہاں سے واپس آجائیں گے۔ اس طرح پھر ایک دن ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور وہ عظام کے ساتھ آرام سے تین چار دن رہ سکیں گے تو عظام نے یہی کہا کہ یا تو میں اس کے پاس رہ جاؤں یا وہ میرے ساتھ آجائے تو اس کے پاپا نے کہا یہ ٹھیک ہے کہ عظام میرے ساتھ چلا آئے اس طرح وہ بھی مطمئن رہیں گے کہ وہ گھر پر اکیلا نہیں ہے۔“ اس نے کافی تفصیل سے اس کے جلد یہاں آنے کا سبب بتایا۔

”بیٹا میں نے یہ تو نہیں کہا کہ عظام یہاں کیوں آیا ہے۔ مجھے تو اس کے یہاں رہنے سے خوشی ہوگی۔ کیا اس کے پاپا نے اجازت دے دی ہے کہ ہاسٹل کے بجائے تمہارے ساتھ رہے؟“

”جی بابا، انہوں نے اجازت دے دی ہے۔“

”یہ گارڈ کیوں بھیجے ہیں انہوں نے۔ کیا انہیں کسی سے خطرہ ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے بابا کچھ ایسا ہی ہے۔ شاید کوئی خاندانی دشمنی ہے۔ میں نے کبھی تفصیل نہیں پوچھی عظام

سے لیکن ایک بار اس نے ذکر کیا تھا کہ اس کی مما اور اس کا جڑواں بھائی دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ تب وہ اپنے آبائی شہر خانیوال میں رہتے تھے۔ شاید اسی لیے اس کے پاپا نے اسے ہمیشہ ہاسٹل میں رکھا۔ اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ کبھی ساتھ باہر لے کر نہیں گئے۔ اس کی مما کی قبر پر بھی اکیلے ہی جاتے ہیں شاید اس ڈر سے کہ اگر کبھی دشمن ان پر حملہ کرے تو وہ بچ جائے۔“

”ہوں۔“ انہوں نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں ذرا عظام کو دیکھوں تو... اللہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

”بابا آپ بیٹھیں میں دیکھتا ہوں۔“ رواحہ کھڑا ہو گیا تب ہی عظام مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”پاپا کے گارڈز ہی تھے چلے گئے دراصل غلطی میری ہی تھی۔“ وہ رواحہ کے پاس بیٹھ گیا۔

”آج شام میں نے ایک شخص کو ممتاز خان سے بحث کرتے دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر رواحہ کو بٹھا کر نیچے آیا تو وہ جا چکا تھا۔ خان چاچا نے مجھے بتایا کہ وہ اندر بیٹھ کر پاپا کا انتظار کرنے کی ضد کر رہا تھا۔ پاپا گھر پر نہیں تھے اور وہ جا نہیں رہا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر میں نے ذکر کر دیا اس شخص کا اور پاپا پریشان ہو گئے اس لیے انہوں نے گارڈ بھیج دیے ہمارے پیچھے۔ یہ گارڈز جن دنوں میں گھر پر ہوں پاپا کے ساتھ تو پاپا انہیں بلا لیتے ہیں۔“

”بہت محبت کرتے ہیں تم سے اس لیے ڈرتے بھی ہیں۔“ وہ بھی بیٹھ گئے تھے۔

”یہ تو ہے انکل، پاپا میرے لیے حد درجہ حساس ہیں اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک میری پڑھائی ختم ہوگی وہ بھی اپنا سارا بزنس سمیٹ کر یہاں ہی سیٹل ہو جائیں گے پھر ہم ہمیشہ کے لیے اکٹھے رہیں گے۔“ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور خوشی اس کے لہجے سے جھلکتی تھی۔

”انشاء اللہ بیٹا۔“

”رواحہ نے آپ کو بتایا ہوگا وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتے ہیں لیکن جب پاکستان میں ہوں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ سارا وقت میرے ساتھ گزاریں۔ اب بھی صرف چار دن کے لیے آئے ہیں وہ تو میں یہ چار دن انہی کے ساتھ گزاروں گا پھر ویسے تو مجھے ہاسٹل جانا ہی تھا لیکن رواحہ نے پاپا سے اجازت لے لی۔“

”مجھے تمہارے یہاں رہنے سے بہت خوشی ہوگی بیٹا، تم مجھے رواحہ کی طرح ہی عزیز ہو۔“

”ویسے تو گھر میں ملازم ہیں، ممتاز خان ہے، چوکیدار ہے، ہمارا گن مین رہتا ہے۔ میں گھر میں اکیلا بھی رہ سکتا ہوں لیکن پتا نہیں پاپا کو کیا خوف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہاسٹل میں، میں زیادہ محفوظ ہوں بہ نسبت گھر میں اکیلا رہنے کے۔“

”بیٹا وہ بڑے ہیں بہتر سمجھتے ہوں گے، یہ خاندانی دشمنیاں بھی کبھی کبھی نسلوں تک چلتی ہیں۔ زمینوں، جائدادوں کے جھگڑے خاندانوں کے خاندان ختم کر دیتے ہیں۔“

”مجھے یہ معلوم نہیں کہ پاپا کے دشمن کون ہیں۔ نہ کبھی انہوں نے اس کے متعلق مجھے بتایا لیکن جس طرح وہ میری حفاظت کرتے ہیں اس سے لگتا ہے کہ انہیں اب بھی خطرہ ہے۔ ایک بار انہوں نے مختصراً بتایا تھا کہ وہ خانیوال سے لاہور آرہے تھے کہ دشمنوں نے راستے میں گاڑی روک کر گولیاں چلا دیں۔ میں اور پاپا بچ گئے لیکن ماما اور بھائی ختم ہو گئے۔ تب میں اور میرا بھائی چار سال کے تھے۔“

عظام پہلے بھی رواحہ کے ساتھ کئی بار گھر آیا تھا۔ اکثر ویک اینڈ پر رواحہ اسے ساتھ لے آتا تھا لیکن اس سے پہلے کبھی انہوں نے اس کی ذات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی عظام نے کبھی اتنی تفصیل

سے کچھ بتایا تھا۔ وہ رواحہ کا دوست تھا۔ اس حوالے سے انہیں عزیز بھی بہت تھا۔ یوں تو رواحہ کے اور دوست بھی تھے لیکن عظام کی طرف اُن کا دل کھنچتا تھا اور اب بھی عظام کا درد ان کے دل میں اتر آیا تھا۔

''یہ مشیت کے فیصلے ہوتے ہیں بیٹا۔ ماں اور بھائی کی کمی تو کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ خلا تو ہمیشہ رہے گا۔ یہ محرومیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں لیکن قدرت کے فیصلوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔'' وہ آبدیدہ ہو رہے تھے۔

''اوہ...... بابا پلیز۔'' رواحہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ''نو جذباتی سین۔'' اس نے عظام کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ ''اللہ نے ہم دونوں کو ماں کی محبت سے محروم کیا لیکن آپ اور انکل جیسے باپ بھی تو عطا کیے کیا کسی اور کے بابا میرے اور عظام کے پاپا جیسے ہوں گے...... ہیں ناں عظمی۔'' اس نے عظام کی طرف دیکھا۔

''بالکل بھی نہیں۔ میرے پاپا نے صرف میری خاطر ماما کے بعد دوسری شادی نہیں کی اور......''

''میرے بابا نے بھی۔'' رواحہ نے فخر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''حالانکہ میں نے تو آج بھی بابا سے کہا ہے کہ اگر وہ راضی ہوں تو میں ان کے لیے کوئی...... ڈھونڈنے کا کام کروں اس مقصد کے لیے ہم کسی میرج بیورو سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔''

''بکومت۔'' وہ مسکرائے اور سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ ''بارہ بج رہے ہیں بیٹا تم لوگ آرام کرو۔ خدا بخش۔'' اسے پیار بھری سرزنش کرکے وہ ملازم کو بلانے لگے۔

''جی صاحب۔'' خدا بخش فوراً ہی آموجود ہوا۔

''گیسٹ روم کھول دو اور......''

''نہیں بابا، عظام میرے کمرے میں ہی رہے گا۔'' رواحہ نے خدا بخش کو گیسٹ روم کھولنے سے منع کیا۔

''ٹھیک ہے، خدا بخش بچوں کے کمرے میں دودھ پہنچا کر خود بھی آرام کرو اور ساتھ ہی دیکھ لینا کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہو۔'' وہ کھڑے ہو گئے۔

''صاحب آپ کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیا مطلب بابا، آپ نے ابھی تک کھانا کیوں نہیں کھایا؟''

''بھوک نہیں ہے یار۔'' وہ مسکرائے۔

''صاحب نے تو چائے بھی نہیں پی آج پڑے، پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔''

''بابا!'' رواحہ نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔

''آپ پھر پرانی البمز نکال کر بیٹھ گئے ہوں گے۔''

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔'' انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''کتنے سال ہو گئے انہیں اسٹور میں ایسا بند کیا کہ پھر نکالا ہی نہیں۔'' انہوں نے رواحہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ رواحہ کو کیا خبر کہ ماضی کو یاد کرنے کے لیے البمز کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ البمز تو ان کے دل میں موجود ہیں جب چاہو صفحے الٹتے جاؤ اور تصاویر دیکھتے جاؤ۔

''بابا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ناں کہ اب آپ کبھی ماضی کو یاد کرکے ڈپریس نہیں ہوں گے۔''

''بھلا میں کب ڈپریس ہوا ہوں میری جان۔'' وہ پھر مسکرائے تھے۔

''جھوٹ نہیں بابا، آپ کی ٹھنڈی چائے والی بات بتا رہی ہے کہ میرے جانے کے بعد آپ نے پرانی

یادوں کو کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی آپ نے عظمی سے کہا کہ یہ مشیت کے فیصلے ہوتے ہیں اور ہمیں قدرت کے فیصلوں کو ماننا پڑتا ہے پھر آپ کیوں نہیں بھول جاتے ماما کو، دادا جان کو۔''

''میں نے قدرت کے فیصلوں کو قبول کیا ہے۔ اللہ کی رضا پر راضی ہوں لیکن جن رشتوں کے ساتھ ہم محبتوں کی ڈور سے بندھے ہوتے ہیں انہیں بھول جانا آسان نہیں ہوتا میری جان اور بھولنا بھی نہیں چاہیے۔ ان کا حق ہوتا ہے ہم پر کہ ہم انہیں یاد رکھیں آخری سانس تک۔'' وہ اداس ہو رہے تھے۔

''اگر دادا جان ہوتے تو میرے بہت لاڈ اٹھاتے۔'' رواحہ نے بے اختیار کہا۔

''ہاں! انہیں بہت انتظار تھا میرے بچوں کا جو نیا نام نظر آتا کاغذ پر لکھ کر رکھ لیتے، میں ہنستا تھا۔ بابا اتنے سارے ناموں کا کیا کریں گے آپ کوئی ایک دو پسند کر لیں۔''

''تو کیا میرا نام انہوں نے رکھا تھا؟'' رواحہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ پھر ماضی میں کھو گئے تھے۔ ''اس روز انہوں نے کسی صحابیؓ کا واقعہ پڑھا تھا جن کا نام رواحہ تھا کہنے لگے کیوں نہ ہم اپنے پوتے کا یہی نام رکھ لیں تو بس پھر میں نے یہی نام رکھ دیا۔''

عظام بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور اسے خیال آرہا تھا کہ اس کے پاپا نے کبھی اپنے والدین کا ذکر نہیں کیا۔ کبھی کسی رشتے کے حوالے سے بات نہیں کی بس وہ کبھی کبھار صرف ماما کا اور بھائی کا ذکر کرتے تھے۔

''عظام بیٹا، آپ بور ہو رہے ہو؟'' ان کی نظر اس پر پڑی تھی۔

''نہیں بالکل بھی نہیں انکل، مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں رشتوں کی حرارت اور محبتوں سے بالکل انجان ہوں، مجھے یہ سب آپ کے متعلق اور رواحہ کے دادا جان کے متعلق سننا بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''صاحب، دودھ کے گلاس کمروں میں رکھ دیے ہیں اور کچھ؟'' خدا بخش نے پھر انٹری دی تھی۔ ''صاحب آپ کے لیے بھی دودھ رکھ دوں؟''

''نہیں یار، مجھے تو بس چائے بنا دو اچھی سی۔''

''کھانا بھی نہیں کھایا اور اب چائے پی کر جی جلائیں گے اور رات بھر جاگیں گے۔'' خدا بخش بڑبڑایا تھا۔ رواحہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خدا بخش ایسا ہی تھا۔ رواحہ نے جب سے ہوش سنبھالا خدا بخش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح ان دونوں کے لیے پریشان رہتا تھا۔ بہت محبت تھی اسے بابا اور اس سے۔ بابا نے اسے بتایا تھا کہ خدا بخش بارہ، تیرہ سال کی عمر میں ان کے گھر آیا تھا۔ اس وقت خود ان کی عمر بھی اتنی ہی تھی پھر دادا جان نے ہی اس کی شادی کروائی تھی لیکن بیوی کا انتقال چند سال بعد ہی ہو گیا تھا۔ اولاد کوئی تھی نہیں ساری زندگی اس نے یہیں گزار دی پھر شادی نہیں کی حالانکہ دادا جان نے تو چاہا تھا کہ وہ شادی کر لے۔ اس نے رواحہ کو بچوں کی طرح ہی پالا تھا اور بابا کے لیے بھی وہ ایک مہربان اور شفیق دوست تھا۔

''خدا بخش آپ چائے کے ساتھ سینڈوچ بھی بنا دیجیے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے میں بنا دوں گا لیکن آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں، ایک بار اسپتال جا چکے ہیں اور ڈاکٹر نے کتنا سمجھایا تھا کہ زیادہ سوچنا نہیں خوش رہنا ہے لیکن انہوں نے تو بس سوچنا ہی سوچنا ہے۔'' اب خدا بخش کی بڑبڑاہٹ قدرے بلند تھی۔

''خدا بخش، اب یہ مجھے سمجھائے گا؟''

"جب بڑوں کو سمجھ نہ آئے تو چھوٹوں کو ہی سمجھانا پڑتا ہے۔" خدا بخش کے لبوں کی مسکراہٹ میں ہلکی سی شرارت تھی اور وہ عظام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیوں عظام صاحب غلط تو نہیں کہا ناں میں نے۔ اب دل بیچارہ پہلے ہی کمزور ہو چکا ایک بار انجاینا کا اٹیک ہوا ہے صاحب کو پھر خدانخواستہ ہو گیا تو......؟"

"جی !" عظام سٹپٹایا تھا۔ "چاچا صحیح کہہ رہے ہیں انکل۔"

"یک نہ شُد دو شُد۔" وہ ہنسے۔ "بلکہ تین شد۔"

"ٹھیک ہے بابا آپ آرام کریں اب۔" رواحہ کھڑا ہو گیا تھا۔ "ہم بھی چلتے ہیں۔"

ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ خدا بخش بڑبڑاتا ہو کچن میں چلا گیا۔

"اللہ حافظ بیٹا! شب بخیر۔" انہوں نے دونوں کی پیشانیوں پر باری باری بوسہ دیا۔ عظام کو بہت اچھا لگا۔

عظام کے پاپا بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ وہ ہاسٹل میں ہوتا تو ہر دوسرے تیسرے دن فون کرتے تھے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے۔ ڈاکٹروں کی لائن لگ جاتی تھی۔ اسے یاد تھا ایک بار جب وہ آٹھویں کلاس میں تھا تو اسے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا تو انہیں جیسے چین ہی نہیں آتا تھا۔ ہر دوسرے دن ڈاکٹر بدل دیتے تھے اور خوب چلاّتے بھی تھے۔

"ممتاز خان یہ کیسے ڈاکٹر ہیں، دو دن ہو گئے بچے کا بخار نہیں اتر رہا لگتا ہے جعلی ڈگریاں ہیں۔" اور ممتاز خان بیچارہ سر جھکا لیتا تھا۔ "جاؤ کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔"

وہ اس کے لیے قیمتی لباس خریدتے تھے۔ برانڈڈ چیزیں، قیمتی گھڑیاں، قیمتی جوتے لیکن اس سب کے باوجود ان کے درمیان ایسی بے تکلفی نہ تھی جیسے رواحہ اور اس کے بابا میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ زیادہ تر ہاسٹل میں رہا اور بہت کم ان کے ساتھ رہنا نصیب ہوا تھا یا پھر ان کی بے پناہ مصروفیات، بزنس کے جھمیلے اور دشمن کا خوف پھر بھی اس سب کے باوجود وہ پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے پاپا دنیا کے بہترین باپ ہیں۔ ان کے درمیان کبھی جذباتی مکالمے نہیں ہوتے تھے۔ انہیں اپنے جذبات پر کنٹرول تھا یا انہیں جذبات کا اظہار کرنا نہیں آتا تھا اور شاید اسی لیے جب رواحہ کے بابا نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو اس کے اندر ایک خوشگوار سا احساس پھیلتا چلا گیا اور اس نے بے اختیار ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا تھا اور اس کے اس انداز پر ان کا دل جیسے اور پگھلا اور انہوں نے بے اختیار اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اس کی پیشانی ایک بار پھر چوم لی۔

"جیتے رہو، خوش رہو۔" رواحہ مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنے دوست کی اس پزیرائی پر اس کا دل بے حد خوش تھا۔

"او کے بچوں اب تم آرام کرو۔" انہیں ایک بار پھر شب بخیر کہہ کر وہ رکے نہیں تھے۔ خدا بخش ان کے بیڈ روم میں شاید ان کے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔

"صاحب دودھ رکھ دیا ہے، چکن سینڈوچ بنائے ہیں کھا لیجیے گا۔ خالی پیٹ مت سوئیے گا۔"

"کھا لوں گا خدا بخش۔" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے ایک ممنونیت بھری نظر اس پر ڈالی۔ "تمہاری محبتوں اور شفقتوں کا ہمیشہ ممنون رہوں گا خدا بخش، تم نہ ہوتے تو بابا جان کے بعد نہ میں خود جی پاتا نہ رواحہ کو سنبھال سکتا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تمہارے احسانات کا بدلہ تو میں مر کر بھی نہیں چکا سکتا۔ تم میرے ہم عمر تھے

لیکن جس طرح تم نے مجھے سنبھالا، میرے دکھ پر میرے ساتھ روئے۔ میرا ایک بچے کی طرح خیال رکھا...... تم مجھے اس طرح نہ سنبھالتے تو میں تو کرچی، کرچی ہو گیا تھا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں صاحب۔" خدا بخش جاتے، جاتے رک گیا تھا۔ "شرمندہ نہ کریں صاحب...... احسان تو آپ کے بابا جان کا ہے مجھ پر...... وہ مجھے پناہ نہ دیتے گلے سے نہ لگاتے تو خدا بخش تو رُل گیا تھا۔ خاک ہو جاتا مٹی میں مل کر...... جب میرے چاچا نے دھکے دے کر گھر سے نکالا تھا تو میرے سامنے تو موت تھی اور سیاہ اندھیری رات۔ خدا بخش تو مرنے کے لیے ہی گھر سے نکلا تھا لیکن آپ کے بابا جان نے پناہ دی، سائبان بنے، گھر بسایا میرا، کیا کچھ نہیں کیا انہوں نے میرے لیے۔ خدا بخش تو اپنی کھال کے جوتے بنا کر آپ کو پہنا دے تو بھی کم ہے، قدموں کی خاک ہوں۔" اس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پونچھے تو انہوں نے اٹھ کر بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

"خدا بخش تم میرے دوست ہو، بھائی ہو، باپ ہو سب کچھ ہو کبھی خود کو کمتر مت سمجھنا۔" اس کے کندھے تھپتھپا کر انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "اس طرح صاحب مت کہا کرو کتنی بار کہا ہے تمہیں خدا بخش، بھائی کہہ لو نام لے لو کچھ۔"

"نہیں صاحب، زبان پر چڑھا ہے مت منع کریں مجھے۔ کہنے دیا کریں...... بلانے سے کیا ہوتا ہے صاحب۔"

"اچھا خدا بخش جیسے تمہاری مرضی۔" وہ مڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئے اور خدا بخش ایک بار پھر انہیں دودھ پینے اور سینڈوچ کھانے کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

ثمر حیات لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی وہ ہونٹ بھینچ لیتا کبھی پیشانی پر بل پڑ جاتے، ٹہلتے ٹہلتے وہ رکا اور انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر ممتاز خان کو بلایا۔ کچھ ہی دیر بعد ممتاز خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"یس باس......"

"گارڈز واپس آ گئے؟"

"جی......"

"ہاں، اب تفصیل سے بتاؤ کون آیا تھا مجھے ملنے۔"

"سر آج سے پہلے اسے نہیں دیکھا...... کہیں بھی نہیں۔ اِدھر نہ ڈی ون اور ڈی ٹو میں۔"

"ہوں......" ثمر حیات نے ہنکارا ابھرا۔ "کیا کہتا تھا؟"

"آپ سے ملنے کی ضد کر رہا تھا اور بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہتا تھا۔ مقبول نام بتایا تھا اس نے۔"

"مقبول......!" اس نے ذہن پر زور ڈالا لیکن اس نام کا کوئی بندہ دور، دور تک نہیں تھا۔ ماضی قریب یا ماضی بعید میں کہیں بھی وہ اس نام کے بندے کو نہیں جانتا تھا۔

"آخر وہ کون تھا اور کیوں ملنے آیا تھا؟" سوچتے، سوچتے اس نے ممتاز خان کی طرف دیکھا۔

"عظام کو کیسے پتا چلا اس کے آنے کا؟"

"سر انہوں نے اپنے کمرے کی گیلری سے دیکھا تھا اور انہیں لگا تھا کہ وہ مجھ سے جھگڑ رہا ہے اس لیے وہ نیچے گیٹ پر آئے تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے وہ جا چکا تھا۔"

ثمر حیات نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ عظام اس کے جاننے والے کسی بھی بندے سے ملے اور پتا نہیں اب یہ بندہ کون تھا اور کیا کہہ دیتا عظام سے۔ ہوسکتا ہے مخالف گروپ کا ہو۔ وہ ساری زندگی بہت محتاط رہا تھا۔ عظام کو خود سے دور رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عظام اس کے متعلق جان کر ہرٹ ہو۔ آج تک عظام نہیں جان سکا تھا کہ ثمر حیات کیا کرتا ہے۔ عظام نے اپنے دل میں اس کا جو امیج بنا رکھا تھا وہ اسے توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ جو بھی کھیل کھیلا اس نے عظام کو اس کی خبر نہ ہونے دی تھی۔ وہ اگر جان جاتا کہ اس کا باپ کیا کرتا ہے؟ کون ہے تو شاید وہ اس سے نفرت کرنے لگتا اور وہ اس نفرت سے ڈرتا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا لیکن عظام کی نفرت نہیں۔ اس پوری کائنات میں عظام اس کا واحد سرمایہ تھا جب سے عظام جوان ہوا تھا تب سے ہی اس کے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ یہ سب چھوڑ دے اور عظام کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزارے۔ ہر خوف ہر ڈر سے دور۔ عظام کی شادی ہو، اس کے بچے ہوں اور ایک ایسی زندگی جو بہت پہلے بچھڑ گئی تھی پھر سے مل جائے لیکن...... اس کے پاؤں دلدل میں اس طرح دھنس چکے تھے کہ یہ دلدل اس کی جان تو لے سکتی تھی لیکن وہ اس دلدل سے نکل نہیں سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے ممتاز خان تم جاؤ۔'' ایک گہری سانس لے کر اس نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔

''عظام بھیا کہہ رہے تھے کہ آپ کو ابھی خانیوال جانا ہے۔''

''نہیں ممتاز خان، تم جانتے ہو میں صبح خانیوال سے آیا ہوں۔ کراچی سے سیدھا خانیوال گیا تھا اور قبرستان سے ہو کر آگیا۔ ہمیشہ کی طرح عظمی کے آنے سے پہلے۔''

''جی باس لیکن پھر آپ نے عظمی بھیا کو کیوں بھیج دیا ترسے ہوئے ہوتے ہیں آپ سے ملنے کو۔'' ممتاز خان کی آواز آہستہ تھی۔

''ممتاز خان جانتا ہوں وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے ہمیشہ لیکن میں بہت مجبور ہوں۔ ابھی مجھے ڈی ون میں جانا ہے کچھ دیر تک...... بگ بانے بلایا ہے۔''

''کیا بگ با یہاں ہیں؟''

''آج ہی آئے ہیں۔''

''کوئی خاص بات ہے کیا باس؟'' ممتاز خان نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔''

''ہوسکتا ہے جو مال پکڑا گیا ہو اس سلسلے میں بلایا ہو۔'' ممتاز خان نے رائے ظاہر کی۔

''نہیں ممتاز خان بگ با اتنے چھوٹے معاملوں کے لیے میٹنگ کال نہیں کرتے۔ کوئی بڑا مسئلہ ہوگا...... خیر تم جاؤ اور دھیان رکھنا اگر عظام مجھ سے پہلے گھر آگیا تو میرے کسی ملاقاتی سے ملنے نہ پائے۔''

''جی باس۔''

''اور ہاں اگر کل دوبارہ وہی شخص آئے تو تم اسی سے فون نمبر لے لینا اور اس سے کہہ دینا کہ تین دن بعد آئے۔''

''بہتر جناب!'' ممتاز خان چلا گیا تو وہ ایک بار پھر ٹہلنے لگا۔

ابھی بارہ بجے تھے اور بگ بانے ایک بجے بلایا تھا۔ ڈی ون تک پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگ جاتا تھا۔ ابھی آدھا گھنٹا تھا اس کے پاس اور یہ آدھا گھنٹا اس نے بگ با کے متعلق سوچتے ہوئے گزار دیا۔ کتنے ہی سال اس نے بگ با کے ساتھ گزارے تھے لیکن جب اس کا بیٹا اس دنیا میں آیا تھا تو اس نے الگ رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی پرورش جرائم کی دنیا میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے ایک اچھا اور بہترین انسان بنانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح ایک غنڈا اور پھر ایک گینگ کا رکن بن جائے۔ فرحی بھی یہی چاہتی تھی۔ وہ شادی کے چودہ سال بعد ماں بن رہی تھی۔

''ہماری زندگی جیسے بھی گزری ثمر گزر گئی لیکن ہمارا بچہ جب اس دنیا میں آئے گا تو میں اس کے لیے کوئی اور زندگی چاہوں گی۔ ہمارا بیٹا یہ زندگی نہیں جیے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ بڑا ہو تو اسے پتا چلے کہ اس کا باپ ایک غنڈا تھا۔ پہلے وہ دادا کہلاتا تھا پھر باس کہلانے لگا۔''

''فرحی۔'' اس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ ''تم جانتی ہو یہ زندگی میں نے خود نہیں چنی تھی۔ میں نے کبھی ایسی زندگی کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ یہ تو خود بخود میری جھولی میں آپڑی تھی اور مجھے اسے قبول کرنا پڑا تھا کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ زندگی جس نے صوفی محمد نصیر بزاز کے بیٹے کو حیاتی دادا بنا دیا میرا انتخاب نہیں تھی پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے بچے کو اس زندگی سے دور رکھوں گا۔'' یہ زندگی جس سے وہ خود بگ با کی وجہ سے روشناس ہوا تھا۔ بگ بانے اس کی زندگی میں متضاد کردار ادا کیا تھا۔ ایک طرف تو اس نے... اس وقت اسے سہارا دیا جب سب نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ چاروں طرف سے پریشانیوں میں گھرا تھا مگر اکیلا تھا۔ ہر طرف خوف تھا کہیں روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی۔ تب بگ بانے ان کے سروں پر ہاتھ رکھا۔ وہ اور فرحی دنیا کے اس اژدھام میں بالکل اکیلے... تنہا اور خوفزدہ تھے دوسری طرف اس نے صوفی محمد نصیر بزاز کے بیٹے کو جو پانچ وقت پابندی سے مسجد میں باجماعت نماز پڑھتا تھا اور جس کے باپ صوفی محمد نصیر کی محلے میں بڑی عزت تھی۔ اہلِ محلہ ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے لیے اسی کے پاس آتے تھے جس کی شرافت، ایمان داری اور نیکی کے سب گواہ تھے۔ اس صوفی محمد نصیر کے بیٹے کو حیاتی دادا بنا دیا تھا۔ کتنا بڑا اخراج لیا تھا بگ بانے اسے سہارا دینے کا۔ اس روز فرحی بہت روئی تھی۔

''اور یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا ثمر اگر میں تمہاری زندگی میں نہ آتی تو تم صوفی محمد نصیر بزّاز کے بیٹے ثمر حیات سے حیاتی دادا نہ بنتے۔''

''فرحی!'' اس نے بے اختیار جھک کر اس کے ہاتھ تھامنے چاہے تھے تب ہی فون کی تیز آواز سے وہ چونکا تھا۔ چونک کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ فرحی تو کہیں نہیں تھی اور وہ لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ سر جھٹک کر وہ فون کی طرف بڑھا اور اس نے ریسیور اٹھایا اور بگ با کی گمبھیر آواز سن کر یک دم الرٹ ہوگیا۔

''یس باس۔''

''تم ابھی تک گھر سے نہیں نکلے حیاتی؟''

''بس نکلنے ہی والا تھا بگ با۔'' اس کی نظریں سامنے کلاک پر پڑیں ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

''تمہارا سیل کہاں ہے۔ مراد نے کئی دفعہ تمہیں کال کی، تم نے اٹھایا نہیں۔''

''بگ با، وہ میں نے چارجنگ کے لیے لگایا ہوا تھا۔ اپنے بیڈروم میں اور میں یہاں لاؤنج میں تھا۔''

''جانتا ہوں آج کے دن تم ڈسٹرب ہو گے تمہاری بیوی کی برسی تھی۔'' بگ با کی سپاٹ آواز سے نرمی جھلکی تھی۔ ''لیکن اس وقت بہت ضروری اور اہم میٹنگ تھی ورنہ تمہیں آج کے دن ہرگز ڈسٹرب نہ کیا جاتا۔ صبح نو بجے کی فلائٹ سے مجھے دبئی جانا ہے۔''

''کوئی بات نہیں بگ با، میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

''مراد نے تمہیں یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ تم ڈی ون کے بجائے ڈی ٹو میں آنا۔''

''جی بہتر۔''

''اور سیل فون ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرو۔ مجھے خود فون کرنا پڑا۔''

اور ثمر حیات کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون بند ہو گیا تھا۔ لینڈ لائن کا نمبر صرف بگ با کے پاس ہی تھا۔ مراد وغیرہ کسی کے پاس یہ نمبر نہیں تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی کوئی لینڈ لائن پر فون کرے اور اتفاق سے عظام ریسیو کرلے۔ یہ کیسی دُہری زندگی تھی جو وہ گزار رہا تھا اور اب اس زندگی سے تنگ آ گیا تھا۔ اس نے پیشانی پر آئے پسینے کے قطرے ہاتھ کی پشت سے صاف کیے اور بیڈ روم سے فون اٹھا کر باہر آ گیا۔ ممتاز خان گیٹ کے پاس ہی چارپائی بچھائے لیٹا ہوا تھا اور غالباً اسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور گیٹ کھولنے لگا۔ وہ ڈرائیو وے پر موجود اپنی لشکارے مارتی بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''ہیلو کیا ہے انی؟'' کچھ دیر بعد ارتقاع نے فون ریسیو کیا تھا۔

''کہاں ہو رتی؟''

''اپنی گاڑی میں ہوں اور ظفری کے فارم کی طرف جا رہے ہیں ہم سب، بس کچھ ہی دیر ہوئی نکلے ہیں۔''

''فوراً واپس آؤ۔'' افنان، ارتقاع سے بات کر رہا تھا اور ایمل پریشانی سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''لیکن کیوں انی، خیریت ہے ناں سب؟''

''گھر آؤ پھر بتاؤں گا سب۔''

''مجھے ٹینشن ہو رہی ہے انی، پلیز بتاؤ کچھ مما اور پپا تو ٹھیک ہیں ناں؟''

''تم گھر آ رہی ہو تو پتا چل جائے گا۔'' اس نے حتمی انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا اور ماں کی طرف دیکھا۔

''مما آپ پاپا کے ساتھ جائیں، میں رتی کو لے کر آتا ہوں۔''

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟'' ایمل نے پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں مما، وہ لوگ ابھی جانے کے لیے راستے میں ہی تھے۔ آ رہی ہے واپس پلیز آپ ریلیکس ہو کر جائیں۔''

ایمل کے چہرے پر اطمینان نظر آیا اور وہ پیچھے بیٹھنے کے بجائے فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ بابر بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''اللہ حافظ!'' افنان انہیں اللہ حافظ کہہ کر واپس اندر چلا گیا اور بابر نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی۔

''دیکھنا اب کتنی خفا ہو گی وہ۔'' بابر نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہوتی رہے خفا۔'' وہ بھی بے پروائی سے بولی۔ ''پتا نہیں کیسے، کیسے لوگ وہاں اکٹھے ہوں گے۔''

''کیسے لوگ ہوں گے؟ وہ کوئی غنڈے، بدمعاش نہیں ہیں۔ اچھے گھرانوں کے بچے ہیں سب اور اپنی

رتی کے دوست ہیں۔''

''اور آپ نے اسے دو تین دن کے لیے اجازت دے دی۔'' ایمل کے لہجے سے اب بھی پریشانی جھلکتی تھی۔

''تو آج ہی جا کر واپس تو نہیں آ سکتی تھی ناں اور کتنی بار بتاؤں وہ اکیلی نہیں گئی اس کی فرینڈ زوہ کیا نام ہے ان کا رافعہ اور عالیہ بھی ہیں۔ رتی کوئی بے وقوف لڑکی نہیں ہے اپنا برا بھلا سمجھتی ہے یار، ٹرسٹ کیا کرو اس پر۔'' بابر کے لہجے میں نرمی تھی اور وہ ڈرائیو کرتے ہوئے ونڈ اسکرین پر ہی نظر رکھے ہوئے تھا۔

''مجھے ٹرسٹ ہے اس پر بابر...... میری بیٹی ہے وہ میں کیوں بھلا ٹرسٹ نہیں کروں گی اس پر لیکن دنیا پر ٹرسٹ نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔''

''زمانہ تو ہمیشہ ہی خراب ہوتا ہے۔'' بابر ہنسا۔ ''یاد ہے ناں تمہاری پھپھو تمہیں اور مجھے کیا کہا کرتی تھیں کہ زمانہ بڑا خراب ہے گھر جلدی آیا کرو۔ مجھے کم اور تمہیں زیادہ...... یہ ہر زمانے کے والدین بچوں سے یونہی کہتے ہیں ایمل۔''

''لیکن آج کل کے حالات تو واقعی بہت خراب ہیں بابر اور صرف لڑکیوں کے لیے نہیں لڑکوں کے لیے بھی۔ والدین کو دونوں پر نظر رکھنی چاہیے۔''

''رکھتی تو ہو تم نظر رتی پر...... کڑی نظر۔'' اس نے ذرا سا چہرہ اس کی طرف موڑا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ''ہر وقت روک ٹوک یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔''

"میں کب روکتی ٹوکتی ہوں اسے اور اگر روکوں بھی تو وہ کب سنتی ہے میری۔"

"اس لیے نہیں سنتی کہ تم بلاوجہ ٹوکتی ہو اسے۔"

"ایسا نہیں ہے بابر، میں نے کبھی اسے بلاوجہ نہیں ٹوکا میں اسے وہی سمجھاتی ہوں جو سمجھانا چاہیے۔"

"تو کیا کل صبح تم نے اسے صحیح ٹوکا تھا؟"

"کل صبح بھلا کب؟" ایمل نے یاد کیا کہ کل کیا بات ہوئی تھی اور پھر اسے یاد آ گیا۔ "غلط تو نہیں کہا تھا میں نے جانے کہاں، کہاں دنیا بھر کے لوگوں سے چیٹ کرتی رہتی ہے۔ اسی بات سے منع کیا تھا بندوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"پتا نہیں ایمل تم کس زمانے کی بات کرتی ہو۔ دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے اور سب ہی بچے چیٹ کرتے ہیں اس سے وہ دوسروں کے متعلق جانتے ہیں۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے پتا نہیں یہ دقیانوسی روح تمہارے اندر کہاں سے سما گئی ہے۔ تم ایسی تو نہ تھیں۔ اپنے زمانے میں تو تم بڑی بولڈ تھیں کالج، یونیورسٹی میں دھوم تھی تمہاری، تمہارے دوستوں میں لڑکے بھی تھے۔ ہم جیسوں کو تو تم لفٹ ہی نہیں کرواتی تھیں اور اب رتی کو منع کرتی ہو لڑکوں سے دوستیاں نہ کرے، یہ تو انصاف نہ ہوا ناں۔" بابر نے پھر ذرا سا رخ موڑ کر بیوی کو دیکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ چپ کر گئی تھی۔ ارتقاع کے معاملے میں بابر اس کی نہیں سنتا تھا۔ اس کی ہر بات پر لیس کہنے والا بابر نوید، بیٹی کے معاملے میں ہمیشہ اپنی چلاتا تھا۔ اتنی زیادہ محبت کرتا تھا وہ ارتقاع سے کہ اس کی ہر جائز ناجائز بات کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اپنی اکیس سالہ ازدواجی زندگی میں اسے بابر سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی سوائے اس ایک شکایت کے کہ وہ ارتقاع کے بے جا لاڈ اٹھاتا تھا۔ ان بیتے ہوئے سالوں میں اگر ان کے درمیان کبھی کوئی تلخ بات ہوئی بھی تھی تو وجہ ارتقاع ہی تھی۔ بابر کے بے جا لاڈ کی وجہ سے وہ بچپن سے ہی بہت ضدی ہو گئی تھی۔

"آج تم غضب ڈھا رہی ہو ڈیئر۔" بابر نے بے حد لگاوٹ سے بیوی کو دیکھا۔ "یاد ہے شادی سے پہلے ایک بار تم نے بالکل اسی فیروزی کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ شاید تمہاری کسی دوست کی بہن کی شادی تھی، میں نے تمہیں دیکھا اور مجھے لگا تھا جیسے پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ فیروزی بناری سوٹ تم پر اتنا جچ رہا تھا کہ میں نے اس روز محسوس کیا تھا جیسے تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو اور تم میرے دل میں اچانک ہی اتر آئی تھیں...... قابض ہو گئی تھیں۔ میں مبہوت سا تمہیں دیکھتا تھا اور تمہیں میرا دیکھنا کتنا برا لگا تھا۔ یاد ہے ناں تمہیں کتنا غصہ آیا تھا اور تم نے کہا تھا بابر بھائی میرے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے جو آپ پاگلوں کی طرح مجھے گھور رہے ہیں اور مجھے اس طرح عورتوں کو گھورنے والے مرد زہر لگتے ہیں...... کیوں یاد ہے ناں یہی کہا تھا ناں تم نے؟" اس نے کن انکھیوں سے ایمل کی طرف دیکھا۔

"سامنے دیکھیں بابر کہیں حادثہ نہ کر بیٹھیں۔" ایمل کو اس کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ "اور یہ کیا آپ بیکار کی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"تب تمہیں کیا پتا تھا کہ یہ زہر لگنے والا مرد عمر بھر کے لیے تم پر مسلط ہو جائے گا۔"

"کسی کو آنے والی زندگی کے متعلق کچھ پتا نہیں ہوتا بابر۔ یہ تو آسمانوں پر لکھا ہوتا ہے کہ کس کے ساتھ کس کا جوڑ ابنا ہے اور نکاح کے بعد ہر لڑکی کے لیے اس کا شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔"

"لیکن تب تو تم مجھ سے بہت نفرت کرتی تھیں ناں۔"

عید قرباں

عید قرباں کی آمد آمد ہے۔ یہ عید ہمیں اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرنے اور بندگی کے گہرے اسرار سے پردہ اٹھانے کی نوید سناتی ہے۔ اس عید میں خدا کے مقرب بندوں کو خدا کے اور زیادہ نزدیک ہونے کا موقع میسر آتا ہے۔ درحقیقت یہ عید انسان کے سامنے ایک نیا افق پیش کرتی ہے۔ یہ عید دنیاوی تعلقات سے آزادی کا دن ہے۔ یعنی خدا کے علاوہ بندے کے وجود میں جو کچھ بھی ہے اس کو قربان کرنے کا دن ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے وجود کے اسمٰعیل کو ذبح کرنے کا دن ہے۔ آپ بھی قربانی کے میدان میں حضرت ابراہیمؑ کی طرح آتے ہیں لیکن پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آپ کا اسمٰعیل کون ہے؟ یعنی آپ کی دلی وابستگی کس کے ساتھ ہے؟ کیا آپ کا مقام ومرتبہ آپ کا اسمٰعیل ہے یا آپ کی جھوٹی عزت وشہرت؟ کیا آپ کی دولت آپ کا اسمٰعیل ہے یا آپ کا گھر، جائداد یا کوئی اور چیز......؟ یاد رکھیں! اس سوال کا جواب صرف اور صرف آپ ہی جانتے ہیں! ہم تو آپ کو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ اس چیز کو تلاش کریں۔ جو آپ کو ایمان کی راہ پر چلنے سے روکتی ہے، جس کی چاہت آپ کو پیام حق سننے سے روکتی ہے، جس کی وجہ سے آپ حقیقت تک نہیں پہنچ پاتے۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بڑھاپے میں اولاد کی نعمت سے نوازا گیا۔ آپؑ نے بچے کا نام اسمٰعیل رکھا جو آپ کو بہت عزیز اور پیارا تھا۔ جب جناب اسمٰعیلؑ جوانی کی منزل پر پہنچے تو خلیل اللہ کو کئی مرتبہ خواب کے ذریعے کوئی وجہ بتائے بغیر یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے عزیز بیٹے کو قربان کر دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نوجوان بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن جب چھری پھیرنے کا وقت آتا ہے تو خدائے مہربان اپنے دوست کی قربانی کو قبول کرتے ہوئے ایک دنبے کو بھیج دیتا ہے۔ عشق ومحبت اور ایثار وقربانی کے عروج کے اس عمل کو خداوند متعال کے حکم سے حاجیوں کے لیے ایک فرض کے طور پر شامل کر لیا گیا اور دنیا بھر کے مسلمان بھی خلیل اللہ کی اس سنت پر عمل کرتے ہیں۔ عید کے دن انسان کی ظاہری آرائش میں فرق محسوس ہوتا ہے اور وہ صاف ستھرا ہو کر نیا لباس زیب تن کرتا ہے، اس کے علاوہ عید کا دن خوشیاں منانے اور آرام وسکون کا دن ہے۔ مرسلہ: صبا سجاد...... دبئی

"آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابر؟"

"غلط تو نہیں کہہ رہا سوئیٹی، میں تمہاری محبت میں تمہارے عشق میں جلتا تھا اور تم ایک نگاہ بھی مجھ پر ڈالنا پسند نہیں کرتی تھیں۔" ایمل کو بابر کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا تھا اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"یہ آپ کیا فضول باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں؟"

"یہ فضول باتیں کہاں ہیں جانو، سچ بتاؤ کیا اب بھی تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟"

"یہ اکیس سالوں بعد آپ کو آج پوچھنے کا خیال کیسے آ گیا؟" ایمل نے اپنی جھنجلاہٹ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ بابر کے لبوں پر ایک محظوظ کر دینے والا تبسم تھا۔

"خیال کی کیا بات ہے کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ ہاں بتاؤ ناں...... کیا نفرت کرتی ہو اب بھی مجھ سے؟"

ایکسیلیریٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ کم ہوا تھا۔ گاڑی کی رفتار آہستہ ہوئی تھی۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

"میں جو بھی سمجھتا ہوں، آج تم سے سننا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں ضدی پن نمایاں تھا۔

"میں آپ سے نفرت نہیں کرتی، پہلے بھی نہیں کرتی تھی۔ بس میں نے اس انداز سے کبھی آپ کے متعلق سوچا نہیں تھا اور شادی کے بعد پھپھو کہتی ہیں نکاح کے بولوں کے ساتھ ہی محبتوں کے رشتے استوار ہو جاتے ہیں۔ عجیب طلسماتی رشتہ ہوتا ہے میاں بیوی کا۔ جس انسان کو اس سے پہلے دیکھا نہیں ہوتا اس کے ساتھ خود بخود ہی محبت کے بندھن بندھ جاتے ہیں۔"

"یہ تو تمہاری پھپھو نے کہا تھا، تم کیا کہتی ہو؟" رفتار کی سوئی اب بھی تیس کے ہندسے پر تھی۔

"پھپھو غلط نہیں کہتی تھیں۔"
"یعنی تمہیں بھی مجھ سے محبت ہوگئی تھی؟" ایمل کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"بولو ناں جان!"
"ہاں مجھے بھی آپ سے محبت ہوگئی تھی۔" ایمل کی پلکیں جھک گئی تھیں اور رخساروں پر شفق دوڑ گئی تھی۔
اب جبکہ وہ چھیالیس سال کی تھی عمر کے اس حصے میں بھی اتنی سی بات کرتے ہوئے اس کا دل بے حد زور سے دھڑکا تھا۔ بابر نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر زور سے قہقہہ لگایا۔
"یعنی تم ایمل بابر...... تمہیں بابر نوید سے شادی کے بعد محبت ہوگئی تھی لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر نکاح کے ان طلسماتی بولوں نے کوئی جادو نہیں کیا اور میں تم سے محبت نہیں کرتا......؟" اس نے ایمل کے چہرے کی طرف دیکھا جس کے مسکراتے لب بھنچ گئے تھے اور چہرے کی شفق زردی میں بدل گئی تھی۔
"بابر آپ......؟" اس کے لبوں سے نکلا تھا۔
"مذاق کر رہا ہوں یار۔" بابر نے پھر قہقہہ لگاتے ہوئے ایکسیلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی اور ایمل نے سہمی سہمی نظروں سے بابر کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ آج بابر نے اس طرح کی بات کیوں کی ہے اس سے پہلے تو اس نے کبھی اس طرح ماضی کی کوئی بات نہیں کی تھی۔"
یہ سچ تھا کہ وہ بابر کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ ناپسندیدگی اسی وقت سے چلی آرہی تھی شاید جب ممی اسے اپنے ساتھ گھر لائی تھیں۔ اس کی عمر تب یہی کوئی پانچ، چھ سال ہوگی اور بابر آٹھ سال کا تھا۔ ممی کو ڈاکٹرز نے بتادیا تھا کہ وہ اب ماں نہیں بن سکتیں۔ تب وہ بڑی خالہ سے ملنے گئیں تو اسے بھی ساتھ لے آئی تھیں۔ وہ بڑی خالہ کا بیٹا تھا۔ انہوں نے خالہ سے اسے مانگ لیا تھا۔ خالہ کے ماشاء اللہ سات بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ ایک بہن اور چار بھائی بابر سے بڑے تھے پھر بابر اور عامر جڑواں تھے پھر سب سے چھوٹا ایک بھائی اور تھا۔
خالہ نے ممی کو انکار نہیں کیا یوں بابر اُن کے گھر آ گیا تھا اور اس کی طرح اپنی خالہ اور خالو کو ممی، ڈیڈی بلانے لگا تھا۔ اس کے آنے سے ممی کی توجہ بٹ گئی تھی شاید اس لیے بچپن میں وہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا بلکہ موقع ملنے پر وہ اس کی شکایتیں بھی ڈیڈی سے کر دیتی تھی کیونکہ وہ اکثر اس سے پوچھے بغیر اس کی چیزیں اٹھالیتا تھا۔ اس کی دراز سے اس کی پنسلیں، بکس جو مرضی اٹھالیتا۔ فریج میں رکھی اس کی پسندیدہ چاکلیٹ کھا جاتا تھا۔
"کیا سوچ رہی ہو؟" بابر نے اس کی طرف دیکھا۔ "سنجیدہ لگ رہی ہو، جانی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بابر نوید کے لیے تم اس دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہو۔ اس کی محبت، اس کا عشق۔" تب ہی ایمل کا فون بج اٹھا تھا۔
"ہیلو ماما کیا بات ہے؟" اس نے فوراً ہی فون اٹینڈ کیا تھا۔
"ممارتی آ گئی ہے گھر لیکن میں اور وہ دونوں ہی مایوں کے فنکشن میں شریک نہیں ہوسکیں گے۔ پھپھو سے معذرت کر لیجیے گا۔"
"کیوں بیٹا؟"
"اس کا موڈ بہت خراب ہے مما۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ "اور اس خراب موڈ میں اسے تنہا چھوڑ کر آنے کا رسک میں نہیں لے سکتا۔"
"او کے بیٹا، بڑی بہن ہے تمہاری خیال رکھنا۔"
"بے فکر رہیں مما۔" افنان نے فون بند کر دیا تھا۔

"کیا فرما رہے تھے تمہارے صاحبزادے؟" بابر کا لہجہ طنزیہ تھا۔
"کچھ نہیں کہہ رہا تھا رتی آ گئی ہے گھر۔"
"تمہارا یہ بیٹا بھی 1950ء میں زندگی گزار رہا ہے۔"
"وہ آپ کا بھی بیٹا ہے بابر۔" اس نے احتجاج کیا تھا۔
"نہیں، میری بیٹی تو صرف رتی ہے۔ میرا بیٹا اتنی دقیانوسی سوچ نہیں رکھ سکتا۔ تمہاری مکمل چھاپ ہے اس پر۔"
"اخلاقی قدریں تو ہمیشہ وہی رہتی ہیں بابر 1950ء ہو یا 2014ء۔"
"اب تم مجھے لیکچر مت دینا پلیز۔" بابر نے بیزاری سے کہا۔ ایمل چپ کر گئی تھی اور بابر پھر خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

☆☆☆

انہوں نے قرآن جُزدان میں لپیٹ کر الماری میں رکھا اور کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر روشنی پھیل چکی تھی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔
"آ جاؤ خدا بخش۔" انہوں نے مڑے بغیر کہا۔ جانتے تھے کہ خدا بخش بیڈ ٹی لایا ہوگا۔ خدا بخش نے دروازہ کھول کر سلام کیا اور چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔
"ناشتے میں کیا بناؤں صاحب؟"
"رواحہ اور عظام اٹھیں تو اُن سے پوچھ لینا۔"

"آپ ان کے ساتھ ناشتا کریں گے، آپ کو آفس نہیں جانا کیا؟"
"آج سنڈے ہے خدا بخش۔"
"اوہ۔" خدا بخش نے افسوس سے سر ہلایا۔ "میری یادداشت بھی بہت کمزور ہوگئی ہے۔ رات رواحہ بیٹے نے بتایا تو تھا مجھے کہ سنڈے ہے لہٰذا انہیں جگایا نہ جائے۔"
"کیوں یادداشت کو کیا ہوا خدا بخش؟" وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گئے۔
"بوڑھا ہو گیا ہوں صاحب۔" خدا بخش نے کپ اٹھا کر انہیں دیا اور پھر ٹرے سے بسکٹ کا جار اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔ "لیں صاحب خالی پیٹ چائے سے اندر نہ جلائیں، ایک بسکٹ لے لیں۔" وہ مسکرائے یہ جملہ کم و بیش ہر روز ہی خدا بخش کہتا تھا۔ انہوں نے بسکٹ لے کر خدا بخش کی طرف دیکھا۔
"میرے کولیگ کہتے ہیں چھیالیس، سینتالیس سال کی عمر میں کوئی مرد بوڑھا نہیں ہوتا لیکن ہم نے بڑھاپا جان بوجھ کر اپنے اوپر اوڑھ لیا ہے۔"
"نہیں صاحب، بھول جاتا ہوں ہر بات...... بوڑھا تو ہو گیا ناں۔"
"بادام کھایا کرو یار۔" انہوں نے چائے کا سپ لیا۔
"تو صاحب آج تو ناشتا باہر سے ہی آئے گا ناں؟"
"ہاں رواحہ کو نہاری پسند ہے۔ نہاری اور چنے پوریاں بھی لے آنا۔ عظام بھی تو ہے...... اب پتا نہیں عظام کو کیا پسند ہے؟"
"جی صاحب۔" خدا بخش کمرے سے چلا گیا تو انہوں نے سوچا۔
"رواحہ اور عظام تو لیٹ ہی جاگیں گے۔" یوں بھی رواحہ سنڈے کو دیر سے ہی اٹھتا تھا۔ اکثر تو اتنی دیر سے اٹھتا کہ ناشتے کے بجائے برنچ ہی ہو جاتا تھا۔ "کیوں نہ ان کے اٹھنے سے پہلے کچھ واک کرلوں۔" گھر کے نزدیک ہی ایک پارک میں وہ اکثر چھٹی والے دن واک کے لیے چلے جاتے تھے۔ کئی لوگ ہوتے تھے۔ انہیں زندگی کی اس گہما گہمی میں کچھ دیر کے لیے شامل ہونا اچھا لگتا تھا۔ نوجوان لڑکے، لڑکیاں کچھ خواتین اور مرد صبح، صبح واک کے لیے آجاتے تھے۔ کچھ لوگوں سے تو ان کی اچھی دعا سلام تھی۔ اگرچہ آج وہ کچھ لیٹ ہو گئے تھے لیکن فریش ہونے کے لیے انہوں نے تازہ ہوا میں جانے کا سوچا اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔
"خدا بخش میں ذرا پارک تک جا رہا ہوں، گھنٹے تک آجاؤں گا۔"
"جی صاحب۔" خدا بخش نے خدا حافظ کہہ کر گیٹ بند کرلیا اور وہ پارک کی طرف چل پڑے۔
پارک میں چند لڑکے ٹریک سوٹ میں ملبوس جاگنگ کر رہے تھے۔ دو تین ادھیڑ عمر خواتین باتیں کرتی ہوئی ٹہل رہی تھیں۔ ایک صاحب بینچ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ بھی ایک خالی بینچ پر بیٹھ گئے۔ اس وقت صبح کی خوشگوار سی خنکی تھی۔ انہیں لگا جیسے رات بھر ٹھیک طرح سے نہ سونے کی وجہ سے جو تھکن ہوگئی تھی وہ یک دم ختم ہوگئی ہو۔ وہ دلچسپی سے پارک میں موجود لوگوں کو دیکھنے لگے۔ سورج کا سرخ گولا آہستہ، آہستہ سامنے کے درختوں کے جھنڈ سے ابھر رہا تھا۔ ایک دس بارہ سال کا بچہ اپنی ماں کو انگلی کے اشارے سے بار بار سورج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ وہ بچہ بھلا اپنی ماں سے کیا کہہ رہا ہوگا جب ان کے کانوں میں آواز آئی۔
"چندا...... چندا پلیز رکو یار۔"

"چندا!" ان کا دل جیسے تیزی سے دھڑک اٹھا۔
"چندا!" انہوں نے دُہرایا اور رخ موڑ کر دائیں طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ایک اسمارٹ سی لڑکی تیز تیز چل رہی تھی اور اس کے پیچھے ہانپتی ہوئی ایک موٹی سی لڑکی اسے آواز دے رہی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر انہوں نے رخ موڑ لیا۔
"میں بھی پاگل ہوں، بھلا چندا یہاں کہاں اور وقت بھی کتنا گزر گیا ہے چندا کو بچھڑے ہوئے لیکن اس کی محبت دل میں آج بھی روزِ اول کی طرح ہی تروتازہ...... پہلی نظر کی محبت بھلائے نہیں بھولتی۔" اس نے بھلا کب سوچا تھا کہ وہ اس طرح کسی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ لڑکی بھی وہ جسے اس نے صرف دو بار دیکھا تھا۔
اس رات وہ بہت تڑپا تھا۔ یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی جسے اس کے دل نے چنا وہ پہلے سے ہی کسی سے منسوب ہو لیکن ایسا ہی تھا۔ مونا نے یہی بتایا کہ اس کی بات بچپن سے ہی اپنے کسی کزن سے طے ہے اور مونا نے یہ بات شاید اس لیے بتائی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے لیے اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو۔ ایسا جذبہ جو لاحاصل ہو۔ شاید وہ اسے روکنا ہی چاہتی تھی پہلی سیڑھی پر ہی لیکن نہیں جانتی تھی کہ وہ تو ایک چھلانگ میں کئی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا اور اب تڑپ رہا تھا۔
"نہیں ضروری تو نہیں کہ بچپن کی طے کی ہوئی بات برقرار رہے۔ وقت کے ساتھ تبدیلیاں بھی تو آجاتی ہیں۔ رشتے ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں۔" اس نے دل کو تسلی دی تھی لمحے بھر کے لیے دل ٹھہر بھی گیا تھا لیکن پھر وہی بے چینی شروع ہوگئی تھی۔ دل کسی ضدی بچے کی طرح مچل اٹھا تھا۔ کم عمری کی محبت یونہی تڑپاتی اور بے چین کرتی ہے اور وہ بھی تو صرف بیس سال کا تھا۔ وہ جو بابا جان سے کہا کرتا تھا کم از کم دس سال تک وہ اس کی شادی کا نام تک نہ لیں۔ اب ایک انجان لڑکی کی محبت میں تڑپ رہا تھا۔ ساری رات وہ بے چین رہا تھا اس لیے جب صبح اٹھا تو رتجگے کے نشان اس کے چہرے پر ثبت تھے۔ جب وہ ناشتے کے لیے آیا تو بابا جان نے بغور اسے دیکھا تھا۔
"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟"
"جی بابا جان۔ بس رات کو ذرا نیند نہیں آئی۔"
"تو اٹھنے کی کیا ضرورت تھی، سوئے رہتے کون سا تم نے کالج جانا ہے۔"
وہ بی ایس سی کا امتحان دے کر فارغ تھا اور اسے رزلٹ کا انتظار تھا جبکہ بابا جان کو کالج جانا تھا۔
"جی...... سو جاتا ہوں۔"
"کوئی اور بات تو نہیں ہے بیٹا اور پھر یہ نیند کیوں نہیں آئی؟" وہ پریشان سے ہو گئے تھے۔
"کیا بات ہونی ہے بابا جان۔" وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ "شاید نیند کا وقت گزر گیا تھا اس لیے۔"
"تو بیٹا اتنی دیر جاگنے کی کیا ضرورت تھی وقت پر سو جاتے۔"
"بس بابا جان دیر تک پڑھتا رہا۔"
"خیر اب سو جانا، میں خدا بخش سے کہہ جاتا ہوں تمہیں جگائے گا نہیں۔"
اور وہ صرف ایک کپ چائے پی کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں پر تکیہ رکھ کر سونے کی کوشش کی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند کی دیوی مہربان نہیں ہوئی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میری شادی

3 جنوری 2008ء کی رات ہماری مہندی کی رات تھی اور یقین جانیں لگتا ہی نہیں تھا کہ مہندی ہے کیونکہ 27 دسمبر 2007ء کو بے نظیر کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس ہفتے میں جتنی بھی شادیاں تھیں سب کینسل ہو گئیں۔ ملک کا کیا حال تھا آپ سب لوگ آگاہ ہیں۔ ابا حضور نے احکامات جاری کر دیے کہ کوئی ہلا گلا نہیں ہوگا نہ ہی کچھ گانا بجانا ہوگا ڈھولکی بے چاری سوچتی رہی کہ یہ کس کی شادی میں آ گئی۔ جہاں مجھے بجایا ہی نہیں جا رہا۔ ڈھولکی ہی سوگوار نہیں تھی، سب ہی اداس تھے۔ بہرحال مجھے پیلا سوٹ سبز گوٹے کناری کے کام والا پہنا کر پھولوں کا زیور پہنایا۔ کزن فریال اور بہنوں نے مل کر ٹیبل سجایا جب مجھے لے جانے لگے تو لائٹ چلی گئی۔ ایک گھنٹا انتظار کیا کیونکہ مووی بنانی تھی اور اس وقت اتنی لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی تھی ورنہ جنریٹر یا ups تو ضرور ہوتا۔ اس دوران مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ کافی مہمان چلے گئے۔ بس مہندی کی رسم جیسے تیسے ہوئی پھر بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ میرا دل بہت اداس تھا کہ کل میں اس گھر سے چلی جاؤں گی۔ جہاں میں نے زندگی کا گولڈن پیریڈ گزارا ہے۔ رات نیند ہی نہیں آئی۔ صبح اٹھتے ہی پارلر جانے کی تیاری...... میری تو آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور دل بھی...... دوپہر کی بارات تھی بہرحال تیار ہو کر ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ اسٹیج پر رسمیں ہوئیں۔ نکاح کے وقت میں نے جلدی، جلدی سائن کیے سب نے مذاق بھی کیا کہ اتنی جلدی کیوں......؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ کہیں اچانک کوئی ولن یہ نہ آ کر کہہ دے کہ اوئے اے شادی نہیں ہو سکدی۔ فوٹوسیشن مووی اور نہ جانے کیا کچھ......



بالآخر رخصتی کا وقت بھی آ گیا میں نے رو، رو کر نوز کا میک اپ ہی اتار لیا جو میری نند نے گھر جا کر ٹھیک کیا۔ گھر پہنچے تو ماحول کافی چینج ہو گیا۔ رونا بھول گئی، نیا ماحول، نئے لوگ، نئے چہرے، خوب ہنسی مذاق ہوا۔ اگلے روز ولیمے پر بھی بہت بارش ہوئی اور سردی بھی بہت شدید تھی... پر موسم بہت خوب صورت تھا اور اللہ کے فضل سے اب تک سارے موسم ہی بہت خوب صورت ہیں۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ عمران میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اللہ پاک نے تین رحمتوں سے نوازا ہے۔ علیشاہ، مبشرہ، ایمہا، اللہ پاک سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے (آمین)

رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان

''اب نیند تو رات کو ہی آئے گی۔'' اس نے سوچا اور کپڑے نکال کر واش روم چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھ لے کر کسی قدر فریش ہو کر اوپر جا رہا تھا۔ مونا لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ دونوں بہنیں کالج جا چکی تھیں چونکہ وہ بھی اس کی طرح فارغ تھی اور اسے بھی بی۔اے کے رزلٹ کا انتظار تھا۔ اس لیے وہ گھر پر ہی تھی۔ وہ اسے اتنے سویرے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

''ارے بھائی آپ، خیریت ہے ناں اتنے سویرے؟''

''بالکل خیریت ہے۔'' وہ سامنے بیٹھ گیا۔ ''اور تمہاری اطلاع کے لیے اتنی بھی سویر نہیں ہے۔ دس بجنے والے ہیں۔''

''ہاں لیکن چھٹیاں ہیں ناں بھئی، میں تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتی لیکن آج مما نے اٹھا دیا اور پھر نیند ہی نہیں آئی۔''

''لیکن میں چھٹیوں میں بھی بابا جان کے ساتھ ہی ناشتا کرتا ہوں۔''

''لیکن کم از کم میں نہیں اٹھ سکتی چھٹیوں میں اتنی جلدی...... رزلٹ کے بعد تو پھر وہی روٹین شروع ہو جائے گی۔ سویرے اٹھنا، بھاگم بھاگ یونیورسٹی پہنچنا۔''

''ہاں ویسے رزلٹ کب آ رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''چندا کہہ رہی تھی اگلے ہفتے تک آ جائے گا۔''

''اور تمہارا کیا ارادہ ہے آگے؟''

''میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کروں گی، انشاء اللہ!''

''ہیں......؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ ''مجھے یاد آ رہا ہے کہ کچھ دن پہلے تک تمہارا ارادہ ہسٹری میں ماسٹر کرنے کا تھا کیونکہ بقول تمہارے...... تمہیں ہسٹری سے بہت دلچسپی ہے۔''

''ہاں بالکل تھا۔'' اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''لیکن یہ جو چندا ہے ناں اس کا ارادہ انگلش میں ماسٹرز کرنے کا ہے تو پھر میں بھی......'' اس نے کندھے اچکائے تھے۔ ''مجبوری ہے...... چندا میری بہت اچھی دوست ہے اور میں اس کی بات ٹال نہیں سکتی۔''

''کہاں ایڈمیشن لینے کا خیال ہے؟''

''پنجاب یونیورسٹی میں بھی اور آپ کے کالج میں بھی دونوں جگہ اپلائی کریں گے اور دیکھیں جہاں بھی ہو گیا اور آپ تو فزکس میں ہی ماسٹر کریں گے اپنے بابا جان کی طرح، ہے ناں؟''

''نہیں پتا نہیں ابھی کچھ کہہ... نہیں سکتا۔'' لیکن وہاں ہی بیٹھے، بیٹھے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی انگلش لٹریچر میں ماسٹر کر کے بابا جان کی طرح ایجوکیشن کے شعبے میں چلا جائے گا۔

''اور یہ جو تمہاری دوست ہے چندا اگر اس کا ارادہ بدل گیا تو...... میرا مطلب ہے کہ اس نے کسی اور سبجیکٹ میں اپلائی کر دیا تو کیا تم بھی ارادہ بدل دو گی؟''

''نہیں، وہ ارادہ نہیں بدلے گی، اسے لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے۔ بہت کتابیں پڑھتی ہے۔ آج کل تو بلاناغہ جناح لائبریری جاتی ہے۔ ممبر شپ لے رکھی ہے اس نے۔''

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا تھا اور پھر یک دم ہی وہ بات پوچھ لی تھی جس کے لیے اتنی صبح، صبح اوپر آیا تھا۔ ''یہ جو...تمہاری دوست ہے چندا کیا وہ بھی اپنے اس کزن میں انٹرسٹڈ ہے، جس کے ساتھ اس کی بات طے ہے؟''

”پتا نہیں میری اس سلسلے میں تو کبھی اس سے بات نہیں ہوئی۔“ مونا چونکی تھی۔ ”لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں بھائی؟“

”میں...... مجھے وہ بہت اچھی لگی ہے مونا اور مجھے لگتا ہے جیسے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔“ اس کا نازک دل مزید اس راز کا بوجھ برداشت نہیں کر پایا تھا۔ اس کا کوئی بہت گہرا دوست نہیں تھا وہ دل کی ہر بات اپنے بابا جان سے ہی کرتا تھا لیکن یہ بات اپنے بابا جان سے شیئر نہیں کر سکتا تھا تو پھر مونا ہی تھی جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ سکتا تھا۔

”مجھے شک تھا کہ آپ چندا سے متاثر ہوئے ہیں۔“ مونا نے سر ہلایا تھا۔ ”میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ اتنا آگے بڑھ جائیں کہ پھر پلٹنا مشکل ہو جائے۔ اس لیے میں نے آپ کو اس کے متعلق بتایا تھا کہ آپ جان سکیں کہ آپ کے اور اس کے درمیان جو طبقاتی فرق ہے وہ آپ کبھی نہیں پاٹ سکتے۔ اس کی ممی تو بڑی مغرور سی ہیں اور اس کے ڈیڈی سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن وہ اپنے اصولوں میں بہت سخت ہیں اور اس کی ممی نے جو مجھے بتایا کہ بچپن سے ہی انہوں نے اس کی بات طے کر رکھی ہے تو یہ بات میں نے اس لیے آپ کو بتا دی تھی کہ آپ اپنے قدم یہیں روک لیں۔“ وہ کسی بڑے کی طرح بات کر رہی تھی۔

”یہ قدم روکنا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے مونا؟“ اس نے بے بسی سے مونا کی طرف دیکھا تھا۔ ”ایک بار جب اس راستے پر قدم پڑ جائیں تو پھر رکتے نہیں ہیں...... پلیز تم اس سے پوچھو تو...... بات تو کرو کیا پتا وہ اپنے اس کزن میں انٹرسٹڈ ہی نہ ہو۔ اس سے شادی نہ کرنا چاہتی ہو۔ بچپن کے طے کیے ہوئے رشتے اکثر بچے بڑے ہو کر رد کر دیتے ہیں۔“

”لیکن اس نے مجھ سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی بھائی تو میں کیسے بات کروں؟“

”وہ تمہاری اتنی اچھی دوست ہے مونا اگر اسے اپنے کزن میں انٹرسٹ ہوتا تو وہ کبھی تو اس بات کا تم سے ذکر کرتی۔“ اس نے امید کا سرا تھاما تھا۔

”ہاں یہ تو ہے بھائی لیکن اگر ایسا ہو بھی تو پھر بھی یہ جو طبقاتی فرق ہے ناں......“ وہ ہچکچائی تھی۔ ”پلیز بھائی روک لیں خود کو۔“ وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

”محبت میں کوئی طبقاتی فرق نہیں ہوتا مونا یہ تو بس ہو جاتی ہے کہیں بھی کسی سے بھی۔ عمر کے کسی بھی حصے میں... محبت کچھ نہیں دیکھتی مونا۔“ نیا نیا محبت آشنا دل ایک ہی رات میں محبت کا فلسفہ بیان کرنے لگا تھا۔

”لیکن وہ تو آپ سے محبت نہیں کرتی بھائی۔“ مونا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور نارسائی نے اس کے دل کے اندر دور تک دکھ کا موسم پھیلا دیا تھا۔

”صاحب...... صاحب۔“ خدا بخش پارک میں دور سے انہیں پکارتا تقریباً بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ یک دم چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی انہیں یہاں بیٹھے ہوئے، بیتی یادیں انہیں ہمیشہ یوں ہی جکڑ لیتی تھیں کہ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

”صاحب، صاحب جلدی چلیں گھر......“ قدرے فاصلے پر رک کر خدا بخش نے پھولی سانسوں سے بہ مشکل کہا تو وہ متوحش سے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

جاری ہے

سائبان

شمیم فضل خالق



شہزاد میرا انتہائی اچھا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ ہم نے اسکول میں ایک ساتھ پڑھا، کالج کی پڑھائی ایک ساتھ ختم کی، یونیوسٹی میں ایک ساتھ رہے۔ ساری عمر نہ اس نے کوئی اور دوست بنایا اور نہ میں نے ایسی کوئی ضرورت محسوس کی۔ ہم دونوں کا تعلق مڈل کلاس سے تھا بلکہ لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ میرا کنبہ بڑا تھا...... بابا ایک عرصے سے بستر پر پڑے تھے انہیں دمے کی بیماری تھی پھر بھی وہ محلے کے نکڑ پر ایک دکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بچوں کے لیے میٹھی گولیاں اور چپس کے پیکٹ وغیرہ بیچا کرتے تھے۔ دکان دار نے انہیں ازراہِ ہمدردی سیڑھیوں پر بیٹھنے کی اجازت دے دی،

میری ساری تعلیم بابا کی اسی کمائی سے ہوئی تھی۔ میں گھر کا بڑا بیٹا تھا، میرے بعد دو بہنیں اور دو چھوٹے بھائی تھے اماں، بہنوں کی مدد سے محلے بھر کے کپڑے سیتیں...... میں تھوڑا سا بڑا ہوا تو بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتا غرض ہمارا سارا گھرانا ایک محنتی گھرانا تھا جبکہ شہزاد کا تعلق بھی لوئر مڈل کلاس سے تھا لیکن اس کے ماں باپ اس کے بچپن میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پا چکے تھے۔ وہ اپنے چچا کے ہاں پلا تھا لیکن چچا کے گھر سے اسے کوئی محبت نہیں ملی تھی وہ ان کی ٹھوکروں میں جوان ہوا تھا۔ دو وقت کی روٹی بہ مشکل ملتی تھی۔ تبھی تو اسے چچا کے گھرانے سے ہمدردی تھی نہ محبت۔ میری طرح وہ بھی ٹیوشن پڑھا کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتا رہا۔ تعلیم ہم دونوں کے لیے بہت اہم تھی ہم سمجھتے تھے کہ پڑھ لکھ کر ہمیں بہت اچھی نوکری مل جائے گی لیکن یہ ہمارا خیال ثابت ہوا۔ ہم دونوں سارا دن نوکری کی تلاش میں پھرتے...... اخبار میں جس نوکری کا اشتہار آتا ہم دونوں انٹرویو دینے پہنچ جاتے لیکن وہاں تو پہلے سے سلیکشن ہو چکا ہوتا۔ انٹرویو تو محض بہانہ ہوتا تھا۔ جب ہم دونوں مایوسی کے آخری دہانے پر پہنچ گئے تو اچانک مجھے نوکری مل گئی۔ مجھے ایک اسپتال کے مُردہ خانے میں کام ملا تھا۔ زندگی میں یہ پہلی دفعہ تھا جب میں اور شہزاد ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ اسے بھی بہت جلد نوکری مل گئی۔ یہ ایک پرائیویٹ فرم میں کلرک کی نوکری تھی اور اس کی یہ جاب میری نوکری سے ہزار درجہ بہتر تھی۔ شروع، شروع میں تو مجھے بہت الجھن ہوتی تھی بڑے، بڑے کمروں میں لمبی، لمبی میزیں اور دیواروں میں نصب بڑے، بڑے خانے کہ جن .... میں لاشیں رکھی جاتی تھیں۔ مردہ جسموں کی بو، پھولی ہوئی لاشیں اگر اس مردہ خانے کی تنخواہ زیادہ نہیں ہوتی تو میں کب کا اس ماحول سے بھاگ چکا ہوتا۔ گھر میں ویسے بھی اب پیسوں کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہو رہی تھی۔ اماں بیمار ہو گئی تھیں۔ انہیں شوگر اور بلڈ پریشر کی بیماری ہو گئی تھی۔ اب وہ سلائی کا کام نہیں کر سکتی تھیں۔ ابا پہلے سے دمے کا شکار ہو کر کام چھوڑ چکے تھے۔ بڑی بہن کی شادی ہونے والی تھی اس کا چھوٹا موٹا جہیز بھی بنانا تھا، ابا اور اماں کی دوائیاں تھیں، چھوٹے ... بھائیوں ... کے ... تعلیمی ... اخراجات تھے۔ اپنے، اپنے کام میں مصروف ہونے کے باوجود میں اور شہزاد ایک دوسرے سے روزانہ ملتے...... ایک دوسرے سے ملے بِنا ہم دونوں کو چین نہیں آتا تھا۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں شہزاد نے اچانک سنجیدگی سے مجھے بتایا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔

”کیا......؟“ میں حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”ہاں یار۔“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”میں ایک گھر اور ایک فیملی کو ترس گیا ہوں۔ اکیلا رہتے، رہتے تنگ آ گیا ہوں، گھر میں بیوی ہوگی، بچے ہوں گے تو زندگی میں چہل پہل پیدا ہوگی۔“

”ہاں۔“ میں کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں واقعی ایک گھر اور بیوی کی ضرورت ہے۔“

”سعد...... کاش ہم دونوں شادی بھی ایک ساتھ کر سکتے۔ جس طرح ہم نے ہر کام اکھٹے کیا ہے ویسے ہی۔“ وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میرے اوپر ذمے داریوں کا بوجھ ہے، میں شادی رچا کر بیٹھ گیا تو یہ ذمے داریاں کون پوری کرے گا۔ ویسے بھی میں نہ تو تمہاری طرح تنہائیوں کا مارا ہوں، نہ ہی مجھے اتنی جلدی کوئی شادی کرنے دے گا لیکن یار شادی کے لیے تو ایک عدد لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہو ناں تم؟“

”ہاں ظاہر ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ اس کی آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ نظریں جھکا کر دھیمی

آواز میں کہنے لگا۔ ”لڑکی میں نے ڈھونڈ رکھی ہے۔“

”کک...... کیا؟“ میں بری طرح اچھل پڑا۔ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی پیٹھ پر گھونسا مارا۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟ یعنی تم نے مجھے بھنک بھی نہیں پڑنے دی اور ایک عدد لڑکی بھی ڈھونڈ لی۔“

”نہیں سعد، تمہاری قسم ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

”ایسی بات نہیں تو کیسی بات ہے؟“ میں پھر اس کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتے ہوئے بولا۔

”بات یہ ہے سعد کہ میں تسکین ضیا کو شروع سے پسند کرتا تھا جانتے ہو ناں تسکین کو...... ہماری کلاس فیلو تھی وہ۔“

”تس...... کین۔“ میرا اٹھا ہوا ہاتھ بے اختیار نیچے آ گیا۔ میں پھٹی، پھٹی نظروں سے اسے یوں دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

”بھول گئے تسکین کو......؟“ وہ شرمیلی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

”ارے وہ نمکین سی لڑکی جو ہم سے ایک سال پیچھے تھی۔ ہماری طرح غریب لڑکی تھی...... تبھی اس کے پاس کینٹین میں کھانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے...... جیسے ہمارے پاس نہیں ہوتے تھے۔“ وہ مجھے مختلف واقعات سنا، سنا کر اسے یاد کرانا چاہتا تھا جبکہ میں صدمے سے چور ہو کر سوچ رہا تھا کہ تسکین کو میں کب بھولا تھا...... وہ تو کالج کے دنوں سے میرے دل میں بس رہی تھی لیکن ذمے داریوں کا اتنا بڑا پہاڑ میرے سر پر دھرا تھا کہ میں صرف اسے سوچا کرتا...... کبھی اسے اپنانے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا...... ہر چیز کی طرح اس بار بھی ہم دونوں نے ایک لڑکی کو پسند کیا تھا۔ وہ میری سوچوں سے بے خبر باتیں کرتا، کرتا... زچ ہو گیا۔

”تمہاری یاد داشت میں تسکین کیوں نہیں آ رہی، ارے وہی جو......“ میں فوراً ہوش میں آ گیا۔

”ہاں، ہاں، مجھے یاد آ گئی ہے...... لیکن اب اسے کہاں ڈھونڈو گے، اس نے تو کالج کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا...... اب کہاں ملے گی وہ؟“

”ملے گی نہیں بے وقوف ...... مل چکی ہے...... میرے چچا کے گھر کے قریب ہی اس کا گھر ہے...... وہ پانچ بہنیں ہیں...... تسکین دوسرے نمبر کی ہے...... میں برابر اس کی خبر رکھتا ہوں چچا کے گھرانے سے...... پچھلے دنوں تسکین کی بڑی بہن کی بات طے ہو گئی ہے...... اور اب اس کا نمبر ہے......“

میں جانتا تھا جب سے شہزاد کے چچا، چچی کا انتقال ہوا تھا اس کے مراسم اپنے چچا زاد بھائی، بہنوں سے بہت اچھے ہو گئے تھے۔ وہ کافی عرصہ پہلے چچا کے گھر سے نکل آیا تھا اور تین اور لوگوں کے ساتھ ایک کمرا شیئر کر کے رہ رہا تھا۔

میں اس رات ایک پل کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بار، بار تسکین کی موہنی صورت میرے خیالوں میں آ کر مجھے تڑپاتی رہی...... جب وہ اپنے کالے بالوں کو اپنے چہرے سے ہٹاتی تو بڑی اچھی اور معصوم لگا کرتی تھی...... لیکن...... میں نے کروٹ بدل کر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سوچا۔

تسکین سے میرا افیئر نہیں تھا...... صرف میں اسے پسند کرتا تھا لیکن اگر افیئر بھی ہوتا تو میں شہزاد کے راستے سے ہٹنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں کرتا...... اور اگر اسے میرے جذبوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ میرے راستے سے ہٹنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائے گا۔ دوستی کا ایسا ہی لازوال رشتہ تھا میرے اور اس کے بیچ...... اس رات میں نے تسکین کا خیال جیسے دل سے نوچ کر پھینک ڈالا...... اب وہ شہزاد کی امانت اور میری بھابی تھی میں نے اپنے مچلتے دل کو سمجھایا اور جیسے مطمئن سا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ تسکین کے گھر اگر شہزاد کا رشتہ جائے گا تو اسے فوراً سے پیشتر قبول کر لیا جائے گا...... شہزاد ایک پڑھا لکھا

اور خو برو لڑکا تھا۔ اس کے پاس ایک اچھی جاب تھی۔ آگے پیچھے اس کا کوئی نہیں تھا جو لڑکی کے والدین کے لیے ایک اچھی بات تھی...... لیکن جب میں اور شہزاد کا چچا زاد بھائی کریم دونوں شہزاد کے لیے تسکین کا رشتہ لے کر پہنچے تو اس کی ماں نے پٹ سے انکار کر دیا...... میں تو سچ مچ حیران رہ گیا۔ کریم کو بھی اس طرح انکار سے حیرانی ہوئی۔

''خالہ...... یہ رشتہ میرے تایا زاد بھائی کا ہے جن کی ہم نے ہمیشہ آپ کے سامنے تعریف کی ہے...... تسکین آپی خوش نصیب ہے جنہیں شہزاد بھائی جیسے اچھے انسان کا ساتھ نصیب ہو رہا ہے۔'' لیکن وہ عورت تو بالکل بھی نہیں مان رہی تھی۔

''تم لوگ میری بات سمجھتے کیوں نہیں...... تسکین میری بیٹی نہیں بیٹا ہے...... وہ ہم سب لوگوں کو پال رہی ہے...... دو سال ہوئے اس کا باپ بھی مر گیا ہے۔ بیٹا میرا کوئی ہے نہیں، تسکین کو پڑھنے کا شوق تھا۔ ہم نے اپنا پیٹ کاٹ کر صرف اس لیے اسے پڑھایا کہ وہ ہمارا بیٹا بن سکے۔'' اپنا سر زور، زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے وہ بولیں۔ میں تو اس ساری صورت حال سے چکرا کر رہ گیا...... کوئی ماں اتنی خود غرض بھی ہو سکتی ہے جو بیٹی کی شادی اس لیے نہ کرے کہ وہ ان کو پال رہی ہے...... مجھے ان پر شدید غصہ بھی آیا۔

''دیکھیں...... یہ آپ بہت ظلم کر رہی ہیں تسکین پر...... آپ ماں ہیں، ایک ماں تو ہر حال میں اپنی بیٹیوں کو اپنے گھر کا کرنا چاہتی ہے۔ آپ کیسی ماں ہیں جو...'' میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ وہ تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔

''ہاں...... میں نے پانچ زندگیاں بچانے کے لیے تسکین کی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہم سب مر جائیں لیکن تسکین اپنے گھر کی ہو جائے...... واہ بھئی واہ...... کیا کہنے...... اچھا...... اب تم لوگ یہاں سے تشریف لے جاؤ...... مجھے اپنی بیٹی نہیں بیاہنی...... کسی کی زور زبردستی نہیں مجھ پر......''

انہوں نے ایک طرح سے ہمیں گھر سے نکال دیا اور داخلی دروازہ ایک زور دار آواز سے بند کر دیا۔

شہزاد نے میری اور کریم کی باتیں بڑے رسان سے سنیں...... پھر وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''چلو...... ہم تینوں ان کے گھر چلتے ہیں۔''

''نہیں شہزاد......'' میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''وہ بڑی بدتمیز عورت ہے، لحاظ تو اس میں ہے ہی نہیں...... بار، بار اپنی بے عزتی کرانے کا فائدہ کیا ہے۔''

لیکن اس نے میری ایک نہ سنی...... اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم تینوں تسکین کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے اور ہمارے سامنے تسکین کی ماں خطرناک تیور لیے بیٹھی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمیں کچا چبا ڈالتیں۔ میں اور کریم تو خاموش تھے جبکہ اس بار بات شہزاد نے شروع کی وہ بڑے رسان سے بہت دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

''خالہ...... میرا نام شہزاد ہے...... اور میں تسکین سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم شہزاد ہو یا بہزاد...... مجھے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی، کتنی بار میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ مجھے نہیں کرنی اپنی بیٹی کی شادی...... بیٹی میری ہے تو مرضی میری ہی چلے گی...... تم لوگوں کو میری بات کی سمجھ کیوں نہیں آتی۔'' وہ اب چیخنے لگی تھیں جبکہ شہزاد نے دھیمی آواز میں کہا۔

''خالہ...... میرا آپ سے ایک معاہدہ ہوگا۔''

''وہ چونک اٹھیں...... ہم نے بھی چونک کر شہزاد کو دیکھا۔

''وہ یہ کہ...... تسکین کی تنخواہ پر آپ کا اسی طرح حق ہوگا جیسے اب ہے...... میں اسے جاب

کرنے سے کبھی نہیں روکوں گا...... ہاں تسکین میری بیوی ہوگی اور میری ذمے داری بھی...... تسکین اپنی پوری کی پوری تنخواہ آپ کو دے گی...... اس کی تنخواہ کی ایک پائی بھی وہ نہ ہم پر خرچ کرے گی اور نہ اپنی ذات پر خرچ کرے گی۔"

شہزاد کی بات پر ہمیں تو سانپ سونگھ گیا لیکن وہ بھی کم حیران نہیں ہوئیں۔ کتنی دیر تو ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا...... بڑی دیر بعد وہ شکی سے لہجے میں بولیں۔

"میں کیسے یقین کرلوں کہ تم اپنی بات کا پاس رکھو گے۔"

"آپ کو جس قسم کی گارنٹی کی ضرورت ہو وہ میں دینے کے لیے تیار ہوں...... اگر آپ اسٹامپ پیپر پر لکھوانا چاہتی ہیں تو میں تیار ہوں...... ویسے آپ میرے کردار کے بارے میں کسی سے بھی پوچھ سکتی ہیں کہ میں سچا اور کھرا بندہ ہوں...... اور جھوٹ کو لعنت سمجھتا ہوں۔"

تسکین کی اماں کو چند لمحے لگے ان باتوں پر یقین کرنے میں انہیں جیسے ہی شہزاد کی بات پر یقین آیا وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں اور روتے، روتے بولیں۔

"کون سی ماں ہوگی جسے بیٹی کا گھر بسانے کی خواہش نہیں ہوگی...... لیکن...... میں کیا کرتی تسکین کے سوا ہمارا کوئی نہیں جو ہماری ضروریات پوری کرتا...... مجھ میں جب تک دم تھا تین چار گھروں کا کام کرتی تھی...... پر اب ہمت نہیں ہے...... بیماریوں نے جسم کی ساری طاقت نچوڑ دی ہے۔" شہزاد نے اٹھ کر ان کا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔

"تسکین کی کمائی پر تو آپ کا حق ہے ہی...... لیکن داماد ہونے کے ناتے میری کمائی پر بھی آپ کا پورا حق ہے...... میں آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھوں گا، آپ تسکین کی ماں ہیں، ساتھ میں میری بھی ماں ہوں گی اور تسکین کی بہنیں میری بہنیں......"

اب تسکین کی ماں نے ہاں کرنے میں دیر نہیں کی اور وہ شدتِ جذبات سے رو رہی تھیں اور بار بار اپنے برے سلوک کی ہم تینوں سے معافی مانگ رہی تھیں۔

شہزاد اور تسکین کی شادی ہوگئی۔ شہزاد نے اپنی شادی سے پہلے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کوارٹر کرایے پر لے لیا اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ کاش...... کہانی یہیں ختم ہوجاتی...... لیکن زندگی کی کہانیاں کہاں اتنی جلدی ختم ہوتی ہیں۔

وقت گزرتا رہا...... شہزاد دو بچوں کا باپ بن گیا...... اس کی ایک فیملی کی خواہش پوری ہوگئی اس نے اپنا وعدہ نبھایا اور تسکین کا کمایا ایک پیسہ کبھی خود پر اپنے بچوں پر خرچ نہیں کیا...... تسکین کے پیسوں سے اس کی چاروں بہنوں کی شادیاں ہوگئیں...... اس کی ماں اب بہت بوڑھی ہوگئی تھیں...... اکیلا رہنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا سو وہ باری، باری اپنی بیٹیوں کے ساتھ رہتیں...... مگر زیادہ وقت وہ تسکین کے ساتھ گزارتیں اور انہیں شہزاد تمام دامادوں سے زیادہ پیارا تھا...... کچھ وقت اور آگے سرکا تو ان کا انتقال ہوگیا۔ شہزاد نے ایک بیٹے کی طرح ان کی آخری رسومات میں پیسہ خرچ کیا...... اب شہزاد نے تسکین کی جاب چھڑانی چاہی جبکہ تسکین اس کے لیے تیار نہیں تھی...... اس کا کہنا تھا کہ ابھی تک اس کا پیسہ اس کے میکے والوں پر خرچ ہوتا رہا تھا جبکہ اب وہ یہ پیسہ اپنے گھر اور بچوں پر خرچ کرنا چاہتی ہے، دونوں میں اس بات کی وجہ سے ہر وقت بحث ہوتی رہتی۔ ان دنوں شہزاد کو آفس کے کام سے کراچی جانا پڑ گیا...... وہ دس دنوں کے لیے چلا گیا...... تسکین کے گھر اس کی بہن اور بہنوئی آئے تھے، ان کے بچے بھی ساتھ تھے، شہزاد مطمئن ہو کر چلا گیا۔ میں ان دنوں اپنے مسائل میں الجھا رہا۔ بابا کی سانس کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور اماں کی شوگر کنٹرول میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موبائل تو خیر بالکل

ناپید تھا لیکن پی ٹی سی ایل فون بھی امیر گھرانوں میں ہوتا تھا۔ شہزاد میرے مسائل سے لاعلم نہیں تھا اس لیے اس نے اپنی سالی اور اس کے میاں کو بلالیا کہ تسکین تنہا نہیں رہے...... مجھ پر اس نے کوئی ذمے داری نہیں ڈالی۔

وہ دن بہت اداس سا تھا...... میرا دل بغیر کسی وجہ کے ڈوبا، ڈوبا سا تھا، میں نے صبح ناشتا بھی صحیح طرح نہیں کیا...... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آج ڈیوٹی پر نہیں جاتا لیکن کام پر جانا تو تھا...... مجھے خود اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آرہی تھی...... بجھے دل سے میں مردہ خانے چلا گیا، ہمیشہ کی طرح اس دن بھی لاشیں آجارہی تھیں۔ میں نے سفید کپڑے سے ڈھکی وہ لاش لفٹ کے ذریعے نیچے اتارنی تھی...... یہ یقیناً کسی حادثے کا کیس تھا، سفید چادر خون سے سرخ ہورہی تھی میں نے وہ لاش سردخانے کی میز پر لٹادی تو اس کے چہرے سے چادر ہٹ گئی اور میری نظر اچانک اس پر پڑگئی اور مجھے ایسے لگا جیسے سردخانے کی چھت مجھ پر آن گری ہو، جیسے سردخانے کی دیواروں نے آکٹوپس کی طرح مجھے جکڑ لیا ہو...... جیسے میرا دل سینے میں ہچکولے لینے لگا ہو...... ہاں، وہ لاش میرے پیارے دوست شہزاد کی تھی...... میں چیخیں مار، مار کر رونے لگا...... میں نے عورتوں کی طرح بین ڈالنے شروع کیے...... میرے ساتھی حیران و پریشان ہو کر مجھے سنبھالنے لگے لیکن میں کسی کے قابو میں نہیں آرہا تھا، اس وقت میری ایک خواہش تھی کہ میں شہزاد کے ساتھ مر کر لاش کا روپ دھارلوں اور اس کے برابر لیٹ جاؤں، میں نے اپنا سر دیوار سے ٹکرانا شروع کیا اور جانے کب میں بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا...... پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا...... تین دن بعد جب مجھے اسپتال میں ہوش آیا تو اماں، ابا اور بہنیں میرے پاس بیٹھی تھیں...... مجھے اچانک شہزاد کی لاش یاد آگئی...... جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے سردخانے میں اتارا تھا......

مجھے خود پر اختیار نہیں رہا، میں چیخ، چیخ کر رونے لگا...... اسپتال کے بیڈ سے اتر کر بھاگنے لگا...... میں چیخ، چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''وہ اکیلے نہیں جائے گا...... میں اس کے ساتھ جاؤں گا...... ہم دونوں کبھی ایک دوسرے سے نہیں بچھڑے...... اب بھی نہیں بچھڑیں گے...... میں اتنا بے وفا نہیں کہ اسے اکیلا چھوڑ دوں۔''

اماں، ابا اور بہنیں مجھے سنبھالنے میں ناکام ہوگئیں تو انہوں نے ڈاکٹر کو بلالیا...... ڈاکٹر نے فوراً مجھے انجیکشن دے کر سلادیا...... ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کا یہ وقفہ بہت طویل تھا...... کوئی پندرہ دن بعد میری حالت سنبھلی تو مجھے گھر لے آیا گیا...... میں کسی مردے کی طرح گم صم ہوچکا تھا...... میرے ماں، باپ نے بہنوں اور چھوٹے بھائیوں نے میری دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی...... میں بے حس ہوچکا تھا۔ مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کپڑے بدلنے کی خواہش رہی تھی۔ ایسے ہی ایک دن اماں میرے قریب بیٹھ کر رونے لگی اور روتے، روتے بولیں۔

''مانتی ہوں شہزاد کی موت کا تمہیں بے حد صدمہ ہوا ہے لیکن بیٹے یہاں ہم بھی تو رہتے ہیں، کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟ تم مرجاؤ گے، شہزاد کے پاس چلے جاؤ گے تو ہم کیا تمہارے بعد زندہ رہیں گے......؟ اور پھر ہم سب کا خون تمہارے ذمے ہوگا۔'' میں خالی، خالی نظروں سے اماں کو دیکھنے لگا تو ابا جان رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

''بیٹا...... زندگی کی طرف پلٹ آؤ...... ہمارے لیے اور...... شہزاد کی بیوی، بچوں کا خیال کرو...... وہ نہیں لیکن اس کی نشانیاں تو موجود ہیں ناں...... اس سے تمہارے دل کو سکون ملے گا...... تمہیں تسلی ملے گی......'' اس بات چیت کے دوسرے دن میں شہزاد کے گھر چلا گیا...... اس کے گھر کی دیوار سے جیسے اداسیاں لپٹی تھیں...... گھر پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ لگتا تھا جیسے موت کا فرشتہ صرف شہزاد کو نہیں اس گھر کی خوشیاں اور رونقیں بھی نوچ کر لے گیا ہو...... شہزاد کے بچے جانے کہاں تھے...... تسکین ان چند دنوں میں جیسے نچڑ کر رہ گئی...... چہرے پر ایک جامد سکوت پھیلا تھا...... سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا...... اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا...... نہ میں نے کچھ کہا...... میرے ساتھ ابا گئے تھے وہی تسکین سے کہنے لگے۔

''بیٹا...... شہزاد، سعد کا بھائیوں جیسا دوست تھا، تمہیں جب بھی کوئی پریشانی ہو، بچوں کی طرف سے کوئی پرابلم ہو...... سعد سے کہہ دیا کرو، یہ آدھی رات میں بھی آئے گا تمہاری پرابلم حل کرنے کے لیے۔''

تسکین کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد بیٹھی رہی...... تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم واپس گھر آگئے۔ میں کچھ، کچھ سنبھل گیا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے مردہ خانے کی نوکری چھوڑ دی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مجھے ایک این جی او میں جاب مل گئی...... اس جاب کی تنخواہ مردہ خانے والے تنخواہ سے بہت کم تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی...... میں اس دن شہزاد کے گھر گیا...... تسکین میرے سامنے کھڑی تھی لیکن میں نے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی، میری نظریں نیچے تھیں۔

''گیس اور بجلی کے بل مجھے دے دو کہ میں جمع کرادوں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ میں نے جمع کرادیے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور پانی کا بل......؟''

''وہ چھ ماہ بعد آتا ہے ابھی آیا نہیں۔''

''سبزی، ترکاری لے آتا ہوں میں۔''

''نہیں...... میں گھر پر ہی ٹھیلے والے سے خرید لیتی ہوں۔''

''بچوں کے لیے پھل فروٹ......؟ وہ تو لے آؤں گا۔''

''وہ بھی خرید لیتی ہوں...... ابھی صبح ہی خریدے ہیں۔'' اسی قسم کے سوال، جواب اس کے اور میرے بیچ ہوتے تھے کبھی جو میں سبزی یا پھل فروٹ لے جاتا تو وہ بڑے خراب موڈ سے لے لیتی۔

''مجھے یہ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا...... آپ یہ تکلف نہ کریں، مجھے پیسوں کی کوئی تنگی نہیں ہے...... میں اپنے بچوں کو پال سکتی ہوں۔'' وہ میرے والے لفافے گرانے کے انداز میں ایک طرف رکھ دیتی پھر بھی میں باقاعدگی سے جاتا اس کا حال احوال پوچھتا...... بچوں کے لیے کھلونے، بکس وغیرہ لے جاتا اور بچوں کے ہاتھوں میں دے دیتا...... شروع، شروع میں مجھے شہزاد کبھی خواب میں آجاتا لیکن بہت غصے میں ہوتا...... منہ سے ایک لفظ نہ کہتا لیکن غصے سے مجھے گھورتا رہتا...... میں جاگتا تو حد درجہ مضطرب ہوجاتا، میں نے ایسا کیا، کیا تھا کہ وہ مجھ سے خفا تھا۔ کیا میں اس کی آخری رسومات میں شرکت نہیں کرسکا تھا اس لیے وہ خفا تھا یا میں اس کی بیوی بچوں کا صحیح طرح خیال نہیں رکھ پارہا تھا وہ اس لیے ناراض تھا...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا لیکن میں بہت زیادہ ٹینشن میں تھا...... اس دن میں شہزاد کے بچوں کے لیے کھلونے اور بکس وغیرہ لے گیا تو گلی کے نکڑ پر پیر صاحب کھڑے تھے۔ پیر صاحب اس محلے کی ایک معزز شخصیت تھے وہ مجھے جانتے تھے شہزاد نے ہی ان سے میرا تعارف کرایا تھا...... میں نے انہیں سلام کیا تو وہ بولے۔

''آؤ برخوردار...... اچھا ہوا آج تم سے ملاقات ہوگئی...... دراصل مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں حیران سا ہوا...... بھلا پیر صاحب کو مجھ سے کیا بات کرنی تھی، وہ اپنی آواز دھیمی کرکے کہہ رہے تھے۔

''برخوردار...... میں جانتا ہوں شہزاد تمہارا بہت اچھا دوست تھا...... ویسے بھی شہزاد کا تمہارے سوا کوئی

ہے بھی نہیں جس سے یہ بات کی جائے۔'' میں الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''دیکھو...... تمہارے دوست کی بیوہ ایک جوان عورت ہے، وہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے...... اور میں نے یہاں آس پاس کئی لوفر اور مشتبہ قسم کے جوانوں کو دیکھا ہے...... کہیں کل کلاں کو کچھ الٹا سیدھا ہوگیا تو تمہارے دوست کی روح کے سامنے تم شرمندہ ہوگے، اس کے لیے تم کیا راستہ نکالتے ہو...... یہ تم بہتر جان سکتے ہو...... میں نے جو بات بتانی تھی وہ بتادی ہے۔'' پیر صاحب تو اپنی بات کہہ کر چلتے بنے جبکہ میرے پیر تو جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ میں ہکا بکا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا...... میرے اندر جیسے زلزلہ آگیا تھا...... کافی دیر تک تو میں اپنی جگہ سے ہلنے.... جوگے بھی نہیں رہا تھا جب ہوش آیا تو شہزاد کے گھر جانے کے بجائے وہاں سے واپس پلٹ آیا...... میرا تو شہزاد کے سوا کوئی دوست نہیں تھا۔ جس سے میں ساری بات کہہ کر صلاح مشورہ لے لیتا۔

بس شروع سے کوئی بھی پرابلم ہوتی تو میں ابا سے صلاح مشورہ لیتا تھا...... اب کے بھی میں نے ساری بات ابا کو بتادی جو بھی پیر صاحب نے مجھے بتایا تھا...... ابا سوچ میں پڑ گئے...... میں نے ان کے بولنے کا انتظار کیا لیکن وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیے، میں وہاں سے اٹھ آیا...... شام کو ابا نے بتایا۔

''سعد...... کیا شہزاد کی بیوی کی عدت ختم ہوگئی؟''

''جی ابا...... ابھی پچھلے ہفتے ختم ہوگئی ہے۔''

''تو بیٹا...... اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ وہ دوسرا نکاح کرلے...... اسی طرح وہ محفوظ رہ سکتی ہے۔'' میں بڑی شدت سے چونک اٹھا...... میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا...... یہ ابا نے کیا کہہ دیا تھا۔ تسکین تو شہزاد کی امانت تھی...... وہ بھلا کسی اور کے نکاح میں کیسے جاسکتی تھی...... میں ہکلا کر بولا۔

''ابا...... وہ شہزاد کی بیوی ہے۔''

''بیوی تھی...... ہے نہیں......'' ابا نرم لہجے میں بولے......'' اور ایک جوان عورت اگر بیوہ ہوجائے تو شریعت میں حکم ہے کہ وہ دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔''

میں نے ابا کو کوئی جواب نہیں دیا...... میں کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا...... ابا کب وہاں سے اٹھ کر چل دیے مجھے بالکل بھی خبر نہیں ہوسکی۔ میں تو گھنٹوں اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا...... میرے لیے تسکین کی حفاظت کا یہ حل قابلِ قبول نہیں تھا...... میری نظر میں وہ آج بھی شہزاد کی امانت تھی۔

رات کو پھر شہزاد میرے خواب میں آیا...... وہ حسبِ معمول انتہائی غصے میں تھا...... خواب میں ہی میں نے اس سے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا کہ آخر وہ مجھ سے کس بات پر ناراض ہے...... لیکن میرے بار، بار کے استفسار کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا...... میں جاگا تو میرا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا...... مجھے اپنا دل ڈوبتا ہو محسوس ہوا۔

''یاخدا...... یہ کیا اُسرار ہے......'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے یہ مسئلہ بھی ابا کے سامنے رکھ دیا...... ابا پنج وقتہ نمازی تھے وہ ہر نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ وہ تبلیغی جماعتوں کے ساتھ بھی کبھی کبھار جایا کرتے...... اگرچہ مستقل رہنے اور جانے کی ان کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی...... بڑے، بڑے عالموں کی نشستوں کو بھی وہ اٹینڈ کرتے تھے...... میرے بار بار کے دیکھے خوابوں کو انہوں نے کسی بڑے عالم سے ڈسکس کرنے کا آئیڈیا دیا اور میں نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ خود میں نے تسکین کے دوسرے نکاح کی بات پسِ پشت ڈالی اور پہلے کی طرح ہر دوسرے دن اس کا احوال جاننے کے لیے جایا کرتا تھا...... اپنے ساتھ چھوٹی، چھوٹی چیزیں اس کی ناگواریت کے باوجود لے جاتا...... بچے مجھے دیکھ کر بے طرح خوش ہوجاتے...... مجھے بھی ان کے وجود سے شہزاد کی خوشبو آیا کرتی سو میں انہیں ڈھیر سارا پیار کرتا...... چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتا...... ان کے ہوم ورک میں ان کی مدد کرتا...... عامر کی عمر چھ سال تھی اور ندا ابھی چار سال کی ہورہی تھی۔ ندا نرسری میں تھی۔ عامر کے جی میں تھا...... وہ اپنے باپ کو بہت مس کرتے تھے کیونکہ ان کی چھوٹی، چھوٹی باتوں سے ان کا درد جھلکتا تھا...... میں جتنی دیر بچوں کے ساتھ ہوتا...... تسکین قریب نہ آتی۔

اس دن پیر صاحب نے مجھے پکڑ لیا...... اب کے ان کا لہجہ قدرے درشت تھا...... وہ چھوٹتے ہی بولے۔

''برخوردار...... میں نے چند دن قبل تمہارے کانوں میں ایک بات ڈالی تھی...... تم نے شاید میری بات کو چنداں اہمیت نہیں دی۔'' میں جزبز ہو کر رہ گیا مجھ سے کچھ نہ بولا گیا...... میں قدرے شرمساری سے انہیں دیکھنے لگا...... وہ رازدارانہ انداز میں بولے۔

''ابھی چند دن قبل شہزاد کے گھر میں رات کے وقت کسی نے پتھر پھینکے تھے اور دھم کی آواز سے کوئی اس کے صحن میں آن کودا تھا۔''

اچانک میرا ذہن سنسنانے لگا...... مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میرے سارے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

''آپ...... آپ کو...... کس نے بتایا؟'' میں نے رک، رک کر ان سے پوچھا تو وہ بولے۔

''شہزاد کی بیوہ نے میری اہلیہ کو خود بتایا ہے...... اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ساری رات کمرے کی کنڈی بند کرکے بچوں سمیت ڈر، ڈر کر جاگتی رہی اور صبح تک نہیں سوئی۔ اس نے میری اہلیہ سے یہ بھی کہا ہے کہ پیر صاحب سے کہیں کہ وہ میری حفاظت کا کوئی بندوبست کردیں...... لیکن برخوردار...... میں اس کی کیا حفاظت کرسکتا ہوں...... میں نے اپنی اہلیہ کو یہی کہا ہے کہ شادی کرلے...... وہ کسی مرد کی پناہ میں آئے گی تو ہی

میری سکھی

کبھی کوئی دل دُکھائے
آنکھ سے آنسو گال پہ آئے
دل کُرلائے
درد کو سہنا
میری بہنا
سسرال کو لیکن برا نہ کہنا
میاں جو روٹھے
اسے منانا
کھانا بھی پکانا
ساس سے اتنا پیار نبھانا
خود کو اس سے
بیٹی کہلانا
نند کو گند سمجھ نہ لینا
بہن کے طور پہ اس کو لینا
دیور کوئی دھونس جمائے
لیکن دلہن چپ رہ جائے
سسر تمہارا باپ برابر
دل میں اس کی عزت ہو سراسر
میری سکھی
میری پیاری سہیلی
بات میری گر تم مانو گی
سسرال کو اچھا گر جانو گی
سب کی آنکھ کا تارہ ہو گی
گھر بھر کا اجیارہ ہو گی

شاعرہ: شہزادی کائنات، کراچی

ہے بھی نہیں جس سے یہ بات کی جائے۔'' میں الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''دیکھو...... تمہارے دوست کی بیوہ ایک جوان عورت ہے، وہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے...... اور میں نے یہاں آس پاس کئی لوفر اور مشتبہ قسم کے جوانوں کو دیکھا ہے...... کہیں کل کلاں کو کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو تمہارے دوست کی روح کے سامنے تم شرمندہ ہو گے، اس کے لیے تم کیا راستہ نکالتے ہو...... یہ تم بہتر جان سکتے ہو...... میں نے جو بات بتانی تھی وہ بتادی ہے۔'' پیر صاحب تو اپنی بات کہہ کر چلتے بنے جبکہ میرے پیر تو جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ میں ہکا بکا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا...... میرے اندر جیسے زلزلہ آ گیا تھا...... کافی دیر تک تو میں اپنی جگہ سے ہلنے...... جوگے بھی نہیں رہا تھا جب ہوش آیا تو شہزاد کے گھر جانے کے بجائے وہاں سے واپس پلٹ آیا...... میرا تو شہزاد کے سوا کوئی دوست نہیں تھا۔ جس سے میں ساری بات کہہ کر صلاح مشورہ لے لیتا۔

بس شروع سے کوئی بھی پرابلم ہوتی تو میں ابا سے صلاح مشورہ لیتا تھا...... اب کے بھی میں نے ساری بات ابا کو بتادی جو بھی پیر صاحب نے مجھے بتایا تھا...... ابا سوچ میں پڑ گئے...... میں نے ان کے بولنے کا انتظار کیا لیکن وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیے، میں وہاں سے اٹھ آیا...... شام کو ابا نے بتایا۔

''سعد...... کیا شہزاد کی بیوی کی عدت ختم ہو گئی؟''

''جی ابا...... ابھی پچھلے ہفتے ختم ہو گئی ہے۔''

''تو بیٹا...... اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ وہ دوسرا نکاح کر لے...... اسی طرح وہ محفوظ رہ سکتی ہے۔''

میں بڑی شدت سے چونک اٹھا...... میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا...... یہ ابا نے کیا کہہ دیا تھا۔ تسکین تو شہزاد کی امانت تھی...... وہ بھلا کسی اور کے نکاح میں کیسے جاسکتی تھی...... میں ہکلا کر بولا۔

''ابا...... وہ شہزاد کی بیوی ہے۔''

''بیوی تھی...... ہے نہیں......'' ابا نرم لہجے میں بولے......'' اور ایک جوان عورت اگر بیوہ ہو جائے تو شریعت میں حکم ہے کہ وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔''

میں نے ابا کو کوئی جواب نہیں دیا...... میں کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا...... ابا کب وہاں سے اٹھ کر چل دیے مجھے بالکل بھی خبر نہیں ہو سکی۔ میں تو گھنٹوں اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا...... میرے لیے تسکین کی حفاظت کا یہ حل قابلِ قبول نہیں تھا...... میری نظر میں وہ آج بھی شہزاد کی امانت تھی۔

رات کو پھر شہزاد میرے خواب میں آیا...... وہ حسبِ معمول انتہائی غصے میں تھا...... خواب میں ہی میں نے اس سے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا کہ آخر وہ مجھ سے کس بات پر ناراض ہے...... لیکن میرے بار، بار کے استفسار کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا...... میں جاگا تو میرا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا...... مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

''یا خدا...... یہ کیا اسرار ہے......'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے یہ مسئلہ بھی ابا کے سامنے رکھ دیا...... ابا پنج وقتہ نمازی تھے وہ ہر نماز با جماعت ادا کرتے تھے۔ وہ تبلیغی جماعتوں کے ساتھ بھی کبھی کبھار جایا کرتے...... اگرچہ مستقل رہنے اور جانے کی ان کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی...... بڑے، بڑے عالموں کی نشستوں کو بھی وہ اٹینڈ کرتے تھے...... میرے بار بار کے دیکھے خوابوں کو انہوں نے کسی بڑے عالم سے ڈسکس کرنے کا آئیڈیا دیا اور میں نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ خود میں نے تسکین کے دوسرے نکاح کی بات پسِ پشت ڈالی اور پہلے کی طرح ہر دوسرے دن اس کا احوال جاننے کے لیے جایا کرتا تھا...... اپنے ساتھ چھوٹی، چھوٹی چیزیں اس کی ناگواریت کے باوجود لے جاتا......

بچے مجھے دیکھ کر بے طرح خوش ہو جاتے...... مجھے بھی ان کے وجود سے شہزاد کی خوشبو آیا کرتی سو میں انہیں ڈھیر سارا پیار کرتا...... چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتا...... ان کے ہوم ورک میں ان کی مدد کرتا...... عامر کی عمر چھ سال تھی اور ندا بھی چار سال کی ہو رہی تھی۔ ندا نرسری میں تھی۔ عامر کے جی میں تھا...... وہ اپنے باپ کو بہت مس کرتے تھے کیونکہ ان کی چھوٹی، چھوٹی باتوں سے ان کا درد جھلکتا تھا...... میں جتنی دیر بچوں کے ساتھ ہوتا...... تسکین قریب نہ آتی۔

اس دن پیر صاحب نے مجھے پکڑ لیا...... اب کے ان کا لہجہ قدرے درشت تھا...... وہ چھوٹتے ہی بولے۔

''برخوردار...... میں نے چند دن قبل تمہارے کانوں میں ایک بات ڈالی تھی...... تم نے شاید میری بات کو چنداں اہمیت نہیں دی۔'' میں جز بز ہو کر رہ گیا...... مجھ سے کچھ نہ بولا گیا...... میں قدرے شرمساری سے انہیں دیکھنے لگا...... وہ رازدارانہ انداز میں بولے۔

''ابھی چند دن قبل شہزاد کے گھر میں رات کے وقت کسی نے پتھر پھینکے تھے اور دھم کی آواز سے کوئی اس کے صحن میں آن کودا تھا۔''

اچانک میرا ذہن سنسنانے لگا...... مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میرے سارے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

''آپ...... آپ کو...... کس نے بتایا؟'' میں نے رک، رک کر ان سے پوچھا تو وہ بولے۔

''شہزاد کی بیوہ نے میری اہلیہ کو خود بتایا ہے......

اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ساری رات کمرے کی کنڈی بند کر کے بچوں سمیت ڈر، ڈر کر جاگتی رہی اور صبح تک نہیں سوئی۔ اس نے میری اہلیہ سے یہ بھی کہا ہے کہ پیر صاحب سے کہیں کہ وہ میری حفاظت کا کوئی بندوبست کر دیں...... لیکن برخوردار...... میں اس کی کیا حفاظت کر سکتا ہوں...... میں نے اپنی اہلیہ کو یہی کہا ہے کہ شادی کر لے...... وہ کسی مرد کی پناہ میں آئے گی تو ہی

میری سکھی

کبھی کوئی دل دُکھائے
آنکھ سے آنسو گال پہ آئے
دل کرلائے
درد کو سہنا
میری بہنا
سسرال کو لیکن برا نہ کہنا
میاں جو روٹھے
اسے منانا
کھانا بھی پکانا
ساس سے اتنا پیار نبھانا
خود کو اس سے
بیٹی کہلانا
نند کو گند سمجھ نہ لینا
بہن کے طور پہ اس کو لینا
دیور کوئی دھونس جمائے
لیکن دلہن چپ رہ جائے
سسر تمہارا باپ برابر
دل میں اس کی عزت ہو سراسر
میری سکھی
میری پیاری سہیلی
بات میری گر تم مانو گی
سسرال کو اچھا گر جانو گی
سب کی آنکھ کا تارہ ہو گی
گھر بھر کا اجیارہ ہو گی

شاعرہ: شہزادی کائنات، کراچی

عزت سے جی سکے گی۔" پھر وہ مجھے اوپر سے نیچے تک گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"برا نہ مانو لیکن تم ہی اس سے شادی کرلو...... اور اپنے دوست کی عزت بچالو...... ورنہ آخرت میں تمہارا دوست تمہارا گریبان پکڑے گا۔" وہ تو مجھے کھائی میں دھکیل کر اپنی راہ چل دیے جبکہ مجھے تو لگ رہا تھا جیسے میں دلدل میں دھنس رہا ہوں...... پسینہ پانی کی طرح میرے سارے جسم سے بہنے لگا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا...... اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے میں گھر آ گیا میں پیر صاحب کی بات سے بہت زیادہ اپ سیٹ تھا...... تسکین میری پسند ضرور تھی لیکن جب وہ شہزاد کی بیوی بنی تو میں نے اپنے دل سے سارے جذبے نوچ کر پھینک دیے...... اب وہ میرے لیے میری بھابی تھی میں دل سے اس کا احترام کرنے لگا تھا...... میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا...... لائٹ گئی ہوئی تھی، گھر میں اندھیرے کا راج تھا۔ اماں اور بہن کچن میں موم بتی جلائے چھوٹے بھائیوں کے لیے ان کی فرمائش پر کچھ پکا رہی تھیں...... دونوں بھائی بھی کچن میں تھے۔ اتنے میں ابا ایک موم بتی جلائے راستہ روشن کرتے ہوئے میرے پاس آئے...... میرے پاس بیٹھ کر انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

"سعد...... تم نے میرے ذمے ایک ڈیوٹی لگائی تھی...... یاد ہے تمہیں......؟" میں نے خالی، خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔ سچ تو یہ تھا کہ پیر صاحب کی باتوں نے مجھے اتنا ڈسٹرب کر رکھا تھا کہ میں اس وقت نہ کچھ بولنے کے موڈ میں تھا اور نہ سننے کے موڈ میں...... اور نہ مجھے کوئی ایسی ڈیوٹی یاد تھی جو میں نے ان کے سپرد کی ہو...... مجھے خاموش پا کر وہ بولے۔

"وہی...... تمہارے خوابوں والی بات...... تم نے کہا تھا ناں...... کہ تمہیں ہر دوسری، تیسری رات کو شہزاد خواب میں آتا ہے جو تمہیں بہت غصے سے دیکھتا ہے؟"

"ہاں ابا......" میں نے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو کیا آپ نے اس بارے میں کسی سے پوچھا ہے؟"

"ہاں بیٹا...... میں نے ایک بندے سے نہیں...... کئی بندوں سے پوچھا ہے، ان میں ایک عالم فاضل بندہ مولوی سراج خان ہے جس سے ملنے اور اپنے مسئلے مسائل کا حل جاننے کے لیے دور، دور سے لوگ آتے ہیں...... انہوں نے شہزاد کا تمام بیک گراؤنڈ جاننا چاہا...... میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔"

"پھر...... پھر انہوں نے کیا کہا؟" میں بے تابی سے پوچھنے لگا۔ ابا کافی دیر تک خاموش رہے...... پھر دھیمی آواز میں کہنے لگے۔

"شہزاد...کی خفگی کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ سعد اس کی بیوہ سے عقدِ ثانی کر لے...... کہ کسی کی پناہ میں آ کر اس کی عزت محفوظ رہ سکے اور اس کے بچوں کو باپ کا پیار نصیب ہو جو اس کم عمری میں ان سے چھن گیا ہے۔"

ابا کی بات تھی یا ایک بپھرتا ہوا سیلاب...... مجھے لگا جیسے بپھری موجوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو...... میرا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا کہ مجھے لگتا تھا کہ یہ ابھی دھڑک، دھڑک کر بند ہو جائے گا...... میرے تو اوسان خطا ہو گئے...... کیا شہزاد کی ناراضی کا یہ راز ہے......؟ نہیں...... میرا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ضروری نہیں کہ اس عالم فاضل نے جو بات کی ہو وہ صحیح ہو۔ ابا کہہ رہے تھے۔

"بیٹا...... تم ہمارے بہت اچھے بیٹے ہو...... ہم تمہارے لیے بہت اچھی بیوی لانے کے خواہشمند ہیں...... لیکن تم نے شہزاد کی موت کا جتنا اثر لیا ہے...... اسے دیکھ کر میں نے .... اور تمہاری ماں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم شہزاد کی بیوہ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اس نیک کام میں ہم تمہارے ساتھ ہیں...... شاید اس طرح تمہارے دل میں شہزاد کی جدائی نے جو زخم ڈالا ہے وہ مندمل ہو سکے۔" اس بات پر میں ساری رات روتا رہا...... میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا کہ مجھے تسکین اس طرح مل جائے...... بلکہ تسکین کو تو شہزاد کی موت کے بعد بھی میں اس کی امانت سمجھتا رہا...... میں کیا کروں، کہاں جاؤں......؟ میں اپنے بال نوچ، نوچ کر بین کرتا رہا...... رات کے کسی پہر لمحے بھر کو میری آنکھ لگی تو میں نے شہزاد کو دیکھا...... مجھے آج وہ غصے میں نہیں لگا وہ بڑی محبت سے مجھے دیکھنے لگا...... اور فیصلہ خود بخود ہو گیا...... جو عام حالات میں، میں کبھی نہ کر پاتا...... میری اور تسکین کی شادی کی پہلی رات ہم دونوں کے لیے کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں تھی...... ہم دونوں شہزاد کی یاد میں بلک، بلک کر روتے رہے...... تسکین سسکیوں کے بیچ کہہ رہی تھی۔

"میں نے شہزاد کی یاد میں ساری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا...... لیکن کاش...... دنیا مجھے جینے دیتی، مجھے تو جان کی بھی پروا نہیں تھی...... لیکن شہزاد کی عزت بچانے کی خاطر مجھے شادی کا یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔"

ساری رات ہم شہزاد کی باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور پھر یہ ہر رات ہونے لگا...... میں اسے شہزاد کے کالج کی اسکول کی باتیں بتاتا رہتا...... وہ ہنستی جاتی...... وہ بھی شہزاد کی زندگی کے دلچسپ گوشوں سے پردہ ہٹاتی...... میں ہنس دیتا...... مجھے لگ رہا تھا جیسے شہزاد ہمارے بیچ پھر سے زندہ ہو گیا ہو اس کے بچوں کو جب میں اسکول لے کر جاتا اور وہ مجھے پاپا کہتے تو میرا سیروں خون بڑھ جاتا...... مجھے اب بھی شہزاد کبھی کبھار خواب میں نظر آ جاتا لیکن وہ میری طرف بڑے پیار سے دیکھتا ہے، اب وہ غصے میں نظر نہیں آتا...... گویا وہ یہی چاہتا تھا کہ میں اس کے بیوی بچوں کے لیے سائبان بن جاؤں۔

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

نواں حصہ



وہ حیران کیوں نہ ہوتا اُس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی وہ بھی بہت رواں اردو میں...... اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ خبطی آئٹم کی ایک، ایک حرکت کو بہت اونچائی اور بلندی سے نوٹ کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا جبکہ وہ لڑکی بہت نیچے تھی۔ اور ذی شاہ لمحے بھر کے لیے اسے دیکھتے وقت چوکا نہیں تھا جو وہ لڑکی موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتی۔ جبکہ اپنے کسی بھی عمل سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ذی شاہ کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہی بے نیاز اور بے حس بنی بیٹھی تھی۔ اس کے پیروں سے اب بھی خون رِس رہا تھا مگر مجال تھی جو اس کے لبوں سے ہلکی سی کراہ بھی نکل آتی۔ بڑا کمال کا ضبط پایا تھا اس نے...... ذی شاہ کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا خبطی آئٹم تھا جو اسے پل پل حیران کر رہا تھا۔ اس

لڑکی کی بے نیازی، ضبط، صبر و تحمل کمال کا تھا۔ ورنہ اس نے تو صرف سوئی چبھنے پر لڑکیوں کو چلّاتے دیکھا تھا۔

ابھی آج صبح ہی تو ایمل کو آنٹی سے محض چھری کا ہلکا سا کٹ لگنے پر ڈانٹ پڑی تھی کیونکہ کٹ بہت معمولی تھا مگر وہ شور اتنا مچا رہی تھی گویا سارے زمانے کا درد اس کی ننھی سی انگلی میں سمٹ آیا ہو...... چلو، ایمل تو بچی تھی، اس نے بندیا اور عینی کو ذرا، ذرا سی تکلیف پہ دھاڑیں مارتے دیکھا تھا۔ وہ تین، تین دن تک بستر نہیں چھوڑتی تھیں اور یہاں وہ ایک جرمن لڑکی کے صبر، برداشت اور حوصلے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تین انچ لمبے اور نوکیلے کانچ کو ایڑھی میں کھبائے مطمئن سی بیٹھی تھی۔

''اللہ اکبر...... اتنا حوصلہ......'' ذی شاہ ساری سوچوں کو جھٹک کر اس کے پیر پہ جھک آیا تھا۔ وہ ایڑھی پکڑ کر زخم کا جائزہ لینا چاہتا تھا جب اس لڑکی نے اسے حلاوت سے روک دیا۔

''اسے مت چھیڑو...... اسے میری ایڑھی میں کھُبا رہنے دو۔'' وہی نرم اور شیریں انداز...... وہ ذی شاہ کو دیکھے بنا نرمی سے منع کر رہی تھی۔ اسے پھر سے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ رواں اردو اور شیریں لہجہ...... وہ لمحے بھر کے لیے چپ سا کر گیا تھا پھر اس سے ایڑھی سے بہتا خون دیکھا نہ گیا۔ نیچے شفاف جگہ پر خون کی ننھی سی ندی رواں ہوگئی تھی۔ اتنا خون بہنے کے باوجود وہ ذرا سی کمزوری محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ حقیقتاً کوئی خبطی آئٹم ہی تھی۔ افراہیم نے بالکل ٹھیک کہا تھا اور پورے مغربی جرمنی میں ذی شاہ کو ایسا خبطی آئٹم نظر نہیں آسکتا تھا۔

اس نے اس کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود بھی فرسٹ ایڈ باکس کھول لیا تھا۔ وہ ڈیٹول کے ذریعے زخم صاف کر کے کانچ کو نکالنا چاہتا تھا جب اس لڑکی نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

''میں نے کہا ناں...... اسے مت نکالو، یہ جب تک میری ایڑھی میں کھبا مجھے تکلیف دیتا رہے گا، میرا اللہ پر یقین بڑھتا جائے گا۔ تم اسے یہیں رہنے دو...... مت نکالو...... مجھے اس درد کی لذت کا احساس بہت سکون دیتا ہے۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی تو ہے جو اتنا درد دیتا ہے کہ بے بس کر کے رکھ دیتا ہے اور ایسی تدبیر کرتا ہے جو حواس چھین لیتی ہے۔'' وہ بن دیکھے اسے اپنے شیریں کلام سے متحیر کر رہی تھی۔ مغربی حسن، مغربی شکل، مشرقی باتیں اور بیچ میں اللہ کا ذکر...... وہ پھر سے بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ خبطی آئٹم تو جیسے اسے بھی خبطی کرنے کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔

''تم پاکستانی ہو؟'' ذی شاہ نے حیران ہونا ترک کر کے زبردستی اس کے پیر پر اپنا پنجہ جما لیا تھا پھر اس کے منع کرنے اور روکنے کے باجود کچھ دیر پہلے کی تقریر بھلا کر اس نے بڑے آرام سے کانچ نکال لیا تھا اور شیشہ نکالتے ہی جیسے گوشت کے کئی لوتھڑے باہر آپڑے تھے۔ خون کا جیسا فوارہ چھوٹ پڑا تھا۔ وہ بغیر گھبرائے بڑی سہولت کے ساتھ خون روکنے کی کوشش کرتا رہا...... مگر یہ کوشش قطعاً ناکام تھی...... ذی شاہ کو اندازہ ہوگیا تھا خون رکنے والا ہرگز نہیں...... زخم بہت گہرا تھا۔

''آئی ایڈ وائس یو ٹو گو ٹو ہاسپٹل......'' ذی شاہ نے متفکر لہجے میں کہا پھر جیسے کچھ سوچ کر اٹھ گیا۔ افراہیم کی گاڑی نہیں تھی اور یقیناً اس خبطی آئٹم کے پاس بھی گاڑی کی سہولت نہیں تھی۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا مین روڈ تک گیا۔ تب اسے اپنے پیچھے ہی ایک آواز سنائی دی تھی۔ ذی شاہ اسے پتھر پر بیٹھا رہنے کی التجا کر کے آیا تھا جبکہ وہ اس کے پیچھے ہی دبے قدموں چلتی آگئی تھی۔ وہ جس طرح پیر زمین پر جما کر چل رہی تھی، اس کے بجائے ذی شاہ کو تکلیف ہونے لگی تھی۔ اس کا ہر زمین پر پڑتا قدم ذی شاہ کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کل سے اپنی کیفیات پر حیران تھا۔ وہ آج بھی اپنی کیفیات پر حیران ہو رہا تھا۔

''ٹیکسی یہاں سے نہیں ملے گی۔ بس اسٹاپ تک چلتے ہیں۔'' وہ یقیناً بڑی ہمت والی بہادر لڑکی تھی۔ ذرا سی کراہ بھی منہ سے نکالے بغیر ذی شاہ کا سہارا لینے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی بلکہ اس کے سہارا دینے پر انکار کر کے آرام سے چلتی بس اسٹاپ تک پہنچ گئی تھی۔ دیکھا

جاتا تو ذی شاہ کو ساتھ جانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود چل کر بس اسٹاپ تک آسکتی تھی تو کیا ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتی تھی؟ اور ویسے بھی ذی شاہ کو تو نہ رستوں کا علم تھا نہ کلینک کی کچھ خبر تھی۔ وہ تو اس کمبخت دل کے مجبور کرنے پر بنا سوچے سمجھے منہ اٹھا کر چلا آیا تھا۔ اور عجیب بات یہ بھی، ساتھ آنے والی محترمہ نے رسمی طور پر بھی اسے ساتھ چلنے سے منع نہیں کیا تھا، سو وہ بھی ڈھیٹوں کی طرح رکنے کے بجائے ساتھ ہی چل پڑا۔

وہ ننگے پیر تھی اور بینڈیج کے باعث خون رکا تو نہیں تھا تاہم پہلے کی طرح ٹپک نہیں رہا تھا پھر بھی اتنے صبر اور حوصلے کے ساتھ بنا تکلیف کا واویلا کیے وہ چل پڑی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر میں بذریعہ بس وہ لوگ ڈاکٹر کے کلینک پہنچ گئے جہاں اسے معائنے کے بعد چھوٹا سا آپریشن کر کے ٹانکے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس دوران ذی شاہ بھی ساتھ، ساتھ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے پہاڑ جتنے حوصلے، صبر اور ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اتنی صابر خاتون ذی شاہ نے اپنی پوری زندگی میں کوئی نہیں دیکھی تھی۔ کم از کم ذرا سی تکلیف کے آثار تو نظر آنے چاہیے تھے۔ یوں تو وہ صابر اور باہمت کے ساتھ، ساتھ کچھ کچھ بے حس بھی لگ رہی تھی۔ جو ہر قسم کے احساسات سے بے خبر تھی۔ جسے تکلیف یا درد تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔

میڈیکل ٹریٹمنٹ کے بعد اب وہ لوگ کیمسٹ کے پاس کھڑے تھے۔ وہ اب بھی ذی شاہ کا سہارا لیے بغیر ڈاکٹر کے لکھے گئے نسخے کو دیکھ رہی تھی۔ دوائیاں لے کر اس نے ادائیگی کرنا چاہی تو ذی شاہ نے اسے روک دیا تھا۔ یقیناً وہ بے خیالی میں اِدھر اُدھر دیکھتی اپنا پاؤچ تلاش کر رہی تھی۔ اس کے پاس پاؤچ تھا ہی نہیں۔ بس کا کرایہ بھی ذی شاہ نے اسے پکڑایا تھا۔ کیمسٹ سے ہی اس نے ٹشو خریدے جو آستین سے ناک پونچھتی اس خبطی آئٹم کو بھی دیے اور وہ اب چلتے، چلتے ایک چھوٹی سپر مارکیٹ کے قریب رک کر اس کا جائزہ لے کر اندر کی طرف بڑھا۔ وہ بھی ساتھ، ساتھ تھی۔ وہ لیڈیز جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان میں داخل ہوا اور خوش مزاج سیلز گرل سے اس کے لیے جوتا دکھانے کو کہا۔ وہ تو اس طرح نخوت سے جوتا لے رہی تھی جیسے ذی شاہ بڑی منتوں کے بعد اسے لے کر آیا تھا۔ خیر...... آیا تو وہ اِدھر اپنی مرضی سے تھا...... مگر مجال تھی جو وہ لڑکی ذرا سا مسکرا دیتی۔ بندہ اس اخلاقی عمل کو دیکھ کر ذرا سی حوصلہ افزائی ہی کر دیتا ہے۔ ذی شاہ کے اتنے مروت بھرے فدویانہ رویّے پہ محترمہ نظر ڈالے بنا جوتے پہنے اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ جبکہ شاپ کی مالکن کچھ الجھی اور سوچتی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو مگر...... پھر پورا رستہ خاموشی میں کٹا...... گھر کے قریب آکر ذی شاہ نے اتنے سوالوں میں پہلا اہم ترین سوال اٹھایا تھا۔ یعنی اس نے خبطی آئٹم سے اس کا نام پوچھنے کی جسارت کر لی تھی۔ یہی جسارت زیٹا (سیلز گرل) بھی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا ارادہ بھانپ کر وہ شاپ سے بھاگ نکلی۔

''آں...... میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ بغیر کوئی رسمی کلمات بولے براؤن کلر کے جوتوں میں پیر پھنسائے اپنے ویس ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی جب ذی شاہ کی آواز سن کر لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر رک گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر جواب دیا تھا۔

''منکشے......'' وہ خبطی آئٹم لمحہ بھر کی دیر میں اپنے ویس ہاؤس کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جاتے سمے وہ اپنا خوب صورت نام ذی شاہ کی سماعتوں میں امرت کی طرح اتار گئی تھی۔ وہ جیسے سحر زدہ رہ گیا تھا۔

''اتنا حسین مگر عجیب نام......'' وہ زیرِ لب... بُڑبُڑاتا ہوا میٹھی سی مسکان ہونٹوں پر سجائے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کے دل کی خوشی اور سکون کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ منکشے سے آج نہ صرف ملاقات ہوگئی تھی بلکہ بہت طویل بات بھی ہوئی تھی۔ جرمنی آنے کے صرف اکتالیس گھنٹوں بعد منکشے سے پہلی باضابطہ ملاقات...... وہ جو پہلی نظر میں دل کی آخری تہوں میں اتر گئی تھی۔ جو ذی شاہ کے دل کا ہر ساز اپنی بے نیازی

میں گھیر کر بجا گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اپنی سادگی کے باعث ہمیشہ کے لیے رچ بس گئی تھی۔ اور ایک بات تو جیسے طے تھی وہ اس کے دل کی سرزمین سے پیر اکھاڑنے والی نہیں تھی۔ وہ عجیب نام کی عجیب لڑکی......

☆☆☆

''تمہارا نام کتنا عجیب ہے......'' کرسٹل کے شفاف باؤل میں سرخ، رسیلی اسٹرابریز بھرے وہ اسٹول نما سنگی پتھر پر نزاکت سے بیٹھی تھی۔ پنک اسکرٹ کے اوپر وائٹ بلوزے پہن رکھا تھا، بالوں کی ڈھیلی سی پونی کے ساتھ وہ بہت بے پروا نظر آ رہی تھی۔ اس کی اٹھان بہت اچھی تھی، ہاتھ پاؤں بڑے، بڑے تھے تاہم نسوانی نزاکت ضرور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ اخروٹی تھا، آنکھیں نیلی اور جسم بہت دبلا پتلا تھا، اس کے باوجود وہ تیرہ سال کی عمر میں سترہ سالہ دوشیزہ نظر آتی تھی۔

ذی شاہ کو ایمل کی کمپنی پسند تھی اور ایمل بھی اسکول سے آ کر اس کے پہلو سے چپک جاتی تھی۔ دن کا بیشتر وقت وہ ماں سے ڈانٹ کھاتی تھی تبھی بقول ایمل اسے کھایا پیا نہیں لگتا تھا۔ وہ باتوں کی شیدائی تھی اور چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اسے ہی سنا جائے۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اچھی خاصی پنجابی میں وہ خوب چٹخارے لے کر اسے باتیں سناتی تھی۔ اپنی بہن کی لو میرج کا قصہ اس نے کوئی اٹھارہ مرتبہ تو اسے سنا رکھا تھا۔ فی الوقت ولیس ہاؤس کی مالکن پر تبصرہ کرتے ہوئے اچانک ایمل کو اس کا نام بہت عجیب لگا تھا۔ اور دل کی بات رکھنے والی تو وہ تھی نہیں۔ تبھی ننھی سی ناک سکیڑ کر بولی تھی۔

''عجیب نام ہے تمہارا ...... پہلے کبھی نہیں سنا......'' ایمل نے موٹی سی اسٹرابیری منہ میں رکھ کر دانت زور سے دبائے تو اسٹرابری کا اضافی رس اس کے ہونٹوں کی تراش اور کونوں سے باہر نکل آیا تھا جسے وہ اپنے ہونٹوں کو چوس چوس کر زبان پھیرتے ہوئے اندر کر رہی تھی۔

''ایں...... عجیب کیوں ہوا......؟'' ذی شاہ برا مان گیا...... اس کی نظریں پھولوں سے لدی ٹوکریوں پر جمی تھیں۔ ایک جیسی ٹوکریاں ایک جیسے گھروں کے کونوں میں موجود چھوٹے سے سوئمنگ پول...... کھڑکیوں کے اندر لٹکے ایک ہی طرز کے سفید جالی دار نائیلون کے پردے...... اتنی مماثلت کا مقصد کیا تھا؟ یا پھر ایک ہی طرز کی کچھ چیزیں یہاں کے کلچر کا کوئی حصہ تھیں، ہر گھر کے اندر پردے ایک جیسے تھے، پھولوں کی ٹوکریاں بھی ایک جیسی...... گارڈن میں موجود پول بھی ایک ہی طرز کے...... حتیٰ کہ کھڑکیوں کا طول عرض بھی ایک سا تھا۔ یہ جرمن قوم کے مزاج کا انوکھا پہلو تھا۔ بہت ساری چیزوں میں انتہا کی یکسانیت...... ہر اجنبی کو اسی طرح حیران کر دیتی ہوگی۔

وہ اتنی ساری عجیب...... چیزوں پر حیران ہونا ترک کر کے اپنی چھوٹی فرینڈ کی عجیب بات میں الجھ گیا تھا جسے ذی شاہ نام جانے کیوں عجیب لگا تھا۔

''میرا نام تو بہت اچھا ہے......'' ذی شاہ نے مصنوعی تفاخر سے جتا کر کہا تھا۔ تب ایمل تیسری اسٹرابری کو اپنے دانتوں تلے دبا کر پہلے والے ہی اسٹائل میں کناروں سے چھلکتا رس چوستی دلچسپی سے بولی۔

''وہ کیسے؟'' اس کی نیلی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

''وہ ایسے کہ میرے نام ذی شاہ کا معنی بہت خوب صورت ہے، شان اور مرتبے والا......'' وہ اپنے تفاخر کی وجہ بتا رہا تھا۔ تب ایمل نے اثبات میں سر ہلا کر جیسے تائید کی تھی۔

''اور تم لوگوں کے نام تو جیسے ہرگز بھی عجیب نہیں...... افراہیم، افریشم اور ایمل...... اور یہ سامنے والی......'' ذی شاہ کچھ بولتے، بولتے ایک دم رک سا گیا۔ حالانکہ وہ جتانا چاہتا تھا کہ یہ سامنے والی عجیب نام کی منکشے خاتون...... ''بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا؟''

''اچھا...... اچھا، نام سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔'' ایمل نے فوراً سیز فائر کرنے کی کوشش میں اسٹرابیری ہاتھ سے رکھ دی تھی کیونکہ ان دونوں کی لڑائی اب متوقع

تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے کوئی اور بات بتا رہی تھی۔

معاً ذی شاہ کو اچانک خیال آیا تو بولا۔

''میرے ساتھ شریب وارن تک چلو گی؟'' اس نے اپنے امپورٹڈ والٹ کو نکال کر کرنسی چیک کی تھی پھر مطمئن ہو کر ایمل کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس سے بھی پہلے قدرے پُرجوش ہو گئی تھی...... ہانٹ لونگ اس کی فیورٹ دکان تھی۔ اسے بھی کافی زیادہ اسٹیشنری کا سامان خریدنا تھا...... سو فوراً باؤل کو اٹھا کر اندر رکھ آئی...... واپسی پر اس کے ہاتھ میں وائٹ بلوزے جیسا ایک پاؤچ بھی تھا۔

''تمہیں ہانٹ لونگ سے کیا خریدنا ہے؟'' ایمل بل گم چباتی تجسس بھرے لہجے میں بولی تھی۔ وہ دونوں فٹ پاتھ پر واک کے انداز میں چل رہے تھے۔ اسٹیشنری یہاں سے دس منٹ کے واکنگ ڈسٹنس پر تھی۔ ذی شاہ کو ابھی یہ علاقہ گھومنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ورنہ وہ اکیلا ہی چلا آتا...... ایسے ہی ارد گرد دیکھتے اس کے دل میں خواہش اچانک انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی کہ ولیس ہاؤس کی مالکن، وہ خبطی آنٹم منکشے یہیں کہیں دکھائی دے جائے...... جانے اس کے پیر کا زخم کیسا تھا......؟ وہ اسے کل سے دکھائی نہیں دی تھی۔ اسے چلنے پھرنے میں یقیناً دشواری کا سامنا تھا۔

''مجھے خط لکھنے کے لیے پیڈ، لفافے اور قلم چاہیے۔'' وہ سنجیدگی سے جواب دیتا ابھی تک منکشے کو سوچ رہا تھا...... اور ایمل بار بار اس کا ارتکاز توڑ رہی تھی...... اسے بولنے کی بیماری تھی اور وہ چپ نہیں رہ سکتی تھی۔

''وہ تو گھر میں بھی موجود تھے۔ تم مجھے بتاتے تو سہی۔'' ایمل نے بڑے پن سے کہا تھا، تب ذی شاہ بے پروائی سے بولا۔

''اٹس اوکے یار......! اسی بہانے تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا پھر کسی سوچ کے زیرِ اثر چلا گیا تھا۔ روتی ہوئی منکشے کبھی آنکھوں کی پتلیوں کے سامنے عکس بنانے لگتی تھی۔ کبھی روڈ کے وسط میں چلتی نظر آتی، کبھی راج ہنس سے باتیں کرتی دکھائی دینے لگتی...... پھر اس کے الفاظ، وہ چلتے، چلتے ٹھٹک گیا۔ اس نے کیسے ذی شاہ کو اتنی اونچائی پر ہونے کے باوجود دیکھا تھا۔ اس کی ایک، ایک حرکت نوٹ کی...... حتیٰ کہ گھنٹوں کا بھی حساب رکھا...... جبکہ بظاہر وہ بے نیاز نظر آتی تھی۔ کیا کمال کی زیرک نظری پائی تھی اس نے...... کیا غضب کا مشاہدہ تھا۔ وہ ابھی تک متحیر تھا، بھلا اتنے بے نیاز روپ کے ساتھ وہ آس پاس کے ماحول سے اتنی باخبر کیسے تھی؟

جانے وہ کب تک سوچوں میں محو رہتا؟ چونکا تو وہ تب جب ایمل نے خفگی سے اس کا بازو دبوچ کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ وہ تو اپنے ہی دھیان میں مگن بہت آگے تک چلا گیا تھا تبھی پھولی سانسوں والی ایمل نے بھاگ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

''اللہ...... کہاں، بھاگے جا رہے ہو......؟ ہانٹ لونگ تو پیچھے رہ گئی۔'' وہ اسے واپس موڑتے ہوئے خاصا شرمندہ کر رہی تھی۔ ذی شاہ چونک کر جیسے حقیقتاً شرمندہ ہو گیا۔ پھر اپنی شرمندگی مٹانے کی خاطر اس نے ایمل کو خاصی شاپنگ کروائی تھی پھر اس نے شاپ کیپر سے پوسٹ آفس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ ایک کاغذ پر جلدی، جلدی کچھ تحریر کر رہا تھا۔

''از دی پوسٹ آفس ٹوڈے؟'' شاپ کیپر سے انگریزی میں پوچھتا وہ خود ہی ہونق ہو گیا تھا کیونکہ شاپ کیپر صاحب نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اخبار اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایمل اس عزت افزائی پر قل، قل ہنسنے لگی تھی۔ ذی شاہ بری طرح بھنّا گیا۔ اس نے قلم چلانا ترک کر کے ایمل کو گھورا تھا۔

''اسے انگریزی کی سمجھ نہیں آئی۔'' ایمل نے شکستہ انگلش اور شُستہ پنجابی میں اسے سمجھایا تھا۔ تب ذی شاہ پھر سے اسٹیشنر کو گھور کر رہ گیا تھا۔ اب کہ ایمل شاپ کیپر کو مخاطب کر رہی تھی۔

''از ت داس پوستا مت مورگن اوفن......؟'' ایمل نے آج کے بجائے کل ڈاک خانے کے کھلے ہونے کی تصدیق کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈاک خانہ

آج اس وقت تک بند ہو گیا ہوگا مگر شاپ کیپر نے بتایا پوسٹ آفس آج بھی کھلا ہے۔ وہ دونوں دانکے شون (شکریہ) بولتے باہر نکل آئے تھے۔ اب انہوں نے قریبی پوسٹ آفس سے لفافوں اور ایروگراموں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے ٹکٹ خریدے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لفافے میں چکنی سلپ پر لکھی کوئی تحریر ڈال کر ”ویئر از دی پوسٹ بکس......؟“ پوچھتا ایک کونے کی طرف چلا گیا تھا۔ خط پوسٹ کر کے اب وہ دونوں واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔

”تم نے خط کسے بھیجا......؟“ ایمل نے اپنی بے چین فطرت کے باعث فوراً سوال اٹھایا تھا۔ وہ کب سے بے چینی چھپائے اس کی کلوروائیاں دیکھ رہی تھی۔ اب صبر نہ ہوسکا تو فوراً پوچھنے لگی۔

”پاکستان اپنے گھر......“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ اِدھر ایمل حیران رہ گئی تھی۔

”تمہارے گھر میں ٹیلی فون نہیں......؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ذی شاہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”فون ہے......“ ذی شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور انٹرنیٹ......؟“ ایک اور حیرانی بھرا سوال۔

”انٹرنیٹ بھی ہے......“ وہ اس کی بے چینی کو سمجھ رہا تھا تبھی خط اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم فون پر بات کر لیتے یا اسکائپ پر......“ ایمل نے منہ پھلا کر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اس تیز رفتار انٹرنیٹ دور میں ایک ماڈرن لڑکے کا خط لکھنا اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی اس کی سمجھ خاصی کمزور تھی۔

”تم نہیں سمجھو گی......“ ذی شاہ نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ وہ پھر سے منہ پھلا گئی۔ اسے بات بہ بات روٹھنے کی بھی بیماری تھی۔ اسے ناراض دیکھ کر وہ پچکارنے لگا تھا پھر ایک آئس کریم کارنر کو دیکھ کر جھٹ سے بولا۔

”کون کھاؤ گی......؟“ وہ اسے لالچ دے رہا تھا مگر ایمل نے فوراً انکار کر دیا...... وہ کچھ موڈی سی تھی اور جب موڈ میں آ کر کسی بات پر انکار کرتے ہوئے

رہن دیوہ...... (رہنے دو) بولتی تو بہت ہی کیوٹ لگتی۔ اب بھی اس نے منہ بنا کر انکار کر دیا تھا۔

”رہن دیوہ“ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی گھر کے اندر گھس گئی تھی جبکہ ذی شاہ کے قدموں کی رفتار خود بخود سست ہوگئی۔ ویلس ہاؤس اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ذی شاہ سے آگے جایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ رک سا گیا، گویا تھم گیا ہو۔

”کیا اسے منکشے کی خیریت معلوم کرنے جانا چاہیے......؟“ دل اور دماغ کی دلیلوں اور جوازوں کے درمیان وہ متذبذب کھڑا تھا۔ آگے بڑھے یا پیچھے پلٹ جائے؟ آگے جانا مناسب تھا یا واپسی میں عافیت تھی؟ وہ الجھتا رہا، سوچتا رہا، بہت دیر کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کے بعد وہ واپس پلٹ کر گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جذبات پہ سوچ حاوی ہوگئی تھی۔

وہ کس طرح بنا کسی جان پہچان کے منکشے کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا؟ محض کل کی مختصر رفاقت کے بل بوتے پر اتنی بے تکلفی یورپ میں اسے بھاری نقصان سے دو چار بھی کر سکتی تھی؟ کیا خبر منکشے اسے دیکھ کر پہچاننے سے انکار کر دیتی؟ یا پھر برا بھلا کہنے لگتی، زیادہ ہی میٹر گھومتا تو پولیس کو بلوا لیتی...... تب وہ منکشے کی طرف سے ملنے والے جھٹکے سے کیسے سنبھلے گا......؟ وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ منکشے کو اپنے دل میں بہت اعلیٰ مقام دے چکا تھا۔ شاید وہ اس سے یک طرفہ محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ اور بات تھی اس محبت کا اعتراف کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ مگر دل کی بدلتی کیفیت اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ یہاں محبتیں کرنے تو نہیں آیا تھا، نہ دل پرایا کرنے آیا تھا پھر اس کے ساتھ آخر کیا ہو رہا تھا؟

وہ عجیب کشمکش میں مبتلا بالوں میں انگلیاں پھیرتا لاؤنج میں آیا تو سامنے ہی ایمل صوفے پر چڑھی اپنی باربی کو سینے سے چمٹائے دکھائی دی تھی۔ اس کا موڈ پہلے سے بہت بہتر لگ رہا تھا تبھی ذرا چہک کر بولی تھی۔

”وہاں کیوں رک گئے تھے...... ویلس ہاؤس کے سامنے؟“ اس نے بڑے عجیب لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ ذرا ٹھٹک گیا۔

اسے امید نہیں تھی، ایمل اندر کسی جھری میں سے اسے باہر کھڑا دیکھ رہی تھی اور نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ بہت غور بھی کر چکی تھی۔ تبھی بڑے حیران کن تاثرات سجائے بیٹھی تھی۔

”نہیں تو......“ ذی شاہ نے ہڑبڑا کر جھوٹ بولا۔

”رہن دیوہ...... جھوٹ نہ بولو، میں نے خود دیکھا ہے۔“ وہ پھر سے چہک کر بولی تھی۔

”کہاں سے؟“ ذی شاہ نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

”اس ونڈو سے“ ایمل نے سفید نائیلون کے جالی دار مہین پردے کی طرف اشارہ کیا تھا جو اس وقت ہک میں اُڑسا ہوا تھا جس کی وجہ سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ذی شاہ بھویں اچکا کر رہ گیا۔

”میں تو ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔“ اس سے بات نہیں بن پائی تھی، اتنی سی بالشت بھر کی بچی نے اسے گھما ڈالا تھا۔

”رہن دیوہ (رہنے دو) ایسے ہی تو بلاوجہ کچھ سوچا نہیں جاتا۔“ وہ اس کے بہلاوے میں نہیں آئی تھی۔ خاصی افلاطونی بچی تھی۔ عمر کے لحاظ سے کم تاہم قد میں اتنی بانس جتنی لمبی......

”مگر میں تو بلاوجہ ہی کھڑا سوچ رہا تھا۔“ ذی شاہ کھسیا گیا۔

”ویلس ہاؤس کو دیکھ کر......؟“ وہ پھر سے چہکی...... ”کسی اور چیز کو دیکھ کر سوچ لیتے، سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ویلس ہاؤس کے داخلی دروازے پر نگاہ جما کر سوچنے سے کیا اچھی، اچھی باتیں ذہن میں آتی ہیں؟ اگر یہ کوئی میجک ہے تو اسے میں بھی آزمالوں گی۔“ ایمل کی بچی نے اس کی درگت بنا ڈالی تھی۔ بہت تیز اور حاضر دماغ لگتی تھی۔ ذی شاہ سر دُھن کر رہ گیا۔

”یہ واقعی میجک ہے...... تم بھی آزما لینا......“ وہ شرارتی انداز میں بولا تھا تب اس کے اگلے الفاظ اس کی ساری شرارت کو ہوا کر گئے تھے۔

”میں کوئی پاگل ہوں جو ویلس ہاؤس کو دیکھ کر سوچوں گی۔ پھر تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔“ ایمل ساری طراری بھلائے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ عجیب سا ہراس اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگا تھا۔

”کیوں بھلا......؟“ وہ حیران ہوا تھا...... تب ایمل جیسے گڑبڑا گئی تھی۔ گویا زیادہ بولنے کے نقصان سے دوچار ہوگئی۔ ذی شاہ کو یوں لگا تھا جیسے وہ کچھ بتاتے، بتاتے چھپا گئی تھی۔

”ایسے ہی......“ اس نے ذی شاہ کے انداز میں ہی جواب لوٹا دیا تھا۔ بالکل اسی کے اسٹائل میں کندھے اچکا کر...... پھر باربی پھینک کر کچن کی طرف بھاگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بلینڈر چلنے کی آواز آئی۔ شاید وہ شیک بنا رہی تھی۔ چند منٹ تک بلینڈر چلتا رہا تھا پھر آواز آنا بند ہوگئی۔ وہ سوچتی نظروں سے اوپن کچن میں کام کرتی ایمل کو دیکھتا رہا۔ وہ جیسے اس کے متوقع سوالات سے بچنے کی غرض سے بھاگ گئی تھی۔ شیک کا تو بہانہ تھا...... کچھ دیر مزید کچن میں رکنے کے بعد وہ ٹھنڈا ٹھار شیک کانچ کے پتلے اور انتہائی لمبے اسٹرا جتنے گلاسوں میں بھر کے لے آئی تھی۔ یہ اسٹرا جتنے لمبے اور پائپ جتنے موٹے بلوریں گلاس اپنی ساخت کے لحاظ سے خاصے پُرکشش لگتے تھے۔ ایمل نے ایک گلاس اسے پکڑا دیا تھا، دوسرا گلاس خود پکڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں بھوک تو نہیں لگی......؟“ ایمل نے بڑے، بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر انکار کیا تھا...... تب وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ آج ایمل کی موتر کہیں گئی ہوئی تھیں۔ لنچ کی ذمے داری ایمل پر تھی شاید تبھی وہ متفکر سی پوچھ رہی تھی۔

”نہیں...... یہ گینزرنگ (شیک) ہی کافی ہے......“ ذی شاہ نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے معصوم ایمل کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”اگر بھوک لگی تو بتا دینا، میں کھانا گرم

کردوں گی۔ ممی سب بنا کر گئی ہیں۔" اس نے بہت بے نیازی سے جواب دیا تھا۔ تب وہ چونک سا گیا۔

"آنٹی کہاں گئی ہیں؟" وہ متفکر سا بولا۔

"افریشم کی طرف ...... اس کی طبیعت خراب تھی۔" ایمل نے بیزاری سے بتایا۔ اسے افریشم سے بہت شکوے تھے، ایک تو وہ شادی کر کے اسے چھوڑ گئی تھی اور دوسرے ممی کو بھی آئے دن بلاوا بھیج دیتی تھی۔ اب اگر ذی شاہ نہ ہوتا تو اس نے قیامت اٹھا لینی تھی کیونکہ وہ اکیلے کبھی گھر میں نہیں رہتی تھی۔

"کیا ہوا افریشم کو......؟" ذی شاہ نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔ یہ وہی افریشم تھی جس نے ایک خوب صورت کارڈ پہ اسے من ہائیم میں ویلکم بولا تھا۔ وہ کارڈ ابھی تک گیسٹ روم کے دروازے پر چسپاں تھا۔

"پتا نہیں......" ایمل کی بیزاری عروج پر تھی۔ اس نے گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا تھا پھر ایمل کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کچھ بتا رہی تھیں۔" وہ سلسلۂ کلام دوبارہ سے جوڑنا چاہتا تھا جہاں سے ایمل توڑ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

"کیا......؟" اب وہ ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں بے پروائی محسوس کر کے ذی شاہ نے جتایا تھا۔

" ویس ہاؤس کے بارے میں......" وہ سنجیدگی سے بولا تھا تب ایمل ٹھٹک گئی۔

"یہ ویس ہاؤس تمہارے حواسوں پر سوار کیوں ہو چکا ہے؟" ایمل چمک کر بولی تھی۔ اس کے الفاظ نے ذی شاہ کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ کس قدر تیز لڑکی تھی، اگر اپنے منہ سے اپنی عمر نہ بتاتی تو وہ اسے اٹھارہ، انیس کی تو لازمی سمجھ لیتا۔ اب بھی اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتی تھی۔ ذی شاہ "اُف اُف" کر اٹھا۔

"ایسی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"تو پھر کیسی بات ہے؟" ایمل صاحبہ اس پر جیسے تھانیدارنی لگ گئی تھیں۔ وہ پھر سے ہڑبڑایا۔

"میں ایسے ہی انفو کے لیے پوچھ رہا ہوں۔" اسے یہ مشکل بات کا ٹکڑا وضاحت کے لیے مل ہی گیا تھا وہ کچھ شانت ہو گیا۔

"اچھا......" ایمل کو کچھ مایوسی ہوئی۔ یعنی صرف انفارمیشن کی ضرورت تھی مقابل کو...... اندر سے معاملہ گڑبڑ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے بہنوئی اور بہن جیسی رومینٹک تازہ ترین لو اسٹوری کا چکر سمجھ رہی تھی...... مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا، وہ سخت بدمزہ ہوئی تھی۔

"بتاؤ ناں......؟" ذی شاہ نے بے چینی سے کہا...... وہ منکشے کے بارے میں کچھ تفصیل جاننا چاہتا تھا، اس کی فیملی اور گھر بار کے متعلق...... اس کی تعلیم، خوبیاں، قابلیت...... آخر یہ لوگ کچھ نہ کچھ تو منکشے کے بارے میں جانتے ہوں گے؟ آنا جانا نہ سہی، وہ کچھ تو منکشے کے اوقات کار، مزاج، گفتار اور رہن سہن کے متعلق جانتے ہوں گے، آخر وہ ان کے سامنے تو رہتی تھی۔

اگرچہ یہ خیال ناقص ہی تھا۔ بھلا یورپ میں کون، کسی کی خبر گیری کرتا ہے مگر اسے قوی امید تھی ایمل جیسی متجسس طبیعت لڑکی ضرور دوسروں کی ٹوہ میں رہتی ہو گی...... اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ ذرا پُرجوش، ذرا خوف زدہ اور تھوڑی سی گھبرا کر اسے رازدارانہ لہجے میں بتانے لگی تھی۔

"تم ویس ہاؤس کی زیادہ بات مت کیا کرو، میری ممی اور بھائی کو پسند نہیں۔" وہ صوفے کی گدازیت میں انگلیاں کھبائے آنکھیں میچے ذرا سہمے، سہمے لہجے میں بولی تھی یوں کہ ذی شاہ قدرے متحیر رہ گیا تھا۔

"مگر کیوں......؟" وہ بھی ایمل کے سے انداز میں سرگوشیانہ بولا تھا...... تب ایمل نے بھینچی بھینچی، بھینچی آواز میں گھبرا کر بتایا۔

"ویس ہاؤس میں مرڈر ہو گیا تھا۔ تب سے میری ممی اور بھائی کو ویس ہاؤس کا ذکر برا لگتا ہے۔" ایمل نے بالآخر اس کے سر پر دھماکا کر ہی دیا تھا...... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تب اچانک کوئی لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا پھر کسی نے چیتے کی سی تیزی سے ایمل کی طرف جا کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا تھا۔ ماحول میں زناٹے دار

تھپڑ کی گونج لہرا گئی تھی۔ جیسے پورا عالم لمحے بھر کے لیے شائیں، شائیں کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"چٹاخ......" ایمل کے منہ پر بڑے زور کا تھپڑ پڑا تھا۔ وہ اتنی بری طرح سے چیخی تھی کہ ذی شاہ بھی گھبرا اٹھا تھا۔ تھپڑ مارنے والی کوئی اور نہیں ایمل کی ممی تھیں جو خونخوار نظروں سے تھر تھر کانپتی، ایمل کو گھور رہی تھیں۔ آخر ہوا کیا تھا؟ انہیں اتنا غصہ کیوں آیا؟ ایمل نے اسے بتا کر کون سا گناہ کر دیا تھا؟ وہ جیسے ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"زبان نہیں رکتی اس کی......" آنٹی آگ بگولا ہو رہی تھیں...... ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ایمل کی پتلی سی انتہائی گوری گردن دبوچ ڈالتیں یا اسے مار، مار کر لہولہان کر دیتیں...... صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ذی شاہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کیسا رویہ دکھائے...... وہ خاموش رہے یا ایمل کی حمایت میں کچھ بولے۔

"وہاٹ ہیپنڈ......؟" اس نے حیرت و بے یقینی سے کانپتی لرزتی ایمل کو دیکھتے ہوئے آنٹی سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی تک ایمل کو گھورنے میں مصروف تھیں تبھی اس کی طرف توجہ نہیں کر سکی تھیں۔ اور ایمل ہاتھوں میں چہرہ چھپائے (اومعافی چاہتی ہوں) جیسے الفاظ بول کر شاید آنٹی کو رام کرنا چاہتی تھی...... مگر آنٹی کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے......" ایمل نے سر جھکا کر کہا تھا جیسے وہ ذی شاہ کو ویس ہاؤس میں مرڈر ہو جانے کا بتا کر سخت پشیمان تھی۔ یقیناً آنٹی کا خوف اسے ہراساں کر رہا تھا۔ وہ ان کے غصے پر زیادہ گھبرا رہی تھی۔ آنٹی کا اتنا شدید ردِعمل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ جبکہ وہ ایمل کی پشیمانی پر سخت طنزیہ انداز میں بات کر رہی تھیں گویا ان کے نزدیک ایمل کا شرمندہ ہونا محض اداکاری تھی۔

"واقعی ہے" انہوں نے غضبناک تیوروں سے اسے دیکھا تھا، گویا پس پردہ کہہ رہی تھیں کیا واقعی تمہیں افسوس ہے۔ صورتِ حال بہت کشیدہ تھی، ماحول کثیف تھا، فضا اداس تھی، ذی شاہ کا دل بھی بہت بوجھل ہونے لگا تھا۔ ایمل کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے، وہی عورت کے آنسو نہ دیکھ سکنے کی بیماری...... پھر ایمل تو اس کی چھوٹی سی فرینڈ تھی اور محض اس کے اصرار پر جو کچھ بتا چکی تھی اب اس کا خمیازہ بھگت رہی تھی...... وہ ہائی اسکول میں جانے والی تھی مگر آنٹی اسے بچوں کی طرح پیٹ ڈالتی تھیں، یہ عمل درست نہیں تھا، خیر پیرنٹس کو غصہ آ بھی سکتا تھا مگر یوں...... ایک جرمن ماں کا یورپین کنٹری میں اولاد پر ہاتھ اٹھانا۔ پھر اولاد کا چپ چاپ تھپڑ سہہ جانا، پولیس کی دھمکی کے بغیر یہ ایک قابلِ ستائش عمل تھا، یقیناً ایمل کی جرمن ممی نے ان بہن بھائی کی تربیت بہت بہترین کی تھی...... اور ان کا گھرانا عام یورپین فیملیز سے ہٹ کر بہت مختلف تھا۔

آنٹی نے ایمل کو اندر بھیج دیا تھا، اب وہ خود کو کچھ نارمل کرتی ذی شاہ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کھڑا دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"وڈیو لائک ٹو ڈرنک سم تھنگ......؟" وہ بھی ایمل کی طرح تھوڑی بہت انگریزی بول لیتی تھیں۔ یقیناً انہیں اب خیال آیا کہ وہ ان کا مہمان ہے، سو وہ آدابِ میزبانی کے ساتھ زیرِ لب بڑبڑاتی کچن کی طرف جانے لگی تھیں جب ذی شاہ نے انہیں روک دیا تھا۔

"شکریہ آنٹی...... میں ایمل کے بنائے شیک سے لطف اندوز ہو چکا ہوں۔" اس نے شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا، بہر حال ایمل کی تکلیف ایک طرف، آنٹی کے احترام میں وہ کوئی کمی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دوست افراہیم کی والدہ تھیں اور ذی شاہ بھی انہیں اپنی ماں جیسا درجہ دیتا تھا۔

"آں...... کیا ایمل نے بنایا؟" آنٹی کچن میں جھانکتی حیران ہوئی تھیں پھر اُن کے چہرے پر نرمی سی اتر آئی۔

"ایمل تھوڑی سگھڑ ہے۔ آہستہ، آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔" کچھ دیر پہلے کی بدمزگی کو بھلائے انہوں نے بڑے پیار سے ذی شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم چاہو تو ٹی وی دیکھ لو۔ یا آرام کر لو...... تب

تک میں گرما گرم پزا بیک کر کے لے آتی ہوں، ایمل کو بھی بہت پسند ہے۔" وہ اب بڑی حلیم ماں دکھائی دے رہی تھیں جسے بس اپنی خفا بیٹی کی ناراضی کو ختم کرنا تھا۔ اس کی پسندیدہ ڈشز بنا کر، ممتا کا یہ مٹھاس بھرا پہلو ذی شاہ کو ستائش میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھنے کا آرام کرنے کے بجائے آنٹی کے پاس کچن میں ہی کھڑا دنیا جہاں کی باتیں کرنے لگا پھر باتوں کے دوران ہی آنٹی نے خود بخود ویلس ہاؤس کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ حالانکہ ذی شاہ نے بہت چاہ کر بھی کسی دلچسپی یا تجسس کے تحت ایمل کو مارے جانے والے تھپڑ کا پس منظر نہیں پوچھا تھا۔ آنٹی نے خود ہی بتا دیا تھا اور دوسرے معنوں میں جیسے یہ وضاحت کرنے کی کوشش میں ذی شاہ یہ جتایا تھا کہ آئندہ اس گھر میں دوبارہ ویلس ہاؤس کا ذکر نہیں ہوگا۔

"وہ سامنے والے گھر میں مرڈر ہوا تھا...... بہت عرصے یہاں پولیس آتی رہی، ہماری بھی شامت آئی رہی، ہر دفعہ کوئی نہ کوئی آفیسر ہماری طرف بھی انویسٹی گیشن کے لیے آجاتا تھا۔ وہ گھر ہمارے لیے صرف ڈپریشن بن گیا۔ پھر پولیس نے گھر سیل کر دیا...... کچھ مہینوں بعد شاید اصل وارثوں نے معاملہ رفع دفع کیا...... گھر پر کرائے دار آنے لگے، ہاؤس فار رینٹ کی تختی لگ گئی تھی مگر کوئی بھی کرائے دار یہاں ٹکا نہیں...... آئے اور پھر چلے گئے۔ ایک سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا پھر یہ گھر بند ہو گیا۔" وہ پزا بنانے کی ابتدائی تیاری کرتے ہوئے خاصی مصروف نظر آ رہی تھیں۔ تب پہلی مرتبہ ذی شاہ نے کچھ چونک کر ان سے سوال کیا تھا۔

"اور اب سامنے والے گھر میں کون رہتا ہے؟" اس کے لہجے میں واضح بے چینی اور تجسس تھا، وہ اندر کی بے قراری چھپانے میں قطعاً ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا...... شاید کوئی نیا کرائے دار یا مالک مکان میں سے کوئی ہوگا۔" ان کا لہجہ سپاٹ سا تھا، گویا وہ جانتی بھی تھیں تب بھی سامنے والے میں دلچسپی لینا نہیں چاہتی تھیں اور نہ مزید اس گھر پر بحث کرنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ انہوں نے ذی شاہ سے ذکر بھی اسی لیے کر دیا تھا کہ وہ تجسس نہ رکھے۔

"ہمارے گھر میں ویلس ہاؤس کا ذکر نہیں ہوتا...... افراہیم نے سختی سے منع کر رکھا ہے، دراصل ہم لوگوں نے اس مرڈر کی وجہ سے بہت پریشانی اٹھائی ہے، بہت تفتیش بھگتی ہے، ایک عرصہ ذہنی اذیت کا شکار رہے تھے...... اب اللہ کا شکر ہے ہر طرف سکون ہو گیا۔" انہوں نے کام کے دوران ہی پائن ایپل کاٹا، اس کے ٹکڑے کیے۔ پھر آڑو اور اسٹرابیری کے پیس کر کے باؤل اور فوک ذی شاہ کو تھما دیا تھا۔ ان کے خیال میں شاید اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔ مگر ذی شاہ کو ہرگز بھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کچھ متحیر سا انہیں سن رہا تھا۔

"اور اب جو ویلس ہاؤس میں کرائے دار رہتے ہیں، آپ کی ان سے جان پہچان نہیں؟" اس کا سوال احمقانہ قسم کا تھا، یہاں کوئی قریب ہی تڑپ، تڑپ کر مر جاتا تب بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ پڑوس میں کون رہتا ہے؟ کتنے لوگ ہیں؟ کوئی ہے بھی یا نہیں؟ سال گزر جاتے مگر کسی کو پتا نہیں چلتا...... اور وہ اتنا مشرقی ٹائپ کا ایک مغربی ملک میں کھڑا ہو کر ایک مغربی خاتون سے سوال کر رہا تھا۔ یہ اس کا پاکستان تو تھا نہیں...... جہاں ایک محلے میں کوئی چھینک بھی مارتا تب آواز اور ٹوہ میں اگلی چھ گلیوں کے لوگ دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو جاتے...... بھلا اتنی مصروف سی افراہیم کی ممی کو کیا خبر سامنے یا دائیں، بائیں کون لوگ رہتے ہیں...... اور ان کا تعلق کہاں، کہاں سے ہے؟ ایسی کھوج پاکستانی گھرانوں میں ہوتی ہے، بھلا یہاں اس کھوج کا تصور کیا جا سکتا تھا؟

"شاید کوئی لڑکی ہے دیوانی سی...... مجھے کچھ معلوم نہیں...... اور تم بھی احتیاط برتنا......" جانے کس رو میں انہوں نے اسے بھی محتاط رہنے کا کہہ دیا تھا۔ بھلا اسے ویلس ہاؤس کے خبطی آئٹم سے کیا خدشہ ہو سکتا تھا؟ کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا؟ وہ سر جھٹک کر باؤل اٹھائے باہر نکل آیا...... کچھ دیر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر وہ بور ہونے کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں

آ گیا تھا...... وہی خوب صورت دودھیا دیواروں والا کمرا جیسے اس کا منتظر کھڑا تھا...... بے داغ، سفید بستر، جالی کے پردے، پھولوں سے لدی ٹوکریاں اور میز پر رکھا اس کا سیمسونائٹ کیس جس کے اوپر ننھی سی سلپ پڑی تھی، وہ عجلت میں چلتا ہوا کیس کے قریب آیا تھا جس کے اوپر کاغذ کا چکنا پیس پڑا تھا۔

"ممی کو تو عادت ہے، ان کو ایسے ہی سامنے والی پر غصہ آ جاتا ہے، میں ذرا بھی ناراض نہیں...... تم کیوں چھپ کر کمرے میں بیٹھ گئے...... باہر آ جاؤ ناں...... گیم کھیلتے ہیں۔" تحریر پڑھتے ہوئے ذی شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اسے ایمل کی معصومیت پر پیار سا آ گیا...... شاید وہ سمجھ رہی تھی، ذی شاہ گلٹی فیل کر رہا ہے اور یہ بات ٹھیک بھی تھی، وہ شرمسار تھا نہ سامنے والی کے بارے میں متجسس ہوتا نہ ایمل کو تھپڑ پڑتا...... خیر، سامنے والی میں کوئی تو ایسی بات تھی جو یہاں کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ یقیناً اس میں کچھ بری عادتیں ہوں گی، اس کے بوائے فرینڈز ہوں گے، سگریٹ یا شراب پیتی ہوگی؟ یا کچھ بھی جو اس معاشرے کے ناسور جیسے بدفعل میں شامل تھے، جنہیں افراہیم کی تہذیب یافتہ نیک طبیعت ممی ناپسند کرتی تھیں...... اس کے علاوہ ذی شاہ کا ذہن کچھ اور آگے جا نہیں سکا تھا۔ وہ بس یہیں تک سوچ کر رہ گیا...... اور اگر یہ سب خوبیاں منکشے میں بدرجۂ اتم موجود ہوئیں تب وہ کیا کرے گا؟ اس سوچ نے ذی شاہ کے اندر تلاطم برپا کر دیا تھا۔ دل کو جیسے کسی نے کانٹوں پر گھسیٹ دیا تھا، وہ شدتِ ضبط سے سرخ پڑنے لگا۔ ماتھے پر پسینہ اترنے لگا تھا اور دل کی حالت بہت شکستہ تھی تب جیسے اس نے ٹوٹ، ٹوٹ کر جڑتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا۔

"میں اتنا آگے تک چلا گیا ہوں...... بھلا کیسے؟ کس طرح؟" اس سوال نے ذی شاہ کو دم بخود کر دیا تھا۔ وہ جیسے خود سے نگاہ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

کیا وہ اتنا سفر کر کے یہاں آتے اور علی عیسیٰ کو ڈھونڈ کر سزا دینے والا عظیم ترین مقصد بھول گیا تھا؟ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ وہ یہ مقصد کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں، بس زندگی کی رہ گزر پر چلتے، چلتے اسے اپنا گوہرِ مقصود بھی جیسے مل گیا تھا اور اب منکشے کے علاوہ کوئی نگاہ میں جچ جاتی یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ دل تھا، کوئی دغاباز کرائے کا گھر اور کرائے دار تو تھا نہیں...... نہ مکین بدل سکتا تھا نہ مکان......

وہ تو اس پاگل، پاگل لڑکی کو یہ تک نہیں کہہ سکا تھا، تم آئی، تم نے دیکھا اور مجھ ذی شاہ کو فتح کر لیا...... کیسی فاتحِ عالم ہو...... تم...... بغیر کوشش اور جتن کیے فتح کر لیتی ہو...... مگر کیا اس خبطی، خبطی لڑکی نے کوشش نہیں کی تھی؟

سفید جالی دار مہین پردے کو دیکھتے ہوئے وہ چلتا، چلتا گلاس ونڈو میں آ کھڑا ہوا تھا...... سلائڈ ہٹائے بغیر اس نے ویلس ہاؤس کی عمارت کو دیکھا تھا۔ منکشے سامنے کہیں نہیں تھی اور اس کے بغیر جیسے ہر حسین منظر ادھورا تھا۔ کوئی بھی چیز قابلِ توجہ نہیں تھی۔ کچھ بھی نظر کو بھانے والا نہیں تھا...... کسی منظر میں اداس کونج کے حسن جیسا سحر نہیں تھا۔ رِستے خون آلود پیر والی اجنبی سی لڑکی ذی شاہ کے دل پر کیسا وار کر گئی تھی؟ یہ کون سا میٹھا درد جگا گئی تھی۔ وہ بے بس سا بستر پر ڈھے گیا تھا۔

جانے پھر کتنا وقت گزر گیا تھا، کمرے میں آہٹ ہوئی تو وہ چونکا تھا۔ افراہیم کی ممی اسے بلانے کے لیے، نیچے آنے کا کہہ کر واپس چلی گئی تھیں۔ لنچ یقیناً تیار تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی پھر بھی اخلاقاً نیچے چلا آیا، کھانے کی میز پر ایمل سے سامنا ہو ہی گیا تھا۔ وہ بڑی خوش باش سی بیٹھی تھی، کمرے میں گرما گرم پزا کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور وہ محترمہ دانت نکال، نکال کر پزا کے بڑے، بڑے ٹکڑے املی کی چٹنی میں بھگو، بھگو کر کھا رہی تھی، کچھ دیر پہلے والا غصہ ناراضی اور خفگی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بچوں کی ناراضی، خفگی اور غصے کی مدت بس اتنی سی ہوتی ہے؟ ذرا اسے لاڈ، پیار اور پچکار سے پہلے کی طرح سب بھلا کر ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں، بچے جو من کے سچے ہوتے ہیں...... نیت کے صاف، من کے

صاف، مخلص اور ایماندار...... وہ پزا سے لطف اندوز ہوتا مسلسل ایمل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ممی کرتی کچھ زیادہ ہی لاڈ کے موڈ میں نظر آ رہی تھی، کچھ دیر بعد وہ اس کے کان میں دوبارہ گھس گئی تھی۔

”وہ خبطی آئٹم روڈ پر بیٹھا تھا۔“ ایمل نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا...... وہ افراہیم کی طرح منکشے کو خبطی آئٹم ہی کہتی تھی جانے اس نے کب افراہیم کو خبطی آئٹم کہتے سن لیا تھا۔ اب منکشے کے بارے میں سن کر وہ قدرے چونک گیا تھا۔ یہ ایمل بھلا کیا کہہ رہی تھی؟

”وہ روڈ پر کیوں بیٹھی تھی؟“ اس نے فورک میں پھنسایا پزا واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا، کھانے سے جی ایک دم اچاٹ ہو گیا۔

”یہ تو پتا نہیں...... اس کی عادت ہے سڑک کے چکر کاٹنا......“ ایمل نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

”وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گی؟“ ذی شاہ متفکر سا خود کلامی کر رہا تھا۔ وہ اتنے گھنٹوں سے لاپتا تھی۔ یعنی کہیں بھی آس پاس نظر نہیں آ رہی تھی، وہ یہی سمجھ رہا تھا، اس کے پیر کا زخم اسے باہر آنے نہیں دے رہا تھا مگر اب ایمل بتا رہی تھی اس نے منکشے کو روڈ پر بیٹھا دیکھا تھا۔ جانے وہ روڈ پر کیوں آئی تھی؟ اس کے پیر کا زخم کیسا تھا؟ وہ بے قرار سا ہو گیا۔ ایک دم دل میں خواہش ابھری تھی کہ وہ ساری احتیاطیں بھلائے بھاگ کر روڈ کراس کرے اور سامنے والے ویلس ہاؤس کا دروازہ بجا ڈالے، وہ منکشے کی خیریت جاننا چاہتا تھا۔ وہ اسے روڈ پر بیٹھی نظر کیوں نہیں آئی تھی؟ حالانکہ اس نے کئی مرتبہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تھا مگر وہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی جبکہ ایمل کو وہ دکھائی دی تھی۔

”اس کے پیر پہ بینڈیج تھی، وہ زمین پر رینگ کے چل رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا۔“ ایمل نے پلیٹ میں رکھا پزا ختم کر دیا تھا، اب وہ اسپون کے ساتھ سوپ کے انداز میں املی کی چٹنی کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا۔

”اگر ممی مجھے تھپڑ نہ مارتیں یا افراہیم کا ڈر نہ ہوتا تب میں اس کو روڈ تو لازمی کراس کروا دیتی۔ وہ قابلِ رحم حالت میں کسی کیڑے کے مانند زمین پر رینگ رہی تھی۔ اس کے پیر کا زخم اسے کھڑا ہونے نہیں دے رہا تھا۔“ ایمل نے کچھ جذباتی سے انداز میں کہا تھا پھر وہ نیپکن سے منہ صاف کر کے گیم کھیلنے چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ذی شاہ کو بھی گیم کھیلنے کی دعوت دی تھی مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس کا دل جیسے ہر چیز سے ایک دم اچاٹ ہو گیا۔

”کیا وہ اتنی بے بسی کی حالت میں ہے؟ اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا؟“ اس کے ذہن میں آنے والی بس آخری سوچ یہی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں لیپ ٹاپ کی روشنی کے علاوہ مکمل اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے میں دروازے پر لگا چمکیلا کارڈ جس پر ویلکو مین اِن من ہائیم لکھا چمک رہا تھا۔ اس چمکیلے کارڈ کو بنانے والی خاتون سے ابھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ویسے بھی اسے غیر متعلقہ لوگوں سے ملاقات کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ بس افراہیم کی فیملی کے حوالے سے یہ سب اس کے لیے قابلِ محترم تھے۔

وہ ابھی کچھ دیر پہلے بندیا اور شامی سے بات کر رہا تھا۔ بندیا نے اسے بتایا تھا آج عینی اپنے نئے گھر کی آرائش وزیبائش کے بعد پارٹی دے رہی تھی جس میں انہیں نہیں بلایا گیا تھا۔ ممی کو اس بات کا بہت دکھ تھا جبکہ بندیا نے بانگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ عینی انہیں بلاتی بھی تب بھی وہ ممی کو ہرگز نہ جانے دیتے۔ شامی کو ذیشان کی بے حسی پر بہت تاؤ آ رہا تھا۔ تاہم ذی شاہ کے سمجھانے بجھانے پر وہ نرم ہونے لگا۔ وہ لوگ خود بھی ذیشان سے تعلقات بحال رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی نازک موڑ پر انہیں چھوڑ کر چلا جاتا۔ یہ اس کی آخری اعلیٰ ترین خود غرضی کی مثال نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ بہت عظیم مثالیں قائم کر چکا تھا...... سو

اب نئے سرے سے بھلا کیا کڑھنا......؟

ذی شاہ کا پہلے سے بوجھل دل کچھ اور اوب گیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور خود کھڑکی کی سلائڈ ہٹا کر باہر جھانکنے لگا۔ من ہائیم اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ رات کی رانی کا سحر طاری تھا ماحول پر مہیب سناٹا، فضا میں دور جنگل کے جانوروں کی آہ و بکا جبکہ ہوا میں کچھ تندی تھی، درخت بڑے زور، زور سے ہل رہے تھے، سامنے ویلس ہاؤس کی عمارت اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ بس ایک کمرے کی لائٹ آن تھی۔ نچلی منزل کا کارنر والا کمرا جس کی کھڑکی کے سامنے ایک طرف جرمنی کے کلچر کو ابھارتا سفید جالی دار نائیلون کا مہین پردہ پڑا تھا اور دوسری طرف گاڑھی سلک کا پھولدار پردہ لٹک رہا تھا۔ جالی دار پردے سے کمرے کا کچھ منظر نظر آتا تھا، ایک سنگل بیڈ، جس کی شیٹ سلوٹ زدہ ضرور ہو گی۔ کیونکہ شیٹ میں بھی بے ترتیبی نمایاں تھی۔ شاید فرش پر لٹک رہی تھی، باقی کمرے کے کیا حالت ہو گی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا...... سامنے ہی ایک اسٹول نما اونچی میز پر گندے برتن رکھے تھے۔ کچھ مگ، پیالیاں، چمچے اور گندی پلیٹیں...... اس کے پاس کوئی دوربین نہیں تھی۔ وہ ایمل سے مانگ بھی سکتا تھا مگر اسے دوربین کی ضرورت نہیں تھی۔ کارنر والا کمرا سڑک کے دوسرے کنارے پر تھا، فاصلہ زیادہ تھا نہ کم تھا۔ تاہم اس سے وہ بہ آسانی کھڑکی کے اندر کا نظارہ کر سکتا تھا۔ آج سے پہلے اس کمرے کی لائٹ آن نظر نہیں آتی تھی۔ کمرا اندھیرے میں ڈوبا رہتا۔ کمرے کی مکین نے آج ہی تمام لائٹس روشن کی تھیں۔ وہ بہت دیر وہیں کھڑا رہا تھا مگر کوئی چہل پہل ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی، تنگ آ کر اس نے پردے برابر کر دیے تھے، سلائڈ گرا دی تھی۔ پھر وہ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ کمرے کا شفاف خوابناک اور آرام دہ ماحول اتنا پُرسکون کر دینے والا تھا کہ فوراً ہی نیند آنکھوں میں رچنے لگی تھی مگر فی الحال وہ سونا نہیں چاہتا تھا، بس علی عیسیٰ کو سوچنا چاہتا تھا، ہاتھوں کو سر کی پچھلی طرف باندھے وہ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں میں علی عیسیٰ کے کئی طرح اور کئی رنگ کے عکس ابھر رہے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں ڈیڈی کے تعریفی الفاظ کے پیشِ نظر ایک خاکہ تشکیل دے رہا تھا۔ جس طرح ڈیڈی، علی عیسیٰ کی تعریف کرتے تھے، اس بات سے تصدیق ہو جاتی تھی کہ یقیناً وہ بہت خوب صورت، چارمنگ اور ذہین جوان تھا۔ اب اتنی حسین سرزمین کے چپے، چپے پر پھیلے حسن میں وہ علی عیسیٰ کو کیسے تلاشتا...... یہاں تو ہر دوسرا بندہ اس نے صحت مند، خوب صورت اور خوش پوشاک دیکھا تھا۔ محض خوب صورتی کو بنیاد بنا کر علی عیسیٰ کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ اسے کوئی تصویر چاہیے تھی، کوئی ویڈیو، کوئی مووی تاکہ وہ اپنا اگلا قدم احتیاط سے اٹھا لیتا۔ مالا نے اسے کوئی ٹھوس ایڈریس نہیں سمجھایا تھا ورنہ اب تک وہ علی عیسیٰ کے گھر پہنچ چکا ہوتا...... محض مفروضوں کی بنیاد پر وہ کہاں تک کامیابی پا سکتا تھا؟ اسے افراہیم کے گھر میں اس بیڈ روم کے آرام دہ بستر پر لیٹ کر اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں جانے کہاں تک آگے نکل جاتا؟ گر جو دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتی۔ ذی شاہ نے سرعت سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سامنے افراہیم کھڑا تھا۔ جو مسکراتا ہوا اندر آ رہا تھا۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں؟“ افراہیم نے ہاتھ میں دو مگ پکڑ رکھے تھے۔ یقیناً وہ ایک لمبی نشست کے لیے آیا تھا، ذی شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں تو......“ وہ اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ پکڑ چکا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے...... ورنہ میں خیال کر رہا تھا کہ تم سو نہ گئے ہو......“ افراہیم صوفے پر جم کر بیٹھ گیا تھا۔ تب ذی شاہ نے غور کیا تھا اس نے ہاتھ میں ایک فائل بھی پکڑ رکھی تھی۔

”یار مجھے افسوس ہے، تمہیں وقت نہیں دے سکا۔ اتنی ٹف روٹین ہے کہ حد نہیں۔ موئے سارا خون نچوڑ کر

گھر بھیجتے ہیں، انگ، انگ دکھ رہا ہوتا ہے۔'' افراہیم اپنی جاب سے نالاں دوست سے بھی کچھ پشیمان تھا۔ وہ اسے وقت نہیں دے پارہا تھا۔ نہ کہیں تفریح کے لیے جا پایا تھا۔ تبھی اسے بہت شرمندگی تھی۔ ذی شاہ سمجھتا تھا اسی لیے نارمل انداز میں سنجیدگی سے بولا۔

''آئی نو یار...... تم کیوں گلٹی فیل کرتے ہو...... میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا بھی تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے افراہیم کو کچھ مطمئن کردیا تھا۔ اور وہ نیکسٹ ویک اینڈ تک اپنی ساری مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر ذی شاہ کو گھمانے کا کوئی پروگرام ترتیب دینا چاہتا تھا۔

''ہم سونتاگ (سنڈے) کو ہائیڈل برگ جائیں گے، وہاں کا تاریخی قلعہ اور جرمنی کی قدیم ترین یونیورسٹی دیکھیں گے، جرمنی اتنا سرسبز ہے جیسے تمہارا سوات اور کاغان...... پورے جرمنی کا سحر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، تم جرمنی کے حسن میں ایسے پھنسو گے کہ کبھی نکل نہ پاؤ گے۔ چاہے عمریں گزریں یا صدیاں......'' افراہیم گھونٹ، گھونٹ کافی چڑھاتا اپنے جرمنی کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ تب ذی شاہ لمحے بھر کے لیے اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔

''آہ...... پھنس تو میں گیا...... کہاں گئے میرے بودے دعوے...... میں یہاں کے سحر میں مبتلا ہونے تو نہیں آیا...... اور اب پور، پور۔ گوڈے، گوڈے ڈوب چکا ہوں...... اگر افراہیم کو پتا چلے کہ وہ خبطی آئٹم میرے حواسوں پر سوار ہو چکا ہے تب یہ میرا ریکارڈ لگا دے گا۔'' ذی شاہ نے عجیب بے چارگی کے عالم میں سوچا تھا۔ جیسے اپنی بے بسی پر خود سے بھی خفا ہونے لگا تھا۔ اِدھر افراہیم جرمنی کی شان میں کلمات بول کر اب فائل کھولے اس کے حواس ٹھکانے پر لے آیا تھا۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی جو ذی شاہ سارا نشہ سارا عشق بھلائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''تو کیا ہو گیا میرا کام......؟'' ذی شاہ نے بے تابی سے پوچھا تھا تب افراہیم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''سو فیصد...... یہ رہا ہیرلخ کا ایڈریس...... بڑی اچھی ساکھ رکھنے والی کمپنی ہے، مجھے خوشی ہے کہ اس کمپنی کی طرف سے تمہیں شراکت داری کا دعوتی خط ملا...... اس کے علاوہ یہاں کے نائب مالکان میں میرا بہنوئی بھی شامل ہے۔ وہ کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ تمہیں قطعاً پرابلم نہ ہوگی...... میں خود تمہیں ہیرلخ چھوڑ کر آؤں گا۔'' افراہیم نے مسکراتے ہوئے تمام پروگرام خود ہی ترتیب دے لیا تھا تب ذی شاہ قدرے چونک گیا۔ وہ افراہیم کو اپنے معاملات میں گھسا کر کسی مصیبت کا شکار کرنا نہیں چاہتا تھا...... پھر افراہیم جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں صرف بزنس کرنے نہیں آیا۔ بلکہ کوئی پرانے حساب چکانے آیا ہے سو وہ کبھی نہیں چاہتا تھا افراہیم اس کے پلان کو جان جائے۔ اس نے خود ہی افراہیم کو منع کردیا۔

''شکریہ دوست......! ہیرلخ تک پہنچنا اب مشکل نہیں رہا۔ تم نے میری بہت ہیلپ کی، میرے لیے یہی کافی ہے۔'' اس نے خلوصِ دل کے ساتھ افراہیم کا شکریہ ادا کیا تھا جس پر وہ فوراً برا مان گیا۔

''اب میرا موڈ خراب مت کرو۔'' افراہیم نے خفگی سے کہا تھا تب وہ معذرت کرتا اسے پھر سے ناراض کر گیا۔ حالانکہ اس نے بات کا آغاز تو ڈرتے، ڈرتے ہی کیا تھا۔

''یار......! اب میرے لیے کوئی کرائے کا کمرا فلیٹ یا کوئی ہوٹل بھی بتا دو، میں اتنے دن بلکہ مہینوں کے لیے تمہارا مہمان بن کر اَن ایزی فیل کروں گا۔'' اس نے بڑی لجاجت سے التجا کی تھی مگر اس کی توقع کے عین مطابق وہ برا مان گیا تھا۔

''اب بکواس کی تو اس کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔'' افراہیم کے تیور بگڑ گئے تھے۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''یار...... پھر بھی۔'' ذی شاہ منمنایا۔

''رہن دے، کُٹ کھائے گا میرے سے۔'' افراہیم کی دھمکی پر وہ چپ سا کر گیا۔ حالانکہ وہ اب مزید یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا مگر افراہیم اور اس کی ممی نے اسے ہرگز بھی رینٹ پہ جانے نہیں دینا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن بعد پھر سے یہ ذکر چھیڑ کر آنٹی کو منائے گا۔ افراہیم کے ماننے کی توقع اسے نہیں تھی۔ یہی سوچ کر وہ تھوڑا مطمئن ہو گیا تھا پھر افراہیم نے جاتے ہوئے اسے یاددہانی کروائی تھی۔

''7:30 پر تیار رہنا...... ہم ایک ساتھ دفتر کے لیے نکلیں گے۔'' وہ اسے ''گوتے ناخت'' (شام سے رات تک کا سلام) بول کر باہر نکل گیا تھا جبکہ ذی شاہ گہری سانس کھینچتا بستر پر ڈھے گیا۔ اس کا ذہن اب ہیرلخ کے اردگرد چکر کھا رہا تھا۔

اگلی صبح جگمگاتے واش روم میں نہا کر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور غیر ارادی طور پر چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا کھڑکی کے پاس آگیا تھا۔ سفید جالی دار نائیلون کے مہین پردے کی ڈوری کھینچ کر اس نے باہر بکھری صبح کی نوخیز سپیدی کو دیکھا تھا۔ نورِ صبح کا عالم ہی کچھ اور تھا...... پرندوں کی خوش الحانی، آلپس کی سحر طرازی، پھولوں کی گنگناہٹ، تتلیوں کا رقص اور راج ہنسوں کی قلقاریاں...... جیسے پورا عالم ثنائے الٰہی میں مشغول تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے دم بخود ہو گیا۔ دور کوہستانِ آلپس کا ملگجا سا دھندلا پہاڑی سلسلہ نظر آرہا تھا۔ جیسے نوکیلی پہاڑیوں پر سفید گھاس پگھل رہی تھی اور دور کہیں دریائے نیکر سوگوار تاثرات کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ نیکر کے شفاف پانیوں میں ابھرتی، ڈوبتی، غم کھاتی، پچھاڑتی اور دھاڑیں مارتی یہ کہانی کس کی تھی؟

من ہائیم کے علی عیسیٰ کی یا پھولوں، کلیوں اور خوشبوؤں سے معطر، بھیگی، مدہوش مالا کی؟

پاکستان سے آنے والے مغرور چہرے، اکھڑ تاثرات اور کٹیلی پُرغرور آنکھوں والے ذی شاہ کی یا پھر سڑکوں پہ دیوانہ وار بہتے پیروں کے ساتھ مدہوش انداز میں چلتی اس اداس کونج کی؟ جو کسی انجان لمحے میں اپنی ڈار سے بچھڑ کر اب بھٹک رہی تھی۔

نیکر کے شفاف پانیوں پر جانے کس، کس کی کہانی بہہ رہی تھی۔ اور وہ کون جی دار آدم زاد تھا جو نیکر کی گہرائیوں میں نڈر ہو کر اتر جاتا اور علی عیسیٰ کی مالا کے دورِ عروج کا صفحہ، صفحہ گیلے پانیوں سے نکال لاتا؟ آخر کون ایسا جی دار تھا جو نیکر کے پانیوں میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا؟ آخر کون تھا جو مالا علی عیسیٰ کی زندگی کے وہ چھ حسین ترین اور... بدترین مہینے نیکر کی گہرائیوں سے نکال لاتا؟

سفید نائیلون کا جالی دار پردہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ذی شاہ کے دل پر جیسے اداسیوں کی اوس کرنے لگی تھی۔

''کیا وہ کبھی علی عیسیٰ تک پہنچ پائے گا؟'' کئی طرح کے سوالیہ نشان تھے۔ اور ہر طرح کی سوچیں تھیں...... اس کا ذہن ریشم کی گانٹھ بن گیا تھا۔ اتنے الجھاوے تھے اور سلجھتا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جس چیز کو سوچتا، وہ اتنی ہی کٹھن، مشکل اور ناممکن لگتی تھی۔ بے خیالی میں پرفیوم اسپرے کر کے وہ نیچے چلا آیا تھا، آنٹی سامنے کہیں نہیں تھیں۔ ان کا بیڈ روم بند تھا۔ ذی شاہ کو کچن میں سے ایمل کے زور، زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

''ہائی اسکول میں چھٹیاں ہیں...... اب میں کیا کروں؟ ممی تو آئے دن لاڈلی بیٹی کے گھر بھاگ جاتی ہیں، مجھے اتنا بور ہونا پڑتا ہے، ایک اتنا اچھا فرینڈ ملا تھا۔ جسے تم دفتر اپنے ساتھ لے جاؤ گے، میں پیچھے کیا کروں گی؟'' ایمل بچوں کی طرح ٹھنکتی بہت غصے میں نظر آرہی تھی۔ موضوعِ گفتگو ذی شاہ کی ذات تھی، وہ گلا کھنکھارتا اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر ایمل کا منہ اور بھی اتر گیا تھا۔

''بن ٹھن کر آچکے ہو...... اب صبح کے گئے منہ اٹھا کر رات کو آجانا افراہیم کی طرح۔'' وہ بھنا، بھنا کر ٹوسٹر سے سلائس نکال رہی تھی۔ افراہیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جسے وہ کمالِ مہارت سے چھپا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں افراہیم سے معاملہ پوچھا تھا جس کی وضاحت وہ محترمہ خود ہی کر رہی تھی۔

''ذی یہاں پہ فارغ رہنے نہیں آیا۔ نہ تمہاری بوریت دور کرنے آیا ہے، اس کا یہاں کام ہے، وہ

کاروبار کرنے آیا ہے۔'' افراہیم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بہت زچ لگ رہا تھا۔ ایمل یقیناً بہت دیر سے بحث کر رہی تھی۔

''میں کچھ نہیں جانتی، تم سارے لوگ ہی بڑے مصروف ہو، ایک میرا ہی وجود فارغ ہے۔'' اس نے جل بھن کر بالآخر ناشتے کی ٹیبل سجا دی تھی۔ افراہیم نے اسٹول کی طرف اشارہ کر کے ذی شاہ سے کہا۔

''اس کی تو عادت ہے، تم بیٹھ کے ناشتا کرو۔''

''آنٹی کہاں ہیں؟'' ذی شاہ نے آنٹی کو نہ پا کر پوچھا کیونکہ وہ ان دو تین دنوں میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ آنٹی کو افریشم کے گھر جاتا دیکھ کر ایمل اسی طرح... جارحانہ تیور لیے سب پہ غصہ اتارتی تھی، ایک تو اسے کام کرنا پڑتا تھا، دوسرے اکیلے رہنا پڑتا۔ پھر آنٹی اسے افریشم کے گھر بھی نہیں لے کر جاتی تھیں۔ اس بات پہ اسے زیادہ غصہ آتا تھا۔

''افریشم کی طرف گئی ہیں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں یار......! ایمل بچی ہے، سمجھتی نہیں۔'' افراہیم نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''اور اس کا شوہر؟'' اس نے ایسے ہی بات برائے بات پوچھا تھا۔ کوئی خاص قسم کی ٹوہ یا تجسس نہیں تھا۔

''بتایا تو ہے...... وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا ایم ڈی ہے...... وہی ہیرلخ کمپنی کا...... تمہاری ملاقات ہوگی اس سے، بہت نائس بندہ ہے...... میں نے اپنا ریفرنس نہیں دیا تم نے سختی سے منع جو کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ خود یہاں آ کر تم سے مل لیتا۔'' افراہیم اپنے بہنوئی کا بہت محبت سے ذکر کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اپنے بہنوئی کے لیے واضح احترام تھا۔ اس کے دل میں جیسے ٹیس سی اٹھی تھی۔ اسی من ہائیم میں ذی شاہ کا بہنوئی بھی موجود تھا۔ اس کی بہن کا مجرم...... اس کی بہن کی خوشیوں کا قاتل...... وہ علی عیسیٰ کے بارے میں سوچتا تو اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ جیسے اب بھی گرما گرم خون رگوں میں جوش کھانے لگا تھا۔

جانے کیسے اس نے خود پر کنٹرول رکھا تھا پھر افراہیم کے اٹھتے ہی وہ خود بھی اسٹول چھوڑ گیا تھا۔ اس کی بھوک، پیاس مٹ سی گئی تھی۔ وہ کچن سے باہر نکلا تو ایمل کی آواز سنائی دی تھی۔ ایمل جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔

''بھائی صاحب تو بیگم کی پٹی سے لگے بیٹھے ہیں، اللہ کرے، میری بہن جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔ میری بہن اتنی حسین ہے، اتنی...... اتنی...... اور اتنی۔'' وہ بازوؤں کو پھیلا کر فرطِ محبت سے بولی تھی۔ ذی شاہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایمل کے دھوپ چھاؤں جیسے رویے کا اب عادی ہو چکا تھا۔ پل میں روتی، پل میں ہنستی، کبھی بنتی، کبھی بگڑتی، وہ خوب موڈی لڑکی تھی۔ اپنے مزاج کے تابع رہتی...... بالکل بندیا کی طرح۔

☆☆☆

افراہیم کی lexus شفاف چوڑی اور انتہائی شاندار سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک معروف ترین شاہراہ تھی۔ اردگرد اسٹور، بڑی، بڑی عمارتیں جن میں بینک، پلازے، سرکاری دفاتر وغیرہ شامل تھے۔ انہی میں ایک ہیرلخ فرم تھی انتہائی شاندار، بلند اور عظیم...... افراہیم نے اسے ہیرلخ کا اردو ترجمہ کر کے بتایا تھا جس کے معنی تھے عظیم الشان...... وہ حقیقتاً glorious یعنی عظیم الشان تھی۔ ڈوئچ لینڈ (جرمنی) میں ایسی عمارتوں کا کال نہیں تھا...... مگر اس نے حیرانی یوں محسوس کی تھی کہ دراصل وہ ہیرلخ کا انتخاب اس وجہ سے کر سکا تھا کیونکہ اس فرم کا اونر ایک مسلم تھا۔ دوسرے اونرز کے نام میں علی عیسیٰ کا نام بھی شامل تھا۔ یہ سب معلومات اس نے پاکستان میں ہی لے لی تھیں اگرچہ علی عیسیٰ کے نام سے من ہائیم کے کئی کاروباری اداروں کے اونرز کی فہرست سامنے آ گئی تھی۔ مگر جانے اس کا دل ہیرلخ پہ کیوں آ کر رک سا گیا تھا۔ اب اسے کتنے فیصد کامیابی ہو سکتی تھی؟ یا پھر وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچا بھی تھا یا نہیں، یہ صرف وقت بتا سکتا تھا۔

اس کی خواہش کے مطابق افراہیم اسے بلڈنگ کے داخلی دروازے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ویسے بھی وہ

اپنے دفتر سے لیٹ ہو رہا تھا۔ اسے نیک تمناؤں سے رخصت کرتا وہ چلا گیا تب ذی شاہ دھڑکتے دل کے ساتھ گلاس ڈور کھولتا اندر آ گیا...... ایک وسیع و عریض چمکتے، دمکتے ہال میں، جس کے ایک طرف ریسیپشن تھا...... گراؤنڈ فلور پہ بے شمار دفاتر تھے، جس میں سوٹڈ بوٹڈ لوگ انتہائی مصروف نظر آ رہے تھے۔ اپنے، اپنے کام میں مگن زیادہ لوگ مغربی تھے۔ اسے ارکانِ کمیٹی کے دفتر جانا تھا۔ بورٹ آفس کا پوچھ کر وہ بذریعہ لفٹ دوسری اور پھر تیسری منزل پر آ گیا تھا۔ تھرڈ فلور پر برٹش آسٹرین، آسٹریلین ورکرز کے کیبن تھے۔ اسے فورتھ فلور پہ جانا پڑا...... ابھی آگے اور نہ جانے کتنے جہان باقی تھے۔

وہ کچھ، کچھ ستائشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ پاکستان میں ڈیڈی کی فرم کے دفاتر بھی اچھے تھے اور بلڈنگ بھی کمال کی تھی مگر اس کا ہیرلخ سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس فرم کو ایمل کی زبان میں ڈائسنٹ (اٹریکٹو) کہہ سکتا تھا۔ بنا شور، آہٹ اور آوازیں نکالے بیامتے، منیجر، آفیسرز اپنے، اپنے کام میں مصروف تھے۔ کوئی بھی ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یہ تھا ترقی یافتہ ملک کا ایک کاروباری ادارہ...... مالکان کی غیر موجودگی میں بھی تندہی سے کام جاری تھا۔ کہیں بھی کیمرے فٹ نہیں تھے۔ روک ٹوک، جھڑکیاں، بدنظمی یا ہنگامہ نہیں تھا۔

ریسیپشن سے معلومات لے کر وہ ایم ڈی کے آپتیل (آفس) تک پہنچ ہی گیا تھا۔ یہ تھا مینجنگ ڈائریکٹر کا دفتر...... افراہیم کے بہنوئی کا آفس...... اسے کچھ دیر کے لیے ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑا تھا۔ ایم ڈی فی الحال اپنے دفتر میں نہیں تھا، اسے ہنگامی طور پر باہر جانا پڑ گیا تھا۔ یورپ میں ہر کام وقت پر قاعدے اور اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ دس منٹ جلدی پہنچ گیا تھا، سو اسے دس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ ایم ڈی اپنے مقررہ وقت پر آفس پہنچ گیا۔

ذی شاہ کو اندر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ جب وہ انتہائی شاندار اور پُرآسائش خوابناک آفس میں پہنچا تب اس کا استقبال تین لوگوں نے کیا تھا۔ ان میں سے افراہیم کا بہنوئی کون تھا؟ شاید مرکزی کرسی پر بیٹھا ہوا انتہائی وجیہہ سا بندہ افراہیم کا بہنوئی تھا۔ باقی دو لوگ انگریز تھے جو یقیناً افراہیم کے بہنوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ ذی شاہ بس اسی جوان کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے اپنی سحر طراز آنکھوں پر گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت جوان تھا۔ خوش پوشاک مگر بلا کا سنجیدہ...... اتنی خطرناک سنجیدگی کی ذی شاہ کو امید نہیں تھی۔ اس نے ذرا بھی نرمی، حلاوت یا جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اس سے بات کرتا رہا۔ یہ ایک غیر رسمی میٹنگ تھی۔ باقاعدہ معاہدے کے تحت وکیلوں کی موجودگی میں حلفیہ بیان دیے گئے تھے۔ ایگری منٹ سائن ہوا۔ اس نے شیئرز کی رقم کمپنی کے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دی تھی۔ ایم ڈی خاصا محتاط تھا یقیناً مرکزی کرسی پر بیٹھ کر اتنا ہی محتاط ہونا پڑتا تھا۔ وہ خود بھی ایک بزنس مین تھا اور کاروباری پیچیدگیوں کو سمجھتا تھا۔

اسے ایکسچینج بیورو اور ایکسچینج ریٹ کے متعلق ابتدائی انفارمیشن دے دی گئی تھی۔ ایم ڈی اپنے رولز کی وضاحت کر رہا تھا۔ اسے فیبرک کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا۔ فیکٹری کس ایریا میں تھی، اسے یہ بھی بتایا گیا، وہ سائٹ پہ جا سکتا تھا۔ اس کے لیے مسٹر وان کی خدمات لینا تھی۔ کاروباری ماحول میں بات چیت مکمل ہو رہی تھی۔ ڈوئچ ایم ڈی بڑی رواں انگریزی میں اپنا نقطۂ نظر واضح کر رہا تھا۔

اسے ایریا وپ نیس (licence) اور انشورنس کے لیے کیا کرنا تھا؟ اگلے دومنٹ میں بتا دیا گیا تھا۔ اپنے ''پاس'' کی ایک کاپی ذی شاہ نے ڈاکومنٹس کے ساتھ جمع کروا دی تھی۔ اب نیکسٹ اسٹیپ اس کی پرفارمنس پر ڈیپینڈ کرتا تھا۔ اسے باقاعدگی کے ساتھ تین ہفتے تک آفس جوائن کرنے کی آفر کر دی گئی تھی۔ تین ہفتے کی مدت وہی بکواس قسم کی ڈوئچ سیکھنے کی شرط تھی۔ یہاں زیادہ ورکر ڈوئچ تھے۔ انگریزی قطعاً نہیں جانتے

تھے۔سوذی شاہ کے لیے ڈوئچ سیکھنا ناگزیر تھا۔

میٹنگ کے اختتام پر مرکزی سیٹ پر بیٹھا جوان اٹھ کر رسمی انداز میں کسی مشین کی طرح نیک خواہشات کا اظہار کر کے باہر نکل گیا تھا۔اس کے چلے جانے کے بعد مسٹروان نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا اور لنچ کی آفر کردی تھی۔یقیناً یہ مہمان نوازی کی ایک کوشش تھی۔مسٹروان ایک ہنس مکھ، ہینڈسم جوان تھا۔یہ کمپنی کا تیسرا ایم ڈی تھا۔یعنی عہدوں کے لحاظ سے بالترتیب تیسرے نمبر پر تھا۔وان بہت باتونی تھا۔لنچ کے دوران اسے بہت سی معلومات ملی تھیں۔اس نے بتایا تھا، کمپنی کا پہلا ایم ڈی یہ تھا جس سے ابھی ذی شاہ کی ملاقات ہوئی تھی۔یہ کبھی دفتر نہیں آتا تھا، آج نہ جانے کیسے بہت مجبور کرنے پر آگیا تھا۔یہ اس فرم کا مالک بھی تھا مگر دفتری امور سے خود کو الگ رکھتا تھا۔دوسرا ایم ڈی چھٹی پر تھا اور تیسرا ذی شاہ کے سامنے بیٹھا کھلنڈرا سا جوان تھا۔تب اس نے حیران اور کچھ، کچھ متاثر ہو کر سوچا۔''بہت حیران کن، افراہیم کا بہنوئی، بہت شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔''وہ بہت متاثر نظر آرہا تھا۔معاً اسے افراہیم کے بہنوئی کا نام پوچھنے کا خیال آیا تھا۔تب مسٹروان نے ہی بے پروائی سے ایم ڈی کا نام بتایا...... وہ ذی شاہ کے ڈاکومنٹس کو ترتیب دے رہا تھا۔کچھ چونک کر سیدھا ہوا۔

''محمد علی عیسیٰ کرسچن نوم (عیسائی) نہیں ہے۔موسیلے (مسلم) ہے۔''

☆☆☆

''علی عیسیٰ؟ تو کیا یہ افراہیم کا بہنوئی ہے؟''وہ اتنا حیران ہوا کہ گھر واپس آکر بھی اس کی حیرانی کم نہیں ہوئی تھی۔جانے کیوں وہ اندر سے بہت مایوس ہوا تھا، جو کچھ وہ سوچ کر گیا تھا ایسا کچھ ہوا نہیں...... جیسے اندر سے وہ لمحے بھر کے لیے بجھ گیا تھا۔آنکھوں کی پتلیوں میں بس ایک ہی عکس ٹھہر گیا تھا۔پورے ماحول پر چھایا فرم کا مالک، افراہیم کا بہنوئی علی عیسیٰ۔

اسے افریشم پر در پردہ بہت رشک آیا تھا۔اس جہان میں کیسے، کیسے بلند بخت اور خوش نصیب لوگ تھے۔اس کا دل بھر آیا۔مالا کی بے رنگ، ویران اور اداس زندگی نے اس کی آنکھوں میں زخم بھر دیے تھے پھر جو طلاق کا بدنما داغ لگا تھا وہ علی عیسیٰ کے گریبان تک پہنچ کر اور اسے سزا دینے کے باوجود بھی دھل نہیں سکتا تھا۔

وہ مالا کے لیے جتنا بھی سوچتا، اسی قدر زخمی ہوتا...... ہیرلخ سے آکر وہ ایسا بددل ہوا تھا کہ اگلی صبح تک باہر نہ آیا۔تقریباً آدھی دوپہر کھسک گئی تب وہ نیچے آیا تھا یوں کہ پورا گھر...... بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔خاموشی جیسے محو رقصاں تھی۔آنٹی اور ایمل کہیں نہیں تھیں۔وہ حیران ہوتا، اِدھر اُدھر جھانکنے لگا تھا۔معاً اس کی نظر ڈائننگ میز کی چکنی سطح پر پڑی تھی۔اس نے گردن اچکا کر دیکھا، وہاں ایک چٹ پر لکھا تھا۔

''جب اٹھ جاؤ تو اوون کھولنے کی زحمت بھی کرلینا۔تمہارا ناشتا وہیں رکھا ہے، میں اور ممی تو شاپنگ کے لیے نکلے ہیں۔''ایمل صاحبہ کی تحریر پڑھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔پھر جو اس کی اس ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اوون کھولا تو سامنے ہی ایک ڈش میں چکن اینڈ گرین پیپر آملیٹ ڈھکا نظر آگیا۔وہ ٹوسٹر میں سلائس ڈالے بغیر ایک کانٹا اٹھا کر باہر آگیا۔آملیٹ اور جوس سے لطف اندوز ہوتا وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب افراہیم کی اسے کال آئی تھی۔بینک میں اس کا کوئی کام تھا، وہ وقت پر پہنچ نہیں سکتا تھا تبھی ذی شاہ سے کہا تھا کہ وہ مقامی بینک سے اس کا مطلوبہ سامان لے آئے۔شاید کچھ پے منٹ کا معاملہ تھا۔ایڈریس سمجھ کر وہ بال ہاتھوں سے سنوارتا باہر آگیا تھا۔یہ بینک زیادہ دور نہیں تھا۔مگر پھر بھی اسے بس پکڑنا پڑی تھی۔افراہیم کا کام جاتے ہی ہوگیا تھا۔قریب، قریب بارہ منٹ لگے تھے اور اب وہ واپس گھر آرہا تھا۔بس اسٹاپ پہ پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد مطلوبہ بس آتو گئی تھی مگر مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی یعنی کوئی سیٹ نہیں تھی۔مزید پندرہ منٹ انتظار میں نہ صرف ضائع ہوئے بلکہ

اسے غصہ بھی دلا گئے تھے۔تھوڑی دیر بعد ایک خوب صورت بلکہ حسین ترین دوشیزہ بھی اسٹاپ پر آگئی۔کیا کمال کی اللہ نے صورت بنائی تھی۔اتنے نفیس اور حسین ترشے ہوئے نقوش تھے۔چہرے پر بلا کی ملاحت اور نزاکت تھی۔بڑی، بڑی گہری آنکھیں...... ذی شاہ نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔اگرچہ وہ کوئی حسن پرست بندہ نہیں تھا مگر خوب صورتی کسے بری لگتی ہے؟ ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ محترمہ تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔چہرے پر انتظار کی کوفت رقم تھی۔پھر ذی شاہ کی نظریں محسوس کر کے وہ کچھ سمٹ سی گئی تھی۔پھر یوں ہوا کہ بس آئی ہی نہیں۔وہ لڑکی تنگ آکر فٹ پاتھ پر چل پڑی۔اب وہ لڑکی ہو کر نازک حالت کے باوجود پیدل چلنے کو ترجیح دے رہی تھی تب ذی شاہ کو بھی تھوڑی غیرت آگئی۔ویسے بھی گھر زیادہ دور نہیں تھا۔وہ تو ایویں ہی بس کا سہارا لینے کھڑا ہوگیا تھا۔اب اس لڑکی کے پیچھے چلنا قطعاً غیر مناسب حرکت تھی۔محترمہ مشکوک ہو کر پولیس کو بھی بلوا سکتی تھیں۔ویسے بھی اس کے بلوزے اور اسکرٹ کا ہم رنگ شولڈر بیگ بھی موجود تھا جس میں ایک عدد موبائل تو یقینی طور پر پایا جاسکتا تھا۔ویسے بھی وہ کسی غیر اخلاقی حرکت کے باعث اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔دراصل اس کا رستہ ہی یہی تھا۔کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو پیچھے چھوڑے آگے بڑھ گیا تھا۔اس کی رفتار تیز تھی جبکہ لڑکی بہت سست روی سے چل رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں وہ گھر کے اندر تھا اور افراہیم کو کال کرتے بتا رہا تھا۔

''تمہارا مال لے آیا ہوں۔''اس نے پیکٹ احتیاط سے دراز میں ڈال دیا تھا پھر افراہیم کا شکریہ سنے بغیر فون کھٹاک سے بند کردیا۔اب وہ فریج سے جوس کا کین نکال لایا تھا۔گھونٹ، گھونٹ جوس پیتے ہوئے جوں ہی اس کی نگاہ لاؤنج کے دروازے تک گئی گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی تھی۔وہ ہکا بکا بوتل کو منہ سے لگائے کھڑا رہ گیا۔اس لڑکی کے تاثرات بھی کم و بیش اسی قسم کے تھے۔ایک دم حیران، شاکڈ اور بے یقین۔

بس اسٹاپ پر کھڑا لڑکا اس کے گھر میں موجود تھا؟ کیوں؟ کیسے اور کس طرح......؟ پھر جیسے اس کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔اسے اچانک یاد آیا...... ''اچھا...... تو یہ وہ ہے؟ افراہیم کا دوست......''

ایک دم اس کے کٹیلے تاثرات بدل گئے تھے۔اب وہ تھوڑی مطمئن سی صوفے پر ڈھے گئی تھی۔مسلسل چلنے کی وجہ سے اس کے پیر سوج گئے تھے اور سانس پھول رہی تھی۔وہ پانی پینا چاہتی تھی اسے پیاس لگی تھی مگر کچن تک جانے کی اب ہمت نہیں تھی۔ذی شاہ اس کے تاثرات دیکھ کر کچھ، کچھ سمجھ رہا تھا۔پھر جس طرح اس نے ذی شاہ کے ہاتھ میں موجود کین کو دیکھ کر حسرت محسوس کی تھی وہ فوراً سمجھ کر فریج میں سے جوس نکال لایا تھا۔کوکونٹ جوس دیکھ کر لڑکی نے فوراً بیزار شکل بنائی تھی۔

''مجھے لیموں یا سنگترے کا جوس دو۔''وہ اپنے پیر دباتی یقیناً بہت تھک گئی تھی، ذی شاہ کو افسوس سا ہوا۔اسے کیا ضرورت تھی چل کر آنے کی، بس کے آنے تک کا انتظار کرلیتی۔وہ سنگترے کا جوس لے کر آداب میزبانی بجا لایا تھا۔لڑکی نے جوس پی کر شکریہ ادا کیا...... پھر جیسے ہی اس کے حواس ٹھکانے آئے، وہ تفتیش کے موڈ میں نظر آگئی تھی۔ذی شاہ نے سوچا تھا اب لمبی تفتیش بھگتنا پڑے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔وہ بڑے تحمل اور نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ دل لگ گیا؟''اسی قسم کے بے ضرر سوال وہ پوچھ رہی تھی۔جبکہ دل لگنے والا سوال تو اس کے دل میں بے ساختہ ٹھا کر کے گڑ گیا تھا۔ظالم نے دل پر ہی ہاتھ ڈال دیا تھا۔اس کی آنکھوں کے سامنے منکشے کا چہرہ آگیا۔وہ آتے جاتے بھی آج کل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔جانے وہ کہاں تھی؟ اس کا دل سکڑ نے سمٹنے لگا تھا۔خیر، فی الوقت منکشے کا خیال جھٹک کر وہ سامنے موجود حسینہ کی طرف متوجہ تھا جو یقیناً افراہیم کی بہن اور علی عیسیٰ کی بیوی تھی۔

''جی ہاں......''دل تو اچھی طرح لگ گیا۔بلکہ

لگا ہی اب ہے، کم بخت کو پاکستان میں لگنا ہی نہ آیا...... اور لگا بھی کہاں۔ وہ اثبات میں جواب دیتا باقی کی بات سوچ رہا تھا پھر سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں افریشم ہوں، افراہیم کی بہن۔'' وہ اپنا تعارف کروا رہی تھی، نہ بھی کرواتی تب وہ جان ہی چکا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اسے مسکرانا پڑا۔

''بس اسٹاپ پر تم ہی تھے ناں......؟'' وہ جانتی بھی تھی پھر بھی پوچھ رہی تھی۔ شاید تصدیق کرنا چاہ رہی تھی۔

''میں ہی تھا...... آپ کو شک ہے کیا......؟'' ذی شاہ سنجیدگی سے بولا تب وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

''مجھے یوں لگا، میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے، خصوصاً تمہاری آنکھیں۔'' افریشم کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے وہ کسی کو یاد کرنے لگی تھی، جیسے کسی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

''اچھا......'' اب کہ ذی شاہ کچھ حیران ہوا تھا۔

''شاید تمہیں ایسا لگا ہو...... خیر، کچھ کھاؤ گی؟'' اسے پھر سے افریشم کی نازک حالت کا خیال آیا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر آنٹی افریشم کے گھر چلی جاتی تھیں اور پیچھے ایمل کا منہ بن جاتا تھا۔

''نہیں شکریہ......'' وہ بہ مشکل مسکرائی تھی تب ذی شاہ کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

''تم آج کل کیا کرتے ہو؟'' افریشم کے سوال اسے حیران کر رہے تھے۔ یعنی وہ گفتگو کو طول دینا چاہتی تھی پھر وہ خود ہی اس سے چیدہ، چیدہ سوال پوچھتی رہی تھی۔ کہاں سے ہو؟ پاکستان کے کس شہر سے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ فیملی کہاں ہے؟ شادی ہوئی یا نہیں کچھ ہی دیر میں وہ خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی اس کا پورا ڈیٹا معلوم کر چکی تھی۔ ویسے تو ذی شاہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتا تھا مگر ایمل اور افریشم میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ دونوں بہنیں بلا کی خوش مزاج، بے تکلف اور باتونی تھیں۔ اسے افریشم کی کمپنی بہت اچھی لگی تھی۔ بیچ میں ایک مرتبہ اس کے شوہر کا فون بھی آیا تھا۔ پھر اس نے شاید کسی ملازمہ کو ہدایت بھی دی تھی۔

''عیسیٰ کی طبیعت ٹھیک نہیں، میں سوپ بنا آئی ہوں، عیسیٰ اٹھے تو اسے سوپ دینا...... اور دیکھو، کچن میں گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔'' افریشم کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔ یقیناً وہ کسی میڈ سے مخاطب تھی اور اپنے شوہر کے لیے بہت متفکر بھی تھی۔

''میں ممی کی طرف آئی ہوں، کچھ دیر ہو جائے گی۔ تم کھانا کھا لینا تاہم عیسیٰ کو ڈسٹرب مت کرنا۔ ٹی وی بھی نہ لگانا۔ شور عیسیٰ کو پسند نہیں۔'' افریشم نے کچھ اور ہدایات دے کر فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ ذی شاہ کو جیسے اس پر رشک آیا تھا۔ علی عیسیٰ کی بیوی...... خوش باش، خوش حال ہر کوئی اتنا بانصیب تو نہیں ہوتا؟ وہ یہی باتیں سوچتا اپنے کمرے میں آ گیا تھا جب اس کے موبائل کی بپ بجی تھی۔ فون بندیا کا تھا جو خاصی پُرجوش لگ رہی تھی۔

''جرمنی سے ایک خط آیا ہے۔'' اس نے مارے مسرت کے چیختے ہوئے بتایا تھا۔

''اچھا...... تو کیا لکھا ہے خط میں؟'' وہ ذرا چونکتے ہوئے دیوار پر لگے کیلنڈر کو دیکھنے لگا۔ تاریخوں کے حساب سے بالکل ٹھیک وقت پر یہ خط پہنچ گیا تھا۔

''مالا کے نام ہے، اس کی خیریت پوچھی گئی ہے، ذی بھائی! کیا پتا یہ عیسیٰ نے خط بھیجا ہو؟ آخر جرمنی میں عیسیٰ کے علاوہ اور کون ہے؟'' بندیا کے جوش کی وجہ سمجھ آتی تھی، ظاہر ہے، اس کے نزدیک ذی تو خط بھیج نہیں سکتا تھا کیونکہ فون پر جو بات ہو جاتی تھی پھر یہ خط بھلا کون بھیج سکتا تھا؟ یقیناً عیسیٰ ہی۔

''یہ خط میں نے لکھا ہے، مالا کے لیے۔'' اس نے بندیا کا سارا جوش پانی میں بہا ڈالا تھا۔ وہ جیسے اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔

''تم نے...... مگر کیوں؟'' اب کے بندیا نے بھی بجھی آواز میں پوچھا تھا۔ ساری خوشی جو ملیا میٹ ہو گئی تھی۔ وہ جو سمجھ رہی تھی۔ ذی بھائی کے جاتے ہی عیسیٰ کی طرف سے رسپانس آ گیا ہے۔ ایک دم بجھ کر رہ گئی تھی۔

''بس مجھے تم یہ بتاؤ کہ مالا نے کیا ردِعمل ظاہر

کیا؟ وہ خوش ہوئی؟'' اس کا سوال نظر انداز کر کے ذی شاہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں، بہت...... حد نہیں...... پھر رونے لگی، پھر بے ہوش ہو گئی۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد بھی اس نے مجھ سے خط کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔'' بندیا اب مالا کی کیفیات اور اس کے ردِعمل کے متعلق بتا رہی تھی۔ ذی شاہ جیسے مطمئن ہو گیا تھا۔ گویا محنت وصول ہو گئی۔ اس نے اسی مقصد کے تحت تو مالا کو خط لکھا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مالا کے وجود پر چھایا جمود ٹوٹا ہے یا نہیں......؟ اس میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں؟ اور بندیا بتا رہی تھی کہ اس میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ جانے کیوں ذی شاہ کو اپنی دونوں بہنوں سے بہت محبت تھی، مالا تو اپنی پیاری، پیاری عادتوں کے باعث دل سے بہت قریب تھی جبکہ تابندہ عرف بندیا بھی نٹ کھٹ سی شرارتی ہونے کی وجہ سے اسے بہت پیاری تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنی محبت بہنوں پر پہلے کبھی ظاہر نہیں کی تھی جو کہ اب خود بخود ظاہر ہو رہی تھی۔

''اور کیا دیکھا تم نے؟ مالا نے کچھ اور پوچھا؟'' وہ بڑے محتاط انداز میں بندیا سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں...... پوچھا بھی اور لفافے پہ لگے ٹکٹوں کو بڑی سنجیدگی سے دیکھتی رہی تھی۔ گویا تصدیق کر رہی تھی کہ جرمنی سے ہی خط آیا ہے ناں......؟'' بندیا نے سابقہ جوشیلے لہجے میں بتایا تھا۔ ذی شاہ شانت ہو گیا تھا۔ گویا اس کو پہلی کامیابی نصیب ہوئی تھی، بندیا نے اسے بتایا کہ خط پڑھنے کے بعد مالا بولتی بھی رہی اور عیسیٰ کی باتیں بھی کرتی رہی۔ حالانکہ اس سے پہلے ان لوگوں کے سروں کی ٹھیکریاں اڑ گئی تھیں مگر وہ عیسیٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ جیسے وہ ابھی تک شاک میں تھی کہ علی عیسیٰ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، کیا وہ اس سب کی حقدار تھی؟

''کیا، کیا باتیں ہوئیں؟'' ذی شاہ نے بے چینی سے پوچھا تھا۔ تب بندیا روانی میں کچھ بتاتے، بتاتے ایک دم جھینپ کر خاموش ہو گئی تھی۔ شاید بھائی سے شرم آ گئی تھی۔ بھلا وہ ذی شاہ کو عیسیٰ کی محبتوں کے متعلق کیسے بتاتی؟ مالا نے جو اتنے سال بعد قفل کھولا تھا، سو بہن سے کچھ بھی نہ چھپایا، عیسیٰ کی محبتوں کا ایک، ایک صفحہ کھول، کھول کر سنایا تھا مگر جدائی کی گھڑیوں تک وہ پہنچ نہیں سکی تھی۔ بندیا خود بھی اس کو دورِ عروج میں ہی رکھنا چاہتی تھی۔ تبھی مالا کے زوال کی طرف اس کا دھیان آنے نہیں دیتی تھی۔ اِدھر بندیا کی خاموشی سے جیسے ذی شاہ خود بخود کچھ سمجھ گیا تھا۔ سو مزید سوال نہ کر سکا۔ بس اس نے بندیا سے یہ کہا۔

''تم مالا سے کسی طرح علی عیسیٰ کا حلیہ تو پوچھ لو...... اور اسے کہو، گھر کا ایڈریس بتائے یا پھر کوئی ایک آدھ تصویر علی عیسیٰ کی مجھے سینڈ کر دو......'' وہ شدید مضطرب ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے دل میں کچھ وسوسے سر ابھار رہے تھے۔ اس کی چھٹی حس کچھ ہنٹ دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، ہیمبرگ میں ملنے والا علی عیسیٰ ہی اس کی بہن مالا کا مجرم ہو سکتا ہے اور یہ افریشم اس کی بیوی تھی۔ ذی شاہ کی بہن کو برباد کر کے کیسی عالیشان زندگی گزار رہا تھا۔ اتنی حسین ہم سفر کی موجودگی میں اسے مالا کیا یاد آتی ہو گی؟ پھر اب بچہ بھی ہو رہا تھا۔ یعنی علی عیسیٰ کو سب کچھ مل گیا۔ پھر سے بیوی بھی مل گئی اور بچہ بھی...... جبکہ مالا کے حصے میں کیا آیا تھا؟ صرف ذلت......؟ رسوائیاں؟ دکھ؟ آنسو؟ غم؟ کرب؟

ذی شاہ کے اندر باہر بھانبھڑ جلنے لگے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو آگ لگا دے... مگر فی الوقت اسے ضبط کے مراحل سے گزرنا تھا۔ جب تک بندیا اسے عیسیٰ کی تصویر نہ بھیج دیتی...... یا اس کا حلیہ نہ بتا دیتی۔ کم از کم تب تک وہ منہ سے کچھ پھوٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی جلد بازی میں کوئی غلط قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ کوئی فضول اور چیپ حرکت کر کے افراہیم کی نگاہ سے گرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیا خبر اس کے خدشے غلط ہوں؟ وہ علی عیسیٰ کوئی اور ہو......؟ افریشم کا شوہر عیسیٰ اس کی بہن کا مجرم نہ ہو...... پھر بھلا وہ بغیر تصدیق کے افریشم کی

ازدواجی زندگی میں کوئی شعلہ بھڑکا دیتا؟ اس کے شوہر پر الزام لگاتا، اسے اپنی بہن کا بنا تصدیق کیے مجرم ٹھہراتا تو یقینی طور پہ... افریشم کی زندگی بری طرح متاثر ہوجاتی..... کیا خبر اس کا گھر ٹوٹ جاتا؟ وہ دوبارہ اپنے شوہر پر اعتبار نہیں کرسکتی۔ اگر افریشم کی زندگی اس کی وجہ سے خراب ہوتی تو کیا افراہیم، ذی شاہ کو معاف کرسکتا تھا؟ اس کی بہن اجڑ کر گھر آجاتی؟ کچھ بھی متوقع تھا، کچھ بھی ہوسکتا تھا؟ سو ذی شاہ کو ہر قدم پھونک، پھونک کر اٹھانا تھا۔ تول، تول کر بولنا تھا اور سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ اس کا کوئی بھی انتہائی قدم بہت سارے لوگوں کی زندگیاں تباہ کرسکتا تھا۔ اور وہ اتنا سنگدل، خودغرض یا مطلبی نہیں تھا کہ اپنے دوست کے گھرانے کو انجانے میں بھی ذرا سی ٹھیس پہنچا دیتا۔

سوچوں کے تار نہ جانے اسے کہاں تک لے جاتے جب ہوا کے دوش پر لہراتی بندیا کی آواز اسے حال کی دنیا میں واپس اٹھا لائی تھی۔

''کہاں چلے گئے؟ ہیلو..... ہیلو۔'' بندیا نے.... بےتابی سے کہا تھا تب وہ بے ساختہ چونک گیا۔

''آں..... ہاں..... یہیں ہوں.....'' ذی شاہ جیسے گڑبڑا گیا تھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بندیا کو ذرا کام کی باتیں سمجھانے لگا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ پاکستان سے علی عیسٰی کے متعلق تمام کوائف جمع کر کے لاتا مگر تب مالا کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب جو اس نے لبوں کا قفل توڑا ہی تھا تو ذی شاہ، بندیا کو مزید ایک سوال نامہ تھما رہا تھا۔ یہ بہت ضروری قسم کی ہدایات تھیں۔

''سنو بندیا.....! تم نے اب... مالا سے کیا، کیا سوالات کرنے ہیں..... ان کو بھی ابھی سے اپنے ذہن میں ترتیب دے لو۔ تم مالا سے پوچھو، عیسٰی کی پسندیدہ کوئی ایسی چیز جس کے بغیر اس کا رہنا مشکل ہو، اس کی پسند ناپسند، اس کا مزاج، عادتیں، اس کے دفتر کا اتا پتا..... یا کوئی ایسی جگہ جہاں وہ کثرت سے جانا پسند کرتا ہو؟ مجھے کچھ ہنٹ چاہیے۔ کچھ ٹھوس ثبوت چاہیے۔ ورنہ میں یہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا بس اپنا وقت ضائع کرتا رہوں گا۔ یاد رکھنا، یہ سوالات بہت ضروری ہیں۔ انہی کی بدولت میں علی عیسٰی تک پہنچ پاؤں گا۔'' ذی شاہ کا لہجہ بلا کا سنجیدہ اور دھیما ہوگیا تھا۔ دوسری طرف بندیا ہمہ تن گوش تھی۔ اور بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی۔

''تم فکر مت کرو بھائی! میں مالا سے باتوں باتوں کے دوران پوچھ لوں گی..... اب وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہتی۔ بولتی بھی ہے اور ممی کے قریب سے تو ہٹتی بھی نہیں۔ ممی کا خیال بھی وہی زیادہ رکھتی ہے۔ اس میں تبدیلی آرہی ہے۔ وہ صدمے کے اثر سے نکل رہی ہے۔'' بندیا نے جیسے اس کے اندر بجھتی امید کو زندہ کردیا تھا۔ وہ جیسے پھر سے پُرامید ہوگیا۔

''یہ خوش آئند عمل ہے۔'' اس نے جوش کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں، ممی بھی حیران اور خوش ہیں۔'' بندیا خوش دلی سے بتانے لگی۔

''تم خیال رکھنا ممی اور مالا کا..... اور زیادہ سے زیادہ مالا کو وقت دینا، دیکھو، اسے تنہا مت چھوڑنا کسی بھی وقت کسی بھی لمحے۔'' وہ ہدایات دیتا رہا۔ بندیا سے بات کر کے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آج کی رات اسے بہت اطمینان سے نیند آسکتی تھی۔ مالا کے اندر ہونے والی تبدیلی بہت خوشگوار تھی۔ وہ بدل رہی تھی۔ صدمے کے اثر سے نکل رہی تھی۔ حقیقت کو قبول کررہی تھی۔ ذہن کے جالوں کو صاف کررہی تھ۔ دھند سے نکل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ واک کے لیے اکیلا ہی باہر نکلا تھا، کچھ دیر بعد ایمل بھی آگئی تھی پھر وہ لمبا راؤنڈ لے کر ایسی تھکی کہ بھاگ کر واپس گھر میں چلی گئی۔ ذی شاہ البتہ فٹ پاتھ پر چلتا ڈوبتے سوج کا سنہرا زعفرانی پن دیکھ رہا تھا۔ بھلا اس منظر سے بڑھ کر بھی کچھ حسین ہوسکتا تھا؟ ڈوبتا ہوا سورج اور زعفرانی تاروں کا بکھرا جال..... زمین جیسے سونے میں بھیگ رہی تھی۔

ولیس ہاؤس پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم ٹھٹک گیا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبا سفید مکان، آس پاس سبزے کے جھنڈ، بےترتیب کھردری شاخیں، پھولوں کے خوفناک کٹ، جو اندھیرے میں خاصے بھیانک لگ رہے تھے۔

اس نے انگلیوں پر حساب کیا تھا، پورے تین دن گزر چکے تھے، منکشے دوبارہ دکھائی نہیں دی تھی۔.... وہ بے سوچے سمجھے کسی غیر مرئی طاقت کے زیرِاثر آگے بڑھتا جارہا تھا۔ آگے بڑھتا جارہا تھا۔ پھر لاؤنج کے یا ہال کے داخلی دروازے پر رک سا گیا۔ اس نے آس پاس گھنٹی تلاشنا چاہی تھی مگر گھنٹی کہیں نہیں تھی۔

اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ''اوہ میرے اللہ..... ایسی بے پروائی.....'' کھلے دروازے کو دیکھ کر اسے اچھنبا ہوا تھا۔ پھر جیسے وہ آگے بڑھتا گیا، مگر یہ کیا؟ جگہ، جگہ رکاوٹیں تھیں..... اسٹول، کرسیاں، بےترتیب اوندھی پڑی تھیں۔ گیلری میں کیزن (تکیے) چادریں، کمبل فرش پر گرے پڑے تھے، کچھ آگے بڑھنے پر اس کے قدموں تلے رکابیاں اور چمچے بھی آنے لگے۔ وہ بچ بچا کر آگے بڑھا تو زوردار ٹھوکر لگی تھی، یہ کوئی کانچ کا گلاس تھا جو لڑھکتا ہوا نہ جانے کس طرف کھسک گیا تھا۔

پورا گھر بھاں، بھاں کررہا تھا۔ اتنی خاموشی اور سناٹا تھا جیسے وہ کسی غار میں غلطی سے گھس آیا تھا۔

''اللہ اکبر..... کیا یہاں انسان نہیں بستے؟'' اس نے بیرونی سناٹے سے گھبرا کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ اسے اپنی ہی آواز کانوں میں گونجتی سنائی دے رہی تھی۔ ہال، گیلری اور یہ شاید سٹنگ روم تھا۔ وہ کچھ آگے بڑھا، اب سامنے یورپین طرز کا ہی کچن نظر آرہا تھا۔ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن تھی۔ ملگجا سا اندھیرا اب گہرے اندھیرے میں بدل گیا تھا۔ ذی شاہ تو جیسے اس جادونگری میں آکر پچھتا رہا تھا۔ وہ کیونکر یہاں چلا آیا؟ پھر جیسے گھبراہٹ نے اس کے دل پر پنجہ مار دیا تھا۔ اتنا اندھیرا تھا کہ حد نہیں..... اس نے آگے بڑھ کر اندازے سے سوئچ بورڈ تلاشنے شروع کردیے تھے۔

تب ایک کمزور، نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے آگے پیچھے ہوا تھا۔ یہ آواز منکشے کی تھی۔

''دائیں سمت گلاس وال کے قریب کارنر شیلف پہ لیمپ رکھا ہے۔'' وہ اس کی رہنمائی کررہی تھی۔ گویا اندھیرے میں بھی وہ ذی شاہ کی آواز پہچان چکی تھی۔ اس کی خوشی اور غرور کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ تو جیسے نہال ہی ہوگیا۔ لمحے بھر میں یہاں آنے کا فیصلہ درست لگنے لگا تھا مگر یہ اندھیرا، بےترتیبی، گھٹن، جگہ، جگہ بکھرا سامان، یہ لڑکی اتنی گندی، بےترتیب اور بےحس تھی؟ اسے گندگی، غلاظت اور گھٹن سے الجھن نہیں ہوئی تھی؟ وہ مزید بھی شاید کچھ سوچ لیتا مگر منکشے کی آواز نے اسے ایک مرتبہ پھر نہال کردیا تھا۔

''ذی شاہ.....! اب آچکے ہو تو اندھیرے سے مانوس ہونے مت کھڑے ہو۔ یہ اندھیرے صرف میرے لیے ہیں۔ ان میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔'' وہ بھیگی آواز میں بول رہی تھی۔ ذی شاہ تو اسی بات پر سرشار ہوگیا تھا کہ اسے ابھی تک اس کا نام یاد تھا۔ یقیناً وہ نہیں جانتا تھا کہ سامنے یا آس پاس موجود لڑکی کی... یادداشت غضب کی تیز تھی۔ اس کے قریب کوئی گلا کھنکھار کے گزر جاتا تو وہ بنا دیکھے اس شخص کی آواز سے اسے پہچان سکتی تھی چاہے وہ آدمی دس سال بعد اس کے قریب سے گلا کھنکھار کے گزرتا۔ وہ قیامت کا ذہن رکھنے والی لڑکی تھی مگر اب اسے بہت سی باتیں بھولنے لگی تھیں۔

وہ جیسے سانس روکے محض منکشے کو محسوس کررہا تھا وہ روشنی میں اس اندھیرے کا طلسم توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روشنی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ منکشے کی سانسوں کا ردھم سن رہا تھا۔ دلِ بےتاب کی نہ جانے کیا حالت تھی! کوئی اس پل ذی شاہ کے اندر اتر کر تو دیکھ لیتا۔

''ذی شاہ! سنتے نہیں ہو؟'' منکشے جیسے تھک کر بول رہی تھی۔ وہ لمحے بھر میں ٹھٹک سا گیا۔

''منکشے! تم کہاں ہو؟'' ذی شاہ بےتابی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ٹٹول، ٹٹول کر کچھ تلاش کررہا تھا۔

"میں یہاں ......وہاں، کہاں، جہاں......
جہاں تم محسوس کرو، میں وہیں موجود ہوں گی۔" آواز میں بوجھل پن اور قیامت کی اداسی اتر آئی تھی۔ ذی شاہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پایا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں غضب کا تلاطم تھا۔ ہر دھڑکن بڑے ترنگ کے عالم میں کچھ انوکھا راز منکشف کر رہی تھی۔

"میں تو یہاں، وہاں، ہوں تمہارے دل میں ہر جگہ، ہر کونے میں۔" کوئی اس کے اندر بڑے جذب کے ساتھ پکارا تھا۔ اس پکار پہ ذی شاہ کے لبوں پر جیسے مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"ہاں، تم یہاں ہو۔" اس کا روم، روم پکار اٹھا تھا، اس نے اپنے مقامِ دل پر ہاتھ رکھا۔ منکشے جیسے اپنی جگہ پہ تھم گئی تھی۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اِدھر دیوانگی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ وہ جیسے دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔ اسے روشنی چاہیے تھی مگر روشنی کہاں تھی۔"

"ذی شاہ! سامنے آؤ ناں......" اس التجا پہ وہ فنا نہ ہو جاتا...... ذی شاہ کے اندر باہر روشنیاں بھر گئی تھیں۔ اب بیرونی اندھیرے کیا معنی رکھتے تھے؟ سفرِ محبت میں وہ تنہا کہاں تھا؟ یہ گندی سندی خبطی سی لڑکی بھی تو اس کے ہمراہ تھی۔ وہ بھی تو پہلی نظر کے عشق میں گرفتار ہونے والی تھی۔ وہ بھی تو بِنا سوچے عشق کے پل صراط پر چلنے والی تھی۔ جیسے کچھ پل کے لیے قیامت خیز سی خاموشی ماحول پر چھا گئی تھی۔ پھر کوئی ٹوٹے لہجے میں آرزدگی سے بولا تھا۔

"ہر دفعہ میرے لیے امتحان بن جاتے ہو۔ سامنے ہو کر بھی سامنے نہیں آتے۔ میں سایوں اور خوابوں میں تمہیں تلاش کر کر کے تھک چکی ہوں۔ تم ایسے الوژن ہو جو میرے دل کا ناسور بن گئے۔" وہ کسی دیوار سے ٹیک لگائے بے آواز رو رہی تھی اور ذی شاہ سے اس کی آواز میں گھلے آنسوؤں کی اذیت محسوس نہ کی گئی پھر بھی جیسے اس کا دل مٹھی میں آ رہا تھا۔ ہاں، عورت کے آنسو دیکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، کم از کم ذی شاہ کسی روتی ہوئی عورت کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اور پھر وہ عورت جو اپنے تمام تر بے ڈھنگے پن، گندگی اور بے حسی کے باوجود اس کے حواسوں پر چھا چکی تھی۔ بھلا اسے کیسے روتے دیکھ سکتا تھا؟ وہ اندازے سے چلتا گلاس وال ٹٹولنے لگا۔ پھر اسے جلد ہی لیمپ کا بٹن نظر آ گیا تھا۔ لیمپ تک پہنچنے کے دوران نہ جانے کتنی ہی چھوٹی، چھوٹی چیزیں اس کے پیروں سے ٹکرائی تھیں۔ تاہم وہ لیمپ کا بٹن آن کر ہی چکا تھا۔ ایک بٹن دبانے سے پورا لاؤنج روشنی سے بھر گیا تھا۔ زرد مگر آنکھوں، چہروں اور چیزوں کو واضح کرتی روشنی...... جیسے گھر کی ایک، ایک الٹی پلٹی پڑی چیز دکھائی دینے لگی تھی۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر، میلی جرابیں، جوتے، چپلوں کا ایک پہاڑ صوفے کے قریب پڑا تھا۔ دوسرے صوفے پر میلے ملبوسات کی گٹھڑی رکھی تھی جس سے کپڑے ابل، ابل کر باہر گر رہے تھے۔ یہ کمرا ڈائننگ روم تھا۔ اس سے آگے کھلا کچن جو تھوڑا اونچا بنایا گیا تھا۔ چار پانچ اسٹیپ چڑھ کر کچن میں داخل ہوتے تھے اور وہ تیسرے پر بیٹھی تھی اور جیسے رینگ کر مکوڑے کے مانند اوپر جا رہی تھی۔ اسے شاید کچن تک جانا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی خالی بوتل تھی، جس میں ایک آدھ قطرہ یقیناً پانی کا موجود تھا۔ وہ ڈھکن کھول کر بے تابی سے پانی کا ایک قطرہ زبان پر چھینکنے لگی۔ ذی شاہ جیسے دنگ رہ گیا تھا۔ وہ شدید پیاسی تھی اور پانی کے لیے شاید مر رہی تھی۔ فی الوقت وہ ذی شاہ کی موجودگی بھلائے اپنے خشک روکھے، حلق کو تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی خاموشی سے ذی شاہ سمجھ گیا تھا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پپڑی زدہ خشک ہونٹ، قحط زدہ سی شکل، نحیف کمزور بے جان ہوتا وجود...... بکھرے، الجھے گندے بال...... جانے وہ کب سے بالوں کو گندا رکھے ہوئے تھی۔ جوڑے کی شکل میں الجھے بالوں کا گولا گردن سے لٹک رہا تھا۔ وہ مورگن روک (رات کے چوغے) میں ملبوس تھی، شاید پنک کلر کا ڈریسنگ گاؤن تھا جو فی الحال اپنی اصلی رنگت کھو چکا

تھا۔ اپنی تمام تر گندگی کے باجود وہ بلا کے ساحر ترین نقوش رکھنے والی لڑکی تھی۔ خصوصاً اس کی اندر تک اتر جانے والی لانبی گہری آنکھیں، سفید بے داغ رنگت......وہ مغربی عورتوں والی سفید گلابی جعلی نما رنگت نہیں رکھتی تھی بلکہ بے انتہا کشش بھی تھی۔ ترشی ہوئی مغرور سی ناک، بھرے بھرے تراشیدہ ہونٹ...... خوب صورت چہرہ مگر انتہائی اذیت سے پُر۔ ذی شاہ نے بے تابی سے اس کا پیر دیکھا تھا جس کی بینڈیج تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔ خون سے پٹی خشک اور اکڑ چکی تھی تو کیا اس نے دوبارہ بینڈیج نہیں کروائی؟ وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی اور ضرورت کے لیے فرش پہ رینگتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ کس قدر اذیت اور تکلیف میں تھی اس کی بے بسی، درد اور اذیت نے ذی شاہ کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

''انسان اتنا بے بس ہو جاتا ہے؟'' وہ اسے رینگ کر فریج تک جاتے دیکھ رہا تھا پھر جیسے وہ ہوش میں آکر منکشے کی طرف لپکا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ فریج تک پہنچ گیا تھا پھر اسے وہیں روک دیا اور سہارا دے کر اسٹول پر بٹھایا اور فریج کھول کر اندر سے جائزہ لیا...... مگر یہ کیا......؟ فریج بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک پانی کی بوتل تک نہیں تو کجا کوئی کھانے کی چیز وہ حیران ہونا ترک کر کے نلکے تک آیا...... گلاس میں پانی بھر کے دوبارہ اس کے لبوں سے لگایا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گئی تھی پھر منکشے نے اور پانی مانگا۔ کم از کم چار گلاس پانی پی کر جیسے وہ سر تھامے میز پر ڈھے گئی تھی۔ نہ جانے وہ کب سے پیاسی تھی؟ چلنے پھرنے سے معذور ہونے کے باعث پیاس سے نڈھال پڑی تھی اور جب پانی کے بغیر نہ رہا گیا تو وہ رینگ، رینگ کر پانی لینے پہنچ گئی۔ انسان اپنے خاندان اور گھر بار والوں کے بغیر کیسے ہوتا ہے؟ اگر بیمار پڑ جائے تو تنہائی میں رینگنے والا کوڑا بن جاتا ہے۔ انسان لوگوں کے بغیر تنہا کیسے رہ سکتا ہے؟ اللہ نے خاندان، رشتے، بہن، بھائی، ماں، باپ، عزیز و اقارب اور دوست وغیرہ اسی لیے تو بنائے ہیں تاکہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ایک دوسرے کے کام آسکیں۔

''دکھ اور سکھ میں۔'' وہ جیسے زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ اسی دکھ کی سانجھ بنائی گئی ہے تاکہ آدمی تنہا سسک، سسک کر مر نہ جائے۔ کوئی تو ہو جو دو بوند پانی ہی حلق میں ٹپکا دے، ماں، باپ، بہن، بھائی، اولاد، دوست، شوہر، اللہ نے ہر انسان کو بے شمار رشتوں سے نوازا ہے اور پھر بھی اس کروڑوں، اربوں، کھربوں لوگوں کی دنیا میں کوئی بدنصیب منکشے جیسا اکیلا بھی ہوتا ہے۔ جس کے دکھ اور سکھ کی سانجھ کرنے والا کوئی نہیں جو اسے دو بوند پانی ہی پلا دے۔ کوئی انسان اتنا بھی قلاش نہیں ہوتا کہ اس کے پاس کوئی رشتہ ہی نہ ہو؟ کیا خبر منکشے کے پاس رشتوں کی قلت ہو مگر کوئی دوست، عزیز ملنے ملانے والا بھی نہیں تھا؟ جو اس کی بیماری کے دنوں میں مدد کر دیتا؟ حتیٰ کہ کوئی پڑوسی ہی...... ذی شاہ جیسے دم بخود سوچ رہا تھا۔ ہکا بکا اور متحیر...... بے چین اور مضطرب سا...... اور وہ نڈھال سی لڑکی جیسے اس کی سوچ میں اتر گئی تھی۔

''میرا کوئی بھی نہیں...... میں تنہا ہوں، لاوارث ہوں، میرا کوئی وارث نہیں۔'' وہ میز کی گرد آلود سطح پر سر رکھے پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تب ذی شاہ نے بے قراری سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ منکشے کا کُرلانا اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا دل سیال بن کر منکشے کے آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گیا۔

''تمہارے ماں، باپ......؟'' اس نے منکشے کے سر پر ہاتھ پھیرا...... اس کے بال گرد میں لتھڑے تھے جیسے سالوں سے انہیں شیمپو نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اپنی اصلی اور حقیقی رنگت کھو رہے تھے۔

''نہیں ہیں۔'' وہ تڑپ، تڑپ کر رو دی تھی۔

''بہن، بھائی......؟'' اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ جیسے کسی غبار میں جکڑ گیا تھا...... جیسے کسی بھاری سل

کے نیچے دب گیا تھا۔

"نہیں ہیں۔" منکشے اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو جیسے کسی نے ٹونٹی کا ہینڈل کھول دیا ہو...... یا کسی کوہ سے پھوٹنے والا مسلسل چشمہ......"اللہ! یہ چپ کیوں نہیں ہورہی؟" وہی بے بسی...... منکشے کے آنسو اس کا اضطراب بڑھا رہے تھے۔

"کوئی دوست، کوئی عزیز......؟" ذی شاہ نے بے قراری سے پوچھا تھا۔

"نہیں ہے۔" وہ اور اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ اپنا سر میز پر پٹخ، پٹخ کر رو رہی تھی۔ اور ذی شاہ کے دل کو دھچکے لگ رہے تھے۔"یا اللہ......! اس کے آنسو رکتے کیوں نہیں۔"

"اور کوئی پڑوسی؟" اس کی اپنی آواز بھی تھکنے لگی تھی۔ کوئی رشتوں کے معاملے میں اتنا بھی مفلس ہوتا ہے؟ اتنا بھی غریب ہوتا ہے؟ جس کے پاس ایک اچھا ہمسایہ بھی نہیں ہو جو مرتے وقت اس کی خبر گیری کرلے۔ کوئی اتنا کنگال بھی ہوتا ہے؟ وہ جیسے خاک خاک ہوگیا تھا اور وہ کسی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی جارہی تھی۔

"نہیں ہے، میرا کوئی بھی نہیں، صرف تم ہو، مجھے تمہارا قرنوں (صدیوں) سے انتظار تھا اور تم میرے پاس چلے آئے، میں شانت ہوگئی۔ میں کنگال ہوکر بھی مالا مال ہوگئی۔" اس نے عجیب دیوانگی کے عالم میں ذی شاہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ مدہوش، حیران اور گم صم......

"مجھے یقین نہیں آتا...... تم میری طرف لوٹ آئے ہو۔" اس نے پاگل پن کی انتہا کردی تھی۔ ذی شاہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا اور وہ حیرت زدہ کیوں نہ ہوتا منکشے تو یوں بات کررہی تھی جیسے ان کا جنم جنم سے ساتھ تھا پھر بیچ میں جدائی آگئی...... اور اب دوریوں کے بعد پھر سے ملاقات ہورہی تھی۔ وہ اسے دم قدم حیران ہی تو کررہی تھی۔ وہ اس سے اپنی بے تابیوں کی باتیں کیے جارہی تھی اور وہ حیران تھا۔

"اللہ یہ پاگل تو نہیں؟ یقیناً افراہیم نے ٹھیک کہا تھا، یہ پاگل ہے، بھلا میری اور اس کی ملاقات کب ہوئی؟ کبھی نہیں، گنتی کے چند دن پہلے تو میں نے اسے دیکھا ہے اور اس نے مجھے تو پھر یہ جنم، جنم کی باتیں؟"

"میں پاگل نہیں......" منکشے جیسے بنا اس کی طرف دیکھے جیسے ذی شاہ کی سوچ پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر دم بخود رہ گیا تھا۔

"تم حیران ہو رہے ہو...اور سمجھ رہے ہو میں پاگل ہوں، ایسا کچھ بھی نہیں، کاش میں پاگل ہو جاتی...... مگر یہ ممکن نہیں...... میری سزا میرے حواس ہیں جو میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے...... چلو اس بات کو جانے دو...... میں تمہیں اپنی محبت کا بتاتی ہوں، تمہاری محبت میرے لیے پوائزن کے مانند ہے، اس نے مجھے میٹھا بنانے کے بجائے زہریلا کردیا۔" وہ اونچی آواز میں پھر سے رونے لگی تھی۔

"یہ میری زندگی کا بہت بھیانک سچ ہے۔" اس نے رونا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تو اندر کے میل کچیل، غلاظتوں اور کثافتوں کو بہا رہی تھی پھر کیسے رونا ترک کردیتی؟

"کیا یہ بھی سچ ہے؟ کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" وہ سراپا سوال بن گیا تھا۔ سامنے بیٹھی عجیب لڑکی نے اسے حواس باختہ کردیا تھا۔ ابھی پچھلے ایک سو پینتالیس گھنٹوں میں وہ یہ سوچتا رہا تھا وہ اس خبطی آئٹم سے کبھی اظہارِ محبت کر بھی سکے گا؟ اور کیا وہ اس کی محبت پہ یقین کرے گی؟ اور اس کی سوچوں، وسوسوں، خدشوں سے الگ یہاں سب کچھ الٹ ہو رہا تھا۔ اتنا الٹ کہ اس کی اپنی عقل دنگ رہ گئی تھی۔

"میں نے تمہیں دیکھا اور تم میرے حواسوں پر چھا گئے؟" وہ ذی شاہ کو بتا رہی تھی، وہ ایک مغربی لڑکی تھی۔ اظہار کے معاملے میں جھجک نہیں سکتی تھی اور وہ ایک مشرقی لڑکا تھا۔ اگرچہ تھوڑا بے باک ہی سہی...... مگر پھر بھی اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی سے بہت عجیب طرح کی باتیں اور اظہارِ محبت سن رہا تھا۔ وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر آئی لو یو والی کہانی نہیں دہرا رہی

تھی۔ وہ تو بڑی عجیب ترین کہاوت سنا رہی تھی۔

اس نے ذی شاہ کو کہاں دیکھا؟ شاید سامنے والے گھر میں کہیں آتے جاتے؟ وہ اس بحث یا گہرائی میں نہیں پڑا تھا۔ اس نے سوال اور نکتے نہیں اٹھائے تھے۔ اس کی خوشی، فخر اور انبساط کے لیے اتنا ہی کافی تھا، سفرِ محبت میں وہ اکیلا نہیں، ڈار سے بچھڑی یہ کونج اس کے ہمراہ تھی۔ وہ اسی بات پر جیسے دل بادشاہ کے سامنے تعظیماً جھکا ہوا تھا۔

"میں حیران ہوں، تم میرے سامنے مجسم بیٹھے ہو پھر بھی بے یقینی ختم نہیں ہوتی۔" اب وہ خود سے ہی مسکرا رہی تھی۔ بڑی حیران کردینے والی مسکراہٹ تھی پھر وہ حیران کیسے نہ ہوتا۔

"میری منزل کہیں نہیں تھی، رستہ انجانا تھا، میں پھر بھی بھاگتی رہی، اندھا دھند، بنا رستوں کی کٹھنائیاں دیکھے...... آبلے پیروں میں پڑے۔ پاؤں فگار ہوئے، آنکھیں پھوٹیں، رشتے ٹوٹے مگر میں پھر بھی نہ رکی۔ کتنی احمق تھی میں، انجانے رستوں پہ بھاگتی رہی، اس بات سے بے خبر کہ اوپر تدبیر کرنے والا منزل کو اپنے وقت پر میرے سامنے لاکھڑا کرے گا مگر میں انجان تھی، سمجھ ہی نہیں پائی۔ اپنے طور پر تدبیر کی تو وہی تدبیر میرے منہ پر الٹ دی گئی۔" وہ ہنستے، ہنستے پھر سے رونے لگی تھی۔

"نہیں اسے اب رونا نہیں، بالکل نہیں......، یا اللہ بس یہ چپ کر جائے۔" اس کا دل پھر سے... گڑگڑانے لگا تھا۔ پھر جیسے وہ خود ہی چپ کرگئی تھی۔ شاید رونے نے اس کو نڈھال کردیا تھا۔ اس کی پوری طاقت جیسے نچڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے غبار چھانے لگا۔ ذی شاہ گھبرا گیا تھا۔ اس نے منکشے کا کندھا ہلایا۔

"کیا پانی چاہیے؟" وہ بھاگ کر گلاس پھر سے بھرنے لگا تھا۔ منکشے ایک دو تین اور پھر چوتھا گلاس بھی پی گئی پھر اس نے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔

"اِدھر میرے کمرے میں یا لاؤنج میں یا پھر اُدھر کیبنٹ میں کوئی بسکٹ، نمکو یا کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈ دو، میں تین دن سے بھوکی ہوں...... مجھ سے بولا نہیں جارہا......" وہ میز پر سر رکھے نیم جاں سی ہوگئی تھی، ذی شاہ کا سر گھوم گیا تھا۔

"تین دن سے بھوکی......؟" وہ جیسے خود پر لعنت بھیجتا کیبنٹ دھڑ دھڑ کھولنے لگا۔ وہ تین دن سے بھوکی تھی، فریج خالی پڑا تھا۔ گھر میں کچھ تھا نہیں، وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی، شاید کل وہ رینگ رینگ کر سڑک تک گئی ہوگی اسی امید پر کہ شاید ذی شاہ اسے دیکھ لے

مگر ذی شاہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ بس ایمل نے اسے دیکھا مگر ترس کھا کر اندر چلی گئی۔ اس کی مدد نہیں کی، ممی اور افراہیم کے خوف سے، وہ فرمانبردار لڑکی تھی، منکشے کی مدد کیسے کرتی؟ ذی شاہ کو اپنی غفلت پر غصہ آرہا تھا۔ بھلا اس نے خود منکشے کی خبر گیری کیوں نہیں کی؟

کیبنٹ سارے خالی تھے، کچن میں راشن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ چینی، پتی تک بھی نہیں تھی۔ یہ لڑکی مسافروں کی طرح اس گھر میں رہ رہی تھی؟ مگر مسافر بھی تو اپنے زندہ رہنے کا سامان ساتھ رکھتا ہے۔ اسے منکشے کی بے حسی اور بے پروائی پر بھی تاؤ آیا تھا۔ پھر اس نے دو چار باتیں اسے سنا بھی دی تھیں۔

''یہ گھر ہے یا کوئی غار......؟ جہاں زندہ رہنے کے لیے خوراک کا ایک ٹکڑا تک نہیں۔'' وہ زیرِلب بڑبڑاتا ایک کیبنٹ سے بسکٹ کا چورا نکال لایا تھا۔ چوہوں نے کتر، کتر کر بسکٹ کا سفوف بنا ڈالا تھا۔ اسے گھن سی آئی تھی جبکہ منکشے خوراک دیکھ کر جانوروں کی طرح پیکٹ پر جھپٹی تھی۔

''مجھے یہی دے دو......'' وہ ندیدوں کی طرح پیکٹ چھین لینا چاہتی تھی مگر ذی شاہ نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس نے پیکٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا پھر جیسے بہت محبت اور نرمی سے بولا۔

''یہ میری گھڑی اپنے پاس رکھو اور وقت نوٹ کرتی جاؤ، میں پورے نو منٹ بعد یہاں آجاؤں گا۔ تم اس دوران یہاں سے ہلنا مت......'' اس نے گھڑی منکشے کے ہاتھ میں پکڑائی تھی پھر پیکٹ کو ڈسٹ بن میں پھینکنے کی غلطی کیے بغیر لمبے، لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ رستے میں اس نے ڈرم دیکھ کر گندا بدبودار بسکٹ کے چورے والا پیکٹ پھینک دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا یہ گندا چورا منکشے ڈسٹ بن سے نکال نہ لے۔ خوراک دیکھ کر اس کی حالت کچھ ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اس نے بیکری سے کئی چیزیں لیں اور ساتھ ہی ناشتے کا کچھ سامان...... اور پھر ایک چھوٹے سے ہوٹل سے کھانا پیک کروا کر وہ نو منٹ سے بھی پہلے واپس ولیس ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک اسی اسٹول پر دونوں ہاتھوں میں اس کی رسٹ واچ کسی مقدس تبرک کی طرح عقیدت کے ساتھ تھامے بیٹھی تھی حیران، گم صم، متحیر اور بے خودی کے عالم میں دیکھتی ہوئی۔ وہ نو منٹ سے پہلے واپس آچکا تھا۔ حالانکہ اتنی دیر میں وہ سمجھ چکی تھی۔ شاید وہ اب دوبارہ غلاظتوں کے ڈھیر میں واپس نہیں آئے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ وہ واپس آیا مگر اتنا سامان اٹھا کر...... کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اسے پاگل کرنے لگی تھی۔ وہ بغیر کسی اور چیز کی طرف دھیان دیے جیسے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔

مچھلی، چوزے کے گوشت کا سالن اور گرما گرم چاول اس نے سر پلیٹ میں گھسا دیا تھا۔ وہ چمچے، کانٹے کا تکلف کیے بغیر ہاتھوں سے کھانا کھا رہی تھی۔ جبکہ ذی شاہ اسی غم میں آدھا ہوا جا رہا تھا جانے اس نے ہاتھ دھوئے بھی یا نہیں۔

''ہاتھ دھلے ہوئے صاف تھے۔'' اس نے تلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا پیس کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ تھی پھر بھی اس کی سوچ میں گھس گئی تھی۔ وہ بے انتہا حیران ہوا تھا۔ منکشے ابھی تک اسے حیران ہی کرتی آئی تھی۔ وہ منکشے کی پرت در پرت شخصیت کے الجھاوے میں الجھ رہا تھا۔

''کھانا بہت مزیدار تھا۔ بہت شکریہ اے اللہ......'' اب وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھائے نم آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔ پورے چار منٹ سے بھی پہلے وہ کھانا ختم کر چکی تھی۔ اب گوشت کی باقیات یعنی ہڈیاں بچی تھیں یا پھر مچھلی کا ایک آدھ قتلا...... جسے ذی شاہ نے احتیاط سے پلیٹ میں ڈھک کر فریج میں رکھنا چاہا مگر فریج بھی گندا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ایک صافی کو گرم پانی سے بھگو کر گزارے لائق فریج صاف کر ہی دیا تھا پھر ایک، ایک چیز فریج میں ترتیب سے رکھ دی۔ وہ اس دوران دونوں کہنیاں میز پر سجائے ہاتھوں کے پیالے میں منہ رکھے بڑی محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی بے خودی اور دیوانگی کے عالم میں...... اسی سرشاری اور خواب کی سی کیفیت

میں، جیسے اسے یقین نہیں آرہا تھا، وہ اپنے سامنے اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔ مشرق کی سرحدوں کے پار سے آنے والا شہزادہ جو مغرب کی ایک پاگل، پاگل لڑکی کا اسیر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے اپنے، اپنے انداز میں بڑی انوکھی محبت کی تھی۔

وہ اپنا کام ختم کر چکا، تب اس کے پیر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ بھیگی پٹی اب خشک ہو چکی تھی اور خون کی وجہ سے اکڑ چکی تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر قینچی دریافت کی تھی۔ لاؤنج کے بکھرے پھیلاوے کو پھاندتا منکشے کی نشاندہی پر کسی کپ بورڈ سے فرسٹ ایڈ باکس بھی نکال لایا تھا۔ اب قینچی کی مدد سے بینڈیج کاٹ رہا تھا۔ اگرچہ منکشے اپنے زخم پر مرہم لگوانے کے حق میں نہیں تھی مگر ذی شاہ کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

اس نے زخم کا جائزہ لیا تو وہ پہلے سے بگڑا نظر آیا۔ ایک آدھ ٹانکا تو اس کے چلنے پھرنے کی کوشش کے باعث اکھڑ چکا تھا۔ اور وہ ایسی باہمت اور دیدہ دلیر تھی کہ زخم کا جی جان سے تکلیف سہہ کر مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ تاسف سے اس کا پیر دیکھ کر بولا۔

''زخم کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو وہ ناسور بن جاتا ہے۔'' اب وہ باریک بینی سے زخم کا جائزہ لیتا سوچ رہا تھا کہ مزید کیسے ٹریٹمنٹ دے...... کاش کہ وہ ڈاکٹر ہوتا؟ کم از کم منکشے کی تکلیف دور کر دیتا۔

''ناسور تو بن چکا......'' وہ جیسے اذیت سے مسکرا دی تھی۔ ''تم رہنے دو ناں...... یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔'' اسے میٹھی نظروں سے تکتی وہ بے پروائی سے بولی تھی۔ تب ذی شاہ بگڑ گیا تھا۔

''خود کیسے ٹھیک ہو گا؟ جب تک علاج نہ ہو؟'' اس کے تیور برہم تھے۔ اب وہ کسی ڈاکٹر کو بلوانا چاہتا تھا کیونکہ صرف بینڈیج نہیں کرنا تھی، زخم کی صفائی اور ایک آدھ ٹانکے بھی دوبارہ لگنے تھے۔ اسے زخم کی گہرائی میں پس بھری بھی دکھائی دے رہی تھی۔

''ڈاکٹر نے جو میڈیسن دی تھیں تم نے استعمال کیں؟'' ذی شاہ نے خاصے متفکر لہجے میں پوچھا تھا۔ جبکہ جواب بے پروائی سے بھرپور تھا۔

''نہیں...... ڈرم میں الٹ دی تھیں۔'' وہ اب اسے میٹھی، میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''اللہ، یہ قاتل نظریں!'' ذی شاہ کا دل ڈول گیا۔ وہ حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ منکشے کی طرف نہیں دیکھے کیا قیامت خیز نظریں تھیں۔

''اللہ اکبر......'' اس نے برہم ہو کر اسے گھورا...... ''اس سے بہتر یہ نہیں تھا کہ تم دوائی اس کیمسٹ کے یا میرے ہی منہ پر مار دیتیں۔ وہ بے چارہ خواہ مخواہ کیپسولز میں کوٹا ہوا سفوف بھر رہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی، اس کی بنائی ساری دوائیاں لوگ ڈرم میں الٹ دیتے ہیں۔'' وہ بھگو بھگو کر مار رہا تھا اور منکشے قاتل نظروں سے دیکھتی مسکرا رہی تھی۔

''خدایا ان قاتل نگاہوں پر کوئی دفعہ نہیں لگتی؟ ہزاروں مارتی اور ہزاروں گراتی ہوں گی، یہ قاتل آنکھیں، یہ پاگل آنکھیں۔'' وہ جیسے دل کی حالتِ زار پر بے بس سا سوچ رہا تھا۔ دوسری طرف مسکراہٹوں سے اس کا کام تمام کیا جا رہا تھا۔ پہلے آنسو اور اب مسکراہٹوں کا ہتھیار پکڑ لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں گت ذی شاہ کی ہی بننے والی تھی۔

''میں نے دوائیاں ڈرم میں الٹ دی تھیں جبکہ تمہارے دیے ٹشو سنبھال لیے۔'' وہ اس کو مزید حیرتوں کے سمندر میں دھکیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا۔

''کہاں سنبھالے......؟'' ذی شاہ نے چونک کر پوچھا تھا تب اس نے مورگن روک کے کھلے گھیر میں موجود ایک جیب میں سے ٹشو نکال کر دکھائے مسلے ہوئے میلے کچیلے ٹشو...... ذی شاہ کا جی متلا گیا۔ اس کا خیال تھا زکام زدہ ٹشو محترمہ نے چوغے میں اڑس رکھے تھے مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔

''یہ نزلے والے نہیں، میرے آنسوؤں میں بھیگے ہیں، مجھے بھیگی اور گیلی چیزیں پسند نہیں...... مجھے گیلے شہروں، گیلی آنکھوں سے نفرت تھی، مجھے من ہائیم سے بھی نفرت تھی۔ اُدھر سرما میں بہت برف پڑتی اور

بارشیں تو اتر سے ہوتیں۔ سڑکیں، گھر، لان، درخت، پودے سب بھیگ جاتے...... بارش کی وجہ سے شہر بہت گیلا اور برف کی وجہ سے غلیظ ہو جاتا ہے۔ مجھے بس بواریا پسند تھا۔ آہ، میرا بواریا مجھ سے چھن گیا۔'' وہ بولتے، بولتے کہیں کھوئی تھی۔ کانچ سی حسین رنگ بدلتی آنکھوں کا عکس اس کی روح تک میں پھیل رہا تھا۔ اس نے ٹشو کی وضاحت کر کے جتا دیا تھا کہ وہ جو سوچ رہا ہے ٹھیک نہیں، یہ ٹشوز کام زدہ نہیں بلکہ آنسوؤں میں بھیگے تھے خیر، اب تو خشک بھی ہو چکے تھے۔ اب وہ بواریا کے دکھ میں مدہوش ہو گئی تھی۔

''اُف یہ بواریا اب کون تھا؟ کسی کا اسم شریف یا؟''

''مجھے گیلی آنکھوں، غمزدہ چہروں سے بھی نفرت تھی۔ میں دوسروں کے آنسوؤں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ حقارت کسی بھی صورت میں ہو، تکبر کی ایک شکل ہوتی ہے اور تکبر اللہ کو پسند نہیں...... اسی لیے آنسو میری سزا بن گئے اور عمر بھر کے لیے میری آنکھوں سے پھوٹ پڑے...... کبھی نہ رکنے کے لیے......'' وہ پھر سے بے آواز روتی رہی تھی۔ اسے رونے کے لیے آواز کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر سات، آٹھ، دس یا پندرہ منٹ بعد اس کی آنکھیں خود بخود گیلی ہونے لگتی تھیں۔ من ہائیم کی منکشے اور اس کی گیلی آنکھیں اسے گیلے شہروں اور گیلی آنکھوں سے نفرت تھی پھر وہ کیوں اس گیلے شہر میں رہ رہی تھی؟

''من ہائیم کو چھوڑ بھی دیتی تو کیا فرق پڑنا تھا؟ یہ گیلی آنکھیں تو ساتھ تھیں جنہیں خود اپنے ہاتھ سے پھوڑنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔'' منکشے میٹھی نظروں سے دیکھتی اس کے تاثرات پڑھ رہی تھی، وہ نہ بھی دیکھتی تب بھی ذی شاہ کا چہرہ اور سوچ پڑھنا مشکل تو نہیں تھا؟ کھلی کتاب جیسا چہرہ، جس پر ایک، ایک لفظ لکھا تھا۔

''تم اتنی بہادر ہو کہ یہ کام بھی کر سکتی ہو۔'' ذی شاہ اس کے پیر کو چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر بکھری چیزوں سے بچتا بچاتا فون تک گیا تھا۔ توقع تو نہیں تھی پھر بھی اسے ٹیلی فون ڈائریکٹری مل ہی گئی تھی۔ اس نے سب سے قریبی ڈاکٹر کا نمبر دیکھ کر کال کی تھی مگر اس سے بھی پہلے منکشے سے پوچھا تھا۔

''از دیئر آ ڈاکٹر ہو کین اسپیک انگلش......؟''

اس نے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کیونکہ یہاں عام طور پر ڈچ ہی بولی جاتی تھی۔ منکشے نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر انگریزی بولنا جانتا ہے سو اس نے قریبی ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا تھا۔ جس نے اگلے پندرہ منٹ میں اس کے زخم کی صفائی کر کے بینڈ تیج کر دی تھی پھر ذی شاہ کی طرح ہی بکھرے پھیلاوے سے بچتا بچاتا بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھتا آگے بڑھ گیا تھا گویا آنکھوں میں اسے جتا کر گیا تھا۔ ''تم دونوں میاں بیوی بہت بد سلیقہ، پھوہڑ، اور گندے ہو۔''

ڈاکٹر کی نگاہوں نے اسے پانی، پانی کر دیا تھا۔ وہ جیسے اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

''بہت خبیث ڈاکٹر تھا۔'' وہ بھی زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ تب ذی شاہ اسے پکڑ اکر کارنر والے کمرے تک لے آیا تھا۔ اس کمرے کا حال بھی بہت برا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جسے وہ اپنے کمرے کی گلاس ونڈو سے دیکھتا تھا۔ کھڑکی کے سامنے مخصوص دو پردے لٹکے تھے، ایک سفید جالی دار نائیلون کا پردہ اور دوسرا اسلک کا پھولدار ریشمی...... اور سوائے پھولوں سے بھری ٹوکریوں کے کمرے کی ہر چیز بے ترتیب اور غلیظ تھی۔ گندے برتنوں سے لے کر کمرے کی آرائشی چیزوں تک اور بیڈ شیٹ تو جیسے سالوں سے دھوئی نہیں گئی تھی۔ اس کا جی بری طرح اوب گیا تھا۔ کہاں اس کا وہ بیڈ روم جو افراہیم نے سنوارا اور سجایا تھا۔ انتہائی شفاف، خوشبو دار اور امپورٹڈ فرنیچر سے سجا...... غسل خانہ اتنا چمکیلا، دودھیا ٹائلوں اور شیشوں سے جگمگاتا ہوا۔ اگرچہ فرنیچر یہاں کا بھی بہت اعلیٰ تھا ہر چیز امپورٹڈ تھی، بس صفائی، نفاست اور ترتیب کہیں نہیں تھی۔

وہ گھر جانے لگا تو باہر ایک دم چھم، چھم مینہ برسنے لگا تھا۔ یہاں کی بارشیں ساون کی بارشوں کو مات کرتی تھیں۔ جب دل کیا، برس پڑیں...... وہ لمحہ بھر کے لیے تھم سا گیا تھا۔

''اے ابرِ کرم...... ذرا تھم کے برس......'' اس نے نائیلون کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا...... مینہ چھاجوں چھاج برس رہا تھا۔ باہر گہری رات نے پر پھیلا رکھے تھے، اتنا وقت بیت چکا تھا، اسے گھر بھاگنے کی بے چینی ہوئی۔ اب تک افراہیم بھی آ چکا ہوگا؟ اس نے بے تابی سے سوچا تھا۔ اس کی lexus گیرج میں کھڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ذی شاہ نے گردن موڑ کر پردے برابر کر دیے تھے پھر فریج سے پانی کی بوتل، دودھ، جوس اور کچھ پھل وغیرہ نکال لایا تھا۔ جسے اس نے قریب سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''یہ تمہارے لیے رات کا سامان، صبح ناشتا میں لے آؤں گا۔ تم اٹھنے کی زحمت نہ کرنا۔'' اسے زبردستی دوائی دے کر ذی شاہ نے کچھ ہدایات کی تھیں پھر جیسے مینہ رکنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگلے پانچ منٹ تک بارش رک جائے گی۔ مگر اس کی امید بارش مزید تیز تر ہوتے دیکھ کر بجھ گئی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کر جیسے پھر سے التجا کی تھی۔

''اے ابرِ کرم...... ذرا تھم کے برس......'' وہ اونچی آواز میں درخواست پیش کر رہا تھا۔ پھر جیسے پیچھے سے آواز آئی تھی۔ مدھم، مسکراتی، ہوش اڑاتی آواز......

''اے ابرِ کرم...... آج اتنا برس، اتنا برس کہ وہ جا نہ سکے۔'' وہ ہتھیلیوں پر نگاہ جمائے کمبل سینے تک اوڑھے دوائی کے زیرِ اثر نیم غنودگی میں تھی۔ ذی شاہ کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ وہ جیسے لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گیا۔

''میں نے غلط نہیں کہا...... ویسے بھی بارش رکنے والی نہیں۔'' لمبی پلکوں کی جھالریں عارضوں پر گرائے وہ کسی منہ بند گلاب کی کلی جیسا تاثر دے رہی تھی۔ حسین، پُرکشش، اوس میں بھیگی...... ہاں، اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو گر رہے تھے۔ قطرہ، قطرہ، بند پلکوں کے جال میں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز

مسکراہٹ تھی اوس گلاب کی پنکھڑیوں پہ گرتی اتنی حسین لگتی ہے؟ ذی شاہ کی نگاہ بھی جیسے منجمد ہو گئی تھی۔

''تم رک جاؤ......'' غنودگی میں اس نے جیسے التجا کی تھی۔ یا اس کی بے آرامی کے باعث کہہ رہی تھی یا پھر بارش میں بھیگ جانے کی وجہ سے؟ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''سرما کی پہلی خطرناک بارش ہے، بیمار پڑ جاؤ گے۔'' اسے ذی شاہ کی فکر تھی، وہ جیسے نہال ہو گیا۔

''میں بیمار نہیں پڑتا...... بڑا سخت جان ہوں۔ یہ نرم بوندیں کیا کہیں گی۔'' اس نے مسکرا کر کندھے اچکائے تھے پھر بڑے شرارتی انداز میں پوچھنے لگا تھا۔

''تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگے گا؟'' اس کی آنکھوں میں بھی شرارت بکھر گئی تھی۔ تب اس نے اپنی نم آلود، بوجھل اور موتیوں سے بھاری پلکوں کو بہ مشکل اٹھا کر ذی شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

''نہیں......'' وہ بڑی سنجیدگی اور مستحکم انداز میں بولی۔

''کیوں......؟'' ذی شاہ حیران ہوا۔ ''تم تو کمزور بھی ہو، تنہا ہو، بے بس ہو سکتی ہو پھر مجھ پر اتنا اعتبار کیوں؟ میں فرشتہ ہرگز نہیں؟ یہ تم سوچنا بھی مت...... میری ہمدردی، خلوص اور ان عنایتوں سے یہ مت سمجھنا، میں کوئی نیک روح، فرشتہ قسم کا انسان ہوں۔'' وہ جیسے اسے خبردار کر رہا تھا اور منکشے اس پر کچھ اور منکشف کر رہی تھی۔

''میں نہیں سمجھتی، تم کسی ہمدردی، ترس یا خلوص میں اتنی عنایتیں کر رہے ہو...... یہ تو صرف محبت ہے، جسے میں نے تمہاری آنکھوں میں کھوج لیا...... ورنہ اس گھٹن زدہ، بدبودار، غلیظ ماحول میں تم کبھی نہ ٹکتے۔ میں جانتی ہوں، تم بڑے ہی نفیس، تر و تازہ اور خوشبوؤں میں بسے رہنے والے انسان ہو اور تمہیں یہاں انسانیت کی تکمیل کرنے، ترس کھانے اور ہمدردی جتانے نے نہیں روکا۔ تمہیں تو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔'' منکشے نے کیسے دھڑ دھڑ دھڑ اس کے دل کی جاگیر پر اپنے قدموں کی دھمال ڈال دی تھی۔ وہ کتنی عجیب، گہری، ذہین اور اندر تک کھوج لینے والی لڑکی

تھی؟ ذی شاہ جیسے دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا رہ گیا تھا، کیسے؟ کس طرح......؟ اور کیونکر اپنی محبت کا صفحہ اس لڑکی کے سامنے کھولے گا جس سے ذی شاہ کو پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے کیسے یقین دلائے گا؟ کس طرح بتائے گا؟ مگر وہ تو سارے پانسے الٹے بیٹھی تھی۔ اظہار کی نوبت ہی نہیں آسکی ......اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بن کہے پڑھنے لگے تھے۔ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف، صفحہ بہ صفحہ......

''اب تم جاسکتے ہو...... مگر دھیان سے جانا، ٹھہرو، وہ سامنے صوفے پر ایک گٹھڑی رکھی ہے، اس میں سے رین کوٹ نکال لو، باہر بہت تیز بارش ہے، تم بیمار پڑ گئے تو میں بھوکی مر جاؤں گی۔'' وہ آنکھوں پر بازو رکھے تمام تاثرات محفوظ کر گئی تھی۔ ذی شاہ کو اس کا مشورہ بھا گیا تھا۔ اس نے باہر نکل کر لاؤنج میں صوفے پر پڑی گٹھڑی کھولی تو ہر رنگ کے کپڑے ابل کر باہر آگئے، گندے، غلیظ اور بدبودار......اس نے ناک پر ہاتھ رکھے بیڈ پر لیٹی منکشے کو گھورا تھا۔

''کانچ تو تمہارے پیر میں تین دن پہلے چبھا ہے، یہ کپڑوں کا ڈھیر تو یوں لگتا ہے پچھلے ایک سال سے نہیں دھلا۔'' وہ اتنا نفیس، باسلیقہ اور نخریلا تھا کہ حد نہیں۔ ذرا سی گرد برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب پورے ایک گھنٹے سے اتنے گھٹن زدہ اور گندے ماحول میں ٹہلیں کر رہا تھا۔ اس کا طنز محسوس کر کے منکشے بند آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔

''دو ماہ پہلے لانڈری گئی تھی پھر وقت ہی نہیں مل سکا۔'' وہ جیسے صفائی پیش کر رہی تھی۔ وضاحت دے رہی تھی، ذی شاہ نے تیور بگاڑ کر جواب دیا۔

''تم ڈوچ لینڈ کی وزیراعظم ہو جو وقت نہیں مل سکا...... یہ کہو، انتہائی پھوہڑ خاتون ہو، ایک دم کام چور ......میری بہن بندیا کی طرح......'' ذی شاہ زیرِ لب... بڑبڑاتا کپڑوں کو چھانٹتا......اب بالآخر ایک عدد رین کوٹ ڈھونڈ ہی چکا تھا۔ لیڈیز اسٹائل میں یہ غلیظ اور بوسیدہ باس چھوڑ رین کوٹ فی الوقت اسے بھیگنے سے بچا سکتا تھا۔ تاہم اسے پہن کر افراہیم کے گھر جانے تک کا حوصلہ کرنا بڑا مشکل اور کٹھن ترین تھا۔

''مجبوری میں کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔'' منکشے کمبل میں منہ چھپا کر آخری مرتبہ بڑبڑائی تھی پھر شاید گہری نیند میں چلی گئی۔ وہ اس کے سو جانے کی تسلی کر کے دروازہ اچھی طرح بند کرتا برستے آسمان کے نیچے آ گیا تھا۔

''اے محبت......! بس تیری خاطر......'' وہ بھیگتا ہوا بھاگ کر روڈ کراس کر کے سامنے والے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ دو آنکھیں اس کے اوجھل ہونے تک کھڑکی کے ساتھ چپکی رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ چپکے سے لاؤنج میں داخل ہوا تھا یوں کہ کسی کو پتا نہیں چل سکے۔ افراہیم کے گھر کا لاک اندر باہر سے مخصوص نمبروں پہ کھلتا تھا جو اسے بتا دیے گئے تھے سو وہ بہ آسانی اندر آ چکا تھا۔ نیچے والے کمرے اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ آنٹی اور افراہیم دن بھر کے تھکے ہارے تھے تبھی جلدی سو چکے تھے۔ افریشم ابھی یہیں تھی جبکہ ایمل یقینی طور پر سو چکی تھی۔ وہ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا تھا۔ رین کوٹ اتار کر اس نے اپنے بازو پر رکھ لیا تھا۔ اس بدبودار کوٹ نے ذی شاہ کو بھیگنے سے بچا لیا تھا۔ سو وہ اسے بڑی پیار بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی یہ منکشے کا کوٹ تھا۔ چاہے جتنا بھی غلیظ اور بدبودار ہوتا، اسے تو پیارا ہی لگنا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں مگن گیسٹ روم کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ہال کی گلاس وال سے چپکی ایمل پہ اس کی نگاہ پڑی تھی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ ایمل گلاس وال سے ناک چپکائے ابھی تک باہر جھانک رہی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ ولیس ہاؤس سے نکلتا ذی شاہ اتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ اوپر آ جائے گا۔ تبھی وہ بڑی معنی خیزی کے ساتھ دیدے گھماتی باہر جھانک رہی تھی۔ مگر یہ کیا......؟ بھاری بوٹوں کی آواز اس کے پیچھے آنے لگی۔ وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹی تو نگاہ ذی شاہ پر پڑی تھی۔

''تت...... تم آ بھی گئے؟'' ایمل بوکھلا گئی تھی۔ تبھی الٹا سیدھا بول گئی۔ حالانکہ وہ اپنے یہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز بھی دے سکتی تھی مگر واہ ری قسمت......! وہ پکڑی جا چکی تھی۔ کچھ اور نہیں بلکہ ذی شاہ کی جاسوسی کرتی۔

''مجھے آنا ہی تھا...... ہمیشہ کے لیے تو نہیں گیا تھا؟'' ذی شاہ نے خاصی ناگواری سے اپنی لاڈلی فرینڈ کو دیکھا تھا۔ تب ایمل نے بوکھلاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

''میرا مطلب ہے بچ کر آ گئے......'' اب وہ بڑی مسرور نظر آ رہی تھی۔ گویا وہ اس کے لیے متفکر تھی۔ ذی شاہ غصہ بھلا کر مسکرا دیا تھا۔ حالانکہ اسے مسکرانا نہیں چاہیے تھا۔ وہ ولیس ہاؤس سے نکل کر آ رہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر، اگر پاکستان ہوتا تو اب تک فسانہ بن چکا ہوتا۔ ایک جوان لڑکی کی تیمارداری کر کے آنے کا جرم معمولی تو نہیں تھا۔

''ہاں، چھپکلی......! بس بچ کر آ گیا...... اس رین کوٹ کی بدولت...... ورنہ بارش تیز تھی۔'' اس نے مسکرا کر وضاحت کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ذی شاہ کے چھپکلی کہنے پر اس نے وضاحت نہیں مانگی تھی اور نہ چھپکلی کے معانی پوچھے تھے۔ ورنہ وہ اس کے پیچھے ہی پڑ جاتی تھی۔ مگر اس وقت خاصی مدبر نظر آ رہی تھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔

''بارش کی بات کون کر رہا ہے؟ وہ تو اندھوں کو بھی رین کوٹ نظر آ سکتا ہے، جس کی بدولت بارش کے قطرے ذرا بھی نہیں بھگوتے۔ میں تو لیڈیز رین کوٹ دیکھ کر کچھ حیران ہوں...... تم خبطی آئٹم کے گھر سے آ رہے ہو، پھر اس کے ہاتھوں زندہ کیسے بچ گئے؟'' محترمہ نے آنکھیں میچ کر جیسے اس کے ہاتھ سے سارے طوطے، کبوتر، اڑا دیے تھے، صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ذی شاہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا پھر جیسے سنبھل کر اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

''خبطی آئٹم کوئی درندہ صفت انسان نہیں...... بے ضرر سی بیمار لڑکی ہے۔ میں اس کی احوال پرسی کرنے گیا تھا۔'' کچھ سوچ کر ذی شاہ نے وضاحت کر دی تھی۔ ورنہ اس لسوڑی نے پیچھا نہیں چھوڑنا تھا۔

''اور تیمارداری کر کے آ گئے؟ اور وہ بھی زندہ سلامت......؟'' ایمل نے ڈیلے گھما کر چالاکی سے کہا تھا۔ وہ اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ ''اللہ، یہ یورپین تیز طرار، چالاک، ہوشیار، بچے...... بابے آدم کے وقتوں کی باتیں بھی کر لیتے ہیں؟ توبہ توبہ۔''

''نظر نہیں آ رہا تمہیں؟'' وہ ڈپٹ کر بولا تھا۔

''یقین نہیں آ رہا...... نظر تو بہت کچھ آ رہا ہے......'' اس نے معنی خیزی کی انتہا کر دی تھی۔ ذی شاہ کے ڈیلے ابل کر باہر آ گئے۔

''ہیں...... کیا، کچھ...... دیکھ لیا تم نے چھپکلی......! بہت چالاک ہو تم تو بچ کر رہنا پڑے گا۔'' وہ جیسے خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ورنہ یہ سفید چھپکلی تو آنکھوں میں گھسنے والی تھی۔

''مجھے بھی تو پتا چلے......؟ کیا کچھ نظر آ رہا ہے؟'' ذی شاہ چبا چبا کر بولا تھا۔ تب وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

''غصہ کیوں کرتے ہو، میں تو تمہاری دوست ہوں...... مجھ سے بھی پردہ داری...... ویسے میری بہن افریشم کی لو اسٹوری بھی میرے ہاتھوں انجام کو پہنچی تھی۔'' وہ قل، قل ہنسنے لگی تھی۔ یعنی پوری طرح جاسوسی کر کے اب دلائل سے بات کر رہی تھی۔

ذی شاہ نے سر تھام لیا تھا۔ وہ ایمل کے ہاتھوں لاجواب ہو چکا تھا اور ایمل صاحبہ اپنے تکّے پر اترائے جا رہی تھیں۔

''میں نے دیکھ لیا تھا تم اتنے پیسے خرچ کر کے اس ناکارہ اور بیروزگار خبطی لڑکی کے لیے راشن کا ڈھیر خرید کر لائے تھے۔ پھر ڈاکٹر بھی اسے چیک کرنے آیا تھا۔ ڈاکٹر کو فیس بھی تمہی نے دی ہوگی۔ یہ سب ایسے تو نہیں کیا جاسکتا......'' ایمل نے کھلکھلاتے لہجے میں بتایا تھا۔ جیسے ذی شاہ کی چوری پکڑ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم جھنجلا گیا تھا۔

''انسانی ہمدردی بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ وہ بے چاری تین دن سے بھوکی پیاسی مر رہی تھی۔'' اسے دکھ

سا ہوا تھا۔ محبت ایک طرف، وہ منکشے کی بے بسی پہ اندر تک تھرا گیا تھا۔ اس قسم کے حالات سے اگر ذی شاہ کو گزرنا پڑتا تب......؟ بس یہاں آ کر اس کی سوچ بلاک ہو جاتی تھی۔

''اور ''محبت'' وہ کس چڑیا کا نام ہے؟ تم مجھے چکما نہیں دے سکتے؟'' ہر وقت تو آنکھیں چپکائے گلاس ونڈو میں کھڑے اسے تاڑتے ہو، جاگنگ پہ جاؤ یا واک کرنے، آتے جاتے ویلس ہاؤس کی زیارت ضرور کرتے ہو...... پھر میں بھلا کیوں نہ سمجھوں......''

ایمل نے آنکھیں گھما کر جیسے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ یورپ کی لڑکی تھی، مغرب کی پیدائش، انٹرنیٹ کے دور کی...... انتہائی تیز طرار ذہن رکھنے والی پھر وہ اس سے کیسی امید رکھ سکتا تھا؟ ایمل کوئی پاکستان کے کسی دیہات سے نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں کی مٹی سے گوندھی گئی تھی۔ تیز رفتار لوگ، تیز رفتار زندگی جینے والے، تیز ترین ذہن رکھنے والے لوگ...... بھلا اس کا موازنہ وہ اپنے ہاں کے کسی تیرہ چودہ سالہ بچے کے ساتھ کر سکتا تھا۔ اور اب تو اس کے دیس، وطن اور پیارے پاکستان کے بچے بھی فطری معصومیت سے انٹرنیٹ اور آزاد میڈیا کی وجہ سے مبرا ہو چکے تھے پھر ایمل تو یہاں کا کرشمہ تھی۔ کیسے نہ ہوشیاری کے کرشمے دکھاتی۔

''اب چپ کیوں کھڑے ہو؟ جلدی سے پھوٹ بھی چکو...... مجبتی آئٹم تمہاری فریون ون (محبوبہ) ہے ناں...... تم اس سے لو کرتے ہو؟ تبھی اتنا خیال رکھتے ہو......'' وہ سر سے لے کر پیروں تک پُر یقین کھڑی تھی پھر ذی شاہ کیسے انکار کر دیتا...... اس کے کندھوں تک آتی بانس جتنی لمبی اس گوری ذرا زرد، زردی پیلی نیلی لڑکی نے ذی شاہ کو گھما ڈالا تھا۔ جھوٹ بولنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا پھر وہ کیسے غلط بیانی کرتا؟

''ہاں ......ناں...... پر پلیز...... تم کسی کو مت بتانا......'' اس نے احتیاطاً التجا کر دی تھی۔

''نہیں بتاؤں گی...... پر تم نے دل غلط جگہ پر اٹکا لیا۔'' وہ خاصی منہ پھٹ اور باتونی تھی۔ سو فوراً اس کی ہمدردی میں بولی تھی۔ وہ کچھ چونک گیا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' ذی شاہ چونکا۔

''وہ لڑکی بہت خطرناک...... ہے، یقین کرو، تمہیں کوئی نقصان نہ دے۔ آفٹر آل ہمارے مہمان ہو تم۔'' ایمل نے خلوص سے کہا تھا۔ اسے ذی شاہ کی فکر تھی۔ وہ اس کے بھائی کا دوست تھا۔ اور بھائی جیسا ہی پیارا ہو گیا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا......'' اس نے پیار سے ایمل کے گال تھپتھپائے تھے۔ ''پیاری چھپکلی! اب تم جا کر آرام کرو۔ باقی جاسوسی بعد میں کر لینا۔ رات بہت ہو چکی ہے۔'' ذی شاہ رین کوٹ کو دوسرے بازو پر منتقل کرتا مسکرا دیا تھا تب ایمل کچھ مچل گئی تھی۔

''پہلے بتاؤ، چھپکلی کسے کہتے ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟'' ایمل اب اسے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ذی شاہ کو جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ، سوچ کر بتانے لگا تھا۔ جیسے دیواروں سے چپکی مخلوق کا نقشہ کھینچنے لگا۔

''ہمارے ہاں...... ایک زردی، کچھ سفید اور لجلجی سی ایک مخلوق ہے، دیکھنے میں بڑی کیوٹ نظر آتی ہے، لڑکیاں عموماً اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر مجھے ڈر نہیں لگتا...... بہت کیوٹ لگتی ہے، تمہاری طرح......'' وہ بہ مشکل مسکراہٹ روکے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بتا رہا تھا جبکہ ایمل نہال ہوتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ جان چھڑا کر گیسٹ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب ایمل بھی سیڑھیاں اترتے ہوئے اونچی آواز میں بولی تھی۔ وہ بہت پُر جوش اور خوش نظر آ رہی تھی۔

''اب کہ پاکستان سے آئے ناں...... تو میرے لیے چھپکلی کا ایک بچہ لے آنا۔ میں اسے بلی کے ساتھ ہی سنبھال کر پالوں گی۔ جیسے مچھلیاں پالتی ہوں......'' ایمل کی فرمائش اسے قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ بیڈ پر اوندھا لیٹا ہنس، ہنس کر بے حال ہو گیا تھا۔ ایمل اس کی چھوٹی سی دوست، افراہیم کی بہن اور بندیا جیسی

مشرقی، کھوجی اور حاضر دماغ یورپ کی کچھ، کچھ ہوشیار لڑکی...... مگر معصومیت اور بھولپن کمال کا۔ وہ ایمل کے لیے اب رائے بدل چکا تھا۔

ایمل کی اکثر عادتیں بندیا سے ملتی تھیں، وہ بندیا کی طرح کچھ، کچھ جھگڑالو، دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والی مگر فطرتاً پُر خلوص لڑکی تھی۔ ایمل اگر افراہیم کی بہن نہ ہوتی تو ذی شاہ کا دل بھی یہاں نہ لگتا...... وہ جلد ہی ہوٹل میں شفٹ ہو جاتا...... مگر ایمل کی وجہ سے اس کا خوب دل لگ گیا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری، ہنس مکھ، شوخ اور مزاحیہ......

آنٹی کہتی تھیں، ایمل کی عقل گھٹنوں سے ہوتی ہوئی ٹخنوں میں چلی گئی ہے۔ جبکہ ذی شاہ کے نزدیک وہ خاصی ذہین اور عقلمند تھی۔ اکثر اسے بڑے کمال کے مشورے دیتی تھی اور کبھی، کبھی منکشے کے متعلق چونکا دینے والی باتیں کرتی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے معلومات کا خزانہ تھی تاہم ویلس ہاؤس کے بارے میں اکثر اپنی رائے محفوظ کر لیتی تھی۔

رات بھر بارش خوب برس کر صبح کو نہ جانے کس دیس سدھاری تھی۔ اگلا دن چمکدار تھا۔ گیلی سڑکیں خشک ہونے لگی تھیں۔ سبزہ دھل کر پہلے سے زیادہ شفاف ہو چکا تھا۔ ہریالی جوبن پر تھی۔ پھول پودے نکھر چکے تھے۔

وہ تازہ دم ہو کر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد آفٹر شیو لوشن منہ پر لگا رہا تھا جب افراہیم اندر چلا آیا۔

''سلامتی ہو...... پھر صبح اٹھ گئے، ہماری تو مجبوری ہے، تم تو سوتے رہا کرو۔'' وہ سلام بھیج کر بڑے خوشگوار لہجے میں بول رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی افراہیم کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی تھی۔ اور یہ ستائش ذی شاہ کے لیے نئی نہیں تھی۔

''تم پر بھی سلامتی ہو، ایں...... یہ کیا؟ میں کیوں پوستیوں کی طرح بستر میں گھسا رہوں؟ صبح خیز ہوں، اپنی عادتیں خراب نہیں کر سکتا۔'' اس نے جواباً مسکراتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ وہ سر ہلا کر جیسے تائید کرنے لگا۔ پھر جس کام کے لیے آیا تھا، اسی کے متعلق پوچھنے لگا۔ اسے دفتر سے دیر ہو رہی تھی۔ اسی لیے جلدی جلدی بات ختم کرنا چاہتا تھا۔

''ڈوئچ سیکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ سنجیدہ تھا، ذی شاہ نے بھی سنجیدگی سے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

''ٹھیک خیال ہے، اس دن ہیرلخ کا ڈائریکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا۔'' وہ افراہیم کو دیکھتا بال بنانے لگا۔ افراہیم نے سر ہلا دیا تھا۔

''ڈوئچ سیکھنا یہاں رہنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک دو ہفتے لگا لو کسی انسٹی ٹیوٹ میں، تم جلدی امپروو کر جاؤ گے۔'' افراہیم نے مسکرا کر کہا تھا۔ وہ جلدی اس کا ایڈمیشن بھی کروانے والا تھا۔

''ویسے انسٹی ٹیوٹ جانا ضروری نہیں، تمہارے اپنے گھر میں اتنا بڑا انسٹی ٹیوٹ موجود ہے۔'' اس کا اشارہ ایمل کی طرف تھا۔ وہ جیسے سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔

''ہاں، یہ تو ہے...... ایمل سے کلاسز لے لو، ایک دم ایکسپرٹ ہو جاؤ گے۔'' افراہیم بھی اسی کے انداز میں بولا تھا، تب جیسے ذی شاہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

''میری ڈوئچ خاصی امپروو ہو چکی ہے، ایمل کی کلاسز میں شاید اتنی نہ ہوتی جس قدر اس کی کمپنی فائدہ مند رہی۔'' وہ ایمل کو سراہ رہا تھا۔ افراہیم نے جیسے ڈر کر کہا۔

''اب اس کے سامنے تعریف نہ کر دینا...... محترمہ اگلے تین سال تک اتراتی رہیں گی۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ ایمل کے مزاج سے سب ہی واقف تھے۔ ایمل اپنی تعریفوں پر گردن اکڑا لیتی تھی پھر یہ کلف سالوں تک نہ اترتی۔

''میں ایسی عظیم غلطی کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں۔'' ذی شاہ بھی جواباً مسکرایا تھا تب اسے چوتھی مرتبہ مرر دیکھتے ہوئے افراہیم گویا چڑ گیا تھا۔ وہ کب سے اسے بار بار مرر دیکھتا، بال سنوارتا، کالر ٹھیک کرتا دیکھ رہا تھا۔ اب چڑ کر رہ نہ سکا۔

''سنگھار مکمل ہو گیا ہے تو گرما گرم ناشتا کر لو۔

میں اب آفس کے لیے نکلتا ہوں۔'' افراہیم نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ پھر بازو دبوچتا نیچے آنے لگا تب اس کی نگاہ زنانہ رین کوٹ پر پڑی تھی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''یہ رین کوٹ کس کا ہے؟'' سوال میں سادگی نہیں تھی البتہ لہجہ ضرور سادہ سا تھا۔ ٹاول اسٹینڈ پر لٹکا رین کوٹ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

''آں...... ہاں......'' ذی شاہ رک سا گیا۔ ''یہ کل میں لایا تھا......'' اس سے بات نہیں بن پڑی تھی۔ مگر پھر بھی افراہیم اتنی سی دلیل پر مطمئن سا ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ بلکہ جاتے، جاتے صرف اتنا کہا۔

''ہیرلخ کا ڈائریکٹر، میرا بہنوئی تمہیں پسند آیا؟ میں نے اسے تمہارا نہیں بتایا۔ ورنہ شاندار پروٹوکول دیتا۔ تم نے منع جو کر رکھا تھا۔'' افراہیم کو قلق سا ہوا۔ کیا تھا جو ذی شاہ بتانے دیتا۔ اس کے بہنوئی کی جرأت تھی جو وہ صرف پروفیشنل ڈیلنگ کرتا...... مگر یہ رولز پہ جان دینے والا اس کا دوست...... اس نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کاروبار میں رشتے داریوں کے ٹھٹے نہیں بجانے...... ورنہ تو صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی۔

''بہت اچھا کیا تم نے...... اور ویسے تمہارا بہنوئی بہت شاندار ہے۔ ایک دم چاکلیٹی ہیرو...... بس تھوڑا سنجیدہ تھا۔'' اس کی آنکھوں کے سامنے علی عیسیٰ کا شاندار سراپا جگمگا گیا۔ کیا تھا جو افراہیم کے بہنوئی کا نام علی عیسیٰ نہ ہوتا...... کچھ اور ہو جاتا مگر علی عیسیٰ نہ ہوتا...... مگر اس کے چاہنے سے بھلا کیا ہو سکتا تھا؟ ہر خواہش پوری ہونے کے لیے تو نہیں ہوتی۔

''سنجیدہ تو نہیں...... خیر آفیشل ایشوز پر بے انتہا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔'' افراہیم کچھ سوچ کر بڑے پیار سے علی عیسیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ تب ذی شاہ اس کے برابر چلتے ہوئے ذرا سرسری سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''ہیرلخ کے علاوہ کوئی اور کمپنی ایسی نہیں، جس کا مالک پاکستانی ہو اور جس کا نام بھی علی عیسیٰ ہو۔'' وہ اگرچہ بہت سرسری انداز میں عام لہجے اور بے پروائی سے پوچھ رہا تھا پھر بھی افراہیم ذرا رک گیا۔ اس کے رکنے کی وجہ موبائل کی وائبریشن تھی۔ اس کا فون بج رہا تھا یعنی کوئی آفیشل کال آ گئی تھی۔ پھر وہ ذی شاہ سے ایکسکیوز کرتا اپنے آفس چلا گیا تھا اور ذی شاہ سر جھٹک کر ڈائننگ روم میں آ گیا۔ افراہیم کی ممی کچن میں تھیں، افریشم فون پر بات کر رہی تھی جبکہ ایمل کھانے میں مصروف تھی۔ اس نے مشترکہ طور پر سب کو سلام بولا تھا تب ایمل کریم کیک کھاتے ہوئے تاگ (ہیلو) کہنے کے بعد دوبارہ سے اپنے شغل میں مصروف ہو گئی تھی۔ افریشم کچھ عجلت میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسے مسکرا کر سلام کہا اور پھر فون پہ مصروف ہو گئی۔

''عیسیٰ نے ناشتا کر لیا؟ اس کی طبیعت کیسی ہے؟ میں بس نکل رہی ہوں، عیسیٰ کو فون پکڑاؤ......'' افریشم اشارے سے سب کو چیوس بولتی باہر نکل گئی تھی۔ تب آنٹی اور ایمل بھی اس کے پیچھے بھاگیں۔

''بیٹا......! تمہارا ناشتا میز پر لگا دیا ہے۔ میں اور ایمل ذرا افریشم کو چھوڑنے جا رہی ہیں۔ تم دھیان سے ناشتا کر لینا۔'' آنٹی نے معذرت خواہانہ انداز میں اجازت چاہی تھی۔ پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی تھیں۔ ذی شاہ نے ان کے چلے جانے کے بعد گہری سانس کھینچی پھر جیسے بجی سجائی میز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ قدرت نے اسے ایک سنہرا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ جیسے نہال ہو کر ناشتے کے لوازمات پیک کرنے لگا۔ آج اس نے بیڈ روم کی کھڑکی کا جالی دار سفید مہین پردہ اٹھا کر ولیس ہاؤس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ سیدھے طریقے سے جا سکتا تھا تو پھر خود کو انتظار کی کوفت میں مبتلا کیسے کرتا؟

منکشے کا رین کوٹ کندھے پر لٹکائے وہ ٹفن میں ناشتا پیک کیے دوسرے ہی لمحے ولیس ہاؤس میں موجود تھا۔ بالکل کل والا ہی منظر، گندگی، بے ترتیبی، پھیلاوا...... جوتے، کپڑے، جرابیں بکھری پڑی تھیں۔ برتن، کشن، کتابیں، اخبار تک کارپٹ پر گرے تھے۔ وہ بچتا بچاتا کارنر والے کمرے تک گیا تھا۔ توقع کے عین مطابق بیڈ روم کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ منکشے کا کمبل زمین کو سلامی دے رہا تھا۔ تکیے، کشن، زمیں بوس تھے، دودھ کی بوتل جوں کی توں پڑی تھی تاہم پانی کی بوتل خالی تھی۔ فروٹ بھی ویسا جیسا تیسا پڑا تھا، یعنی محترمہ نے کھانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کھاتی تھی جس سے زندہ رہ سکے۔ مگر یہاں آ کر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ تب کھاتی تھی جب مرنے کے قریب ہو جاتی، وجود بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جاتا، چلنے پھرنے میں دشواری... آ جاتی، کمزوری کی وجہ سے چکر آنے لگتے۔ وہ ذی شاہ کی زندگی میں آنے والا عجیب... کردار تھی۔ اور اپنی حرکتوں سے اسے حیران کر رہی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی عجیب لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے ذی شاہ کے بے انتہا اصرار اور مجبور کرنے پر بھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ اسے بھوک نہیں ابھی کہہ کر ٹالتی رہی تھی۔ سو وہ مزید اصرار کیے بغیر خود ڈٹ کر ناشتا کر کے ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارنے کے بعد واپس آ گیا تھا۔

اگلے کچھ دن وہ تین وقت کا کھانا ریسٹورنٹ سے بکنگ کے ذریعے منگواتا رہا تھا۔ ہوم ڈلیوری سروس کی بدولت کھانا تین وقت ولیس ہاؤس میں ڈلیور ہو جاتا تھا۔ وہ اگلا ڈیڑھ ہفتہ ولیس ہاؤس جا ہی نہیں سکا۔ انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیت نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم وہ اتنا ضرور جانتا تھا منکشے کا پیر اب ٹھیک ہے، اسے چلنے پھرنے میں دشواری کا سامنا نہیں...... کھانا بھی اسے تین وقت مل رہا تھا، اپنے تئیں وہ بڑی ذمے داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ مگر یہ تو اسے چھٹی کے دن پتا چلا تھا کہ اس کا بھیجا تمام کھانا اور کھانے پینے کا سامان کچھ تو پھپھوندی لگ کے خراب ہو گیا تھا اور کچھ کچھ چوہوں نے اپنے پیٹ میں اتار لیا تھا۔

ذی شاہ کو منکشے کے اس عمل نے دھچکا پہنچایا تھا۔ یعنی اسے ذی شاہ کے جذبات کی کوئی پروا نہیں تھی؟ وہ اس کی محبت اور خلوص کو ایسے خاک کر رہی تھی؟ اس کا دل جیسے بجھ گیا تھا اور دماغ گرم ہونے لگا۔ مگر منکشے کی نازک حالت اسے غصے کا بھرپور اظہار کرنے نہیں دے سکی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ نڈھال تھی۔ چلتی تو چکرا کر گر پڑتی۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ چکا تھا۔ وہ بھوکے رہنے کی وجہ سے گرتی پھر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر ہزار نعمتوں کے باوجود کچھ نہیں کھاتی تھی، چاہے کھانا ہوتا یا نہ ہوتا۔ پھر اگر خوراک کو پھپھوندی لگ جاتی یا کھانا باسی ہو جاتا تب کہیں مرنے کے قریب پہنچ کر اسے خوراک کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جیسے اب اتنے دن بعد اسے خوراک کی ضرورت تھی۔ جبکہ کھانا اتنے دن کا اب کھانے کے قابل نہیں تھا۔ باسی شدہ... بدبودار اور خراب ہو چکا تھا۔ کھانا ریسٹورنٹ سے آنا بند ہو چکا تھا کیونکہ ذی شاہ نے نئی بکنگ ابھی نہیں کروائی تھی۔ یہاں آ کر اتنا مہنگا کھانا ڈرم میں الٹتے ہوئے اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ نعمتوں کی ایسی ناقدری اور ناشکری؟ اب جبکہ کھانے کو کچھ نہیں تھا، بریڈ...... اور کیک وغیرہ باسی ہو چکے تھے، کھانا ڈرم میں الٹا جا چکا تھا۔ اب اسے خوراک کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ ریں بھری کا جار پکڑے ندیدوں کی طرح مربہ کھا رہی تھی، جیم اور مربے کے علاوہ گھر میں اور کچھ نہیں تھا۔ خالی معدے میں کچھ اترا تو منکشے کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ وہ شیرے سے لتھڑے ہونٹ چوستی ذی شاہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''اتنے دن سے کہاں غائب تھے؟ جیسے بھول ہی گئے تھے۔'' وہ سر جھکائے شکوہ کر رہی تھی۔ اداس، غمگین اور نمناک......

''تم کوئی رف ہوئی فائل نہیں جسے بھول جاؤں۔'' وہ ناراضی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا گھر میں بکھرے پھیلاوے کو دیکھ کر غصہ دوچند ہو رہا تھا۔ وہ تندرست ہونے کے باوجود گھر کی صفائی اور پھیلاوا نہیں سمیٹ سکی تھی۔ منکشے اتنی بے حس اور بے پروا کیوں تھی؟ اسے بھلا غصہ کیوں نہیں آتا؟ ایک تو کھانے کی ایسی بے حرمتی اور دوسرا گھر کی بے

ترتیبی...... اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اوپر سے محترمہ کے شکوے کمال کے تھے۔

''تو پھر کہاں غائب تھے؟'' آنسو بلاوجہ ہی گرنے لگے تھے۔ پلکوں کی گھنی جھالروں میں اٹکنے لگے تھے۔ سمندر آنکھیں قطرہ، قطرہ بہہ رہی تھیں۔

''کام میں مصروف تھا۔'' وہ چڑ کر بولا۔ پھر جیسے اس پر کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر لاؤنج سے لے کر کچن تک ایک، ایک چیز سمیٹ ڈالی تھی۔ کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر لانڈرنگ کے لیے رکھ آیا تھا، جوتے سارے کیبنٹ میں گھسائے۔ برتن کچن میں سنک کے اندر رکھ کر ٹونٹی چلائی اور سارے برتن دھو دھلا کر شیلف میں سجا دیے تھے۔ فریج اور کیبنٹ تک کو دھو ڈالا۔ الماریوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے بیڈ شیٹ نکالی کارنر والا کمرا چمک دمک گیا تھا۔ باقی کمرے لاکڈ تھے۔ بس لاؤنج، کارنر والا کمرا اسٹنگ روم کھلا تھا جس کی حالت انتہائی خراب تھی اور اب جیسے کسی نے جادو کی چھڑی پھیر کے منظر بدل دیا تھا۔

وہ نہ جانے کتنے دن سے مورگن روک پہنے ہوئے تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سا لمبا چوغہ جو پیروں میں الجھ رہا تھا مسلی ہوئی سلوٹ زدہ جگہ جگہ سے اکھڑی جھالریں جھول رہی تھیں، کچھ فرش پر لٹک رہی تھیں۔ اس کے بال اتنے بوسیدہ اور گندے تھے جیسے صدیاں بیت چکی تھیں اور انہیں شیمپو نہیں کیا گیا تھا۔ الجھے، بے رونق مگر انتہائی لمبے، یقیناً بالوں کا رنگ بلونڈ تھا مگر خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی اصلی رنگت کھو چکے تھے۔

وہ ہکا بکا سی کچن کو جاتے اسٹیپس پر بیٹھی اسے اِدھر اُدھر گھوم کر کام کرتے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں تحیر اور خوشی کے آنسو تھے، گیلی آنکھوں والی لڑکی منجمد بیٹھی تھی جیسے سفید برف کا کوئی مجسمہ ہو۔

اور ذی شاہ اِک طائرانہ نظر ڈال کر جیسے مطمئن اور پُرسکون ہو کر اس کے قریب آخری کونے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا حلیہ بگڑ چکا تھا تاہم اس کے آس پاس کا ماحول شانت کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا جیسے اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ کیونکہ اپنا رف حلیہ اسے الجھن زدہ کر رہا تھا۔ وہ تو ہر لمحہ اتنا بن ٹھن کر تیار شیار رہتا تھا جیسے ابھی کسی کا ولیمہ اٹینڈ کر کے آیا ہو۔ نہایا دھویا، تروتازہ، مہکیلا، خوشبودار...... بہترین لباس زیب تن کیے، جس پہ شکن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی اور اب خوب میلا، میلا ہو رہا تھا مگر اسے اپنے حلیے پہ قطعاً افسوس نہیں تھا۔ وہ اپنی خوشی سے یہ سب کر چکا تھا۔ در پردہ منکشے پر یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ کس قسم کا ماحول اپنے آس پاس بنائے ہوئے ہے؟ ایسے حالات رہے تو کون یہاں جھانکے گا؟ وہ خود ہی ایک دن دھول مٹی ہو جائے گی اور یہ کہ اپنی زندگی کی بے ترتیبی کو اسے خود ہی بدلنا ہوگا۔ وہ جیسے لفظ جوڑ رہا تھا۔ جب منکشے اپنی گیلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اس کا کندھا ہلانے لگی تھی۔

''یہ سب جو تم نے کیا؟'' وہ اتنی بے خود اور حیران تھی کہ اس سے بات کرنا بھی محال تھا۔ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جیسے وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

''یہ سب...... مجھے کرنا ہی تھا۔'' ذی شاہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔ ''تاکہ تمہیں بتا سکوں، بے ترتیبی مجھے پسند نہیں۔ گندگی سے مجھے نفرت ہے اور ایسے کام پاکستان میں میرے گھر کے نوکر کیا کرتے ہیں۔'' اس نے منکشے کی گیلی آنکھوں میں خوشی اترتی دیکھی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی۔ لکیروں میں کیا لکھا تھا؟ شاید کچھ بھی نہیں وہ بددل ہو گئی تھی۔

''یہاں سے تمہیں کیا ملے گا؟'' اس نے گردن موڑ کر منکشے کی ہتھیلی پر نظر جمائی۔ ''اگر کچھ پانا چاہتی ہو تو عمل کی طرف توجہ دو...... عمل کے بارے میں مجھ جیسا پریکٹیکل بندہ ہی تمہیں بتا سکتا تھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے عمل کر کے...... جب کل میں آؤں تو یہاں، وہاں کچھ بکھرا نہ ہو۔'' وہ جیسے اسے تنبیہ کر رہا تھا۔ منکشے نے سر جھکا لیا۔ گیلی آنکھیں ایک تواتر سے بہہ رہی تھیں۔

''اللہ یہ اس کی آنکھیں کبھی خشک نہیں

ہو سکتیں۔'' وہ جیسے بے بس سا ہو گیا۔

''تم...... تم بہت اچھے ہو، میرے خیالوں سے بڑھ کے مگر میں اچھی نہیں ہوں۔'' اس کے بوجھل پن کی وجہ ذی شاہ کو سمجھ آ گئی تھی۔ وہ خود ترسی کا شکار تھی۔ تنہائی نے اس کی مثبت سوچوں کو نگل لیا تھا۔ اس کے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ذی شاہ کو لگا تھا اس کے سامنے ایک اور مالا آ کھڑی ہوئی ہے، زندگی سے بیزار، ویران اور جیسے اپنی سانسیں پوری کرتی ہوئی۔ اس عمر میں یہاں کی لڑکیوں کے بے شمار کام اور بے انتہا مصروفیات ہوتی تھیں۔ بوائے فرینڈز، پارٹیاں، ہنگامے، فنکشن، پکنک ٹرپ مگر یہ لڑکی ہر چیز سے بیزار تھی۔ خود سے بھی، ماحول سے بھی اور زندگی سے بھی آخر ایسا کیوں تھا؟

''یہ صرف تمہاری سوچ ہے اگر تم اچھی نہ ہوتیں تو میں تمہارے قریب نہ بیٹھا ہوتا، مجھے انسانوں کی زیادہ نہ سہی، کچھ تو پہچان ہے۔'' ذی شاہ نرمی سے مسکرایا۔

''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' وہ بے آواز رونے لگی تھی، گیلی آنکھیں، مکھن کی ٹکیہ جیسا چہرہ...... ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ گندی سندی یہ لڑکی اسے کتنی عزیز ہو چکی تھی۔ وہ اسے کس طرح سے بتاتا؟ کس طرح سے سمجھاتا۔

''میں جاننے کے لیے ہی تو تمہارے پاس آیا ہوں۔'' وہ پھر سے مسکرا رہا تھا۔ نرم سی حوصلہ افزا مسکراہٹ تھی۔ منکشے کے دل کو ڈھارس سی پہنچی۔

''جان کر کیا کرو گے؟ مجھ سے نفرت......؟ جو میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ وہ اپنے ننگے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ پیروں کے ناخن کتنے بڑھ چکے تھے۔ اسے کاٹنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اسے تو کبھی کسی بات کا خیال نہیں آتا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا......'' ذی شاہ کا لہجہ مستحکم تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، مِن ہائیم کی خبطی لڑکی اس سے اتنا بڑا پہاڑ جتنا عہد لینے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔ بھلا یہ پاگل، جنونی اور جذباتی لڑکی کیا کرنے والی تھی؟ وہ اسے سنک کی طرف بڑھتا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس نے صابن...... سے رگڑ، رگڑ کر ہاتھ دھوئے تھے۔ پھر ہاتھوں کو خشک کیا اور الماری سے کھینچ کھانچ کر صاف دُھلا ہوا کپڑا نکال کر کہیں اندر چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس نے سینے سے کچھ لگا رکھا تھا۔ اور وہ گیلے چہرے کو رگڑتی اس کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ کیا کرنے والی تھی؟ اس کا ارادہ کیا تھا؟ دو سیکنڈ پہلے ذی شاہ کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

''مقدس قرآن کی کھاؤ قسم! تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گے، کسی بھی صورت میں، کسی بھی حال میں...... تم مجھ سے محبت کرو گے اور مجھے اکیلا نہ چھوڑو گے کم از کم میرے مرنے کی مدت تک۔'' منکشے اس کے سامنے سفید کپڑے میں لپٹا قرآن لیے کھڑی تھی، وہ جیسے سراپا حیرت بن گیا تھا۔ یہ منکشے کیا کہہ رہی تھی؟ اس کا دماغ تو ٹھیک تھا؟ حواس تو قائم تھے؟ جیسے قرآن کی ہیبت اس کے دل پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ سرما

نہیں رہا اب

آج غیر کی محفلوں میں وفا کا پیکر بنا ہوا ہے
کبھی وہ اپنا بھی راز داں تھا، نہیں رہا اب

اسی کے دم سے ہماری سانسیں رواں دواں تھیں
ہمارا دلبر، ہماری جاں تھا، نہیں رہا اب

غمِ جدائی کو رفتہ، رفتہ تھپک تھپک کر سلا دیا ہے
جو درد آنکھوں سے عیاں تھا، نہیں رہا اب

ہمارا ہر اِک شوق سلامت تھا اس کے ہوتے
ہمارے سر پہ بھی سائباں تھا، نہیں رہا اب

زمانے کی ہر بلا سے ہم کو چھپا کے رکھتا، بچا کے رکھتا
جیّا جی اپنا وہ کُل جہاں تھا، نہیں رہا اب

شاعرہ: سیدہ جیّا عباس، تلہ گنگ

کے آغاز میں پسینہ، پسینہ ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر اتر گئی۔

''قرآن پر سچے مسلمان، سچی قسم اٹھاتے ہیں۔'' منکشے کسی دیوار کی طرح تن کے کھڑی تھی، جیسے جواب لیے بغیر ٹلنے والی نہیں تھی۔ وہ وحشت کے عالم میں دنگ کھڑا تھا۔ جیسے نہ پیچھے ہٹ سکے گا، نہ آگے بڑھ سکے گا اور منکشے کی گیلی آنکھوں میں دھیرے، دھیرے استہزائیہ پھیلنے لگا تھا۔ جیسے اس کے بودے عہد کی کرچیاں اسے لہو، لہو کر رہی تھیں۔ وہ اندر سے خود بھی ٹوٹ رہی تھی۔

''ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس پر قائم نہ رہا جا سکے۔ تم مجھ سے نفرت کرو گے اور ضرور کرو گے۔'' منکشے نے مقدس قرآن کو سینے سے چمٹایا اور پلٹنے لگی تھی جب وہ کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر منکشے کے سامنے تن کر آ کھڑا ہوا تھا۔ لمحے کے آخری حصے میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب بس عہد کو دُہرانا تھا اور قسم کا بار اٹھانا تھا۔

''سچے مسلمان...... قرآن پر سچی قسم اٹھاتے ہیں۔ قسم ہے قرآن کی، جو محمدؐ پر اترا...... جن کے بعد نہ کوئی نبی آیا اور نہ آئے گا...... میں قرآن کو گواہ بنا کر کہتا ہوں...... انسانوں سے نفرت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا...... ہر بندہ خود اپنے عمل کا سزاوار ہے اور میرے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں...... میں تمہیں چھوڑ دوں؟ یہ وقت پر منحصر ہے، تم مجھے مل جاؤ تو یہ میرا نصیب ہے۔ بہر حال تم سے محبت تو میں کرتا رہوں گا۔ جان رہے یا نہ رہے...... گر یقین کر سکتی ہو تو کر لو......''

ذی شاہ نے بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ مقدس قرآن کو اس کے ہاتھ سے لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا پھر وہ اندر کہیں جا کر کسی الماری کی سب سے بلند جگہ پر قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ آیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تب بھی منکشے کسی بت کے مانند ساکت کھڑی تھی۔ دم بخود ساکت اور متحیر...... اتنی حیران کہ ہاتھ لگانے سے بھی نہ چونکتی، جھنجوڑنے سے بھی نہ چونکتی، ہلانے سے بھی نہ چونکتی۔

''میں نے زندگی بھر میں اتنے حسین الفاظ کبھی نہیں سنے۔'' وہ کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ وہ بادلوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ اس کے پیر زمین پر نہیں تھے۔ وہ نرم بگولوں کے رتھ پر سوار تھی۔ وہ زمین پر آنا چاہتی تھی مگر وہ خواب کے سفر میں تھی۔ وہ آنکھ کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''تم بہت اچھی ہو اور اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ کی حقدار ہو۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکان اتر آئی تھی۔

''میں اچھی نہیں ہوں۔'' وہ جیسے جھٹکا کھا کر آسمان سے اتر کر زمین پر آ گئی تھی۔ اس کے دل پر قیامت کی گھڑی اتر آئی۔

''یوں مت کہا کرو۔'' ذی شاہ نے نرمی سے ٹوکا تھا۔

''یہ سچ ہے۔'' وہ تڑخی تھی۔

''یہ سچ نہیں ہے۔'' اس کی حلاوت کا کوئی انت نہیں تھا۔

''تم نہیں جانتے۔'' منکشے بے بس ہوگئی۔

''میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''مگر مجھے بتانا ہے تمہیں...... بہت کچھ......'' منکشے نے دونوں آنکھوں کو پھر سے رگڑا...... گیلی آنکھیں اسے الجھن میں گرفتار کر رہی تھیں۔ وہ جھنجلا رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر غصہ آ رہا تھا۔

''مجھے نفرت ہے ان گیلی آنکھوں سے۔'' وہ جیسے اپنی آنکھوں کو نوچ لینا چاہتی تھی۔ ''من ہائیم میں برسات ہوتی تو میں بوار یا بھاگ جاتی تھی۔ نفرت تھی مجھے بارشوں اور گیلی بستیوں سے...... اور آنکھوں کے آنسوؤں سے۔'' وہ زہر خند ہو رہی تھی۔

''تو پھر یہاں کیوں رکی ہو، بھاگ کیوں نہیں جاتیں؟'' اس نے حیرانی کے عالم میں پوچھا تھا۔

''یہ میری سزا ہے، جس چیز سے نفرت کروں، وہیں رہوں، مجھے تو یہ ویلس ہاؤس بھی پسند نہیں۔ پھر بھی یہاں ہوں......'' منکشے زخم، زخم سی بولی تھی۔ کانچ سی سرخ آنکھوں میں جیسے کوئی کہانی تیر رہی تھی۔

''تم خود ساختہ سزاؤں اور احساسِ جرم میں مبتلا ہو، تم شاید ماضی کے اثر میں ہو۔'' وہ گویا لمحوں میں منکشے کے اندر تک اتر گیا تھا۔ وہ تھم سی گئی تھی۔ پھر اپنے بالوں کو کھینچ تان کے نوچنے لگی۔ ذی شاہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔

''خود پر ظلم کیوں کرتی ہو؟ اللہ نے تمہیں اتنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔'' وہ ٹوکے بنا رہ نہیں سکا تھا۔ منکشے جیسے لرز کر رہ گئی تھی۔ بھیانک ماضی نے چہرہ کرایا تھا۔ وہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گئی۔

''ہاں...... میں ناشکری تھی، مجھے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر کرنا نہیں آیا۔'' اس نے پھر سے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھ گئی بے آواز روتی ہوئی۔ ذی شاہ کو بے انتہا تکلیف ہوئی تھی، وہ اپنے دل سے قریب کسی بھی عورت کے آنسو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

''اللہ، اس کے آنسوؤں میں، میں بہہ جاؤں گا۔'' وہ انتہا کا بے بس ہوا تھا۔ منکشے چپ چاپ روتی رہی تھی۔ پھر جیسے تھک ہار گئی۔

''اب کہ میں آؤں تو مجھے ایسی مت نظر آنا......'' وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا جبکہ منکشے ساکت رہ گئی تھی۔

''تم مجھے کیسا دیکھنا چاہتے ہو؟'' منکشے پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ نظر سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ اٹھ کر قد آور شیشے کے سامنے آ کر رکی...... اسے اپنی صورت دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں پر گنتی تو حیران رہ جاتی۔ جانے آخری مرتبہ اس نے آئینہ کب دیکھا تھا؟ کیا یہ منکشے تھی؟ ملگجی، غلیظ، ویران، قحط زدہ سی...... اسے اپنی صورت سے وحشت ہونے لگی۔

☆☆☆

عام تعطیل کے دن افراہیم کی فیملی نے ہائیڈل برگ جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ ذی شاہ اگرچہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر ایمل اور افراہیم کی خاطر چپ سا کر گیا۔ یہ تفریح کا پروگرام ان لوگوں نے ذی شاہ کے لیے ہی تو بنا رکھا تھا۔ وہ منع کرتا تو ان لوگوں کے دل برے ہو جاتے اور ننھی چھپکلی ناراض ہو جاتی۔ جس کی خفگی اسے گوارا نہیں تھی۔

وہ اتنے دن سے ویلس ہاؤس بھی نہیں جا سکا تھا۔ جانے منکشے کس حال میں تھی؟ انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیت نے اسے چکرا رکھا تھا۔ اب صرف چند دن باقی تھے پھر اسے ہیرلخ کو جوائن کرنا تھا۔ اور افراہیم چاہتا تھا اس دوران وہ تھوڑا بہت تو جرمنی میں گھوم پھر لے، آخر اس کا جرمنی اتنا حسین جو تھا۔

ہائیڈل برگ کا صرف نام ہی بہت تھا۔ دریائے نیکر کے اس پار...... یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا...... اپنی قدامت، حسن، جمال کے باعث ہر آنکھ کو سحر زدہ کرتا...... ہائیڈل برگ کا تاریخی قلعہ اور یہاں کی قدیم ترین یونیورسٹی...... تنگ سے گنجان بازار مگر انتہائی صاف شفاف، خوش پوشاک، باوقار چلتے پھرتے لوگ، پُرسکون ماحول، نہ شور نہ ہنگامہ...... اپنی، اپنی دُھن میں جیسے مگن، کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ افراہیم اسے جرمنی کی قدیم ترین یونیورسٹی دکھانے لایا تھا۔ اپنی قدامت سے لوگوں کو متوجہ کرتی یہ یونیورسٹی بہت جلال، رعب اور شان سے کھڑی تھی اور اس کے طلبہ اور طالبات جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے میں گم، مگن، مدہوش کچھ کتابیں پڑھ رہے تھے، کچھ اپنی، اپنی محبوباؤں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے...... اور کچھ تو...... جیسے انہوں نے حد ہی کر دی تھی۔

ذی شاہ جیسے کانوں تک سرخ ہوگیا تھا۔ اگرچہ مغرب میں ایسے مناظر کچھ اچنبھے کا باعث تو نہیں تھے مگر درسگاہوں کے کچھ اصول، لحاظ اور قواعد ہوتے ہیں پھر ایسی حرکتوں کے لیے نائٹ کلب، بار، پب جو موجود ہیں پھر یوں سرِعام...... اللہ اکبر...... اس نے گردن موڑ کر ساتھ چلتی ایمل کو دیکھا تھا۔ زیادہ خفت ایمل کی وجہ سے اٹھانی پڑ رہی تھی۔ بچی کے ذہن میں کیا سوچ ابھرتی ہوگی۔ وہ بے چارہ خواہ مخواہ بدحواس ہو رہا تھا۔ بچی کو جیسے پروا نہیں تھی اور افراہیم بھی بے نیاز تھا۔ جیسے یہ منظر ان کی آنکھوں کے لیے نئے نہیں تھے۔ سو انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ایمل بھی ایسے چل رہی تھی گویا کچھ دکھائی نہیں دیا ہو۔ اس نے اپنی بلی اٹھا رکھی تھی۔ اسی کی سیوا

میں مصروف تھی۔ ذی شاہ کے دل کو تسلی ہوئی۔ اس نے فوراً یہاں سے چلنے کی بات کر ڈالی تھی۔

اب وہ مولگن کور پر کھڑے یہاں کا تاریخی قلعہ دیکھنے کے لیے مچل رہے تھے۔ اگر چہ مغربی جرمنی کا حسن ایسا نہیں تھا جس کے سحر سے اتنی جلدی آزاد ہوا جا سکتا مگر پھر بھی اس کا من تو ویلس ہاؤس کی طرف اڑا، اڑا جا رہا تھا۔ وہ جلد ہی تفریح سے بیزار ہو گیا۔ افراہیم اس کی بے دلی کو نوٹ کرتا ریسٹورنٹ سے کھانا کھلا کر واپسی کے سفر پر گامزن ہو گیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا، ذی شاہ تھک چکا ہے، تھکاوٹ تو ایمل کو بھی ہو گئی تھی۔ سو وہ تمام رستہ سوتی رہی تھی۔ گھر آ کر بھی نیند میں دھت ہو گئی۔

افراہیم بھی سونے کے لیے چلا گیا تھا مگر آنٹی نے اسے روک لیا۔ حالانکہ وہ بھی شاور لے کر سونا چاہتا تھا۔ مگر آنٹی کا موڈ کچھ باتیں کرنے کا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں...... عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو آج معاملہ بھی کچھ یوں کھلا تھا۔ اسے نہا دھو کر منکشے کی طرف جانے کی جلدی تھی اور آنٹی اسے رک جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ نیند کا تو بہانہ تھا۔ وہ خواہ مخواہ جمائیاں لے رہا تھا... اور آنٹی جیسے اس کی جمائیوں کو نظر انداز کرتی کچھ اور کہنے کے موڈ میں تھیں۔

''تم آج کل ویلس ہاؤس بہت جاتے ہو؟ وہ لڑکی...... کیا نام ہے اس کا......؟'' آنٹی نے جیسے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کی نیند کو آنکھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ نوچ لیا تھا۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور حیران ہوا، یہ آج آنٹی نے کیا قصہ چھیڑ دیا تھا؟

''منکشے......'' اس نے سر جھکا کر جیسے اعترافِ جرم کر لیا۔ آنٹی کچھ پل کے لیے چپ ہو گئی تھیں۔ جیسے کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گئیں۔

''ہاں...... تو وہ لڑکی...... بیٹا کچھ ٹھیک نہیں وہ، تم میرے لیے افراہیم جیسے ہو...... میں تمہیں کچھ غلط کرتا...... یا کنویں میں گرتا نہیں دیکھ سکتی۔'' انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کیسے نرم، نرم الفاظ میں اسے منع کرتیں۔ وہ ان کے بیٹے کا بہت پیارا دوست تھا۔ وہ اسے کسی مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی تھیں اور منکشے کی طرف اس کے بڑھتے قدم کو روکنا بھی محال تھا۔

''نہیں آنٹی...... ایسا کچھ بھی نہیں، منکشے بہت اچھی لڑکی ہے، بیمار ہے تو میں نے انسانی ہمدردی......'' ذی شاہ سے بھی بات بن نہیں پائی تھی۔ وہ جھوٹ بولتے، بولتے رک گیا تھا۔ جیسے جھوٹ بولنا اسے مناسب نہیں لگا تھا۔ وہ محض انسانی ہمدردی میں تو ویلس ہاؤس نہیں جاتا تھا۔ یہ تو محبت کا قصہ تھا، جسے آنٹی کے سامنے چھیڑنا مناسب ہرگز نہیں تھا۔ پھر آنٹی احتیاطی تدابیر پہ لیکچر دینا شروع کر دیتیں۔ ویسے وہ نہ بھی بتاتا تب بھی آنٹی ایک عمر کا تجربہ رکھتی تھیں۔ انہیں بھی بہت کچھ نہ سہی، کچھ تو نظر آ رہا تھا۔

''انسانیت کے ناتے مدد کرنا غلط نہیں...... پر وہ لڑکی بہت بڑی ساحرہ (جادوگرنی) ہے۔ ایک نمبر کی ڈرامہ باز ہے، بہت مکار اور ہوشیار...... تم اس سے دور رہو بیٹا!'' آنٹی نے بڑی محبت اور خلوص سے جیسے اسے سمجھانے اور خبردار کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ بھلا سمجھانے سے سمجھنے والا تھا؟ اسے لگتا، وہ روکنے اور روکے جانے کی اسٹیج سے آگے نکل گیا تھا۔ کوئی منکشے کے بارے میں کچھ بھی بتا دیتا۔ کیا وہ اس پر یقین کر سکتا تھا؟ وہ منکشے پر غلط گمان کر سکتا تھا؟ شاید کبھی نہیں، اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ آنٹی اسے منکشے کے پاگل پن، جنون اور ڈراموں کی کہانیاں سنا رہی تھیں اور اس کا ذہن منکشے میں الجھا تھا۔ جانے اس نے کھانا کھایا یا نہیں......؟ وہ بھوکی ہو گی؟ کہیں کُوچ نہ کر گئی ہو؟ آخر تین چار دن سے وہ اسے دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ جانے منکشے کس حال میں تھی؟ اسے یاد کرتی ہو گی؟ خفا ہو گی؟ مس تو لازمی کرتی ہو گی۔ روتی بھی ہو گی۔

''دیکھو بیٹا! تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا۔ یقین مانو وہ لڑکی اچھی نہیں۔'' آنٹی کچھ بتاتے، بتاتے رک گئی تھیں پھر ان کا دھیان جیسے بٹ گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ذی شاہ کی خلاصی کروا گئی تھی۔ وہ آنٹی کو فون سنتا دیکھ کر چپکے سے اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ آنٹی کی

خوشی سے مسرور آواز اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ جانے کس کا فون تھا؟ وہ رک سا گیا تھا۔

''عیسیٰ کا فون ہے...... افریشم اسپتال میں ہے، بیٹا ہوا ہے۔'' وہ مارے مسرت کے رو پڑی تھیں۔ افریشم کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ بی پی پرابلم تھا۔ تبھی آنٹی کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اب جیسے سارے وسوسے اڑنچھو ہو گئے تھے۔ وہ خوشی سے بے حال افراہیم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد گرتی پڑتی ایمل بھی آ گئی۔ خوشی سے کودتی، چھلانگیں لگاتی، افراہیم، آنٹی اور ایمل اسپتال کے لیے نکل گئے تھے۔ انہیں خوشی ہی بہت عظیم ملی تھی۔ رات سے پہلے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اس کے کانوں میں آنٹی کی مسرور آواز اتر رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر کوئی بھالے اتار رہا تھا۔ جیسے قطرہ، قطرہ زہر اتار رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کرب کی لہروں کو اٹھتا محسوس کر رہا تھا۔ ''علیٰ عیسیٰ بہت خوش تھا۔'' آنٹی افراہیم کو بتا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اس نے جیسے آنکھیں میچ کر اس منظر سے نگاہ چرا لی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہی ٹھنڈا ٹھار، روشن، معطر، صاف ستھرا گیسٹ روم اس کے ذہن پر بوجھ لد گیا۔ دل بوجھل اور اوب رہا تھا۔ جیسے عیسیٰ کی خوشی اسے اندر سے کاٹ رہی تھی، جیسے اس کی خوشی آگ لگا رہی تھی۔ وہ سر تھامے بیڈ پر ڈھے گیا۔ بِنا کسی ٹھوس ثبوت کے عیسیٰ پہ ہاتھ ڈالنا کچھ نا ممکن تھا؟ جوشِ جذبات میں کوئی بھی غلط قدم اسے خود اپنی ہی نظر سے بھی گرا سکتا تھا۔ وہ جذبات میں آ کر کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غصے، جوش، جذبات معاملات بگاڑ سکتے تھے۔ اور یہ تو ویسے بھی رشتوں کا پل صراط تھا۔ اسے سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ ایک طرف مالا تھی اور دوسری طرف افراہیم کی فیملی پھر عیسیٰ کا افراہیم کی فیملی سے بہت گہرا تعلق لگتا تھا۔ بلکہ جو اسے نظر آ رہا تھا، اس پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

علی عیسیٰ، افریشم اور اب ان دونوں کا بیٹا...... ایک ہنستا، بستا خوشحال گھر...... وہ کیسے بِنا ثبوت کے اس گھر کی عمارت پر ضرب لگا دیتا؟ تھوڑا انتظار تو کرنا ہی تھا۔ کم از کم بندیا کی کال آنے تک...... اور یہ اس کی خوش نصیبی تھی جو آج ہی بندیا کی کال آ گئی تھی۔ اس نے بے تابی سے ممی اور مالا کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب بندیا نے اسے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو اسے جھنجوڑ کر رکھ گئی تھیں۔ بندیا نے بتایا تھا بلکہ وہ بہت سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔ جیسے مالا کی گفتگو کو ذہن میں دُہرا رہی تھی۔

''عیسیٰ کی کوئی تصویر نہیں مل سکی۔'' وہ مایوس پھر بھی نہیں تھی جبکہ ذی شاہ جیسے بجھ گیا تھا۔

''اور کچھ......؟'' ذی شاہ نے مایوسی کی لہر اپنے اندر اترتی محسوس کی تھی۔ جیسے وہ ایک دم ڈھے گیا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ وہ کم از کم عیسیٰ کو دیکھے بغیر کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟ ضروری تو نہیں تھا یہی علی عیسیٰ افراہیم کا بہنوئی ہوتا اور وہی مالا کا مجرم ہوتا۔ کیا خبر، اس کی نظر دھوکا کھا رہی ہو؟ کچھ بھی تو متوقع تھا۔ کچھ بھی غلط یا صحیح ہو سکتا تھا۔ جبکہ جلد بازی اور عجلت سوائے نقصان کے کچھ نہیں دے سکتی تھی۔ اور وہ کوئی نقصان اٹھا کر بھائیوں جیسے دوست افراہیم کی نظر سے گرنا نہیں چاہتا تھا، نہ اسے کوئی دکھ دینا چاہتا تھا۔

''اور بہت کچھ ہے۔'' بندیا جیسے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے پُر جوش ہو گئی تھی۔ وہ کچھ چونک گیا تھا۔ ذرا ٹھٹک گیا تھا۔

''کیا......؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، اس کا رواں، رواں کان بن گیا۔

''مالا نے بتایا ہے، علی عیسیٰ کے پاس ایک گاڑی ہے۔ اس کی لاڈلی benz جو اسے بہت پیاری ہے اور یہ کہ علی عیسیٰ کو بواریا سے بہت محبت ہے، اس کی ایک بہن مون کے متعلق بھی مالا نے بہت کچھ بتایا ہے۔ ذرا رکو میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' بندیا تھوڑے وقفے کے بعد پھر سے بولنے لگی تھی۔ شاید فون کان سے لگائے کچن میں چلی گئی تھی۔ کھٹ پٹ کی آوازوں سے وہ یہی اندازہ لگا سکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لائن پر دوبارہ آ گئی...... اس کی آواز میں

دریائے نیکر کی لہروں جیسی سنجیدگی تھی۔

''عیسیٰ کی بہن مون، مالا سے شدید نفرت کرتی تھی اور اسی کی وجہ سے......'' بندیا آگے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ اس نے وقفے، وقفے سے جو مالا سے باتیں اگلوائی تھیں، وہ اب ذی شاہ کے گوش گزار کر رہی تھی۔ ذی شاہ جیسے سانس روکے سن رہا تھا۔

''تو گویا سارے فساد کی جڑ یہ مون تھی۔'' ذی شاہ نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد نفرت سے کہا تھا۔ اگرچہ مالا نے پوری تفصیل نہیں بتائی تھی تاہم یہ بندیا کے اپنے اندازے تھے۔ جس پر تصدیق کی مہر ذی شاہ لگا رہا تھا۔ بندیا سے بات کرنے کے بعد اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ تو گویا کہانی کچھ، کچھ اسے سمجھ آ رہی تھی۔ مگر ابھی بہت سی الجھنیں باقی تھیں...اور بہت سے انکشافات ہونے کا وقت نہیں آیا تھا۔ تاہم اتنا وہ جان گیا تھا کہ علی عیسیٰ اور مالا کی طلاق میں مون حسیب کا بہت اہم کردار رہا تھا۔ اس کا خون جیسے ابلنے لگا تھا۔ رگوں میں کھولنے لگا تھا۔ نفرت اور غصے کا زہر اس کے دماغ پر چڑھ رہا تھا۔ علی عیسیٰ سے نفرت کا گراف کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ کانوں کا کچا مرد...... عورت کے اشارے پر ناچنے والا...... بہن کا تابع...... اس کے اندر آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ شعلے بھڑکتے جا رہے تھے۔ اس آگ میں جل کر کون، کون خاکستر ہونے والا تھا؟ اس بات سے سب ہی انجان تھے۔

☆☆☆

رات کو ایمل اور افراہیم واپس آ گئے تھے۔ اور وہ جو اتنے گھنٹوں کی ذہنی اذیت کے بعد اب ویس ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے ارادے کو پس پشت ڈال گیا تھا۔ ایمل اسپتال سے آ کر بہت خوش تھی۔ بار بار موبائل میں کھینچی تصاویر دکھاتی۔ پہلے تو وہ بے دلی سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر جیسے ٹھٹک گیا۔ ہر تصویر میں علی عیسیٰ واضح تھا۔ ننھے سے بچے کو گود میں لیے، کمبل میں لپٹا نومولود بھلا کون دیکھ رہا تھا؟ وہ تو ہکا بکا علی عیسیٰ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے ایک دم ذہن میں کچھ کلک سے روشن ہوا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کی ہنستی مسکراتی گہری آنکھوں میں نمی نظر آ گئی تھی۔ کچھ سوز کچھ درد، کچھ خوشی میں ڈوبی مسکراہٹ...... ایمل نے کھٹ کھٹ کئی پکچرز دکھائی تھیں۔ افریشم، آنٹی، افراہیم اور کچھ مزید لوگ بھی تھے۔ یقیناً ان کے ملنے ملانے والے...... مگر وہ تو ایک ٹک علی عیسیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ ایک پکچر میں وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بچے کو دیکھتا کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک تصویر میں وہ بچے کے کان میں اذان دے رہا تھا۔ ذی شاہ کو جیسے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کے اندر بھانبھڑ جلنے لگے۔ دھواں نکلنے لگا۔ آگ بھڑکنے لگی۔

''عیسیٰ نے منے کا نام محمد موسیٰ رکھا ہے۔'' ایمل سرشاری بتا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ موبائل سے بچے کو نکال کر چوم، چوم کر حشر کر ڈالتی۔ پھر وہ موبائل اسے تھما کر اپنی شاپنگ دکھانے لگی تھی۔ وہ بچے کے لیے ڈھیروں کھلونے، کپڑے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھا لائی تھی۔ اپنے منے سے بھانجے کے لیے وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ ایمل تو اسپتال سے آنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر افراہیم اسے زبردستی لے آیا۔ ذی شاہ سے کچھ بھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جالے آنے لگے۔ وہ ایمل کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا مگر پھر بھی وہ اسے سنا رہی تھی۔ ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی، اس کا بس چلتا تو بچے کو افریشم کی گود سے کھینچ لاتی اور ذی شاہ کو زبردستی دکھاتی۔

''موسیٰ مجھ پر پڑا ہے، اتنی کیوٹ ہوں میں اور اتنا کیوٹ ہے وہ۔'' وہ جھوم، جھوم کر بتا رہی تھی۔ انتہائی خوش اور پُرجوش......

''عیسیٰ کو اتنی فکر تھی، میں منے کو لاڈ کر کر کے بے ہوش نہ کر دوں۔'' ایمل نے ننھے منے کھلونوں کو کارپٹ پر بکھیر دیا تھا۔ اب وہ ایک، ایک چیز کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ کی نگاہ کے سامنے مالا کا چہرہ آ گیا۔ پارک میں بچے کی طرف لپکتی مالا، اسے چومتی، لاڈ کرتی۔ پھر بچوں کی ڈھیروں شاپنگ کھلونے، کپڑے، مُنّے مُنّے جوتے، جن کا عینی نے اتنا مذاق اڑایا تھا۔

ذی شاہ کی آنکھوں میں کانچ چبھنے لگے تھے۔ موبائل اسکرین پر روشن وہ یونان کے دیوتاؤں جیسا روپ سروپ رکھنے والا علی عیسیٰ محبت پاش نظروں سے منے سے بچے کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اس کے اندر باہر جیسے آگ بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی ایک بھی منظر اس کی آنکھوں میں جم کر نہ دیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ ایمل کی طرف متوجہ تھا جو اسے کچھ بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب کچھ، کچھ برہمی اور غصہ تھا۔ ذی شاہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ ایمل کو اچانک کچھ یاد آ گیا تھا۔

''میں نے منے کا نام پہلے بلی رکھا، وائٹ کیٹو...... جو کسی کو پسند نہیں آیا۔ پھر چوزا رکھا...... یہ بھی کسی کو پسند نہیں آیا...... افراہیم نے کہا ہمارا منا تو شیر جیسا ہے، بھلا شیر کوئی کیوٹ ہوتا ہے؟'' ایمل نے ناگواری سے منہ بنا، بنا کر بتایا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے رکھے نام ناپسند کیے تھے تبھی وہ بھی ان کے رکھے نک نیم ریجیکٹ کر رہی تھی۔ ذی شاہ ذرا دھیان دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگر ایمل کی بات پہ غور نہ کرتا تو وہ اور بھی ناراض ہو جاتی اور ایمل کی ناراضی سہنا کچھ آسان نہ تھا۔ جبکہ فی الحال وہ سخت غصے میں لگ رہی تھی۔

''پھر عیسیٰ بولا، ہمارا منا تو چیتے جیسا ہے، ہونہہ...... چیتا بھی کوئی کیوٹ ہوتا ہے؟ چوزے، بلیاں اور مچھلیاں پیاری ہوتی ہیں۔'' ایمل جیسے تمام باتیں پھر سے دُہرا رہی تھی۔ اب کہ اس کی نیلی آنکھوں میں شدید غصہ بھر گیا تھا۔ ذی شاہ سہم سا گیا اور اس کی اداکاری کو محترمہ نے کھانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور وہ اسے ہی گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

''پھر میں نے کہا...... شیر اور چیتے تو خونخوار اور درندے ہوتے ہیں، ہمارا منا ایسا نہیں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے پچکار کر بول رہا تھا۔

''تم نے ٹھیک کہا...... منا، شیر اور چیتا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے معصوم سے بچے کو شیر اور چیتے سے تشبیہ دینا مناسب نہیں۔'' اپنے تئیں اس نے ایمل کی حمایت کی تھی مگر وہ جیسے دہاڑ کر رہ گئی۔ ذی شاہ پھر سہم گیا تھا۔ اگرچہ یہ سہمنا مصنوعی تھا پھر بھی......

''ہاں...... میں نے بھی یہی کہا تھا۔ اتنا معصوم بچہ شیر اور چیتا کیسے ہو سکتا ہے۔ منا تو چھپکلی جیسا ہے۔ وائٹ اور تجلجلا سا...... اس بات پر مجھے افریشم نے تھپڑ مارا...... افراہیم بھنّا گیا اور عیسیٰ ہنستا رہا۔ میں رو پڑی تھی تو تب افریشم کو اور غصہ آ گیا۔ اس نے کہا...... اتنی گندی مخلوق سے میرے بچے کو تشبیہ کیوں دی؟ کیا یہ دیواروں سے چپکا، ڈراؤنی چھپکلی جیسا ہے؟ تب...... تب مجھے عیسیٰ کے ہنسنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اور افریشم کے غصے کی بھی۔ میرا دل چاہا، میں تمہارا قیمہ بنا دوں؟'' ایمل آگ بگولا ہو کر چیخی تھی۔ تب ذی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اور پھر وہ ہنس، ہنس کر بے حال ہو گیا۔ اسے لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر ایمل کو اور بھی غصہ آ گیا تھا۔ اس نے کشنز کے ڈھیر کو نگاہوں کی زد میں کر لیا تھا۔

''تو کیا میں چھپکلی جیسی ہوں؟'' اس نے کشن کی برسات کر ڈالی تھی۔ ذی شاہ دم دبا کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگ نہ سکا۔ ایمل کے نشانے بڑے ٹھیک لگ رہے تھے۔ اسے بچاؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا اور ایمل کی بے عقلی اور اپنے راز کھلنے پر ہنسی آ رہی تھی۔

''نہ...... نہ میری پیاری بہن تو شہزادی ہے۔'' اگلے آدھے گھنٹے تک وہ ایمل کی جھوٹی سچی تعریفوں میں رطب اللسان رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایمل کا موڈ بہتر ہو گیا۔ بالآخر اس نے غصہ تھوک دیا تھا۔ اور دوبارہ سے منے کے عشق میں فنا ہونے لگی تھی۔ جب ذی شاہ کو اچانک بندیا کی باتیں یاد آ گئیں۔ علی عیسیٰ کی بہن مون، اس کی لاڈلی benz اور بواریا...... وہ کڑی سے کڑی ملاتا رہا۔ مگر پھر بھی کچھ مسنگ تھا۔ کچھ ادھورا تھا۔ کہیں خالی پن ضرور تھا۔ کچھ نگاہ سے اوجھل بھی تھا۔ کچھ پردے کے پیچھے بھی تھا...... کچھ ایسا ضرور تھا جو کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ معاً اسے خیال آیا...... ایمل سے محتاط ہو کر بھی پوچھنا

تھا۔ پھر جیسے وہ موضوعِ گفتگو بدل کر گاڑیوں کی بات کرنے لگا۔ نئے اور پرانے ماڈل کی گاڑیاں......

''تمہیں کون سی گاڑی پسند ہے؟'' اس نے منے کے کھلونوں میں سے ایک کار کو اٹھا کر ایمل کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ کارپٹ پہ مختلف رنگوں کی کاریں بکھری پڑی تھیں۔ ہر رنگ اور ہر ماڈل کی کار...... ایمل کو گاڑیوں کا شوق تھا۔ تبھی کھلونوں میں کاروں کا ڈھیر اٹھا لائی تھی۔ یقیناً یہ ایمل کا پسندیدہ ٹاپک تھا۔ وہ کچھ، کچھ پُرجوش ہو چکی تھی۔ اور بکھری کاروں کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے...... ferrari پسند ہے۔ آئی لو فراری...... افراہیم کو hummar پسند تھی۔ پھر lexus اٹھا لایا۔ بڑی مشکل سے اتنے پیسے جمع کر کے خریدی تھی۔ گاڑی کی ضرورت بھی تھی اور شوق بھی۔ افریشم کا دل infinity پر آ گیا تھا مگر ہم لوگ لے ہی نہ سکے۔ افریشم نے اب اپنا شوق پورا کر لیا ہے۔ اس کے پاس دو، دو گاڑیاں ہیں...... bmw اور infinity بھی...... جب میں شادی کروں گی تو اپنے شوہر سے کہوں گی مجھے فراری لے کر دے...... تم دعا کرنا مجھے اتنا امیر شوہر مل جائے۔'' وہ ایک پیر کارپٹ پر رکھے، گھٹنا فولڈ کر کے صوفے پر رکھے، ہتھیلی کو گھٹنے پر جما کر منہ اس کے اوپر سجائے بڑے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ تب ذی شاہ کی آنکھیں ذرا پھیل گئی تھیں۔

''افریشم کے پاس دو، دو گاڑیاں ہیں...... اور وہ پھر بھی بس سے یہاں آتی ہے؟'' اسے مطلب کی بات بالآخر مل ہی چکی تھی۔ انتہائی عام سے لہجے میں بات کرتا وہ خاصا بے پروا نظر آ رہا تھا۔ اسے اچانک بس اسٹاپ کا منظر یاد آیا تھا۔ افریشم کا بس پر آنا؟

''جب گھر میں نہ ہوں تو بس پر بھی آ جاتی ہے۔'' ایمل اس سے بھی زیادہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تفتیش کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

''اچھا تو عیسیٰ کے پاس benz نہیں تھی؟'' اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے ایمل کا موبائل پھر سے اٹھا لیا تھا۔ تصویریں پھر سے روشن ہو گئی تھیں۔ علی عیسیٰ اس کے دل کا ناسور...... وہ زہرخند ہونے لگا۔ آنکھوں میں ہر عکس چبھنے لگا تھا۔ اندر زہر اترنے لگا۔

''تھی ناں...... بہت پہلے...... پھر جل گئی۔'' ایمل ایک دم دکھی سی ہو گئی تھی۔ ''عیسیٰ کو benz سے بڑا پیار تھا۔ پھر خود ہی جلا دی......'' اس کی آنکھوں میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ عیسیٰ نے benz کیوں جلائی؟ ایمل نے یہ نہیں بتایا تھا جبکہ ذی شاہ اندر تک ساکت ہو گیا تھی۔ بندیا نے بھی یہی بتایا تھا۔ علی عیسیٰ کو benz سے بڑا پیار تھا۔ benz اس کا دوسرا عشق...... جسے اس نے خود اپنے ہاتھ سے راکھ راکھ کر دیا تھا کیوں؟ کس لیے؟ عیسیٰ نے بینز کو کیوں جلا دیا تھا؟

''اچھا یار...... تم Audi, ford, opel کو چھوڑو، مجھے بواریا کے متعلق بتاؤ...... بواریا کون ہے؟ کسی کا اسم شریف ہے؟'' وہی بے پروا سا، بے نیازانہ اسٹائل، وہ ایمل کو چونکانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ تبھی بڑے محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ذرا بے پروا، ذرا سرسری اور ذرا بے نیاز سا، ادھر ایمل قل، قل ہنستی جیسے اس کی لاعلمی پر چوٹ کر رہی تھی۔ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اور بواریا کو اسم شریف کے اسٹائل میں پوچھنے پر یا کوئی خاتون سمجھنے پر ہنس رہی تھی۔

''تمہیں بواریا کا نہیں پتا؟'' ایمل نے آنکھیں گھما کر جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔ ''ارے...... تم نے بواریا نہیں دیکھا تو سمجھو کچھ نہیں دیکھا...... جرمنی کا صوبہ ہے اور اس کے بے شمار حسین سرسبز دیہات......'' وہ افراہیم کی زبان میں اسے بتا رہی تھی۔ وہ چونک، چونک اٹھا۔ بواریا کا ذکر منکشے نے بھی کیا تھا۔ ہاں، وہ بھی بواریا کی بات کر رہی تھی۔

''آہ...... بواریا جانے کے لیے تو سب ہی تڑپتے ہیں۔ وہ جنت کا کوئی خطہ ہے، اتنا حسین کہ آنکھیں بھر جائیں پر منظر ختم نہ ہوں...... عیسیٰ کا سارا ننھیال بواریا میں تو ہے۔ ہم بھی عیسیٰ کے ساتھ بواریا گئے تھے۔ جسم واپس لے آئے، روح وہیں چھوڑ

آئے۔ افراہیم بتاتا ہے، پاکستان میں بھی ایک علاقہ بواریا جیسا موجود ہے۔'' ایمل بھی بواریا کے عشق میں مبتلا تھی۔ جرمنی کے سرسبز دیہات، جو پاکستانی دیہاتوں سے انتہائی مختلف تھے۔ ہر طرح کی سہولیات سے مزین...... جدید، عمدہ......

''عیسیٰ کو بواریا سے بہت محبت ہے، پر اب وہ بواریا نہیں جاتا۔ تعلق جو ٹوٹ گئے۔'' ایمل کے باتونی پن نے جیسے اس کے بے شمار مسئلے حل کر دیے تھے۔ بے شمار جالے ہٹ چکے تھے۔ بے شمار راز کھل چکے تھے۔ اب تو کوئی شک نہیں رہا تھا۔ علی عیسیٰ، اس کی مالا کا مجرم تھا اور خود ایسی خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی بہن کو ناکردہ گناہوں کی سزا دے کر وہ کیسے چین پا سکتا تھا؟ کیسے سُکھ سے جی سکتا تھا؟ وہ اس کی زندگی جہنم بنا کر جائے گا۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارے گا۔ اس کے سکھ چین کو چھین کر جائے گا۔ اسے عمر بھر کے لیے ایسا مزہ چکھائے گا کہ زخموں پر کبھی کھرنڈ نہ چڑھ سکیں گے۔

اس کا خون ابلنے لگا تھا پھر ایمل کے اٹھتے ہی اس نے موبائل اٹھایا۔ بلیوٹوتھ آن کر کے عیسیٰ کی تصویر اپنے موبائل پر سینڈ کیں۔ یہ خیال ابھی، ابھی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اب وہ ایمل کا سیل وہیں رکھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک کر کے اس نے لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ اب وہ تمام تصویریں موبائل سے لیپ ٹاپ میں منتقل کر رہا تھا۔

آخر یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟ عیسیٰ کی تصویریں ایمل سے مانگی بھی تو جا سکتی تھیں مگر اس کام میں رسک تھا۔ اب تو ایمل کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ذی شاہ نے اس کے موبائل سے صرف علی عیسیٰ کی تصویریں اڑائی ہیں۔

بندیا کو علی عیسیٰ کی تصویریں سینڈ کر کے اسے ارجنٹ کال کی تھی اور فوراً آن لائن ہونے کو کہا تھا۔ بندیا نے حکم کی فوری تعمیل کی تھی۔ عیسیٰ کی تصویریں دیکھ کر وہ شاکڈ رہ گئی۔ دنگ رہ گئی تھی، کئی لمحوں تک منجمد رہی تھی۔ اس سے بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

''یہ عیسیٰ ہے، حبیب چاچو کا بیٹا...... اتنا حسین...... اور یہ بچہ کون ہے؟'' بندیا نے ایک ہی سانس میں کئی سوال اگل دیے تھے۔ وہ بار، بار علی عیسیٰ کو دیکھے جا رہی تھی۔ حیران، متحیر، ستائشی نگاہوں سے۔ رشک کرتی اور دکھی ہوتی، روتی ہوئی۔

''سنو بندیا! میری بات دھیان سے سنو...... میں علی عیسیٰ تک سمجھو پہنچ چکا ہوں، وہ افراہیم کا بہنوئی ہے، اس کی بہن سے دوسری شادی کر چکا ہے، یہ بچہ عیسیٰ کا ہے۔ مگر مالا کو کچھ مت بتانا...... بس مجھے تصدیق کرنی ہے، کیا یہ واقعی وہی علی عیسیٰ ہے؟ تم مالا کو تصویریں دکھاؤ۔'' کچھ دیر بعد ذی شاہ نے بہت بوجھل انداز میں بندیا سے کہا تھا۔ پھر لیپ ٹاپ آف کر کے بیڈ پر ڈھے گیا۔ اب اسے بندیا کی کال کا انتظار تھا۔ وہ لمحہ، لمحہ بے قرار سا انتظار کرنے پر مجبور تھا اور اس کا روم روم جیسے التجا کر رہا تھا۔ دعا کر رہا تھا۔ درخواست کر رہا تھا، تمنا کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔

''اللہ، وہ مالا کا علی عیسیٰ نہ ہو...... میرا وہم بس وہم رہے۔ وہ افریشم کا ہی علی عیسیٰ ہو۔'' اس کے اندر سناٹے گونج رہے تھے۔ خاموشی تڑپ رہی تھی۔ اضطراب ٹھاٹیں مار رہا تھا اگر اس کے تمام خدشات درست نکلے تب وہ کیا کرے گا؟ کون سا قدم اٹھائے گا۔ افراہیم کو سچ کیسے بتائے گا؟ ان کی خوشیاں تہس نہس کیسے کرے گا؟ افریشم کی زندگی تباہ کیسے کرے گا؟ آنٹی، ایمل اور افراہیم کا سامنا کیسے کرے گا؟ وہ سچ بتا کر ان لوگوں کی ہنسی کا گلا کیسے گھونٹے گا۔ گر جو علی عیسیٰ مالا کا مجرم نکلا تب......؟ ہاں تب وہ افراہیم کو سچ بتا دے گا۔ علی عیسیٰ کی زندگی میں زہر گھول دے گا۔ اس سے اپنی بہن کے ایک، ایک آنسو کا حساب لے گا۔ قیامت آتی ہے تو بے شک آئے، اسے کسی کی پروا نہیں تھی، نہ افراہیم کی، نہ آنٹی کی نہ افریشم اور ایمل کی۔ اسے بس مالا کے مجرم کو سزا دینا تھی۔ اس کا اتنا لمبا سفر رائگاں چلا جائے...! یہ ذی شاہ کو گوارا نہیں تھا۔ وہ علی عیسیٰ سے حساب لینے آیا تھا۔ پھر کیسے نہ حساب لیتا؟ بنا

کتا بچے کھولے کیسے ناکام لوٹ جاتا۔ وہ اپنے اندر کا سارا زہر علی عیسیٰ کے من میں اتار کر ہی جانے والا تھا۔ وہ علی عیسیٰ کو زمین میں زندہ در گور کر کے ہی جانے والا تھا پھر جیسے انتظار کی گھڑیاں تھم گئی تھیں۔ وقت کی نبضیں رک، رک گئیں۔ پاکستان سے بندیا کا فون آ گیا تھا۔ وہ قیامت کی خبر لائی تھی۔ ذی شاہ کی سانس تک رک گئی۔ دھڑکن تک تھم گئی تھی۔ وجود کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ درد انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

"اِدھر تو قیامت آ گئی ذی بھیا......! وہ مالا کا علی عیسیٰ ہے، اس نے پہچان لیا اور پچھاڑیں کھا کر بے ہوش ہو گئی۔ ہم مالا کو اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔" بندیا نے روتے ہوئے اس کے جسم سے روح کو کھینچ لیا تھا۔ فون بند ہو گیا اور جیسے ذی شاہ کا دل بھی بند ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دو تین اور چار دن گزر گئے۔ اسے ایسا بخار چڑھا کہ کئی دن ہوش نہیں آیا۔ افراہیم کی فیملی جیسے دیوانی ہو گئی۔ آنٹی کی جان کو غم لگ گیا۔ پردیسی بچہ خیر سے گھر جائے۔ یہاں کیوں بیمار پڑ گیا۔ انہیں جیسے پورا یقین تھا ویس ہاؤس کی ساری نحوست کا اثر ذی شاہ کی جان پر پڑا تھا۔ وہ منکشے کو جی بھر کر کوستی تھیں۔ ایمل اور افراہیم اس کی پٹی سے لگ گئے تھے۔ بیچ میں افریشم بھی اس کی احوال پرسی کے لیے آئی تھی۔ منا سا بچہ اٹھا کر، ذی شاہ کا دل چاہا وہ افریشم کی گود میں سوئے بچے کی ننھی سی گردن دبوچ ڈالے کچھ ایسی نفرت سی ہو چکی تھی اسے علی عیسیٰ اور اس کے بچے سے۔ دل چاہتا تھا، پوری دنیا کو آگ لگا دے۔ جس دن اسے ڈسچارج ہونا تھا۔ یہ اسی دن کی بات تھی۔ وہ جو یہاں سے جانے کے بعد اگلا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ ایک دم منکشے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ جانے وہ کس حال میں تھی؟ زندہ بھی تھی یا مر چکی تھی؟ اور اب تو اتنے دن ہو چکے تھے اس کی لاش تک گل سڑ چکی ہو گی۔ ذی شاہ کے دل پر بوجھ آ پڑا تھا۔ وہ اندر تک کھوکھلا ہو گیا۔ منکشے کی صورت جیسے دل پر پنجہ جما گئی تھی۔ یوں ہی اتنا ڈھیر سا وقت بیت گیا۔

افراہیم ابھی پہنچا نہیں تھا۔ ذی شاہ نے سوچا، وہ خود ہی ڈسچارج شیٹ بنوا کر گھر چلا جاتا ہے۔ آخر اس نے افراہیم کے گھر سے کوچ کرنے کی بھی تو تیاری کرنا تھی۔ اب تو وہ لمحے بھر کے لیے بھی اِدھر ٹکنے والا نہیں تھا۔ افراہیم کے گھر رہنے کا مطلب تھا، افریشم، عیسیٰ اور اس کے بچے سے بار بار سامنا ہوتا جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ پھر یہاں سے جا کر ہی وہ افراہیم کے سر پر بھی دھماکا کرنا چاہتا تھا۔ عیسیٰ کے کالے کرتوت بتا کر...... وہ بیڈ سے اتر کر کسی نرس یا ڈاکٹر کو تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔ جب کوئی چپکے سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ ذی شاہ نے گردن موڑ کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا...... زمین جیسے گول، گول گھومنے لگی تھی۔ وہ جیسے کسی قبر سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہی غلیظ سی مور گن روک پہنے، پہلے سے بھی بدحال، نڈھال اور کمزور، چلتی تو چلا نہ جاتا دیوار پکڑ، پکڑ کر بڑھ رہی تھی۔ پھر جیسے چکرا کر گرنے ....لگی تھی جب ذی شاہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ وہ کوئی ذی شاہ کی منکشے تھی؟ اسے یقین ہی نہیں آیا۔ اتنی بدحال، نڈھال، کمزور، اس سے بولا نہیں جا رہا تھا، وہ اس کی عیادت کرنے آئی تھی یا ایڈمٹ ہونے؟ جانے کتنے دن کی بھوکی تھی؟ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سہارا دے کر منکشے کو بیڈ پر بٹھایا تھا۔ پھر جوس کا گلاس بھر کے تھمایا...... اس کا دل مٹھی میں آ رہا تھا۔

"اللہ پہلے کیا مسئلے کم تھے جو یہ ایک نیا امتحانِ محبت...... اس پرچے میں کہیں فیل نہ ہو جاؤں۔" وہ افسردہ سا سوچ رہا تھا۔ منکشے کی حالت سخت تشویشناک تھی۔ اس کا بی پی بھی بہت لو لگتا تھا اور آنکھیں جیسے بجھتی جا رہی تھیں۔

"کتنے دن سے بھوکی ہو؟" وہ جیسے بہت غصے اور کرب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منکشے کی گیلی آنکھیں، پپڑی زدہ ہونٹ، بالوں کا گھونسلا، کمزور وجود...... اس کے دل پر گھونسا سا پڑا تھا۔ وہ فق بیٹھا اسے دیکھے جا رہا تھا، حیران، متحیر......

"جب سے تم آئے نہیں...... نو دن ہو گئے، پانی اور بسکٹ...... ہاں، تمہارے لیے زندہ رہنا تھا۔ ورنہ یہ بھی نہ کھاتی...... مجھے تم تک آنا تھا۔ تمہیں کچھ بتانا تھا۔" منکشے نے گیلی آنکھیں زور سے رگڑیں۔ وہ رو نہیں رہی تھی پھر بھی آنکھوں سے بہتا پانی...... اس کے اندر آنسوؤں کا شاید چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

"اللہ، یہ گیلی آنکھیں...... دم نہ نکال لیں۔" وہ گم صم سا ہو گیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے معنی خیز خاموشی کا جال تن گیا۔ وہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی ساکت، بے جان مجسمہ ہو، ذی شاہ کو خود ہی مخاطب کرنا پڑا تھا۔ اس نے مجسمے کا کندھا ہلایا۔ اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔

"منکشے! تم خود اپنے ساتھ کتنا ظلم کر رہی ہو، بھوکی رہ، رہ کر کسی دن مر جانا، کوئی دفنانے بھی نہیں آئے گا۔" وہ کرب انگیز لہجے میں بولا تھا۔ اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں آنکھیں رگڑ رگڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے دیکھ، دیکھ کر دل نہیں بھر رہا تھا۔ ذی شاہ جھنجلا گیا تھا۔ کیسی بے خود، شرابی سی قاتل نظریں تھیں۔

"ایسے کیوں دیکھتی ہو؟" وہ جز بز ہو گیا۔

"تو کیسے دیکھوں؟" منکشے اداسی سے مسکرا دی تھی۔ وہ چپ سا رہ گیا تھا۔ معاً خیال آنے پر چونکا۔

"تم نے کچھ بتانا تھا؟" اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ بھی جانے کیا بتانے کے لیے بے چین بیٹھی تھی۔ اس کے توجہ دلانے پر چونک گئی تھی پھر جیسے لمبی، لمبی سانس لینے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی ناکارہ انجن دھواں چھوڑ رہا ہے۔ اس کا وجود بھی جھٹکے کھانے لگا تھا۔ شاید کمزوری کے باعث وہ کانپ رہی تھی، وہ بنا سوئیٹر کے نکل آئی تھی۔ ذی شاہ کو جیسے ہی احساس ہوا تھا اس نے اپنی چادر اتار کر اسے پہنا دی تھی۔ حالانکہ کمرے میں ہیٹر بھی لگا تھا۔ پھر بھی وہ بری طرح سے لرز رہی تھی، لحظہ لحظہ ہونٹ کاٹتی منکشے کتنی مضطرب، بے حال اور بے قرار لگ رہی تھی۔ جانے وہ کیا بتانے والی

تھی۔ ذی شاہ کا رُواں، رُواں کان بن گیا تھا۔

"میں نے بہت گناہ کیے ہیں۔" منکشے نے سر جھکا کر جیسے پہلا انکشاف کیا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں چونکا۔ بس اسے سننا چاہتا تھا۔ ذی شاہ جان گیا تھا، وہ اپنے دل پر کوئی بوجھ لیے پھر رہی ہے۔ اسے کسی ایسے سامع کی ضرورت تھی جو اس کے دل کا بوجھ اتار لیتا۔ معاً منکشے نے ذی شاہ کو بری طرح ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ کوئی سوال کر رہی تھی۔

"تمہارے نزدیک گناہ کیا ہے؟" اب وہ اسے بولنے پر اکسا رہی تھی۔ وہ جیسے لحظہ بھر کے لیے متحیر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولتی رہی تھی۔ پھر ذی شاہ نے گناہوں کی ایک فہرست ذہن میں ترتیب دی تھی۔ اسے جواب تو دینا ہی تھا۔

"شراب، جوا، جھوٹ، غیبت، چوری، ڈاکا، حرام کاری، یہ سب بھاری گناہ ہیں، کیا تم ان گناہوں کے بوجھ سے شرمسار ہو؟" اس کا دل رک، رک کر چلنے لگا تھا۔ جانے وہ کیا بولتی؟ آخر مغربی لڑکی تھی۔ یہاں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا؟ گناہ و ثواب سے قطع نظر...... موت کے خوف سے دور، بس آزادی کا ناجائز استعمال، تو جانے یہ کس قسم کے بھاری گناہ کے بوجھ تلے دبی تھی۔ کاش کہ وہ یہ سوال نہ ہی کرتی...... وہ جیسے خود بھی کسی بوجھ تلے دب گیا تھا۔

"نہیں۔" اس کے ایک لفظی جواب نے ذی شاہ کو اندر تک شانت کر دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں ہر بوجھ سے آزاد ہو گیا...... اب وہ کچھ اور پوچھ رہی تھی۔ سر جھکائے گم صم سی، کھوئے کھوئے لہجے میں، بے خودی۔ وہ اپنے آپ میں کہاں لگتی تھی۔

"کیا تمہارے نزدیک یہی بڑے گناہ ہیں؟" اس کا سوال، اسی کی طرح عجیب تھا ذی شاہ پھر سے ٹھٹک گیا۔

"ہاں......" اس کے ذہن میں گناہوں کی فہرست اب خالی ہو چکی تھی۔ تبھی اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"کیا کسی کو قتل کرنا گناہ نہیں ہے؟" گیلی آنکھوں والی لڑکی اسے دہلانے آئی تھی یا ہلانے آئی تھی؟ وہ لمحہ

بھر کے لیے دم بخود رہ گیا تھا۔ جیسے لفظ کھو گئے تھے۔ جیسے لفظ گم ہو گئے تھے۔ جیسے کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بڑی بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

''تم...... تم نے کس کو قتل کیا ہے منکشے؟'' ذی شاہ نے دہل کر اس کا چہرہ دیکھا...... گلاب پہ اوس گر رہی تھی۔ زرد گلاب اور گدلی اوس...... اس سے گیلی آنکھوں کو دیکھا نہیں گیا تھا۔ منکشے کے آنسو اس کی کمزوری بن گئے تھے۔

''اللہ یہ روئی، روئی آنکھیں......'' وہ جیسے تھم تھم گیا تھا۔ رک رک گیا تھا۔ ٹھہر ٹھہر گیا تھا۔ منکشے اسے کس موڑ پر لے آئی تھی؟ نہ وہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گیا۔ کانوں میں آنٹی اور ایمل کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ویس ہاؤس میں قتل، پاگل، جنونی، اور خبطی منکشے...... اسے ویس ہاؤس جانے سے روکنا، منکشے کو برا بھلا کہنا...... اس کی برائیاں کرنا...... ایک، ایک جالا ہٹ رہا تھا۔ منکشے قاتل تھی، اس نے کس کو قتل کیا تھا؟ تو کیا یہ سچ تھا؟ وہ واقعی کسی کو قتل کر چکی تھی؟

''علی عیسیٰ کی بہن، مون حسیب کو...... وہ ایک بری لڑکی تھی، اللہ نے اسے عظیم نعمتوں سے نوازا...... ایسا دماغ دیا جو نکولس کو دیا تھا۔ جو گراہم بیل کو دیا تھا، جو چارلس ویٹسٹون کو دیا تھا۔ مگر اس نے اپنے دماغ سے کوئی ایک بھی عظیم کام نہیں لیا نہ نظام شمسی میں نکولس کی طرح کوئی کارنامہ سرانجام دیا۔ نہ گراہم بیل کی طرح ٹیلی فون جیسی کوئی ایجاد کر سکی۔ نہ زمین کی مقناطیسی قوتوں کو دریافت کیا نہ فزکس، کیمسٹری میں نئے نظریے لائی، نہ تجربات کیے...... بس ایک حسد اور انتقام کے پیچھے آگ لگاتی گئی۔ پھر میں نے اس بری لڑکی کا کام تمام کر دیا...... تاکہ اس کا خطرناک ذہن مزید تباہیاں نہ لا سکے۔'' گیلی آنکھوں سے قطرہ، قطرہ لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ جیسے مون حسیب کو قتل کر کے بڑی شانت اور پُرسکون بیٹھی تھی۔ اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا، پھر بھی یہ بے قراری......؟ یہ اضطراب؟ یہ بے سکونی......؟ یہ اذیت؟ غم؟ یا پاگل پن، ڈراما تھا؟

''مون حسیب کون؟ علی عیسیٰ کی بہن۔'' ذی شاہ دم بخود پوچھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ جان تو چکا تھا پھر بھی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے تصدیق کرنی تھی اور وہ بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''علی عیسیٰ اور مون، تمہارے کزن...... حسیب احمد کے بچے...... اتنے انجان کیوں بن رہے ہو؟ اسی کہانی کی تلاش میں تو یہاں آئے ہو، سو میں آج تمہیں سب بتا دوں گی جو کچھ تم جانتے ہو اور جو نہیں جانتے۔'' منکشے کے انکشاف نے اسے پتھر کا کر دیا تھا۔ وہ اگلی سانس تک نہ لے سکا۔

''کیا بتاؤں گی؟ یہ تم سمجھ جاؤ گے، پہلے سنو...... مون حسیب کون تھی؟ کیا تھی؟ اور اس کا ذہن کیوں اتنا خطرناک تھا؟'' گدلی گیلی آنکھوں کو رگڑتی سر جھکائے بیٹھی منکشے ابھی تک کانپ رہی تھی۔ اس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ یہ تو آنے والے وقت کا لرزہ طاری تھا جو اسے رعشہ زدہ بنا رہا تھا۔ خوف نے اس کے دل میں پنجہ جما رکھا تھا اور وہ سامنے بیٹھے اس وجود کو زندگی کی آخری سانس تک کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سامنے بیٹھے وجود کو کیسے بتاتی؟ کس طرح بتاتی؟ کہ وہ اس شخص کے عشق میں کتنے سالوں سے گرفتار تھی۔ وہ اس سے کیسا عشق کرتی تھی؟ بھلا کس طرح سے اسے بتا دیتی؟ اس عشق کی ابتدا تو مون حسیب سے شروع ہوتی تھی۔ مون حسیب بھلا کون تھی؟

''وہ ماہرِ اشکالِ افکار تھی اور ذہنوں کو اپنے بس میں کر لیتی تھی۔ یعنی لوگوں کے دماغ میں گھس کر انہیں تسخیر کر لیتی تھی۔'' منکشے نے سر جھکا کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا جبکہ ذی شاہ جیسے بھونچکا رہ گیا۔

کیا ذی شاہ، افراہیم کو علی عیسیٰ کی حقیقت بتا پائے گا؟ منکشے کیا راز فاش کرنے جا رہی تھی؟ یہ سب ضرور واضح ہوگا مگر نومبر کے شمارے میں۔

میری گڑیا

سعدیہ عزیز آفریدی

ایمبولینس سے نکلتے اسٹریچر کو لے کر میل نرس اندر کی طرف تقریباً بھاگ رہے تھے۔ سلیم احمد بھی اُن کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسٹریچر کے پہیوں کے نیچے کسی نے اس کا دل رکھ دیا ہے اور یہ پہیے اس کا اپنا آپ کچلتے ہوئے آگے چلے جا رہے ہیں۔

اسٹریچر پر زینت تھی...... وہی زینت جسے دس سال پہلے وہ زندگی کی اولین خوشی کی طرح اپنے گھر بیاہ

کرلایا تھا۔ یہ کہانیوں کی یا افسانوں کی طرح محبت کی شادی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اُن کی زندگی میں محبت ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گل و خوشبو کی طرح اُگتی پھلتی پھولتی ہوا کے سنگ ہم سفر تھی۔

زینت کے پاس سب کچھ تھا بس وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ زینت کو بیٹے کی خواہش تھی اور اُسے ہمیشہ عام مردوں کے برعکس بیٹیوں کی خواہش۔ وہ اکثر اس بات پر لڑ پڑتے تھے لیکن پھر دونوں نے اس پر سمجھوتا کرلیا۔

''بیٹی ہوئی تو تمہاری محبت سے بڑھ کر اسے پیار دوں گی۔'' وہ مسکرا دیتا اور جواباً کہتا۔

''بیٹا ہوا تو تمہارے سارے خواب اس کی آنکھوں میں دیکھ، دیکھ کر جیا کروں گا۔''

زندگی اس پیار بھرے سمجھوتے سے لپٹی ہوئی آگے کا سفر جاری رکھے ہوئے تھی جب اس کے ہاں بیٹی نے جنم لیا۔ اس کی بیوی نے اپنی خواہش سے بڑھ کر اس کی خوشی کو دل سے سینچا تھا۔

''نورالعین۔'' ان دونوں نے اس کا نام نورالعین ہی تو رکھا تھا۔

سلیم ایک دم بھاگتے بھاگتے ٹھہر گیا تھا چاروں طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کررہا ہے۔ وہ کاریڈور سے پلٹ آیا تھا۔

''نورالعین......نور......'' وہ پاگلوں کی طرح بچی کا نام لے کر ڈھونڈ رہا تھا جب اچانک ایک ستون کے پیچھے سے ڈری سہمی نورالعین برآمد ہوئی۔ اس نے دیوانوں کی طرح نورالعین کو اپنے سینے میں بھینچ لیا...... ایسا لگتا تھا وہ کوئی صحرا تھا اور اس کی نورالعین ٹھنڈی میٹھی نہر۔

''تم کہاں گم ہوگئی تھیں میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔'' نورالعین نے اس کے بے تحاشا بہتے ہوئے آنسو اپنی ننھی ننھی پوروں سے صاف کیے۔

''بابا......امی کیسی ہیں؟ انہیں کیا ہوا ہے؟'' سلیم احمد ایک دم چونک گیا۔

''زینت......!'' بے قراری نام کے پکارے جانے میں بھی تھی۔ نورالعین کو گود میں اٹھائے وہ تیز، تیز قدم چلتا ہوا اسی کاریڈور میں آ گیا تھا جہاں کے ایک کمرے میں اس کی زینت گم تھی۔ وہ ٹھنڈی یخ کرسی پر خود بھی ٹھنڈا یخ وجود لیے بیٹھ گیا۔

''بابا...... بتائیں ناں امی کو کیا ہوا ہے؟'' نورالعین نے سلیم کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

''ان کی طبیعت بہت خراب ہے...... دعا کرو تمہاری امی ٹھیک ہوجائیں۔'' نورالعین نے اپنے ننھے، ننھے ہاتھ اٹھالیے۔

''اللہ میاں، میری امی کو ٹھیک کردیں، ان سے اتنا پیار کریں جتنا وہ مجھ سے کرتی ہیں۔'' سلیم نے نورالعین کو ایک مرتبہ پھر سینے میں بھینچ لیا۔ دو نرسیں اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

''پولیس کو بلانا چاہیے۔'' دوسری نرس نے اسے نفرت سے دیکھا تھا۔

''پولیس نے کیا کرنا ہے، میڈیا کے سامنے اسے ذلیل کرنا چاہیے اتنی گھناؤنی حرکت کرتے ایک بار بھی اس نے نہیں سوچا۔'' نورالعین نے سلیم کی طرف دیکھا۔

''کیسی گھناؤنی حرکت بابا...... یہ گھناؤنی کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' اس نے نرسوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''میری بچی بہت معصوم ہے، مہربانی کر کے اس کے سامنے کوئی غلط بات مت نکالیں۔''

دونوں نرسیں اُسے ایسے دیکھنے لگیں جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو۔ پہلی نرس دوسری کی طرف دیکھ کر بولی۔

''بن رہا ہے تاکہ پاگل بن کر اس کیس سے بچ سکے۔''

''مجھے اسی دن شک پڑ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے... اس کی بیوی جینڈر جاننے کے حق میں نہیں تھی اور یہ زبردستی کررہا تھا۔ اس نے ڈاکٹرنی سے زبردستی معلوم کیا۔'' دوسری نرس غصے سے سلیم کو دیکھ رہی تھی۔

''پتا نہیں لوگ بیٹی ہونے سے اتنا چڑتے کیوں ہیں مجھے تو لگتا ہے بیٹی ٹھنڈے میٹھے پانی کی نہر ہے جو زندگی کے صحرا کو سیراب کردیتی ہے۔''

ڈاکٹرنی اس کے سر پر آکر کھڑی ہوگئی۔ سلیم نے نورالعین کو بینچ پر بٹھایا اور بے قراری سے خود کھڑا ہوگیا۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ، زینت کیسی ہے؟''

ڈاکٹرنی نے غصے میں ہتھ چھٹ انداز میں تھپڑ مارا تھا وہ لڑکھڑا گیا تھا۔

''تم نے اپنی بیوی کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر یہ عورتیں بڑی سخت جان ہوتی ہیں...... بچ گئی ہے وہ تمہاری ساری کوششوں کے باوجود۔''

سلیم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ مڑا۔

''نورالعین...... تمہاری امی ٹھیک ہیں۔ تمہاری دعا کام آگئی ہے بیٹا۔''

ڈاکٹرنی نے ہاتھ کے اشارے سے نرسوں سے پوچھا کہ یہ کیا بکواس کررہا ہے۔ کس سے بات کررہا ہے۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ پاگل پن کا ڈھونگ کر کے بچنا چاہتا ہے لیکن اسے پولیس کے حوالے ضرور کرنا چاہیے۔ اگر ایک منٹ کی دیر ہوجاتی تو زہر پھیلنے سے عورت کی جان جاسکتی تھی۔ یہ شخص اس بچی کا قاتل ہے جس نے اس دنیائے رنگ و بو میں ابھی آنکھ کھولنی تھی۔''

''میں نے پولیس کو کال کردی ہے اس سفاک آدمی کو میں اتنے آرام سے تو نہیں جانے دوں گی۔'' ڈاکٹرنی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ قتلِ عمد کا مرتکب ہوا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی کاریڈور میں آیا تھا۔

''کون ہے جی مجرم؟'' ڈاکٹرنی نے سلیم احمد

ساون یادیں

گھنگور گھٹائیں، کالے بادل
تیز بارش، ٹھنڈی ہوا
دل میں مچائے ہلچل
کوئل کی کوک
من کے اندر ہوک
چاہت ٹھہری دلدل، دلدل
انکھیاں ترسیں
ساون کی رم جھم
بھیگتا جائے آنچل
کوئی نہ جانے
کوئی نہ سمجھے
ساون برسا ہے
یا آنسو روئے ہیں
بھیگتی جائے
اِک لڑکی پاگل، پاگل

فصیحہ آصف خان، ملتان

غزل

یہ عادتیں ہی تو ہیں جو سب کو خراب کرتی ہیں
یاروں کا جینا اور مرنا عذاب کرتی ہیں
ان سرمئی آنکھوں کی مستی کو کیا نام دیجیے
جو سکون میں پیدا اضطراب کرتی ہیں
حسنِ جاناں کی ادائیں وہ قیامت ہیں کہ جو
کبھی سرشار تو کبھی آب آب کرتی ہیں
اِک گھڑی کا قصہ ہو تو سہہ لیں ہنس کر
یاں تو ہر آن جفائیں ہی حساب کرتی ہیں
جلائے ہے رقیبوں کو تو گفتار کی گرمی
ہم پہ ٹھنڈی ٹھار باتیں عتاب کرتی ہیں
یاد آتی ہیں مسلسل اور آئے جاتی ہیں
یادیں اُن کی آ کے مجھے بے تاب کرتی ہیں

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

کی طرف اشارہ کیا۔

"اوئے یہ لڑکے تجھے کیا دیتے ہیں...... ٹھینگا' بیٹی کا سن کر تم لوگوں کو موت کیوں پڑ جاتی ہے؟" سلیم، سپاہی کو دیکھ رہا تھا۔ نورالعین خوفزدہ نظروں سے سپاہی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"بابا...... آپ مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا، چاہے یہ کچھ بھی کہے۔"

سپاہی نے ذلیل کرنے کے سے انداز میں سلیم کو گدّی سے پکڑ کر آگے دھکا دیا تو وہ گر گیا۔ نورالعین زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ باپ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر وہ بھی رونے لگی تھی۔

"بابا...... میرے بابا مت روئیں' یہ لوگ گندے ہیں۔" سپاہی نے کالر سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔

"چل نوٹنکی مت کر۔"

"میں اپنی بیٹی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ بہت چھوٹی ہے ڈر جاتی ہے۔"

"ابے کون سی بیٹی...... وہ جو تو نے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دی جس بے چاری کا نام تک نہ رکھا جا سکا...... چل اٹھ۔" سپاہی کھینچے جا رہا تھا مگر سلیم اس کے کنٹرول میں نہیں آ رہا تھا۔ تبھی جیپ سے ایس ایچ او اتر کر اسپتال میں داخل ہو گیا۔

سلیم اب بھی اوندھا زمین پر پڑا ہوا تھا۔

"کون سا وی آئی پی ہے جسے لانے میں اتنی دقتیں ہیں۔ ایک مرنجا مرنج بندہ نہیں گرفتار ہو سکتا۔" سپاہی شرمندہ نظر آنے کی وجہ سے اسے لاتوں سے مارنے لگا تھا۔

"سر سالا...... کسی کی سن ہی نہیں رہا کہہ رہا ہے میری بیٹی چھوٹی ہے، میں اس کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"اس کی کون سی بیٹی؟" ایس ایچ او حیرت سے بولا۔ "کون...... وہ جسے اس نے خود مار دیا۔ دنیا میں آنے سے پہلے خود قتل کر دیا۔ اب اس کا سوگ کر رہا ہے۔" ایس ایچ او کو ایک دم غصہ آ گیا تھا۔

"خبیث یہ ڈرامے تھانے چل کر کرنا وہاں تیرے ہر ایکسپریشن پر داد ملے گی۔" ایس ایچ او نے اسے اٹھایا تھا اور چہرہ دیکھ کر ایک دم ایسے پیچھے ہٹ گیا تھا جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

"سلیم احمد تم......؟"

سپاہی اور نرسیں جو تماشا دیکھنے کے لیے رک گئی تھیں حیرت سے ایس ایچ او اور سلیم احمد کو دیکھ رہی تھیں۔ ایس ایچ او نے اسے بینچ پر بٹھا دیا۔ سپاہی کو بھاگ کر پانی لانے کا حکم دیا۔ وہ سلیم کو لیے بغیر جانے لگا تھا جب ڈاکٹرنی نے طنزیہ پوچھا۔

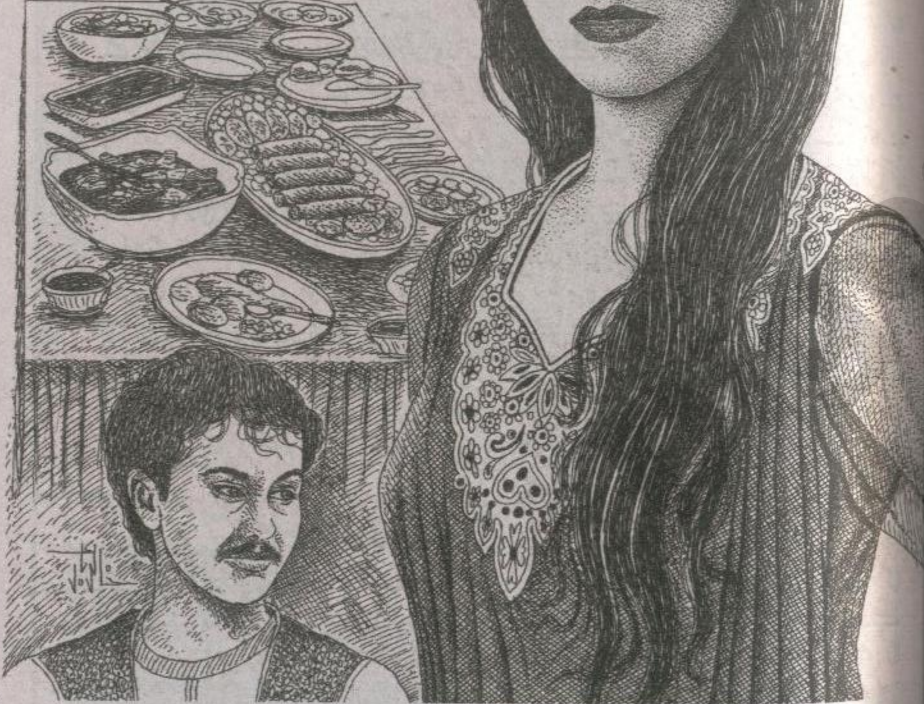
"کوئی جان پہچان ہے سر یا مٹھی گرم ہو گئی ہے؟" ایس ایچ او غصے میں پلٹا تھا۔

"یہ سلیم احمد ہے جس کی جان اپنی بیٹی نورالعین میں بند تھی۔ چند ماہ قبل اس کی چھ سالہ نورالعین کو کسی درندہ صفت انسان نے زیادتی کے بعد قتل کر کے گٹر میں پھینک دیا تھا۔" تینوں کا چہرہ ہونق تھا' وہ سلیم احمد کو اب ترحّم سے دیکھ رہی تھیں جنہیں اب خیال آ رہا تھا کہ وہ تو بیٹی کے ہیولے سے بات کر رہا تھا۔ سلیم احمد اُن میں سے کسی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"نورالعین تمہاری ایک ننھی بہن نورالصباح آئی ہے۔ وہ کب سے تمہارے دروازے کے باہر کھڑی تمہارے ساتھ کھیلنے کے لیے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کے ساتھ جا کر کھیلو اور اسے کہنا بابا اس سے بہت پیار کرتے ہیں بس مجبور ہیں...... ورنہ بیٹی کے دنیا میں آنے کی خوشی سب سے زیادہ بابا ہی مناتے۔"

نرسوں اور ڈاکٹرنی کی آنکھ میں اب آنسو تھے اور آنسو اس عورت کی آنکھوں میں بھی تھے جس نے ابھی کے ابھی اپنی مُردہ بیٹی کو جنم دے کر زندہ آنکھوں سے دیکھا تھا......!

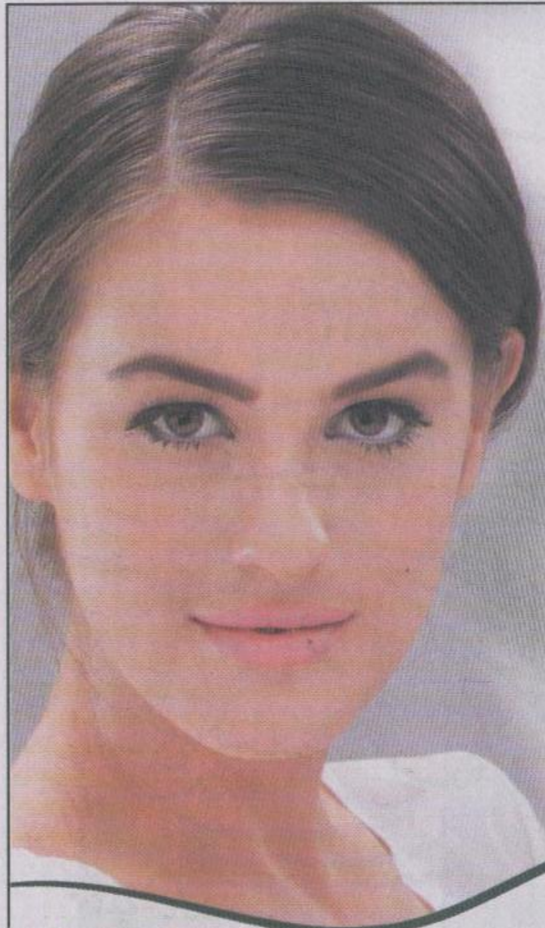




وہ ناداں ہے

سارہ ملک

چکن منچورین، فرائڈ رائس، چکن باربی کیو، چاکلیٹ کرنچ آئس کریم اور ونیلا اینڈ اسٹرابیری کاک ٹیل آئس کریم سے بھری ٹیبل رنگین...... لیمپ شیڈز میں [illegible] کے باعث مدھم روشنی دیتے بلب' اسٹائلش راٹ آئرن اسٹینڈز میں سجی پرفیوڈ کینڈلز، گول ڈیکو ریٹو غبارے، بلیک اور گرے بلائنڈز، بلیک کلر اسکیم میں ماحول کو مزید خوابناک بناتے بلیک کاؤچز، بلیک اور اسٹیل گرے ٹیبلز، گرے





ماربل کا لش لش کرتا فرش اور ٹیبل پر موجود بلیک اور گرے لینن کی سیٹنگ، اس پر ہی بس نہیں بلیک جینز اور لیدر جیکٹ میں ملبوس ولید عمیر کا دلکش ساتھ اور یہ پُرفسوں ماحول ......بلیک ویلوٹ کے بے حد اسٹائلش ڈریس میں ملبوس، ہلکی پھلکی ڈیسنٹ سی تیاری اور میک اپ کے ہمراہ خوشبوؤں میں بسی ہالہ عمیر...... گویا کہ اس عالیشان ریسٹورنٹ کی کلر اسکیم کی خوب صورتی سے دونوں مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کی شادی کو محض دو ماہ گزرے تھے اور شادی کے بعد ہالہ کی پہلی، پہلی سالگرہ تھی جس کو سیلبریٹ کرنے کے لیے دونوں اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ میں موجود تھے کیونکہ ہالہ اور ولید دونوں ہی بے حد خوش خوراک تھے اور آئے روز نت نئی ڈشز کے شوقین تھے جو کبھی تو ہالہ گھر میں تیار کرلیا کرتی تھی ورنہ ریسٹورنٹس تو تھے ہی۔ اور چونکہ ولید خود بھی خاصا چٹورا تھا اور خوراک پر خرچ کرنے کے معاملے میں دل اور ہاتھ کا کھلا بھی تھا سو ہالہ کی اس عادت کا اس نے کبھی برا نہیں مانا تھا بلکہ وہ اس کی خوش خوراکی کی عادت کو بگاڑنے کا ہی سبب بنا تھا۔ ہالہ کاؤچ پر موجود سلور گرے نرم و ملائم سلکی کور والا کشن گود میں رکھے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ولید کی جانب بے حد پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ محبت، سکون، سرخوشی، اس ماحول پر طاری یہ فیلنگز......، پیسہ، خوب صورتی، بھرپور موقع، خوشی اور خرچ کرنے کا دل......زندگی کو زندگی کی طرح گزارنے کے تمام تر اسباب...... خوراک کا من پسند سامان، لباس و آرائش، مہنگا ترین ریسٹورنٹ اور تمام خواہشات کی تکمیل......زندگی گزارنے کے ان اسباب سے حاصل کردہ یہ عیاشیاں...... اب وہ دونوں مدھم سُروں میں بجتے رومینٹک میوزک کو انجوائے کرتے ہوئے ڈنر اسٹارٹ کر چکے تھے۔ باوردی ویٹرز ان کے اطراف گھوم پھر کر ٹیبلو پر موجود سیٹنگ کی درستگی اور ہر چیز کی پرفیکشن کو یقینی بنانے میں مصروف تھے زندگی اس رخ سے دیکھیں تو جنت نظیر، دنیاوی لحاظ کے مطابق......مگر کیا جنت بس اتنی ہی حسین ہوگی؟

☆☆☆

"واپسی پہ نگٹس اور براؤنیز لیتے آیئے گا۔ فرائز میں گھر پر بنا رہی ہوں۔ چائے آپ کے آنے پر تیار کروں گی۔" موبائل کان سے لگائے ہالہ قدرے جھک کر ویجی ٹیبل اسٹینڈ سے بڑے، بڑے آلو چن کر الگ کر رہی تھی۔

"او کے سویٹ ہارٹ جیسے تم کہو۔" ولید نے مسکراتے ہوئے بات سمیٹی اور خدا حافظ کہہ کر آفس سے نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔ دوسری جانب ہالہ آلوؤں کو کاؤنٹر پر رکھے چاپنگ بورڈ اور چھری لیے فرائز کی تیاری میں مگن تھی۔ کمال پھرتی سے آلو کاٹ کر اس نے تھوڑے سے پانی میں نمک ڈال کر بھگوئے، برنر پر کڑاہی چڑھا کر تیل ڈالا اور آنچ دھیمی کرتی اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ جتنی دیر میں آئل گرم ہوتا اتنے میں وہ تیار بھی ہوجاتی۔ ولید کی واپسی میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ وہ وارڈ روب سے پلم اور گرے کنٹراسٹ میں لانگ شرٹ اور ٹراؤزر نکال کر ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ خدا نے صورت شکل اور سراپا لاکھوں میں ایک عطا کیا تھا۔ ڈریس چینج کر کے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ اسے میک اپ اور تیاری میں کوئی خاص تردد کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ کچھ وہ خود بھی سادگی پسند تھی۔ زیادہ لیپا پوتی کی بہ نسبت ہلکے پھلکے میک اپ کو ترجیح دیا کرتی۔ اسی وجہ سے اچھی لگا کرتی۔ لمبے گھنے سلکی بال سلجھا کر آدھے بالوں کو کیچر میں جکڑا۔ موئسچرائزنگ کریم لگا کر آنکھوں میں ایک لکیر کاجل کی اور لبوں پر ایک کوٹ گلوس کا اور بس......وہ اتنے میں ہی چمک اٹھی۔ ہلکی پھلکی روٹین کی جیولری سے وہ ہر وقت سجی رہتی۔ دوپٹا کندھوں پر

پھیلا کر خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو کر باہر نکل آئی۔

☆☆☆

چمکتے دمکتے صاف ستھرے کچن میں کھڑی وہ فرائز اور چائے کے ساتھ سرونگ پلیٹس کاؤنٹر پر سجا رہی تھی کہ ولید کی آمد ہوئی۔ ہالہ کو نگٹس اور براؤنیز کے پیکٹس تھما کر وہ فریش ہونے چل دیا۔ یہ لوازمات بھی سرونگ ڈشز میں سجا کر کاؤنٹر پر رکھے اور وہیں رکھے اسٹولز میں سے ایک پر بیٹھی ولید کے انتظار میں کچن کا جائزہ لینے لگی۔ کام کے دوران استعمال ہونے والے برتن وہ ساتھ، ساتھ دھو کر ریک میں رکھنے کی عادی تھی اور سلیب پر ڈسٹر پھیر کر اسے بھی ساتھ ہی صاف کرتی جاتی۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ اس کے کاموں کا کبھی انبار نہیں لگا۔ اس وقت بھی چائے اور فرائز بنانے میں جتنے برتن استعمال ہوئے تھے سب دُھلے ہوئے ریک میں سجے تھے۔ شیلف صاف تھا اور کوئی بھی غیر ضروری چیز... سامنے موجود نہیں تھی۔ اس نے ایک طمانیت بھری سانس خارج کر کے گردن موڑی۔ ولید چینج کر کے ہالہ کے برابر اسٹول پر بیٹھ رہا تھا۔

"جی تو پرنسز آف مائے ہوم، آج ڈنر میں کیا ہے؟" ولید نے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنا روزانہ کا سوال پوچھا۔ ہالہ نے مسکراتے ہوئے چائے کا مگ اس کے آگے کیا اور اس کی پلیٹ میں چیزیں ڈالتے ہوئے گویا ہوئی۔

گیس واٹ......؟"

"ہوں......تو یہ بات ہے۔" ولید نے بھی گویا چیلنج قبول کرتے ہوئے مٹھی ہونٹوں پر جمائی اور سوچ میں پڑ گیا پھر جیسے ہار مان کر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں یار......تم روز ہی ڈنر میں اتنی ورائٹی دیتی ہو کہ میں اندازہ کر ہی نہیں سکتا۔" ہالہ نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے فورک میں براؤنی کا پیس پھنسایا اور ولید کے منہ میں ٹھونس کر کھلکھلائی۔

"جناب آج کا ڈنر مینیو ہے لزانیہ وِد اٹالین سلاد اور سویٹ میں کافی ڈیلائٹ۔"

"اوہ......واؤ......" ولید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بٹ یار یوں تو میں شادی کے ایک ہی سال میں پھول کر عدنان سمیع پارٹ ٹو بن جاؤں گا۔" وہ خوف کی اداکاری کرتے ہوئے پلیٹ پرے کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ہالہ نے ہنس کر فرائز اپنی پلیٹ میں ڈالے پھر ولید کی پلیٹ کو پھر سے بھر کر اس کے آگے کر دیا۔ ولید اسے گھورنے لگا۔

"نو مائی سویٹ ہارٹ ------- اگر ایسا ہو بھی گیا تو آپ کے ساتھ، ساتھ میں بھی پھول کر گوبھی بن جاؤں گی تو پھر ہم دونوں مل کر ڈائٹنگ بھی کر لیں گے۔ اگر آپ کی ہالہ ایک بھرپور قسم کا رچ مینیو بنا سکتی ہے تو اتنا ہی بہترین لو کیلوری ڈائٹ پلان بھی بنا سکتی ہے اور ڈائٹ پلان پر چلنے کے لیے اگر کوئی ساتھی موجود ہو تو سختی سے عمل درآمد کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا......مگر فی الحال تو موج اڑائیں۔" ولید نے بھی تائیدی انداز اپنایا اور دوبارہ بھری گئی پلیٹ کو پھر سے خالی کرنے میں جُت گیا۔ زندگی اس رخ سے دیکھیں تو گویا جنت کے ذائقے، جنت کی خوراکیں، جنتی شریکِ زندگی کے ہمراہ مگر کیا جنت کے ذائقے بس اتنے ہی محدود ہوں گے جتنے ہالہ ولید عمیر بنانے میں ایکسپرٹ سمجھی اور مانی جاتی تھی۔

☆☆☆

یہ سچ تھا کہ ہالہ نہ صرف ایک بہترین کُک تھی بلکہ اتنی ہی پرفیکٹ ڈائٹ پلانر بھی تھی۔ زبان کے چسکے کے لیے اگر وہ ورائٹی دیا کرتی تھی تو ساتھ ہی خوراک کے صحت بخش ہونے پر بھی توجہ دیا کرتی تھی......اور ولید اور اپنی صحت کے لیے وہ خاصی تگ و دو کیا کرتی تھی۔ علی الصباح بیڈ ٹی کے بجائے وہ گرم دودھ میں شہد ملا کر باداموں کے ساتھ خود بھی لیتی تھی

اور ولید کو بھی لازمی دیا کرتی تھی۔ گرمیوں میں آم کا شیک بنالیا کرتی تھی...... آدھ پون گھنٹے بعد دونوں ناشتا کرتے تھے اور ناشتے کے لوازمات بھی وہ روز تبدیل کیا کرتی۔ کبھی بریڈ اور آملیٹ، کبھی بوائل انڈے اور کارن فلیکس، کبھی انڈا پراٹھا اور چھٹی والے دن آلو یا قیمے کے پراٹھے اور کشمیری چائے۔

لنچ ولید کا آفس میں ہوتا تھا اور اس کے لیے بھی وہ ولید کو بازاری کھانے منگوانے سے سختی سے منع کیا کرتی تھی بلکہ لنچ کے لیے وہ خود کچھ ہلکے پھلکے اسنیکس بنا کر اسے ساتھ دیتی تھی اور خود بھی لنچ میں وہی کھاتی، کبھی چکن چیز سینڈوچ، کبھی کلب سینڈوچ، کبھی کٹلٹس، نگٹس، فروٹ چاٹ وغیرہ...... پھر چائے پہ وہ تھوڑا سا اہتمام کرتی اور ڈنر اہتمام سے بھرپور ہوتا...... اسی طرح موسمی پھلوں کے جوسز یا ملک شیک وغیرہ بھی وہ ایک خاص ترتیب سے خوراک میں شامل رکھا کرتی تھی۔ غرضیکہ ہالہ سے شادی کے بعد ولید عمیر کی صحت پر انتہائی خوشگوار اثر پڑا تھا اور اب وہ چھوٹی موٹی بیماریوں سے محفوظ رہا کرتا جو روٹین کی بے احتیاطیوں سے جنم لیا کرتی ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر ہالہ کا پہلا کام ولید کے آفس لنچ کی تیاری کا ہوتا تھا۔ آج کے لنچ کے لیے ولید نے کلب سینڈوچز کی فرمائش کی تھی۔ سینڈوچز تیار کر کے اپنے حصے کے الگ کر کے فریج میں رکھے اور ولید کے لیے فوڈ ریپ میں لپیٹ کر لنچ بیگ میں ڈال دیے۔ فریج میں سے دودھ نکالا اور فروٹ باسکٹ سے بڑا سا سیب نکال کر چھیلنے لگی۔ سیب کے بڑے، بڑے پیس کاٹ کر بلینڈر میں ڈالے۔ ساتھ ہی دودھ، چینی اور تھوڑی سی کریم ڈال کر بلینڈر چلا دیا۔ مزیدار ایپل شیک تیار کر کے ہالہ نے ڈسپوزیبل بائل میں بھرا اور اسی لنچ بیگ میں ڈال کر زپ بند کر کے ولید کو جگانے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ یوں بچوں کی طرح لنچ باکس بنا کر دینے پر پہلے پہل تو ولید کے کولیگز اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے مگر پھر اس کے لنچ میں اس قدر ورائٹی اور ذائقے دار آئٹمز دیکھ، دیکھ کر استہزائیہ جذبات رشک کے جذبات میں تبدیل ہوتے، ہوتے اب تعریفی انداز اختیار کر گئے تھے۔

''اٹھ جائیں ولید، سات بج گئے ہیں، جلدی سے فریش ہو جائیں، میں دودھ لے کر آتی ہوں۔''

وہ ولید کو جگا کر دودھ گرم کیا کرتی تھی تاکہ جاگنے میں دیر ہو جانے پر دودھ ٹھنڈا نہ ہو جائے مگر مقابل بھی تو ولید جیسا ڈھیٹ اور نیند کا رسیا بندہ تھا۔ وہ شہد ملا دودھ اور ڈرائی فروٹ کی ڈش لائی تو ولید صاحب بے ترتیبی سے بیڈ پر ہی پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ ہالہ نے بھی ایک جھٹکے سے کمبل کھینچا اور سرعت سے تہ لگا کر صوفے پر رکھ دیا اور اتنی ہی تیزی سے...... سوئچ بورڈ پر موجود تمام بٹن آن کر کے پورا کمرا روشن کر دیا۔ ولید چیختا ہوا اٹھا تو وہ اپنا دودھ کا گلاس اٹھا کر ڈرائی فروٹس مٹھی میں بھر کر ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ یوں ولید ہالہ کو زیر لب کوستا ہوا واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہو کر وہ دودھ اور ڈرائی فروٹس لیتا تھا اور پھر چینج کرتا تھا۔ اتنے میں ہالہ ناشتا تیار کر لیتی تھی۔ یہ ان دونوں کی روز کی لگی بندھی روٹین تھی جو یونہی ہنستے مسکراتے گزرتے گزرتے ازدواجی زندگی کے تین ماہ مکمل کر گئی تھی۔ زندگی اس رخ سے دیکھیں تو گویا مرنے کو جی ہی نہیں چاہے۔ ایک مکمل آسودہ زندگی بظاہر جنت سے دلفریب...... کیونکہ جنت دیکھی نہیں صرف سنی ہے لیکن درحقیقت......

☆☆☆

ولید کو آفس بھیج کر وہ عام ہاؤس وائف کی طرح دوبارہ بستر میں نہیں گھستی تھی بلکہ گھر کا پھیلاوا سمیٹ کر ہلکی پھلکی صفائی کر لیا کرتی ...... اور پھیلاوا بھی کیا...... گند مچانے والا تو کوئی تھا ہی نہیں اور کچھ ہالہ کی ساتھ، ساتھ سمیٹنے کی عادت کی بنا پر بھی پھیلاوا کچھ خاص نہیں ہوتا تھا۔ سوا سے زیادہ محنت نہیں کرنا

پڑتی تھی پھر اس نے گھر کی آرائش میں بھی سادگی سے کام لیا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز رکھی تھی مگر غیر ضروری ڈیکوریشن پیسز سے گھر بھرنے سے اجتناب کیا تھا۔ ہلکی پھلکی ڈیکوریشن اس نے خود ہی اپنے ہاتھ سے بنائے آئٹمز سے کی تھی۔ سو ڈسٹنگ کا کام بھی بہت محنت طلب نہیں تھا۔ لنچ وہ بھی وہی کرتی تھی جو ولید کو دیتی تھی سو لنچ بنانے کا کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ رات کے کھانے کی پلاننگ کر کے اس کا آدھا کام وہ دن میں ہی مکمل کر لیا کرتی تھی تاکہ رات میں ولید کو زیادہ سے زیادہ ٹائم دے سکے۔ دھونے والے کپڑے وہ روز ہی بھگو دیا کرتی تھی اور ڈنر کی آدھی تیاری کے بعد دھو کر پھیلا بھی دیتی تھی۔ یوں ولید کے آنے سے پہلے کپڑے سوکھ بھی جاتے اور وہ سنبھال بھی لیتی تھی۔ لنچ کے بعد وہ کچھ دیر ریسٹ کرتی تھی اور اسی دوران فون کالز وغیرہ کا سلسلہ بھی چلتا تھا کیونکہ اس کا میکا اور سسرال دونوں کراچی میں تھے اور ولید کی جاب کی وجہ سے یہ دونوں اسلام آباد میں رہتے تھے۔ سو ان ہی اوقات میں وہ فون بھی کیا کرتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ ٹی وی ڈراموں اور پروگرامز کی بھی رسیا نہ تھی بلکہ خاصی شوہر پرست قسم کی لڑکی تھی جس کی سارا دن کی روٹین بس اپنے شوہر ہی کے گرد گھومتی تھی۔ اپنے ہر کام کے لیے وہ بے حد آرگنائزڈ تھی۔ عصر ہوتے ہی وہ اٹھ کر بیڈ کی چادر درست کرتی پھر اگر چائے کے ساتھ گھر پر اسنیکس بنانے ہوتے تو اس کی تیاری کرتی اور اگر ولید سے منگوانے ہوتے تو اسے کال کر کے بتا دیتی۔ اس کے بعد وہ ہلکی پھلکی تیاری کر کے اپنا حلیہ درست کرتی...... ولید کے آنے کے بعد بھی وہی لگی بندھی روٹین تھی۔ چائے کے بعد وہ کچھ دیر ریسٹ کرتا۔ اتنے میں ہالہ ڈنر کی تیاری مکمل کرتی۔ ولید اٹھ کے کچھ دیر ٹی وی دیکھتا اور دونوں گپ شپ کرتے...... سو اس وقت تک ہالہ کچن سمیٹ کر فارغ

عید

سونی آنکھیں اجڑی کلائی پھیکی عید
بن تیرے ہو کیسے ساجن میری عید
سکھیاں مجھ کو چھیڑ کر ہنستی گاتی ہیں
تیرا ماہی بھول گیا ہے میٹھی عید
روز ہی سپنا دیکھے، تیرے آنے کا جوگن
نندیا روٹھی آنسو نکلا کیسی عید
دل ہی دل میں، میں تو سارے سوگ منالوں
چاہیے مجھ کو تیرے پیار میں بھیگی عید
سب لوگوں کی نظریں پوچھیں آئے گا کب بالم
ست رنگی چنریا اوڑھوں ہو میری یہ پھر عید
دور تلک ہیں تیرا رستہ تکتی میری آنکھیں
سارے وعدے یاد کرو تم، ہوگی پھر میری عید

از: شہزادی کائنات، کراچی

ہو جایا کرتی تھی۔ پھر وہ دونوں واک پر نکلتے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹا واک کے لیے مختص ہوتا...... پھر سونے سے پہلے ولید کے اگلے دن کے لیے ڈریس سلیکٹ کر کے پریس کر دیتی اور دونوں سونے لیٹ جاتے۔ اس فکسڈ روٹین میں تبدیلی تب آتی جب ولید کے کسی دوست کے گھر جانا ہوتا، کوئی گیٹ ٹو گیدر کوئی پارٹی فنکشن ہوتا یا پھر ہالہ کو شاپنگ کرنی ہوتی۔ ایسے تمام کاموں کے لیے ہالہ نے شام کی چائے کے بعد کا وقت مختص کیا ہوا تھا۔ جس کے لیے پہلے سے پلان ہوتا کہ ڈنر باہر ہی کیا جائے گا یا گھر پر...... اور عموماً ڈنر وہ لوگ باہر ہی کیا کرتے تھے۔ ہالہ کی اس فکسڈ اور آرگنائز لائف میں ہلچل تب مچی جب ایک بڑا ٹوئسٹ آیا اور وہ زندگی ہی کیا جس میں چھوٹے بڑے ٹوئسٹ نہ آئیں۔ ٹوئسٹ چھوٹا تھا یا بڑا...... اس کا اندازہ تو آپ لگائیں۔ البتہ اس ٹوئسٹ نے ہالہ ولید عمیر کی زندگی کا پورا نقشہ الٹ

پھیر کر رکھ دیا... الٹ کر رکھ دیا یا سیدھا کر دیا...... یہ فیصلہ بھی آپ پر ہے۔

☆☆☆

''مسز ولید عمیر، آپ کی ہیلتھ ماشاء اللہ بہت اچھی ہے تمام ٹیسٹ رپورٹس پرفیکٹ ہیں، آپ کو ایز یچ کوئی deficiency نہیں ہے۔ الٹرا ساؤنڈ بھی پرفیکٹ پکچر دے رہا ہے۔ بے بی تندرست ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ یہ پرفیکشن پورے نو ماہ قائم رہے۔ اتنا تو مجھے آئیڈیا ہو گیا کہ آپ کی ڈائٹ اچھی ہے اور آپ خود بھی بہت کیئر کرتی ہیں سو آپ کو کوئی بڑا مسئلہ فیس کرنا نہیں پڑے گا، انشاء اللہ......!'' گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر روحانہ فہیم نے الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کا پرنٹ آؤٹ نکال کر پرچے کے ساتھ اسٹیچ کیا اور ایک پُرخلوص مسکراہٹ ہالہ کی طرف اچھالتے ہوئے رپورٹس فائل میں کلپ کر دیں۔ اطمینان اور سرشاری نے ہالہ کے وجود میں گھر کیا۔ وہ ٹشو کی مدد سے کیمیکل صاف کر کے ٹشو ڈسٹ بن میں ڈال کر ڈاکٹر کے سامنے رکھے اسٹول پر آ بیٹھی۔ اب ڈاکٹر ملٹی وٹامنز لکھ رہی تھی۔

''صرف ایک بنیادی ضرورت کے تحت میں آپ کو یہ ملٹی وٹامنز لکھ رہی ہوں کیونکہ ابتدائی چند ماہ تک کچھ بھی کھانے پینے کا دل نہیں کرتا لہٰذا کہ پرفیکٹ ڈائٹ...... تو عورت اپنی ڈائٹ اچھی نہیں رکھ پاتی۔ ایسے میں یہ ملٹی وٹامن آپ کو سپورٹ کریں گے۔'' اب وہ ڈیو ڈیٹ کیلکولیٹر سے ہالہ کی ڈیو ڈیٹ چیک کر کے پیڈ پر نوٹ کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اگلے ماہ کے وزٹ کی تاریخ پرچے پر لکھ کر اس نے فائل ہالہ کو تھما دی...... اور وہ تو گویا اڑتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ ولید باہر ہی اس کا ویٹ کر رہا تھا۔ اسپتال میں موجود دیگر لوگوں کے سامنے اپنی خوشی کو بہ مشکل ضبط کیے اس نے کار میں بیٹھنے تک صبر کیا اور ولید کے برابر سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ ولید سے لپٹ گئی۔

''اللہ آئی ایم سو ہیپی ولید......'' فرطِ مسرت سے اس کی آواز بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ ولید نے جوش سے اس کا ہاتھ دبایا۔

''می ٹو ہالہ...... اللہ کا بڑا کرم ہے۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ولید نے ہینڈ فری کانوں میں لگا کر باری، باری کال ملا کر اپنے اور ہالہ کے گھر والوں سے یہ خوش خبری شیئر کی۔ دونوں طرف سے بھرپور رسپانس ملا۔ سبھی نے اصرار کیا کہ ہالہ کو آرام کی ضرورت ہے سوائے میکے یا سسرال میں سے کسی بھی گھر بھیج دیا جائے کم از کم چوتھے مہینے تک کے لیے...... مگر ہالہ رضا مند نہیں ہوئی۔

''ہاں تو مائے سویٹ ہارٹ وائف...... کیا کھانا پسند کریں گی آپ آج کی اس گریٹ نیوز کی خوشی میں۔'' موبائل واپس پاکٹ میں ڈالتے ہوئے ولید نے محبت پاش نظروں سے اپنی دلاری بیوی کو دیکھا۔

ہالہ نے محبت بھری مسکان سے اس کی محبت کا جواب دیا اور سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر دھیمے سے بولی۔

''موقع اسپیشل ہے، دل بھی ہے، دل والا بھی...... مگر وہ کیا ہے کہ طبیعت کچھ ایسی عجیب سی ہو رہی ہے کہ میں سمجھ ہی نہیں پا رہی کہ میں کیا کھاؤں...... سچ پوچھیں تو یہ بے حد عجیب سی کیفیت ہے جو میرے ساتھ پیش آ رہی ہے کہ میں کسی بھی ڈش کا نام ذہن میں لاؤں تو اندر سے منفی سگنلز آنے لگتے ہیں۔ ایک عجیب ابال سا اٹھتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز میں نے نہیں کھانی اور جس چیز کے لیے اندر خاموشی طاری ہے اور کوئی سگنل نہ ملے تو وہ چیز میں بہ آسانی کھا بھی لیتی ہوں اور مجھے وامٹ بھی نہیں ہوتی۔'' وہ کہتے، کہتے رکی اور دائیں ہتھیلی سے سینہ مسلنے لگی پھر تھوک نگل کر خود پر قابو پایا اور گہری، گہری سانسیں بھر کر دوبارہ بولنے کے لیے ہمت مجتمع کرنے لگی۔

''میں نے ڈاکٹر روحانہ فہیم سے اپنی یہ کیفیت شیئر کی تو انہوں نے ایک انوکھی بات بتائی۔ جو اَب تک میں نے کسی سے بھی نہیں سنی تھی۔''

''وہ کیا بھلا......؟'' ولید نے ریڈ سگنل پہ گاڑی روک کر پوری توجہ سے ہالہ کی جانب دیکھا۔

''وہ کہنے لگیں کہ ایسی حالت میں جس چیز کا بھی دل کرے وہی کھانی چاہیے اور یہ جو نیگیٹو سگنل ملتے ہیں ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ یہ چیز کھا بھی لیں گی تو وہ بچے کو نقصان پہنچائے گی۔ اسی لیے اس چیز کا دل نہیں کر رہا ہوتا سو اس تمام عرصے میں وقتی طور پر پرفیکٹ ڈائٹ کا خیال دل سے نکال کر صرف وہی چیز کھائیں جس کا سگنل اندر سے ملے۔ اس وقت وہی چیز آپ کی پرفیکٹ ڈائٹ ہو گی جو آپ اچھے طریقے سے ہضم کر لیں اور رہی یہ بات کہ پیٹ بھر کر نہیں کھایا جا رہا یا بہت ہی کم کھایا جا رہا ہے تو بے فکر رہیں اس سے بھی بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ سب وقتی ہے، صرف چند ماہ کی کیفیت ہے۔'' ولید نے قدرے حیرت سے یہ بات سنی اور ایک موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی کی رفتار دھیمی کر کے بولا۔

''بات میں وزن تو ہے ڈیئر...... مگر اب جلدی سے سوچو اور اندر سے سگنلز برآمد کرو کہ ہمارے منے میاں کو کیا چاہیے کیونکہ ہمارا فیورٹ ریسٹورنٹ وہ رہا سامنے۔'' ہالہ اس بات پر یک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر فائل میں سے پرچہ نکال کر ولید کے آگے کیا اور سرفہرست لکھی ٹیبلیٹ پر انگلی رکھ کر بولی۔

''فی الحال تو منے کے ابا مجھے یہ والی ٹیبلیٹ لا کے دیں کیونکہ اسے کھا کر ہی میں کچھ کھانے پینے کے قابل ہو سکوں گی اور مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے وامٹ بس آنے ہی لگی ہے۔'' ہالہ نے پرچہ ڈیش بورڈ پر رکھا اور اپنی جانب کا شیشہ پورا کھول کر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔

''کار کو ذرا سائیڈ پہ رکھیں مجھے وامٹ ہو گئی تو

مشکل ہو جائے گی۔'' اس کی آواز بدلنے لگی چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے اور اس کا متغیر ہوتا رنگ دیکھتے ہی ولید نے گاڑی میں دائیں بائیں ہاتھ مار کر کہیں سے ایک شاپر برآمد کیا اور ہالہ کو تھما کر گاڑی فٹ پاتھ کے کنارے روک دی۔ عین اسی لمحے ہالہ کو زور سے ابکائی آئی اور ولید نے شکر ادا کیا کہ گاڑی میں شاپر موجود تھا۔ ورنہ ابھی چمکتی دمکتی سڑک پھلکاری کا نمونہ بن جاتی۔ وہ اب فکر مندی سے ہالہ کی جانب متوجہ ہوا جو فارغ ہو چکی تھی اور شاپر کو گرہ لگا رہی تھی۔ ولید گاڑی سے اتر کر ہالہ کی جانب آیا اور شاپر اس کے ہاتھ سے لے کر ایک کونے میں نصب ٹریش کین میں گرا آیا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس نے سیٹ کے نیچے سے پانی کی بوتل نکالی اور ہالہ کا منہ ہاتھ دھلوانے میں مدد کی۔ اپنی جیب سے رومال نکال کر اس نے ہالہ کو منہ پونچھنے کے لیے دیا اور بوتل واپس سیٹ کے نیچے رکھ کر پھر سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دیکھا ہالہ نڈھال سی اپنی سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کے لب ہلکے، ہلکے کپکپا رہے تھے۔ اس نے فکر مندی بھری محبت سے ہالہ کی گود میں دھرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ سے تھپتھپایا۔

''یو او کے ناؤ......؟ اب تو ایزی ہو گئی ہو گی ناں......؟'' ہالہ نے دھیمے سے مسکرا کر آنکھیں کھولیں۔ گہری، گہری سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کیا اور اثبات میں سر ہلایا۔ ولید نے شانت ہو کر گاڑی آگے بڑھائی۔ پہلے ہالہ کی ٹیبلیٹس خریدیں اور پھر دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

روٹین تو وہی فکسڈ اور آرگنائزڈ تھی۔ روٹین کو سر انجام دینے والی مس پرفیکٹ ہالہ ولید عمیر بھی وہی تھی۔ جس کے پیچھے دن رات گول چکر میں وہ گھومتی

سی تھی اس کا محبوب شوہر ولید عمیر بھی وہی تھا۔ پھر تبدیلی کہاں آئی تھی؟ ہاں تبدیلی تو باہر کہیں نہیں تھی۔ بس ہالہ ولید کے اندر در آئی تھی۔ بے دلی، بیزاری، سستی، کسلمندی، بوجھل پن، چڑچڑا پن، ہمہ وقت متلی کی بد ترین کیفیات، یوں تو یہ سبھی علامات پریگنینسی سے متعلق ہیں...... اور ہالہ کی تھی بھی پہلی، پہلی پریگنینسی پھر اس سب میں نیا کیا تھا؟ کچھ تو تھا، نیا، انوکھا۔ ولید کے لیے بھی یہ سب نیا تھا۔ اب تک لوگوں سے صرف سنا تھا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا لیکن وہ فطرتاً بے حد کیئرنگ تھا اور ہالہ سے محبت بھی بے حساب کرتا تھا اس لیے اس کی تمام ناگوار کیفیات کو نہ صرف صبر و برداشت سے جھیل رہا تھا بلکہ جذباتی طور پر ہالہ کو سہارا بھی دے رہا تھا۔ ولید کے لیے اس کے اہتمام میں کوئی کمی تو نہیں آئی تھی البتہ اب وہ صرف وہی کھانے بنا پاتی تھی جن سے اسے کوئی ناگواری نہ محسوس ہوتی۔ مثلاً اب اسے شوربہ دیکھتے ہی متلی ہونے لگتی سو وہ شوربا پکا بھی نہیں سکتی تھی۔ بھنی ہوئی اور خشک چیزیں بناتی۔ ان میں بھی وہ ایسی ورائٹی بناتی کہ ولید یکسانیت سے اکتا نہ جائے...... لیکن خود وہ پھر بھی کھا نہیں پاتی تھی۔ انڈا دیکھ کر اسے ابکائی ہوتی تھی۔ روٹی کو ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔ ایسے میں وہ ناشتے میں ایک سلائس بہ مشکل چائے کے ذریعے حلق سے اتارتی تھی۔۔۔ اور کھانے میں وہ ایک ماہ سے چاولوں کے سوا کچھ نہیں کھا پا رہی تھی۔ دودھ سے اسے بری طرح چڑ ہو گئی تھی۔ دودھ کو دیکھتے ہی اسے یوں لگتا تھی سے بھرا ہوا گلاس دیکھ رہی ہے۔ غرض یہ کہ ہر وہ نعمت جو وہ دل بھر کر کھاتی تھی اب اسے زحمت لگنے لگی تھی۔ وہ پزا، براؤنیز، نگٹس، فرائز، برگر، کولڈ ڈرنکس، شوارما اور اسی قسم کے دیگر فاسٹ فوڈز جن کی وہ دیوانی تھی اب دیوانے کا خواب ہی ہو گئے تھے۔ اب تو براؤن بریڈ، مکئی اور جوار کی روٹی جیسی سادہ خوراکوں پر اس کے اندر خاموشی اور سکون چھایا رہتا، کوئی نیگیٹو سگنل نہ ملتا اور وہ وہی بنا کے کھا لیتی۔ اور اس روز بھی یہی ہوا۔ متلی کی ٹیبلٹس متواتر استعمال کرنے کے باوجود اسے قے اور متلی ضرور ہوتی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ وامٹ کرنے بھاگتی تھی۔ صبح کے ایک سلائس اور چائے کے کپ کے بعد وہ ایک نوالہ بھی حلق سے اتار نہیں پاتی تھی اور وامٹ کر کر کے اب تو پیٹ میں کچھ بچا بھی نہیں تھا۔ خالی پیٹ ابکائیاں کر کر کے وہ بے حال ہو گئی تھی۔ پیٹ اور پسلیوں میں اب شدید تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔ آخری بار وامٹ کر کے وہ گرتی پڑتی واش روم سے نکل کر کمرے میں پڑے کاؤچ پر گر سی گئی۔ ولید نے بے چین ہو کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اسے یہ سوچ پریشان کر رہی تھی کہ سارا دن یہی کیفیت ہالہ نے تنہا گزاری تھی اور وہ اس کی وجہ سے کراچی جانے کے لیے بھی راضی نہیں ہو رہی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے آفس سے ہی کال کر کے اسے ڈنر تیار کرنے سے منع کر دیا تھا اور واپسی پہ برگر اور کولڈ ڈرنکس لیتا ہوا آیا تھا۔ اب وہی برگر وہ مائیکرو ویو میں گرم کر کے بیڈ روم میں ہی لے آیا اور سینٹر ٹیبل پر پلیٹس رکھ کر پھر سے ہالہ کو اپنے ساتھ لگا کر بیٹھ گیا۔

"کچھ کھا لو میری جان، تھوڑی سی کوشش کرو، ایک، ایک بائٹ لے لو تھوڑے، تھوڑے وقفے سے۔ اچھا چلو ایک، ایک گھونٹ سیون اپ کا بھی لیتی رہنا۔ ہضم ہو جائے گا انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ دیکھو میں اکیلا کیسے کھاؤں۔" وہ چھوٹے بچوں کی طرح اسے پچکار رہا تھا۔ دفعتاً اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اس نے جھک کر دیکھا تو ہالہ خالی، خالی نظروں سے سامنے پڑے لوازمات کو دیکھ رہی تھی اور آنکھوں سے اشک لڑیوں کی صورت میں رواں تھے۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ اس نے [illegible] کے گرد حمائل کر کے اسے مزید قریب کیا اور اپنی سپورٹ کا احساس دلاتے ہوئے کچھ دیر خاموش ہو گیا تاکہ وہ کھل کر رو لے اور اپنا غبار نکال لے۔ تھوڑی دیر وہ بے آواز روتی رہی۔ جب من کچھ ہلکا ہوا تو وہ آنسو پونچھ کر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ ولید نے نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور برگر کی پلیٹ اٹھا کر ہالہ کی طرف مڑا اور برگر اس کے منہ کے قریب کیا۔

"لو اب میرے ہاتھ سے صرف ایک بائٹ لو شاباش......" اس نے اتنے مان اور محبت سے کہا تو ہالہ نے ڈرتے، ڈرتے ایک بائٹ لیا۔

"لو اب ایک سپ سیون اپ کا۔" اس نے سیون اپ کو گلاس میں انڈیل کر اس کے آگے کیا۔ ہالہ نے مسکراتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ اس کے اندر سے کوئی منفی سگنلز نہیں آ رہے تھے سو اس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا پھر بھی احتیاطاً وہ کم، کم ہی کھا رہی تھی۔ یوں ایک بائٹ ولید اسے کھلاتا دوسرا وہ خود کھاتا۔ اسی طرح اس نے برگر ختم کروا دیا۔ ہالہ نے ولید کے چہرے پر بے انتہا سکون اترتے دیکھا تھا۔ اگر یہ ان کی زندگی میں آنے والا پہلا ٹوئسٹ تھا تو یہ چھوٹا ٹوئسٹ تھا۔ بڑا ٹوئسٹ کب اور کیسے آیا؟

☆☆☆

کچھ روز سے ولید محسوس کر رہا تھا کہ ہالہ بہت چپ، چپ رہنے لگی ہے۔ کھانا تو اس کا یوں بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ کام کاج وہ جیسے تیسے کر ہی لیتی تھی۔ وزن اس کا تیزی سے کم ہوا تھا۔ مگر ایک گہری چپ تھی جو مستقلاً اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ ہر وقت ایک گہری سوچ میں یوں مدغم رہتی گویا کوئی گہرے پانیوں میں ایسے اترا ہے کہ باہر نکلنے کا ارادہ نہیں جیسے۔ ولید ساتھ بیٹھا اسے دیکھتا رہتا اور وہ اپنی سوچوں کے ریشم میں بری طرح الجھی جانے کون سے تانے بانے بنتی رہتی۔ ولید چاہ رہا تھا کہ وہ از خود اس سے شیئر کرے کیونکہ یہ کیفیت پریگنینسی سے الگ ہی لگ رہی تھی۔ وہ انتظار میں تھا کہ کب ہالہ کی چپ ٹوٹے۔ اس وقت بھی وہ لاؤنج میں عین ٹی وی کے سامنے پڑے کاؤچ پر بیٹھی سوچوں میں پھنسی ہوئی تھی لیکن اس کی نظریں ٹی وی کے بجائے ٹی وی کے پیچھے موجود دیوار پر لگی کلاک پر جمی تھیں۔ اس کے خوب صورت سلکی بال بکھرے ہوئے تو نہ تھے البتہ پہلے جیسے سنورے ہوئے بھی نہیں تھے۔ ٹی پنک اور موو کامبی نیشن کا جو سوٹ اس نے پہنا ہوا تھا اسے پہنے بھی آج اسے شاید تیسرا دن تھا اور وہ شکنوں سے پُر تھا۔

دونوں ہاتھ ڈھیلے سے انداز میں اس کی گود میں دھرے تھے۔ رنگت میں پیلاہٹ واضح تھی۔ ایک لمحے کو اس پر کسی مومی مجسمے کا گمان ہوتا تھا۔ گو کہ ڈاکٹر ردحانہ کے مطابق اس کی یہ کنڈیشن وقتی تھی لیکن پھر بھی اسے اس قدر بدحال دیکھ کر ولید کا دل ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اچانک ہالہ کے لب ہلے۔

"ولید! کبھی آپ نے سوچا کہ ہماری زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟" اس کا انداز اب بھی کھویا، کھویا سا تھا، نظریں اب بھی وال کلاک پر گڑی تھیں، وہ ہلی تک نہیں تھی۔ ولید اس قدر غیر متوقع سوال پر منہ کھولے ہالہ کو دیکھنے لگا۔ وہ ولید کے جواب کا انتظار کیے بنا پھر سے گویا ہوئی۔

"اچھی تعلیم...... بہترین کپڑا لتا، کھانا پینا۔۔۔ پُرتعیش رہائش، پیار محبت، شادی، اولاد، رشتے، اسٹینڈرڈ اور مقابلے کی نہ ختم ہونے والی دوڑ...... پر ولید کبھی کسی نے یہ سوچا کہ یہ سب تو انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ ہم شادیاں کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، ان کے لیے کماتے ہیں اپنی اور ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں، یہی سب کرتے، کرتے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دن مر جاتے ہیں اور بس۔"

اب وہ اضطرابی انداز میں اپنی انگلیاں مسل

رہی تھی۔ ولید کی سمجھ میں کچھ، کچھ آنے لگا تھا۔

"کیا انسان بس ان ہی مقاصد کے لیے پیدا ہوا ہے؟ جبکہ یہ تو مقاصد ہیں ہی نہیں...... کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ضرورت کے درجے پر پیدا کیا ہے؟ تو پھر اسے اشرف المخلوقات کیوں کہا؟ ہم نے اپنی زندگی کے اصل مقاصد سے صرفِ نظر کر کے ضروریاتِ زندگی کو مقاصدِ زندگی کیونکر بنالیا......؟ اور پھر اسی محور کے گرد گھومتے، گھومتے ہم عمریں تمام کرنے لگے۔" اب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے قراری سے ولید کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں پھر وہ ولید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی انگلیاں مسلنے لگی۔ ولید اس کی ہر حرکت کا خاموشی سے مشاہدہ کر رہا تھا۔

"میں ناشتے میں کیا، کیا لوازمات تیار کرتی تھی۔ کبھی پراٹھے، کبھی انڈے، کبھی سینڈوچز، کارن فلیکس اور جانے کیا، کیا...... دس قسم کے لوازمات کے بنا میں ناشتے کو ناشتا ہی نہ سمجھتی تھی۔ سادہ بریڈ لینا تو میرے نزدیک ناشتے کی بے عزتی کے مترادف تھا پھر میری پریگنینسی شروع ہوئی۔" ولید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری...... اب اسے سمجھ آئی کہ ہالہ دراصل خود آگہی کے دور سے گزر رہی ہے اور یہ حالت اس موجودہ حالت کے طفیل ہے۔ اب وہ قدرے ریلیکس ہوگیا۔ ورنہ اسے لگ رہا تھا کہ ہالہ ڈپریشن کا شکار ہونے لگی ہے جو اکثر خواتین اس حالت میں ہو جاتی ہیں۔

"آپ نے دیکھا ولید میں اسی ایک بریڈ سلائس پر آ گئی۔ کون سے انڈے، کہاں کے پراٹھے، گھی اور دودھ کو دیکھ کر ابکائی آتی ہے، انڈے کو دیکھ کر متلی ہوتی ہے، تب میں نے سوچا...... مجھے اپنے ناشتے پر کتنا فخر تھا۔ مگر اللہ نہ چاہے تو میں اپنے پسندیدہ ناشتے کا ایک لقمہ بھی حلق سے اتار نہیں سکتی۔ اس پریگنینسی میں مجھ پر بہت سی حقیقتیں آشکار ہو رہی ہیں ولید۔" بولتے، بولتے اس کی آواز بھرّا گئی تو وہ لحظہ بھر کو خاموش ہوگئی گویا اپنے آنسو پی کر پھر سے بولنا چاہتی ہو۔ ولید نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر اس کے ہاتھوں کی پشت کو تھپتھپا کر خاموش حوصلہ دیا تو وہ آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر پھر سے بولنے لگی۔

"کل ڈنر میں، میں نے دو سلائس پر مکھن لگا کر چائے کے ساتھ لیا...... اس سے میری بھوک نہیں مٹی۔ میرا پیٹ نہیں بھرا مگر میں مجبور تھی۔ لاچار تھی کچھ بھی کھانے سے...... وہ جو سنت ہے ناں تھوڑی بھوک رکھ کر کھانا کھانے کی...... وہ مجبوری میں ادا ہو رہی ہے۔ قصداً تو ہمیں توفیق نہیں ہوتی۔ پھر اللہ ہمیں بتاتا ہے۔ اب کھا کے دکھاؤ وہ سب جو تم دن بھر ٹھونستے رہتے ہو اور شکر کا ایک کلمہ بھی ادا نہیں کرتے۔ آج چند لقموں پر میں کیسے شکر ادا کرتی ہوں کہ کچھ تو پیٹ میں گیا۔" اب اس کی آنکھوں میں بھرے تمام آنسو لڑیوں کی صورت بہہ نکلے...... ولید ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ یہ محض ہالہ کی خود آگہی نہیں تھی، یہ تو سب کی خود احتسابی تھی۔

"اللہ نہیں چاہتا تو دیکھیں تین ماہ ہو گئے مجھے روٹی کھائے ہوئے، تین ماہ سے میں صرف چاول کھا رہی ہوں وہ بھی ڈر، ڈر کر ذرا، ذرا سے...... ہم بیماری کے خوف سے خوراک چھوڑ دیتے ہیں لیکن عذاب کے ڈر سے گناہ کبھی نہیں چھوڑتے...... حالانکہ یہ کیفیت محض چند ماہ کی ہے مگر دل میں احساس جگا گئی ہے کہ دیکھو پیٹ تو چائے اور بریڈ سے بھی بھر گیا۔ پیٹ بھرنا ہی مقصد ہے ناں...... پھر ہم اتنا کیوں ٹھونستے ہیں، کھانے پینے کے لوازمات پہ ہزاروں کیوں اڑاتے ہیں، پیٹ تو ذرا سی بریڈ سے بھی بھر جاتا ہے اور اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کوڑا چن، چن کر گلا، سڑا اٹھا کے پیٹ بھرتے ہیں۔ اللہ بتا رہا ہے ہمیں ولید، اللہ سب بتا دیتا ہے۔" اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ولید نے اٹھ کر گلاس میں پانی ڈالا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اس سے ہالہ کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ "تو کیا اللہ ہماری تکلیف محسوس نہیں کرتا ہوگا؟ کیا وہ نہیں چاہتا کہ اس کے پیارے بندے خود کو سدھاریں اور عذاب سے بچیں۔" ولید اب سوچ رہا تھا۔ ہالہ نے چند گھونٹ پانی پی کر گلاس واپس رکھ دیا۔

"اصل میں تو اب میں شکر کی اصلیت کو پہچاننے لگی ہوں...... ہم شکر کب کرتے ہیں، ہم تو بس روتے رہتے ہیں، ہائے ہمیں یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا...... قرآن میں بار ہا پڑھا ہے ناں (اور کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو) کتنا صحیح ہے ناں، کم تو کیا ہم تو سرے سے شکر ادا کرتے ہی نہیں ہیں۔ جو کچھ ملتا ہے حق سمجھ کر لیتے اور برتتے رہتے ہیں...... اور جیسے ہی کچھ نہ مل پائے تو فوراً واویلا شروع...... ہائے ہمیں تو کچھ نہ ملا۔" ولید کے چہرے پر اب شرمندگی کے تاثرات تھے۔ اس کی نظریں لاؤنج کی مرکزی دیوار پر سجے فریم پر جمی تھیں جس پر ایرانی کیلی گرافی سے آیت لکھی تھی۔

"تو تم اپنے رب کی کون، کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔" ہم تو آیتوں والے فریم گھروں میں سجا کر بس دین دار ہونے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

"جب میں وامٹ کر کر کے بے حال ہو رہی تھی اور ترس رہی تھی کہ کسی طرح میں اپنے فیورٹ برگر کے چند لقمے ہی کھا سکوں، تب کتنی تڑپ تھی ہم دونوں کے دل میں...... کبھی اللہ کے لیے ایسی تڑپ پیدا نہیں ہوئی ولید...... وہ تڑپ صرف خوراک کے لیے تھی۔ تُف ہے اس انسان پر...... اور جب وہی خوراک میں نے کھالی...... تو جو طمانیت تھی ہم دونوں کے دلوں میں اور چہروں پر...... تب میں نے سوچا کہ واقعی ہم کون، کون سی نعمت کو جھٹلائیں گے اور کب

میں اور میرا ربّ

☆ میں پریشان ہوں تیری مدد کیسے ملے گی یاربّ؟

جواب ملا۔ صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔
(سورۂ بقرہ آیت 45)

☆ میں بہت گناہ گار ہوں، شرمندہ ہوں کیا کروں؟

جواب ملا۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، استغفار کرو۔ اللہ سب گناہ بخش دے گا۔
(سورۂ زمر، آیت 53)

☆ میرے رب میرے دل کو سکون نہیں؟

جواب ملا۔ بے شک اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے۔ (سورۂ احزاب۔ آیت نمبر 28)

☆ میرے ربّ میں بہت اکیلا ہوں۔

جواب ملا۔ بے شک ہم تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔
(سورۂ ق، آیت 16)

☆ مجھے کوئی یاد نہیں کرتا۔

جواب ملا۔ تم مجھے (یعنی اللہ) کو یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔
(سورۂ بقرہ، آیت 152)

☆ بے شک دلوں کا چین اللہ کے ذکر میں ہی ہے۔

القرآن

مرسلہ: سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی

تک جھٹلائیں گے۔ چند لقموں کے لیے کتنے جتن کیے ہم نے...... کب تک ناشکرے بنے رہیں گے......؟ اس رب نے بھوکا سونے سے بچالیا۔ ورنہ پیسہ بھی تھا، کھانا بھی تھا، سہولت بھی تھی اور موقع بھی......بس اللہ نہیں چاہ رہا تھا۔ پیسہ بھی بھوکا سونے سے نہیں بچا سکتا۔ یہ اللہ ہے جو ہر امر پر قادر ہے۔'' وہ مسلسل بول رہی تھی اور ولید بے چین ہوا سنے جا رہا تھا۔

''میں نے جب چاہا۔ جو چاہا پالیا، جس چیز کی خواہش کی اللہ نے بن مانگے دے دی۔ ظاہر ہے میں نے صرف خواہش کی...... اللہ سے دعا کر کے مانگنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑی۔ اتنا پیار ہے میرے اللہ کو مجھ سے...... جب بھی جس معاملے میں بھی اپنی مرضی کرنا چاہی اس نے میرا ساتھ دیا۔ پھر میں کیسے سمجھتی؟ اللہ ہمیں دیتا رہتا ہے، دیتا رہتا ہے...... ہم سمجھ نہیں پاتے، پھر وہ ہم سے تھوڑا سا چھین لیتا ہے تا کہ ہم اس کی طرف پلٹیں...... یہ بھی تو اس کی محبت ہے ناں کہ وہ ہمیں اس طرح اپنی طرف بلاتا ہے، وہ بھی ہمارے فائدے کے لیے تو پھر ہم کیوں نہیں سمجھتے؟''

کمرے میں پڑا ہالہ کا موبائل بج رہا تھا مگر اس کا دھیان ہی نہیں تھا۔ ولید نے بھی ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خود بھی اس سیکوئنس کو توڑنا نہیں چاہ رہا تھا جو ہالہ کی باتوں سے بنا ہوا تھا۔

''میں علی الصباح بیدار ہوتی ہوں، عموماً وہ فجر کا وقت ہوتا ہے مگر میں نے کبھی نہیں سوچا کہ خود بھی فجر کی نماز ادا کروں اور آپ کو بھی ترغیب دوں...... میں وقت پر کام کاج مکمل کر کے لنچ کر کے ریسٹ کرنے لیٹ جاتی ہوں میرا کبھی دھیان ہی نہیں گیا کہ وہ وقت ظہر کا ہوتا ہے۔ میں ظہر پڑھ کے بھی لیٹ سکتی ہوں۔ میں آپ کی واپسی اور چائے کی تیاری کی ٹائمنگ کا حساب رکھ کے بستر سے اٹھتی ہوں چائے کے ساتھ اسنیکس بنانے کے لیے بھی ٹائم مینج کرتی ہوں، میں نے کبھی عصر کے چار فرض کا ٹائم مینج نہیں کیا۔ میرا ڈنر کی تیاری کا ٹائم فکس ہے، مغرب کی اذان کے ساتھ میں تیاری شروع کرتی اور عشا کے ساتھ ڈنر سرو کر دیتی ہوں۔ میں نے اس کی عبادات کے اوقات میں اپنے کام کاج سیٹ کر لیے اور اس کا کرم دیکھیں اس نے ہمیشہ بھرم رکھا اور کبھی میری ٹائمنگ میں خلل نہیں پڑنے دیا۔ ہمیشہ میری پابندیِ وقت کو قائم رکھا۔ میں جو خاندان بھر میں آرگنائزڈ ترین پرسنالٹی مشہور ہوں، میں جو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ، ساتھ حرکت کرنے میں ثانی نہیں رکھتی۔ میں جو ہر چھوٹا بڑا کام بہترین پلاننگ کے ساتھ کرتی ہوں، میں نے اپنی نمازوں کے لیے کبھی کوئی پلان ترتیب دیا ہی نہیں۔'' اس کی سانس اب پھول رہی تھی اور ساتھ اس کی ہچکیوں اور سسکیوں میں اتنی شدت آگئی کہ وہ مزید بولنے سے قاصر تھی۔ ولید مہر بہ لب اس کے جھٹکے کھاتے روتے، سسکتے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ اس میں اتنی سی بھی ہمت نہ تھی کہ اب کی بار اسے دلاسا دینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا۔ وہ بس ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا کہ اللہ کا واقعی ان دونوں پر کتنا کرم تھا کہ بنا ٹھوکر دیے انہیں اپنی ذات کا شعور عطا کر دیا...... بلکہ ٹھوکر کے بجائے دنیا کی عظیم ترین خوشخبری یعنی والدین بننے کی خوشخبری کے ساتھ اپنی ذات کی آگہی بطور تحفہ عطا کر دی۔ ان لمحات کو گنوانے کا مطلب تھا سراسر نقصان...... اسے کبھی کہیں پڑھا ہوا ایک حمدیہ شعر یاد آ گیا۔

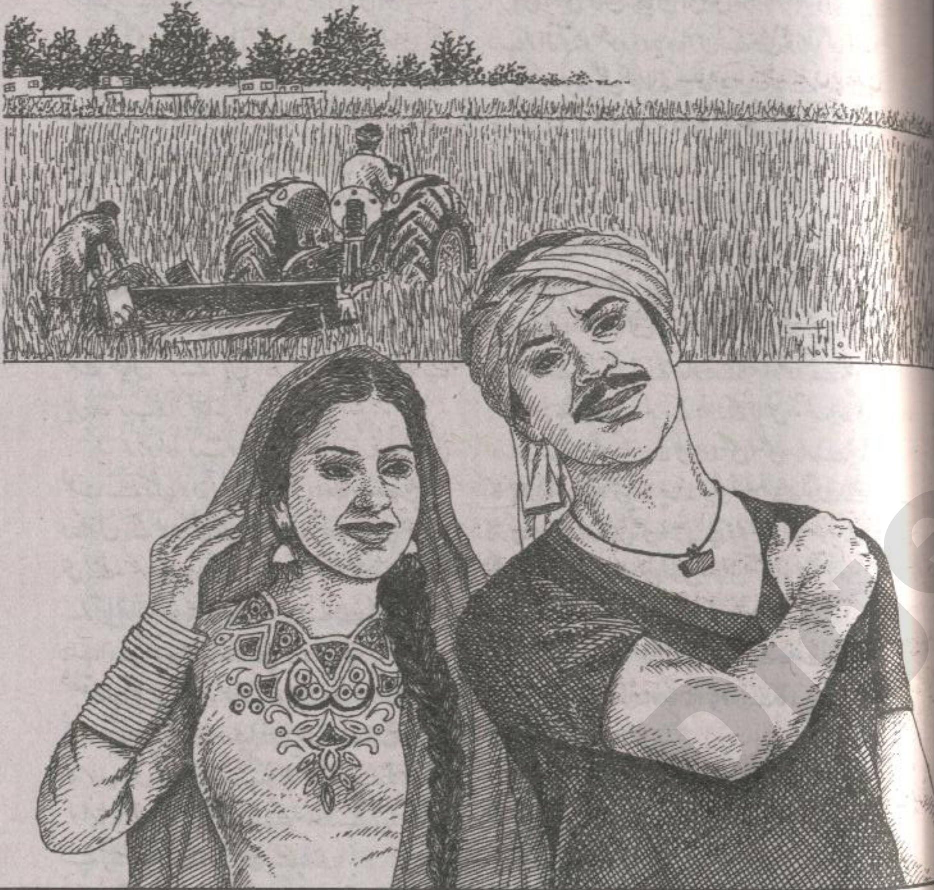
وہ ناداں ہے جو کہتا ہے ہنر ہے کارگر اس کا
حقیقت تو بس اتنی ہے وہ دیتا ہے تو کھاتے ہیں

اگر وہ اب بھی ان لمحات کو اہمیت نہ دیں تو شاید پھر کبھی اللہ ان پر اپنی اتنی رحمت نہ کرے...... اتنے گناہ گار ہو کر بھی اللہ نے ان پر کس قدر جلد اور کتنی خوب صورتی سے عقل اور آگہی کے در وا کیے تھے۔



پوچھو تو جانیں

ارم ثمامہ



''نواز، بلو ہُن وڈی ہوگئی ہے...... تو نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' رجّو نے ویہڑے میں بیٹھی بلو کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے رب نواز سے کہا، جو ابھی، ابھی باتن لے کر گھر میں داخل ہوا تھا۔

''ہاں رجو اس بات کے دل وچ آتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے کہ اب بلو وڈی ہوگئی ہے وچھوڑے کا ویلا قریب آ گیا ہے۔ تجھے پتا ہے میں نے بلو کو کتنے پیار اور دلار سے پالا ہے مگر کیا کروں دین اور دنیا دونوں کے فرض کو ہم نے بھی ادا کرنا ہے......'' صافے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے رب نواز نے پیار سے

بلو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس نے بھی محبت بھری نظروں سے رب نواز کی طرف دیکھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری گوری چٹی، بڑی، بڑی کالی آنکھیں اور سڈول جسم، متناسب قد کاٹھ، سارے پنڈ والے اسے دیکھ کر رشک کرتے اور پھر سارے پنڈ کی لاڈلی تھی بلو......

کبھی چاچا خیر کی ہٹی پر کھڑی کچھ کھاتی نظر آتی، کبھی تائے جورے کے ٹیوب ویل کے پانی سے لطف اندوز ہوتی، کبھی ہرے بھرے کھیتوں کی طرف چلی جاتی اور دور افق پر سورج کے نارنجی گولے کو ڈوبتا دیکھتی رہتی۔ جب رات کا پہلا تارہ شام کے کانوں میں سرگوشی کرتا تو اُدھر سے گزرتا نمبردار کا لڑکا ڈانٹ کر اسے گھر کی طرف روانہ کر دیتا۔

''میری بلو بڑی کرماں والی ہے سب اس کا بہت خیال کرتے ہیں اور اس سے بڑا پیار کرتے ہیں۔'' رب نواز کہتا۔

رجو اور رب نواز کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے نہیں نوازا تھا کئی سال انتظار، علاج اور دعاؤں کے بعد بھی ان کا دل اور گھر دونوں سونے ہی تھے۔ پھر ایک دن اچانک رب نواز چھوٹی سی بلو کو لے آیا تھا۔ بس پھر تو ان دونوں کے دن پھر گئے اور جب سے اب تک وہ ان دونوں کی محبتوں اور شفقتوں کا مرکز تھی۔ رجو نے اپنی ساری ممتا اس پر نچھاور کر دی تھی اور سارا دن اس کے نکے، نکے کاموں میں لگی رہتی۔ رب نواز کھیتوں سے آتا تو بلو کو اپنا منتظر پاتا۔ غرض پنڈ کے سادہ سے یہ دو لوگ اپنے فیصلے پر خوش اور مطمئن تھے۔

وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا۔ یونہی لاڈ دُلار میں وقت کا پنچھی اڑان بھرتا رہا اور بلو بڑی ہو گئی اب تو اس کا حسن اور جوانی دیکھنے کے قابل تھی، رب نواز نے اسے بہت ناز اور نخرے سے پالا تھا۔ اس لیے وہ پنڈ کے ماحول اور لوگوں سے مطمئن نہیں تھا وہ چاہتا کہ بلو جس کے پلّے پڑے وہ نیک اور اچھا کام کرنے والے لوگ ہوں تا کہ اس کی بلو کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔

اور پھر بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے پنڈ کے نمبردار سے مشورہ کیا۔ وہ پڑھا لکھا بھی تھا اور شہر میں اس کی اچھی جان پہچان بھی تھی اور پھر نمبردار نے رب نواز کو جو مشورہ دیا وہ اس کے دل کو بھا گیا اور اس نے اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ چاہے پنڈ کے لوگ کتنی باتیں بناتے مگر اسے اپنی بلو سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

آج رجو کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کبھی روئی کے بنٹوے صاف کرتی، کبھی کھیوں کے بنبل بناتی، کبھی ساگ کو درانتی سے کاٹنے لگ جاتی اور پھر تنگ آ کر اس نے سارے کام ادھورے چھوڑ دیے اور ہاتھ صاف کر کے بلو کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی جو ابھی ابھی سارے پنڈ کا چکر لگا کر آئی تھی۔ اچھا ماحول تھا، اچھے لوگ تھے ڈر کی کوئی بات نہیں تھی اس لیے وہ روز صبح سویرے نکل جاتی اور گھوم پھر کر واپس آ جاتی کبھی رجو منع کرتی تو رب نواز یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ یہی تو تھوڑے دن ہیں اس معصوم کے گھومنے پھرنے کے، مت منع کر اور خود ہی اداس بھی ہو جاتا وچھوڑے کا ویلا قریب آتا جا رہا تھا۔

رجو اور بلو صبح سے ہی بے چین تھیں۔ دونوں کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتی تھیں۔

آج سویرے ہی رب نواز لاری میں بیٹھ کر شہر گیا تھا، نمبردار نے اسے پتا سمجھا دیا تھا اور ساتھ میں پرچی بھی لکھ دی تھی جب نمبردار شہر میں رہتا تھا تو اس کا اچھا واسطہ ہو گیا تھا۔

رب نواز نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شہر میں اس کام کے لیے بھی دکانیں ہوں گی اور با قاعدہ ایک طریقۂ کار ہو گا۔ وہ ٹھہرا ان پڑھ جس

نے کبھی اپنے پنڈ سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی مگر آج اس نے اپنی لاڈلی بلو کے لیے پنڈ سے قدم باہر نکال لیے تھے اور اب اس کا ارادہ پیچھے مڑنے کا ہرگز نہیں تھا...... شام ڈھلے جب سائے ویڑے کی بنیر سے اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے، لیموں کے پودے پر ٹھونگے مارتی چڑیوں نے بھی گھر کی راہ لی تھی، پنڈ کے سارے گھروں سے تھائیوں اور لکڑیوں کے جلنے کی ملی جلی باس کچی دیواروں کو یاد کرتی بادلوں کی طرف اٹھنے لگی تھی کہ رب نواز نے گھر میں داخل ہو کر سلام کیا۔ رجو کے دعائیں مانگتے لب ایک دم مسکرانے لگے، رب نواز سب سے پہلے بلو کی طرف گیا اور اسے گوٹے والا دوپٹا اور جھانجریں دکھانے لگا جو وہ اس کے لیے شہر سے لایا تھا اور رجو دونوں کے لاڈ دیکھتے ہوئے چولھے کے پاس چل دی۔

اس نے توا رکھا اور اس پر مکئی کی روٹی ڈال دی۔ پھر اس نے سرسوں کے ساگ کو اصلی گھی سے تڑکا لگا دیا، یہ رب نواز کا من پسند کھاجا تھا اس لیے وہ مکئی اور ساگ کی رلی ملی خوشبو سے کھنچا چلا آیا اور وہیں رجو کے پاس پیڑی پر بیٹھ گیا اور تازہ روٹی کے گرم، گرم نوالے منہ میں ڈالنے لگا۔

کھانا کھا کر اور لسی پی کر جب وہ فارغ ہوا تو رجو کی آنکھوں میں ایک سوال ہلکورے لے رہا تھا کہ شہر میں کیا ہوا کوئی بات بنی یا نہیں۔

''رجو تجھے پتا ہے جب میں وہاں پہنچا تو میری تو مت ماری گئی' اتنا رش تھا کہ کھوئے سے کھوا چھلتا تھا۔ با قاعدہ نمبر کی پرچیاں کٹ رہی تھیں۔ بار بار ٹیلی فون بج جاتا تھا۔ رب کی شان ہے یہاں تو ایسا کام کرنے والے کو نہ عزت دی جاتی ہے نہ محنت بھر اجرت...... اور وہاں لوگ ان کی منتیں کر رہے تھے۔ وڈی دکان تھی شیشوں والی' میں نے لاری اڈے سے اتر کر جیسے ہی ایک بابو سے پتا پوچھا اس نے فٹ بتا دیا کہ اقبال بھائی کو وہاں سب جانتے ہیں ویسے تو آتے، آتے رات ہو ہی جاتی مگر نمبردار کی پرچی کی وجہ سے انہوں نے بڑی چنگی طرح سے میری گل سنی سب کچھ چنگا ہو گیا۔ بس اب تو دعا کر کچھ دنوں تک وہ لوگ آ ئیں گے۔''

سارے مرحلے بخوبی طے ہو گئے اور بالآخر وچھوڑے کا ویلا آن پہنچا۔ رات ہوتے ہی رب نواز کے مٹی اور گارے سے لپے گھر میں اداسی چپ چاپ چلی آئی تھی۔

آج بلو کی اس گھر میں آخری رات تھی سارا دن کاموں اور تیاریوں کی نذر ہو گیا تھا اور رات ہوتے ہی دونوں میاں بیوی بلو کے پاس آ بیٹھے تھے۔

بلو کی آنکھوں میں دکھ اور درد دونوں ملے جلے

بات فقط اتنی سی تھی

پہاڑی علاقے کی ایک عمر رسیدہ بڑھیا کو ایک جھگڑے کے سلسلے میں گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج نے پوچھا۔

''اماں جی! آپ اس جھگڑے کے سلسلے میں کیا جانتی ہیں؟''

''ایسی تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی......'' جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا نے بے پروائی سے کہا۔

''پھر بھی آپ بتائیں تو سہی...... آپ نے کیا دیکھا۔'' جج نے اصرار کیا۔

''ایسی کوئی خاص تو ہوئی ہی نہیں......'' انہوں نے ایک بار پھر اسی بے پروائی سے کہا......

''بس اُدھر گل خان نے شہباز خان کے سر پر لاٹھی ماری اور وہ اسی وقت گر گیا...... اس کا دوست اس کے کفن دفن کے بجائے خواہ مخواہ پستول چلا بیٹھا اور یوں تین چار لوگ مارے گئے۔ قصہ ختم بات تو کوئی خاص تھی ہی نہیں۔''

از: فائزہ شہزاد، پشاور

نظر آرہے تھے اس کا گھر اور گھر والے چھوٹ رہے تھے جنھوں نے اسے بہت لاڈ اور دلار سے پالا تھا، وہ بھی ان دونوں کی طرح بے حد اداس تھی۔

صبح ہوتے ہی نکے بالے سب تیار ہو کر رب نواز کے گھر کے آگے جمع ہونے لگے۔ ساری گلی کو رنگ برنگ جھنڈیوں سے سجایا تھا۔ بڑی دھوم تھی ساری پنڈ میں شہری لوگوں کی۔

تھوڑی دیر میں ایک گڈی بوہے آگے آ کھڑی ہوئی۔ اس میں سے چند لوگ اترے۔

رب نواز نے ویہڑے میں بیٹھی بلو کی طرف آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا۔

رجو بھی رک رک کر آنکھوں کو پلّے سے بار بار رگڑ رہی تھی، آج رجو اور رب نواز کا دل اور ویڑا ایک بار پھر سونے ہونے چلے تھے۔

”رب نواز بھائی، لاؤ بھئی جلدی سے......

”قربانی کی گائے لاؤ۔“ ہمیں شہر میں بڑے جانور نمٹانے ہیں، یہ تو تمہاری خواہش، ڈبل پے منٹ اور نمبردار کی سفارش تھی جو ہم اتنی صبح سویرے اتنی دور چلے آئے ہیں۔“ اقبال قریشی اینڈ برادرز ایسوسی ایشن کے صدر بالے بھائی نے آواز لگائی۔ جو اپنے کام میں بڑا ماہر گردانا جاتا تھا اور دین کے طریقے کی سمجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔

رب نواز نے بلو کی سنہری رسی کھولی اور اس پر سے گوٹے والا دوپٹا اتارا پیروں سے جھانجریں اتارتے وہ چند سال پیچھے کی طرف لوٹ گیا جب گھر میں تنہائی کاٹنے کو دوڑتی تھی تو اس کے دوست کی گائے نے ایک بچھڑی کو جنم دیا۔ جانے اس کے دل میں کیا سمائی وہ اسے گھر لے آیا اور اس کا نام بلو رکھ لیا۔

اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ اسے پال پوس کر قربانی کے لیے تیار کرے گا پھر جب وہ قربانی کے لائق ہوئی تو رب نواز کو اس سے گوڑا پیار ہو گیا، رجو اور اس نے اسے ایک بچے کی طرح ہی پالا تھا۔ وہ دونوں سارا دن اس کے نکے، نکے کاموں میں لگے رہتے اور بلو بھی ان سے بہت انسیت اور محبت کا مظاہرہ کرتی تھی۔

اب عیدِ قرباں قریب آتی جا رہی تھی اور اس کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے رہا تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنی پیاری چیز ہی راہِ خدا میں دینا اصل قربانی ہے اور پھر وہ سنتِ ابراہیمیؑ پر عمل کرنے جا رہا تھا۔

مگر پنڈ میں جس طرح کے ناتجربے کار لوگ ہر عید پر چاقو چھریاں لے کر میدان میں اتر آتے تھے جو بے دردی سے جانور کو گراتے، ذبح کرتے جنھیں ذبح کا صحیح دینی طریقہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تکبیر کتنی بلند آواز میں پڑھنی ہے، جانور کو کس طرح گرانا ہے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو، نرخرے پر تیز دھار چھری کس طرح چلانی ہے۔ یہ سب ان باتوں سے ناآشنا تھے۔ رب نواز کو مسجد کے مولوی صاحب کی اتنی بات یاد تھی کہ اس طرح قربانی حرام ہو جاتی ہے اور جانور کو بھی بہت تکلیف ہوتی ہے پھر اس کے پوچھنے پر نمبردار نے اسے بتایا تھا کہ شہر میں بڑے، بڑے ماہر قسائی موجود ہیں جن کی بڑی مانگ ہے۔ عیدِ قرباں سے مہینوں پہلے لوگ ایڈوانس بکنگ کروا لیتے ہیں اور پھر بھائی عید کے دن قسائی کی حیثیت جوائی سے زیادہ ہوتی ہے، سب چاہتے ہیں کہ ان کے اتنے محبتوں سے پالے گئے مہنگے، مہنگے جانور حلال طریقے سے ذبح ہوں۔

اور یوں رب نواز شہر جا پہنچا اور آج بقر عید کا دن تھا اور وہ اس کی بچپن کی پلی خوب صورت گائے بلو رانی کو ذبح کرنے آئے تھے۔

رب نواز نے بالے بھائی کی دوبارہ پڑنے والی آواز پر بلو کی رسی تھامی اور دھیرے، دھیرے قدموں سے باہر کی طرف چل پڑا اور رجو اسے جاتا دیکھتی رہی۔





دردِ بیکراں

اسما قادری

اس کے ہونٹوں پر بہت مدھم لیکن بے حد خوب صورت مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ اتنا خوب صورت، پُرسکون اور اسمارٹ لگ رہا تھا کہ پچھلے تیس سالوں میں شاید ہی کبھی لگا ہو یا شاید بات یہ تھی کہ میرے اندر کے حسد نے کبھی مجھے یہ سب محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا سچ تھا کہ میں خود سے صرف گیارہ ماہ چھوٹے بھائی سے بے حد حسد محسوس کرتا تھا اور اس حسد کے لیے میرے پاس خاصی

معقول وجوہات بھی تھیں۔ یہ وجوہات ایسی تھیں کہ خون کی کشش پر حاوی ہوگئی تھیں لیکن میں ہمیشہ کا بزدل اور کمزور انسان کبھی کھل کر اس حسد اور نفرت کا اظہار بھی نہیں کرسکا تھا جو شعور کی آنکھ کھلنے سے قبل ہی اس کی پیدائش سے بھی پہلے میرے دل میں جگہ پا چکے تھے۔

جی ہاں، یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ میں اپنے بھائی کے دنیا میں آنے سے قبل ہی صرف چھ ماہ کی عمر میں اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ یہ اور بات کہ میرے دل میں جنم لینے والے اس جذبے کا مجھے یا کسی دوسرے شخص کو اس وقت ادراک بھی نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے خود بھی اس سے اپنی نفرت وحسد کے آغاز کا تعین کئی سال بعد کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے اور میں نے وقت کا ٹھیک، ٹھیک تعین کیا ہے۔ کیا آپ اس بچے کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جسے صرف چھ ماہ کی عمر میں ماں کے دودھ سے محروم ہونا پڑا ہو اور اس کا سبب تھا میرا چھوٹا بھائی اقبال احمد۔ بغیر کسی وقفے کے میرے فوراً بعد ماں کی کوکھ میں آکر اس نے میرے پہلے بنیادی حق پر ڈاکا مارا تھا۔ اس وقت کی اپنی کیفیات مجھے خود تو یاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن مختلف قریبی رشتے داروں کی زبانی میں نے جو حالات سنے ان کے مطابق ان دنوں میں بے حد چڑچڑا اور بد مزاج ہوگیا تھا۔ ڈبے کے دودھ کو قبول کرنا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوا تھا اور جب بھوک کی عفریت نے مجھے کبھی ماں کے دودھ کا نعم البدل نہ بننے والی مصنوعی غذا کو قبول کرنے پر مجبور کردیا تھا تو میرے پیٹ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔۔۔۔ آئے دن ہونے والے الٹی موشن نے میری صحت کو خراب کرنے کے ساتھ، ساتھ میرے چڑچڑے پن میں بھی اضافہ کردیا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہنستا بچہ سب کا اور روتا بچہ صرف ماں کا ہوتا ہے چنانچہ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ گھر میں دادی، چچا اور پھپھیوں کے ہونے کے باوجود میں کسی کی آنکھ کا تارا نہ بن سکا تھا کہ سب ہی میرے رونے سے گھبرا کر جلد مجھ سے دستبردار ہوجاتے تھے اور بالآخر میں اس ماں کے گلے پڑ جاتا جو بہت قلیل عرصے میں دوسری بار تخلیق کے مرحلے سے گزرنے کی وجہ سے خود بھی کمزور اور بیمار رہنے لگی تھی۔ لازمی بات ہے کہ امی کو مجھ سے محبت تو تھی لیکن گھریلو امور کی انجام دہی اور اپنے کمزور جسم نے خود انہیں بھی قدرے چڑچڑا کردیا تھا ایسے میں جب میں بھی انہیں تنگ کرتا تو ان کی یہ جھلاہٹ عروج پر پہنچ جاتی۔ امی نے خود ایک بار میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے مجھے پہلا تھپڑ صرف نو ماہ کی عمر میں لگایا تھا کیونکہ میں نے متواتر دو راتیں رو، رو کر انہیں جگانے کے بعد اتنا ادھ موا کردیا تھا کہ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں شل ہوگئی تھیں اور جھلاہٹ میں وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھیں کہ صرف نو ماہ کا بچہ اس قسم کے رویّے کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ امی کے مطابق مجھے وہ تھپڑ مارنے کے بعد خود بھی دکھ سے بہت دیر تک روتی رہی تھیں لیکن کمان سے نکلا تیر لوٹایا تو نہیں جاسکتا۔ یقیناً یادداشت کی سلیٹ پر نہ ابھرنے کے باوجود وہ تھپڑ میرے اندر کہیں بہت گہرائی میں جاکر نقش ہوگیا ہوگا اور میری نفسیات پر اپنے اثرات مرتب کرتا رہا ہوگا۔ میرے گیارہ ماہ بعد دنیا میں وارد ہونے والے اقبال احمد کو اس قسم کے مسائل کا قطعی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بقول میری بڑی پھپھو کے وہ پیدائشی خوش مزاج بچہ تھا جسے سب ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ پیدائش کے وقت وہ تھوڑا کمزور ضرور تھا لیکن چھ سات ماہ بعد اس کی صحت بن گئی تو وہ اور بھی پیارا لگنے لگا۔ اس کے مقابلے میں، میں وہی روتا بسورتا بچہ تھا جو عام طور پر صحت کے مسائل میں گھرا رہتا تھا۔

اقبال اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ثابت ہوا کہ اسے پورے دو سال تک ماں کا صحت بخش دودھ میسر آیا کیونکہ اس میں اور اس کے بعد پیدا ہونے والی ہماری چھوٹی بہن سمیرا میں پورے تین سال کا وقفہ تھا۔ شاید ایک دشوار تجربے کے بعد میرے والدین نے عقل

مندی سے کام لیا تھا۔ وجہ جو بھی تھی لیکن نتیجہ یہ تھا کہ اقبال مجھ سے گیارہ ماہ چھوٹا ہونے کے باوجود بہت جلد پہلے میرے برابر کا اور بعد میں مجھ سے بڑا لگنے لگا۔ ہماری جسمانی صحت کو دیکھتے ہوئے ہی امی، ابو نے فیصلہ کیا کہ مجھے اور اسے ایک ساتھ ہی اسکول میں داخل کروایا جائے۔ یوں عمر کے اعتبار سے میں اسکول میں اس سے ایک سال آگے ہونے کا حق دار ہوتے ہوئے بھی اس کا ہم جماعت ہی رہا اور یہ زیادتی بھی میرے ساتھ عمر کے اس حصے میں کی گئی جب میں اپنے حقوق کے لیے بولنا تو دور کی بات ان کا صحیح شعور بھی نہیں رکھتا تھا۔ اسکول میں بھی مجھے کم وبیش گھر جیسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیچرز برملا اس بات پر حیرت کا اظہار کرتیں کہ ہم دونوں سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔ میں نہ تو اقبال جیسا خوب صورت وصحت مند تھا اور نہ ہی خوش مزاج وذہین چنانچہ ہوا یوں کہ اس نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور میں اوسط درجے کے طالب علم کی حیثیت سے غیر نمایاں ہی رہا۔ مجھ جیسے عام سے طالب علم کی طرف ٹیچرز کی توجہ جاتی تھی بھی تو صرف اس وقت جب کسی ٹیسٹ میں میرے نمبرز خراب آتے تھے۔ اس وقت مجھے اقبال کے شاندار نمبرز دکھاتے ہوئے اس بات پر شرم دلائی جاتی تھی کہ وہ چھوٹا ہوتے ہوئے بھی پڑھائی میں مجھ سے بہتر بلکہ بہت بہتر ہے۔ جی ہاں اقبال کا چھوٹا ہونا بھی میرے لیے ایک طعنہ تھا۔ جب ساتھی طالب علم ہم دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ دیکھ کر یہ تبصرہ کرتے کہ اقبال چھوٹا ہونے کے باوجود مجھ سے بڑا لگتا ہے تو مجھے عجیب سا احساسِ کمتری محسوس ہوتا۔ اصل میں ابتدائی عمر میں ہی گھیر لینے والی بیماریوں نے بچپن کے کئی سال گزر جانے کے باوجود بھی مجھے پوری طرح اپنے شکنجے سے نہیں نکلنے دیا تھا اور اس کا اثر میری حاضری، تعلیمی کارکردگی اور قد وقامت سب پر نمایاں تھا۔ یہاں میں ایک بات ضرور بتاؤں گا ہر شخص کے رویّے کے برعکس اقبال کا رویّہ میرے ساتھ بہت محبت بھرا ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے اور چھوٹی بہن سمیرا دونوں ہی سے بہت محبت کرتا تھا البتہ اپنی کم گوئی کے سبب میں سمیرا سے بھی محبت کرنے کے باوجود کبھی اظہار نہیں کرپاتا تھا۔ سو وہ بھی میری نسبت اقبال سے زیادہ قریب تھی اور ہر دم اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی اور بہت سی خواہشوں کی طرح میرے دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ سمیرا اقبال کی طرح میرے ساتھ بھی۔۔۔۔ بے تکلف ہو لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ البتہ ایک حیرت انگیز بات ضرور ہوگئی اور وہ یہ کہ میں اقبال سے تعلیمی میدان میں ایک سال آگے نکل گیا لیکن نہیں اب کے یقیناً میں کچھ غلط بتا گیا ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ اقبال تعلیمی میدان میں مجھ سے ایک سال پیچھے رہ گیا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ نہم جماعت کے امتحانات سے دو دن قبل اس کے پیٹ میں اتنا شدید اور عجیب وغریب درد شروع ہوا کہ وہ امتحان ہی نہیں دے سکا۔ ان دنوں امی اور ابو دونوں ہی بہت پریشان رہتے تھے۔ چند ہی دنوں میں انہوں نے اقبال کو بہت سے ڈاکٹرز کو دکھا ڈالا اور اس کے بے شمار ٹیسٹ بھی ہوئے لیکن کسی طرح اس کی بیماری کی وجہ نہ پکڑی جاسکی اور پھر اچانک شروع ہونے والا یہ عجیب وغریب درد خود ہی اچانک ختم ہوگیا لیکن اس وقت تک امتحانات ختم ہوچکے تھے۔ اسکول کی پرنسپل اور ٹیچرز نے مشورہ دیا کہ ابھی اقبال صرف بعد میں ہونے والے پریکٹیکل ایگزامز دے دے اور تھیوری کے پرچے اگلے سال میٹرک کے پرچوں کے ساتھ دے دے تو اس کا ایک سال ضائع ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ سب کو یقین تھا کہ اقبال اتنا ذہین ہے کہ ایسا کرسکتا ہے لیکن خود اقبال نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے مطابق اکھٹے دو سال کے پرچے دینے سے اس پر برڈن پڑے گا اور نتیجہ اچھا نہیں آئے گا۔ اس کا کہنا غلط بھی نہیں تھا۔ اس لیے سب کو اس کی بات ماننی پڑی اور یوں اسکول کا آخری سال اقبال سے الگ جماعت میں

بیٹھ کر میں نے قدرے سکون سے گزارا۔ اس کا میرے رزلٹ پر بھی اچھا اثر پڑا اور میں نے میٹرک کا امتحان اکہتر فی صد نمبرز لے کر یعنی اے گریڈ سے پاس کرلیا۔ میرے اس نتیجے نے قدرتی طور پر گھر والوں کو خوش کیا اور رشتے داروں میں مٹھائی کی تقسیم کے علاوہ مجھے تحائف سے بھی نواز کر ڈھیروں خوشی منائی گئی۔ کالج میں قدم رکھ کر بھی میں دنوں پہلی بار ملنے والی اس اہمیت پر مسرور رہا لیکن کچھ عرصے بعد آنے والے اقبال کے نہم کے نتیجے نے سب دھندلا دیا۔ اس کا اٹھاسی فی صد نمبروں کے ساتھ اے ون گریڈ بن رہا تھا اور میٹرک میں یہ نتیجہ بانوے فی صد نمبرز اور بورڈ میں پانچویں پوزیشن تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ایسی شاندار کامیابی کے ہر طرف ڈنکے بج گئے۔ امی، ابو اور یمیرا کے تو لگتا تھا خوشی سے زمین پر قدم ہی نہ ٹک رہے ہوں۔ اقبال کی اتنی نمایاں کامیابی کے اعزاز میں ابو نے شایانِ شان خوشی منانے کا فیصلہ کیا اور تمام عزیزواقارب کو جمع کر کے ایک شاندار پارٹی کرڈالی۔ اس موقع پر اقبال کو اتنا سراہا گیا اور اتنے تحائف سے نوازا گیا کہ اپنے میٹرک کے نتیجے سے حاصل ہونے والی خوشی میرے دل میں کملاسی گئی اور میں مہینوں یہ سوچ کر کڑھتا رہا کہ کچھ بھی کرلوں اقبال سے جیت نہیں سکتا، وہ میرے لیے قطعی ناقابلِ شکست تھا۔ جی ہاں میں اس سے ایک ایسا مقابلہ کر رہا تھا جس کی اسے خبر ہی نہیں تھی اور اس بے خبری میں ہی اس نے خود کو ملنے والے بہت سے تحائف میں مجھے بھی حصے دار بنالیا تھا۔ اس کے مطابق کئی چیزیں اسے ڈبل ملی تھیں اس لیے اگر وہ ان چیزوں کو میرے ساتھ شیئر کرلیتا تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن بات یہیں تک نہیں تھی۔ اس نے تو میری آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک دیکھ کر بڑے ماموں کا دیا ہوا ویڈیو گیم بھی یہ کہہ کر میرے حوالے کردیا تھا کہ اسے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ بعد میں، میں نے سنا تھا یمیرا اسے اس کی حماقت کا احساس دلا رہی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ختم کردی تھی کہ یہ ہم دونوں بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے چنانچہ اسے اس میں نہیں بولنا چاہیے۔ اس کے جواب کا یمیرا نے برا بھی مانا تھا لیکن اپنی شخصیت کے جادو سے کام لے کر اس نے جلد ہی اسے منالیا تھا اور وہ دونوں پھر پہلے ہی کی طرح ہوگئے تھے۔ ان دنوں میں اس کی سخاوت اور دریادلی کو سراہنے کے بجائے اس بات پر جلتا کڑھتا رہتا تھا کہ ایک جیسا رشتہ ہونے کے باوجود میرے اور یمیرا کے درمیان وہ تعلق نہیں ہے جو اُن دونوں کے درمیان ہے۔

اسی طرح کے جذبات و کیفیات کے درمیان ڈولتے لڑکپن کا وہ دور بھی گزر گیا اور ایک سال کے فرق سے ہم دونوں بھائی یونیورسٹی جا پہنچے۔ میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن اس لیے لیا تھا کہ میری اوسط درجے کی کامیابی مجھے کسی پروفیشنل کالج تک نہیں پہنچا سکتی تھی لیکن اقبال کا میرٹ بننے کے باوجود میڈیکل میں ایڈمیشن نہ لینا سب کے لیے حیرت کا سبب بن گیا۔ اس نے جینٹکس میں ایم ایس سی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''نہیں بھئی، میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا کیونکہ میرا دل اتنا مضبوط نہیں ہے کہ میں لوگوں کو تکلیف میں دیکھ سکوں اور ویسے بھی ضروری نہیں کہ ہر اچھا طالب علم ڈاکٹر یا انجینئر بنے۔ میں ٹیچنگ لائن میں جانا چاہتا ہوں۔ ہمارا المیہ ہے کہ لوگ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس شعبے میں قدم رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ٹیچنگ نالائق اور ناکام لوگوں کا شعبہ بن گیا ہے حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ سب سے زیادہ لائق اور قابل لوگ اس شعبے میں بھرتی کیے جائیں کیونکہ ان ہی لوگوں نے تو مستقبل کے معماروں کی نوک پلک سنوارنی ہے۔'' لوگوں کی حیرت کا جواب اس نے اس تقریر سے دیا تھا۔

''ہونہہ، خواہ مخواہ خود کو منفرد ثابت کرنے کی کوشش۔'' یہ میرا اس پر دل میں کیا جانے والا تبصرہ

تھا۔ بہر حال وہ تو ہر طرح کے تبصروں اور تجزیوں سے بے نیاز اپنی دُھن میں مگن رہنے والا بندہ تھا چنانچہ آرام سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ یہ ان کی کلاسز کے آغاز کا پہلا دن تھا۔ ہم دونوں بھائی ایک ساتھ ہی یونیورسٹی آئے تھے لیکن یہاں آتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ہجوم میں گم ہوگیا تھا۔ ہم وقت سے تھوڑا پہلے آئے تھے اس لیے کلاسز کے آغاز میں کچھ دیر تھی۔ میں جو گھر کی طرح باہر بھی زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا تنہا ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور یونہی پچھلے دن کے نوٹس پڑھنے لگا۔

''ایکسکیوز می۔'' نسوانی جلترنگ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اپنی آواز ہی کی طرح گنگناتی غزل...کی سی لڑکی تھی۔ سروقامت، دودھ میں شہد گھلی سی سنہری رنگت، بڑی بڑی بولتی آنکھیں اور شانوں سے ذرا نیچے آتے ایک سنہری کیچر میں جکڑے آدھے کھلے آدھے قید بالکل سیدھے ریشم کے سے ملائم چمکیلے سیاہ بال۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''پلیز کیا آپ مجھے جینٹکس ڈپارٹمنٹ تک گائڈ کردیں گے؟'' مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے بڑے نرم لہجے میں استدعا کی۔

''جی کیوں نہیں۔'' میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آج پہلا دن ہے ناں! اتفاق سے میری کسی فرینڈ نے میرے ساتھ یہاں ایڈمیشن نہیں لیا اور اکیلے ڈپارٹمنٹ کی تلاش میں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ سنا ہے فرسٹ ڈے اسٹوڈنٹس کو خوب بے وقوف بنایا جاتا ہے اس لیے کسی سے بھی کچھ پوچھنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ بھال لینا چاہیے۔'' میرے ساتھ سائنس فیکلٹی کی طرف جاتے ہوئے اس نے بڑی معصومیت سے بتایا۔

''اچھا تو آپ نے خوب دیکھ بھال کر میرا انتخاب کیا ہے؟'' شوخ مزاج نہ ہونے کے باوجود میں اس پل شوخی پر اتر آیا۔ جانے ایسی کیا بات تھی اس میں کہ میں نے خود بخود ہی اپنے دل میں ایک ترنگ سی محسوس کی تھی۔

''جی آپ مجھے خاصے سنجیدہ اور معقول شخص لگے تھے۔'' اس نے اپنی اسی معصومیت اور نغمگی لیے ہوئے سادہ سے لہجے میں جواب دیا جس نے مجھے اولین پل میں ہی تسخیر کرلیا تھا۔

''انشاء اللہ آپ کا یہ انتخاب غلط ثابت نہیں ہوگا۔'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے اسے جواب دیا اور پھر مزید گفتگو جاری رکھنے کے خیال سے اسے بتانے لگا۔ ''میرے چھوٹے بھائی اقبال احمد نے بھی اسی شعبے میں ایڈمیشن لیا ہے۔''

''اچھا تو آپ کے بھائی کا نام اقبال احمد ہے اور آپ کا؟'' اس کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھیں۔ ان سیاہ آنکھوں میں اتنی گہرائی تھی کہ میں پوری طرح ڈوب گیا۔

''جمال احمد، میں بی بی اے کا اسٹوڈنٹ ہوں۔'' دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اسے بتایا۔

''اور میں نوین طاہر۔'' اس کی طرح اس کا نام بھی خوب صورت تھا۔ ''لگتا ہے آپ دونوں بھائی مختلف مزاج کے ہیں اس لیے اتنی الگ الگ فیلڈ کا انتخاب کیا ہے۔'' وہ خاصی باتونی لڑکی تھی اور سچ یہ ہے کہ پہلی بار مجھے کسی کا اس قدر باتیں کرنا اتنا اچھا لگ رہا تھا۔

''درست اندازہ لگایا آپ نے۔'' میں نے اختصار سے اس کی بات کا جواب دیا۔ پہلی ہی ملاقات میں اسے تفصیل سے کیا بتاتا کہ میں بی بی اے صرف ابو کو خوش کرنے کے لیے کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت میں ان کے ساتھ ان کا بزنس سنبھال سکوں۔ اقبال نے البتہ بہت لاڈلا بیٹا ہونے کے باوجود اس انداز میں نہیں سوچا تھا اور اپنی الگ ہی راہ منتخب کرلی تھی۔ شاید وہ پہلے ہی سب کو اتنا پیارا

تھا کہ اسے کسی کی نظروں میں اپنی اہمیت بنانے کے لیے ایسی کسی جدوجہد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے فیصلے پر امی نے ہی معمولی سا اعتراض کیا تھا۔

"تمہیں ڈاکٹر نہیں بننا تو نہ سہی ایم بی اے کر لو تا کہ آگے چل کر اپنے ابو کا ہاتھ بٹا سکو۔" انہوں نے اس کے جینٹکس میں ایڈمیشن لینے کا سن کر کہا تھا۔

اصل میں پہلے ابو کا چچا کے ساتھ مشترکہ کاروبار تھا۔ خاندانی کاروبار ہی سمجھ لیں لیکن چچا کی شادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات کو محسوس کر کے دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ گھر اور کاروبار الگ کر لیے جائیں تا کہ باہمی مروت قائم رہے۔ دادی کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا اور پھپیاں بیاہ کر اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں اس لیے اس فیصلے پر آسانی سے عمل درآمد ہو گیا۔ اکیلے کاروبار کو سنبھالنے اور بڑھانے کے لیے ابو کو دن رات بہت محنت کرنی پڑی تھی سو فطری طور پر امی کی خواہش تھی کہ ہم بھائی ان کا یہ بوجھ بانٹ لیں۔

"پلیز شاہین تم اسے کنفیوز مت کرو۔ یہ میرا خواب دیکھنے والا بہت حساس بیٹا ہے۔ اسے وہ سب کرنے دو جو اس کا دل چاہتا ہے۔ ابھی میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کہ اکیلا کاروبار نہ دیکھ سکوں اور پھر چند سال ہی کی تو بات ہے اپنا جمال تعلیم مکمل کر کے مجھے جوائن کر لے گا۔" ابو نے امی کے اعتراض کو مسترد کر دیا تھا اور میں ان کے میٹھے لہجے میں اپنا جمال کہنے پر ہی خوش ہو گیا تھا۔

"آپ کہاں کھو گئے...... وہ دیکھیں وہاں کوئی ہاتھ ہلا کر آپ کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔" نوین کی آواز نے مجھے خیالات سے نکالا تو میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ وہ اقبال ہی تھا جو مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نوین کو لیے اس کی سمت بڑھ گیا اور ان دونوں کو آپس میں متعارف کروایا۔

"نو پرابلم مس نوین، آپ میرے ساتھ آئیں۔ میرا بھی آج یہاں پہلا دن ہے لیکن میرے یہاں اتنے دوست ہیں کہ کسی مشکل میں پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے اپنے ازلی اعتماد سے نوین سے کہا اور اس دن کے بعد سے ہماری دوستی کی تکون کا آغاز ہو گیا۔ میں موقع ملنے پر تقریباً روز ہی ان کے ڈپارٹمنٹ کا چکر لگا لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دونوں بھی آ جاتے تھے۔ بعض اوقات نوین تنہا ہوتی تھی کہ اقبال کے اتنے دوست تھے کہ اس کے لیے ہر وقت نوین کو کمپنی دینا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ میں اور نوین کبھی کبھی ساتھ لائبریری اور کیفے ٹیریا بھی چلے جاتے تھے باتیں تو وہی زیادہ کرتی تھی اور میں مسکراتا ہوا اسے سنتا رہتا تھا۔ اسے دیکھنا اور سننا مجھے بہت اچھا لگتا تھا پھر وہ ایسی تھی کہ مجھے بھی کچھ نہ کچھ بولنے پر مجبور کر ہی دیتی تھی۔ وہ میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ میں بہت خوش رہنے لگا تھا اور پڑھائی میں بھی پہلے سے زیادہ جان مارنے لگا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آہستہ، آہستہ وہ اقبال کی ذہانت سے متاثر ہو رہی ہے۔ ہماری ملاقاتوں میں اب اقبال کا ذکر زیادہ ہونے لگا تھا۔ وہ کیسے پوری کلاس میں سب سے نمایاں ہے، کس طرح اپنے پروفیسرز کو لاجواب کر دیتا ہے، نصابی کے ساتھ ساتھ کون، کون سی غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنا سکہ جما چکا ہے سب مجھے نوین کی زبانی سننے کے لیے ملتا رہتا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی نئی یا غیر معمولی باتیں نہیں تھیں لیکن نوین کی زبان پر اس کا اس قدر ذکر مجھے کھلنے لگا تھا۔ اکثر میں بہانے سے موضوع تبدیل کر دیتا تھا اور وہ اتنی سادہ تھی کہ میرے اندر کی کیفیت کو سمجھے بغیر دوسرے موضوع میں مگن ہو جاتی۔

ان دنوں میں بہت الجھا، الجھا رہنے لگا تھا۔ کبھی اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ اقبال کی ذہانت سے متاثر نوین کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ تو نہیں پنپ رہا ہے جب کوئی حتمی فیصلہ نہ کر پاتا تو

اقبال کا جائزہ لینے لگتا۔ وہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ شوخ، متحرک اور دوستوں میں گم رہنے والا۔ اس کے اندر مجھے ایسی ... کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی کہ جتلائے عشق محسوس ہو۔ خدشات میں گھرے میرے دل کے باوجود وقت بہر حال آگے بڑھتا رہا اور میں فائنل ایئر میں پہنچ گیا۔ فائنل کے ایگزامز سے پہلے مجھے احساس ہوا کہ اس کے بعد میرا روز، روز نوین سے ملنا ممکن نہیں ہوگا اور یہ سوچتے ہی مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ زندگی میں پہلی بار ہمت سے کام لے کر میں نے امی کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا۔ امی میری زبان سے ایسی بات سن کر حیران ہوئیں اور ہنس کر بولیں۔

"حیرت ہے، میں تو سمجھی تھی کہ یونیورسٹی پہنچ کر اقبال ایسا کوئی گل کھلائے گا۔ اپنے اتنے سنجیدہ بیٹے سے تو مجھے ایسی کوئی امید ہی نہیں تھی۔"

"کس بات کی امید نہیں تھی والدہ ماجدہ؟" اسی وقت اقبال وہاں آ ٹپکا اور دھم سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے امی سے پوچھا۔

"جمال کی بات کر رہی ہوں۔ موصوف یونیورسٹی میں کسی لڑکی کو پسند کر بیٹھے ہیں اور مجھ سے اس کے گھر رشتہ لے جانے کو کہہ رہے ہیں۔" امی نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو مجھے کم از کم اتنا اطمینان ہو گیا کہ انہیں میری خواہش گراں نہیں گزری ہے۔

"واؤ زبردست، کون ہے وہ خوش نصیب؟" امی کی اطلاع پر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"کسی نوین طاہر کا نام لے رہا ہے۔ تمہاری کلاس فیلو ہے ناں...... تم بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟" امی نے جواب دیا جبکہ میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا کہ امی کا جواب سن کر اس کے چہرے پر لمحے بھر کو سایہ سا لہرایا ہو لیکن بس ایک پل کی بات تھی، وہ دوبارہ اپنے شوخ موڈ میں واپس آ گیا۔

"واہ امی، کیا زبردست انتخاب کیا ہے آپ کے بیٹے نے...... یقین کریں ایسی بہو پا کر تو آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گی۔" اس نے اپنا ووٹ میرے حق میں ڈال دیا۔

"اب تو اس لڑکی کے گھر جانا ہی پڑے گا۔ میرے دونوں بیٹے جس کی اتنی تعریف کر رہے ہیں وہ کوئی عام لڑکی تو ہونے سے رہی۔ بتاؤ کب لے کر چل

ناممکن

چلی جاتی ہے آئے دن وہ بیوٹی پارلر
کہ مقصد ہے جواں لگنا، مثالِ حور ہو جانا
مگر یہ بات کسی خاتوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی
کہ ممکن ہی نہیں کشمش کا پھر انگور ہو جانا

مرسلہ: رُدابہ علی، لالہ موسیٰ

حسرتیں

یوں اکیلے میں مجھے اہلِ وفا یاد آئے
جیسے بندے کو مصیبت میں خدا یاد آئے
جیسے اجڑے ہوئے پنچھی کو نشیمن اپنا
جیسے اپنوں کے بچھڑنے پہ دعا یاد آئے
جیسے ڈھلتی ہوئی شاموں کو سویرا کوئی
جیسے پنجرے میں پرندے کو فضا یاد آئے
جیسے بوڑھے کو خیالات میں بچپن اپنا
جیسے بچے کو شرارت پہ سزا یاد آئے
جیسے اجڑی ہوئی بستی کو زمانہ اپنا
جیسے طوفاں کے ٹھہرنے میں دیا یاد آئے
جیسے پلکوں کے جھپکتے ہی کنارے بھیگیں
جیسے اس روز ہُوا کون جدا یاد آئے
جیسے سورج کی تمازت میں گھٹا یاد آئے
یوں اکیلے میں مجھے اہلِ وفا یاد آئے

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

رہے ہو مجھے اس کے گھر؟'' امی کو بھی جوش آگیا۔

''میرے خیال میں ابھی تھوڑا ٹھہر جائیں امی۔ ایگزامز ہونے دیں پھر بات چھیڑیے گا۔'' اس بار اس نے سنجیدگی سے امی کو مشورہ دیا۔

''وہ کیوں بھئی؟'' امی نے وہ سوال کیا جو میرے اپنے دل میں بھی تھا۔

''وہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس طرح کی باتیں بعض اوقات ذہنی انتشار کا بھی سبب بن جاتی ہیں کہیں ڈسٹرب ہو کر نوین کی توجہ پڑھائی سے نہ ہٹ جائے پھر ہمیں اس کے گھر والوں کے ردِعمل کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں۔ بعض اوقات لوگ اپنی بیٹیوں کو کو ایجوکیشن میں پڑھنے کی اجازت تو دے دیتے ہیں لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے لیے ان کے کسی ساتھی کا پروپوزل آئے۔ ایسی صورت میں بھی نوین کا نقصان ہو سکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے جمال تمہاری کبھی نوین سے اس موضوع پر بات ہوئی ہے؟'' امی کو اپنے اعتراض کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اس نے اچانک ہی مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، میں نے یونیورسٹی میں کبھی اس سے اس قسم کی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔'' میں اس کے درمیان میں ٹانگ اڑانے پر بدمزہ تو ضرور ہوا تھا لیکن اس کے دلائل اتنے بے جان نہیں تھے کہ انہیں رد کیا جا سکتا چنانچہ سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے طے ہو گیا کہ ایگزامز کے بعد میں نوین کے گھر تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گی۔'' میرا جواب سن کر امی نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ مناسب ہی تھا اس لیے میں بھی مزید اصرار نہیں کر سکا۔ اب امی سے تو یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ نوین کو ایک دن بھی دیکھے بغیر رہنا میرے لیے سخت دشوار کام ہے۔ امتحانات کا زمانہ بھی بالآخر گزر گیا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ امی آخری پیپر والے دن ہی نوین کے گھر رشتہ لے کر جا پہنچیں لیکن اقبال نے انہیں روک دیا کہ آج کل نوین کے گھر والے کسی قریبی رشتے دار کی شادی میں مصروف ہیں اس لیے ایک آدھ ہفتے بعد ان سے رجوع کیا جائے۔ میں اس تاخیر پر خاصا جز بز ہوا اور تھوڑا سا بدگمان بھی کہ کہیں اقبال کی نیت تو خراب نہیں ہے اور وہ میرے نوین سے رشتے میں رکاوٹ تو نہیں ڈالنا چاہتا لیکن پھر جلد ہی یہ سارے خدشات اور بدگمانی بھی دور ہو گئی۔ میرا رشتہ نوین کے لیے گیا اور روایتی مراحل سے گزرنے کے بعد فوراً ہی قبول بھی کر لیا گیا۔ میری خواہش پر امی نے شادی کے لیے قریبی تاریخ لے لی تھی۔ تاریخ لیتے ہی ہمارے گھر میں گویا ہنگامے جاگ اٹھے۔ امی اور سمیرا پورے جوش و خروش سے تیاریوں میں جت گئیں۔ اقبال ان کا ڈرائیور بنا ہر جگہ ان کے ساتھ رہتا۔ شادی کارڈ چھپوانے سے لے کر کیٹرنگ تک کے سارے انتظامات اس نے سنبھال رکھے تھے اور مشکل سے ہی گھر میں دکھائی دیتا تھا۔

''آپ سارا دن کہاں مارے، مارے پھرتے رہتے ہیں اقبال بھائی۔ تھوڑا اپنی صحت کا بھی خیال کیجیے۔ تھوڑے سے دنوں میں اچھے خاصے دبلے ہو گئے ہیں آپ۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آپ کو ڈھنگ سے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔'' ایک دن سمیرا اس پر خفا ہو رہی تھی تو آنے والے خوش کن دنوں کے خیالات میں مگن مجھے احساس ہوا کہ واقعی وہ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔

''کوئی دُبلا وبلا نہیں ہوا تھوڑا سا اسمارٹ ہو گیا ہوں۔ تم اماؤں والی عینک لگا کر مجھے نہیں دیکھا کرو۔ یہ اماؤں کی ہی عادت ہوتی ہے کہ انہیں اپنی بچے ہمیشہ کمزور نظر آتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر سمیرا کو ٹال دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''شاپنگ کے لیے چلیں! تمہارے لیے اچھی سی شیروانی پسند کرتے ہیں۔'' مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں گھر سے روانہ ہو گئے۔ وہ پورا دن اس نے مجھے شاپنگ سینٹر میں گھماتے ہوئے گزار دیا کہیں کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تھا اسے۔ بالآخر بڑی مشکل سے ایک شاپ پر وہ یہ سمجھانے میں کامیاب ہو سکا کہ ہم کس طرح کی شیروانی تیار کروانا چاہتے ہیں۔ شاپ کیپر نے اس کے آئیڈیے کو بہت سراہا اور خود بھی چند مشورے دے دیے۔

''میں نے نوین کے ویڈنگ ڈریس کی مناسبت سے تمہاری شیروانی تیار کروائی ہے۔'' آرڈر دے چکنے کے بعد اس نے مجھے بتایا تو میں ہنس دیا۔ ان دنوں میں بہت خوش رہا کرتا تھا۔

''یار یہ نوین کا موبائل دیکھو مستقل بند ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جب سے رشتے کا سلسلہ چلا ہے میری اس سے بات ہی نہیں ہو سکی ہے۔'' موقع دیکھ کر میں نے اس سے ذکر کر ڈالا۔

''بات چیت تو اس کی مجھ سے بھی نہیں ہو رہی ہے۔ اصل میں اس معاملے میں اس کی فیملی کچھ دقیانوسی ہے اور ان کے ہاں لڑکی کا قبل از شادی دولھا یا سسرال والوں سے ربط وضبط پسند نہیں کیا جاتا۔'' اس نے مجھے بتایا تو میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''اتنی ٹھنڈی سانسیں کیوں لیتے ہو بھائی ......شادی کا دن کون سا بہت دور ہے۔ وہ تمہاری زندگی میں آجائے تو جی بھر کر اس سے باتیں کرتے رہنا۔'' اس نے مجھے چھیڑنے کے انداز میں کہا تو میں دھیرے سے ہنس کر اس دن کے خیالوں میں کھو گیا جب نوین میری بن کر میری زندگی میں داخل ہوتی۔

شادی کا دن واقعی میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ اقبال اور سمیرا کے دوستوں نے مل کر خوب رونق لگا رکھی تھی۔ اس دن پہلی بار مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ میرے والدین، بھائی، بہن مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ ان محبتوں کی جلو میں جا کر میں اپنی محبت نوین کو بیاہ لایا۔ دلہن

بن کر نوین پر بہت روپ آیا تھا۔ خواب گاہ کی تنہائی میں، میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا اور پھر ٹوٹ کر اس پر اپنی محبتوں کی برسات کر دی۔ اسے اپنی شدتوں سے آگاہ کرتے مجھے بھرپور احساس تھا کہ وہ حیران سی یہ سب سن رہی ہے۔ حیران تو اسے ہونا ہی تھا کہ یونیورسٹی میں تقریباً روز ملاقات ہونے کے باوجود میں نے کبھی زبان سے اظہار نہیں کیا تھا۔ اظہار کے سارے الفاظ اور انداز تو میں نے آج کی خوب صورت رات کے لیے سنبھال رکھے تھے اور لگتا تھا کہ میری شدتوں کے آگے نڈھال نوین میں بولنے کا یارا بھی نہ رہا ہو۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا اظہار تمہیں اتنا حیران کرے گا کہ تم گنگ ہی ہو جاؤ گی۔'' اس کی حالت دیکھ کر میں نے اسے ہنس کر چھیڑا۔

''میں واقعی حیران ہوں کہ مجھے کبھی احساس کیوں نہیں ہوا کہ تم مجھے اتنی شدت سے چاہتے ہو۔'' وہ کھوئے، کھوئے سے انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ وہ جو ڈھیروں باتیں کرتی تھی آج اس کی یہ مختصر کلامی مجھے لطف دے رہی تھی۔ اس کا رکا رکا اور جھجکا ہوا سا یہ انداز اسے مزید خوب صورت جو بنا رہا تھا لیکن اگلے چند دنوں میں اس کی یہ کم گوئی مجھے الجھن میں مبتلا کر گئی۔ یوں تو وہ گھر کے تمام افراد کے ساتھ گھل مل گئی تھی اور سب اس سے خوش نظر آتے تھے لیکن اس کے مزاج کی شوخی و چونچالی کہیں گم سی ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ میری ہر خواہش کو حکم کا درجہ دیتی تھی اور پہننے اوڑھنے میں میری پسند کا خاص خیال رکھتی تھی۔ میری تمام ذمے داریاں بھی اس نے ازخود سنبھال لی تھیں پھر بھی میں کوئی کمی سی محسوس کرتا تھا۔ آخر ایک دن میں نے اس سے اس حوالے سے بات کر ڈالی۔

''لڑکیوں کو وقت کے ساتھ تبدیل ہونا پڑتا ہے جمال۔ یونیورسٹی کی بات اور تھی لیکن اب میں

ایک شادی شدہ عورت ہوں جسے گھر کی بڑی بہو کی حیثیت سے اپنی ذمّے داریاں نبھانی ہیں۔ اب مجھ پر پہلے کی سی شوخی اور لاابالی پن اچھا نہیں لگے گا۔ ہاں البتہ اگر مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو آپ شکایت کرسکتے ہیں۔''
اس نے ایسے انداز میں مجھ سے یہ بات کہی کہ مجھے قائل ہونا پڑا۔ شکایت تو اس سے کوئی تھی ہی نہیں میں نے اسے یہ پیشکش ضرور کی کہ وہ چاہے تو یونیورسٹی جوائن کرسکتی ہے لیکن اس نے انکار کردیا۔ اس کے مطابق وہ اپنا سارا وقت اپنے گھر کو دینا چاہتی تھی اور واقعی اس نے خود کو گھر میں بہت اچھی طرح مدغم کرلیا تھا۔ اتفاق سے میری شادی کے بعد ابو کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی اور بڑھتے ہوئے بلڈ پریشر کی وجہ سے ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیا تھا۔ میں چونکہ کاروبار میں ابو کا ہاتھ بٹاتا تھا چنانچہ اس صورتِ حال کی وجہ سے ساری ذمّے داری میرے شانوں پر آگئی اور حسبِ پروگرام میں نوین کے ساتھ ہنی مون پر نہ جاسکا۔ ان حالات میں نوین نے بھی مجھ سے بھرپور تعاون کیا اور پروگرام ملتوی ہوجانے پر برا ماننے کے بجائے الٹا میری دلجوئی کی کہ ہم آئندہ کبھی گھومنے پھرنے جاسکتے ہیں۔ ایک ایسی عورت جو آپ کی محبت ہو اور ہر اعتبار سے تعاون کرنے والی بھی کیسی نعمت ہوتی ہے اس بات کا مجھے نوین کی رفاقت میں بھرپور تجربہ ہوا۔ اپنی زندگی کے اس خوب صورت تجربے اور کاروباری مصروفیات میں مگن مجھے اقبال کے بدلتے معمول کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔ ایک رات میں کسی ضرورت کے تحت کمرے سے باہر نکلا تو اقبال کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے سمیرا کی آواز پر چونک گیا۔
''کیا ہوگیا ہے آپ کو اقبال بھائی، آپ تو بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ رات گئے تک گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ڈھنگ سے کھاتے پیتے تک نہیں۔ صحت دیکھی ہے کتنی خراب ہورہی ہے اور اس پرے یہ اسموکنگ بھی شروع کردی ہے۔'' سمیرا کے لہجے میں بیک وقت خفگی اور پریشانی تھی۔
''بیکار میں پریشان ہوتی ہو بہنا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بس آج کل پڑھائی میں ذرا زیادہ جان مار رہا ہوں فائنل ائیر ہے ناں اس لیے زیادہ محنت کرنی پڑرہی ہے۔ زیادہ وقت یونیورسٹی میں گزر جاتا ہے اس کے بعد دوست کمبائن اسٹڈی کے لیے گھسیٹ لیتے ہیں۔ پڑھتے، پڑھتے تھک جائیں تو ذرا خود کو فریش کرنے کے لیے گھومنے نکل جاتے ہیں۔ بڑی بے فکری کے دن ہیں بہنا، میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ لائف انجوائے کررہا ہوں۔ اس کے بعد تو ظاہر ہے پیروں میں بیڑیاں پڑجائیں گی اور پریکٹیکل لائف کا آغاز ہونے پر یہ ساری بے فکری اور عیاشی خواب ہوجائے گی اس لیے تم مجھے مت روکو اور لائف انجوائے کرنے دو۔'' اقبال نے بے پروا سے انداز میں اسے جواب دیا تو وہ پل بھر کے لیے چپ ہوگئی لیکن پھر جھنجلا کر بولی۔
''چلیں باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن یوں چین اسموکنگ کرکے آپ کون سا انجوائے کررہے ہیں؟'' مجھے اندازہ تھا کہ ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ اس نے اقبال سے سگریٹ بھی چھینی ہوگی۔
''یہ تو یاروں کی صحبت کا اثر ہے۔ تمہیں معلوم ہے جب سب لڑکے باہر نکلے ہوں تو اس طرح کا شغل لازمی کرتے ہیں اور جو ساتھ دینے سے انکار کرے اسے عورت ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ میں ایک سگریٹ کی خاطر اپنی مردانگی پر حرف آتا تو نہیں دیکھ سکتا ناں۔'' اس کا انداز ویسا ہی شوخ تھا لیکن مجھے بڑا عجیب سا لگا اور میں یہ سوچتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا کہ کسی دن خود اقبال سے بات کروں گا لیکن کچھ جھجک اور مصروفیت کی وجہ سے نوبت ہی نہ آسکی۔ اقبال سے میری اتنی زیادہ بے تکلفی نہیں تھی

کہ ہر موضوع پر اس سے کھل کر بات کرسکتا۔ ہمارے درمیان جب بھی بات چیت ہوتی تھی آغاز ہمیشہ وہی کرتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے کاروبار کو وسعت دینے کے لیے ایک آفس لاہور میں بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا یوں میری مصروفیات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ لاہور والی برانچ نئی ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ توجہ اور وقت دینے کی ضرورت تھی چنانچہ میرا زیادہ وقت لاہور میں گزرنے لگا۔ میں نے سہولت کے لیے وہاں کرایے پر فلیٹ لے لیا تھا چنانچہ ہر ٹرپ پر نوین کو بھی امی کی اجازت سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ زندگی بڑی مگن اور سُبک گزر رہی تھی۔ آٹھ مہینے کا عرصہ ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔ ان ہی دنوں مجھے نوین نے دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی تو میں اسے اپنے ساتھ لیے سرشار سا کراچی لوٹا۔ مجھے یقین تھا کہ دادا، دادی بننے کی خبر سن کر امی اور ابو بھی کھل اٹھیں گے۔ ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب امی نوین کے لیے سفر کو مضر قرار دیتے ہوئے اسے میرے ساتھ آنے اور لاہور جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور مستقل کراچی میں ہی روک لیں گی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر امی نے ایسی کوئی بات کہی تو میں انکار نہیں کروں گا۔ مجھے خود بھی نوین اور اپنے آنے والے بچے کی سلامتی عزیز تھی۔ خوشی سے معمور دل لیے میں کراچی پہنچا تو یہاں کی صورتِ حال نے مجھے ہکّا بکّا کردیا۔ اقبال شدید بیماری کی حالت میں اسپتال میں داخل تھا۔
''اس کے دونوں گردے فیل ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق شراب نوشی کی کثرت نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔'' ابو کی دی اطلاع سن کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ ابو تو گویا دنوں میں بوڑھے ہوگئے تھے۔ ان کا جوان لائق فائق بیٹا اس حال کو پہنچ گیا تھا تو ان کا یہ حال تو ہونا ہی تھا۔ امی اور سمیرا کی حالت ان سے بھی زیادہ غیر تھی۔ میں اور نوین ان لوگوں کو کوئی خوش خبری کیا سناتے انہیں سنبھالنے میں لگ گئے۔ عجیب دکھ اور بے یقینی کا عالم تھا بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات تھی کہ وہ لڑکا جس نے بچپن اور لڑکپن نہایت ذمّے داری سے مثبت سرگرمیوں میں گزارا ہو سمجھداری کی عمر میں بری صحبت کا شکار ہوگیا اور اپنی صحت کے ساتھ سب کچھ گنوا بیٹھا۔ وہ بھی اتنے مختصر عرصے میں کہ کسی کو کچھ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔
''یہ کیا کرلیا میرے بھائی؟'' میں نوین کے ساتھ اس سے ملنے اسپتال پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر بلک اٹھا۔
''کچھ نہیں...... بس زندگی کا خراج ادا کررہا ہوں۔ کم ظرفوں کے حصے میں ایسی سزائیں تو آتی ہی ہیں۔'' اس نے اداسی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر نوین پر ڈالی جو ضبط کی کوشش کے باوجود نڈھال نظر آرہی تھی۔ اس کی بے تحاشا سرخ آنکھوں اور سُتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کتنے شدید دکھ سے دوچار ہے۔ دیور بننے سے پہلے اس کا اقبال سے دوستی کا رشتہ تھا اور ظاہر ہے کوئی بھی سچا دوست اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھ کر

لازمی

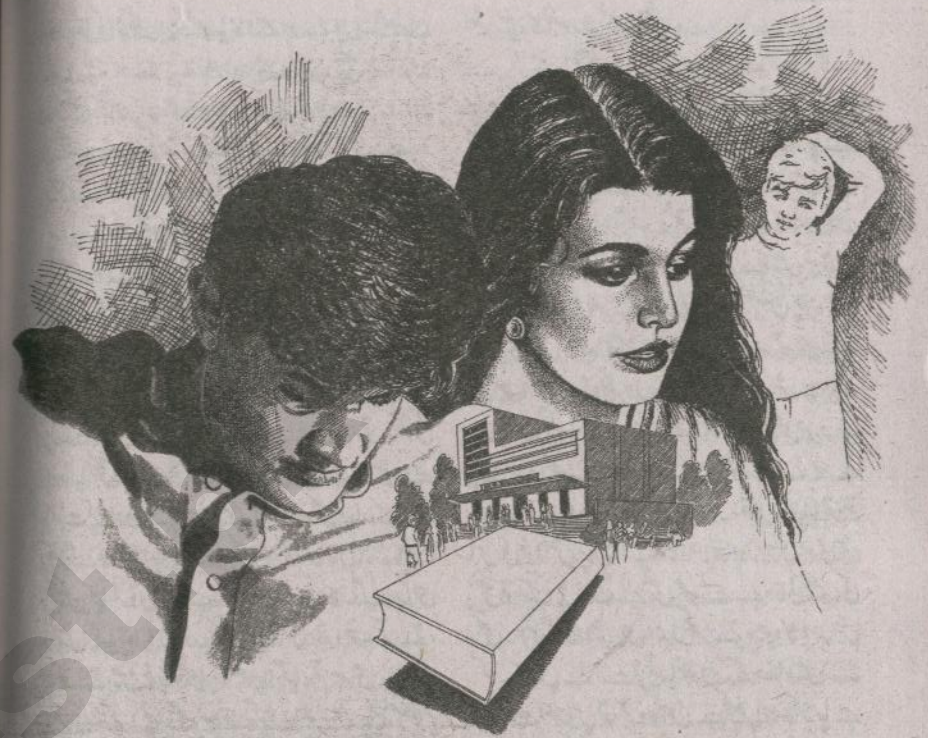
کیا آپ جانتی ہیں کہ چھتری بارش کو نہیں روکتی لیکن اس کی وجہ سے ہم خاصے مطمئن ہوجاتے ہیں کہ کچھ تو ہے...... یہ بارش ہمیں تر بتر نہیں کرسکتی۔ اسی طرح ہمیں اعتماد کامیابی نہیں دلاتا لیکن یہ ہمیں وہ قوت دیتا ہے جس کے ذریعے ہم مشکلات کا سامنا کرسکتے ہیں۔ اعتماد اور بھروسے کی چھتری ہر عورت کو اپنے پاس لازمی رکھنی چاہیے۔

از: سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

ترپ اٹھتا وہ بھی بہت دکھی تھی۔
"کیسی ہو نوین؟" اقبال نے مسکرا کر اس سے دریافت کیا تو وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔
"تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میں خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کیوں خبر نہیں ہو سکی کہ تم کن راہوں پر چل پڑے ہو؟" میرے اندر ماتم بپا تھا۔
"تمہیں خبر کیسے ہوتی، میں تو اس دنیا میں تھا جہاں سے بندے کو اپنی بھی خبر نہیں ملتی۔" اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں اور پوچھوں کہ اس نے خود پر اور ہم پر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا لیکن وہ اس حال میں ہی نہیں تھا کہ اس سے کسی قسم کی جواب طلبی میں وقت ضائع کیا جاتا۔ ابھی تو سب سے زیادہ ضرورت اس کو بچانے کی جدوجہد کرنے کی تھی۔ میں نے اسپتال میں موجود امی اور سمیرا کو زبردستی گھر بھیجا اور خود ڈاکٹر سے ملنے چل پڑا۔
"مسٹر اقبال کے دونوں گردے کام کرنا چھوڑ چکے ہیں۔ ہم نے ان کے جو ٹیسٹ لیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شراب کے ساتھ دیگر خطرناک نشہ آور ادویات بھی کثرت سے استعمال کر رہے تھے جن کے باعث بہت کم عرصے میں ان کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ اب ان کا واحد علاج گردے کی تبدیلی ہے۔ اگر جلد از جلد انہیں کوئی ڈونر نہیں ملا تو ان کا زندہ بچنا بہت مشکل ہے۔" ڈاکٹر نے بہت صاف الفاظ میں مجھ پر صورتِ حال واضح کر دی۔ میں سن سا دماغ لیے اس کے کمرے سے نکلا۔ حالات بتاتے تھے کہ اقبال نے جان بوجھ کر خود کو تباہ کیا ہے۔ ابھی دو ماہ قبل ہی تو وہ کمبائن اسٹڈی کا بہانا کر کے گھر سے ہاسٹل منتقل ہوا تھا اور میری معلومات کے مطابق اس عرصے میں ایک آدھ بار ہی گھر والوں سے ملنے کے لیے آیا تھا بس فون پر ہی بات کر لیتا تھا۔ میرا تو اس عرصے میں سرے سے اس سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا ورنہ شاید میں ان تبدیلیوں کو بھانپ لیتا۔
کچھ نہ سمجھ آنے والی کیفیت میں، میں شکستہ حال سا واپس اس کے کمرے کی طرف لوٹا۔ بند دروازے کو کھولنے کے لیے ناب پر ہاتھ رکھتے اندر سے آتی آوازوں پر میں خود کار انداز میں اپنی جگہ تھم سا گیا۔
"جب سہنے کا حوصلہ نہیں تھا تو خود پر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا...... کیوں مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا؟" یہ نوین کی آواز تھی جو بلکتی ہوئی اس سے سوال کر رہی تھی۔
"مجھ میں اپنے بھائی کا دکھ سہنے کا بھی تو حوصلہ نہیں تھا ناں۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر تم اسے نہ ملیں تو وہ ٹوٹ جائے گا اور اس کے ٹوٹنے پر میں خود کیسے سالم رہتا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے اپنا بھائی اتنا عزیز ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی ایک جھلک دیکھ کر بھی اپنی پسندیدہ ترین شے سے دستبردار ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنا قیمتی تعلیمی سال اس لیے ضائع کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے آگے نکل سکے پھر بھلا میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیسے اختیار ہوتے ہوئے بھی پوری نہ کرتا۔" اقبال کی آواز دھیمی اور ڈوبی ہوئی ہونے کے باوجود میں نے اس کا ایک، ایک لفظ سنا کہ اس وقت میرا پورا وجود ہی کان بنا ہوا تھا۔
"تم نے اپنے ساتھ مجھ پر... بھی بڑا ظلم کیا اقبال۔ میں اس وقت کتنے بڑے امتحان سے دوچار ہوں تمہیں کیسے بتاؤں ایک بیوی اور جمال کے ہونے والے بچے کی ماں کی حیثیت سے میں ان کی وفادار ہوں لیکن میرے دل کا ایک گوشہ تمہارے لیے بھی تڑپتا ہے۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھ پر جو گزر رہی ہے میں ہی جانتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ عالمِ دیوانگی میں بال کھولے اپنے کپڑے نوچ کر ننگے پاؤں سڑکوں پر بھاگتی پھروں لیکن حیا

اور وفا کی زنجیریں مجھے باندھے ہوئے ہیں۔ شعلوں میں لپٹے ہونے کے باوجود میں ایک چیخ تک نہیں مار سکتی کہ میرے اور تمہارے خاندانوں کی عزت داؤ پر لگ جائے گی۔" بولتے ہوئے وہ تسلسل سے رو رہی تھی جبکہ میں باہر کھڑا آندھیوں کی زد میں تھا۔
"مجھے تمہاری قوتِ ضبط کا اندازہ نہ ہوتا تو تمہیں اس امتحان میں ڈالتا ہی کیوں؟ مجھے معلوم ہے کہ میری خواہش اور محبت کا بھرم رکھتے ہوئے تم اس کڑے امتحان سے گزر جاؤ گی۔ میں تمہارے ظرف کا قائل ہوں نوین اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرا خود پر سے یقین نہیں توڑو گی۔ تم ہمیشہ جمال کو خوش رکھو گی اور بالکل ویسے ہی اُسے چاہو گی جیسے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ یقین کرو کہ اگر مجھے بھی تمہارے جیسا ظرف عطا کیا جاتا تو میں بھی خود کو اس حال تک نہ پہنچاتا لیکن کیا کروں مجھ سے تمہاری جدائی کا روگ سہا ہی نہیں گیا اور اس درد کو مٹانے کی جدوجہد کرتے، کرتے میں خود کو ہی مٹاتا چلا گیا۔ تم میری اس کم ظرفی کے لیے مجھے معاف کر دینا نوین۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اس دنیا سے جاتے، جاتے تمہارے لیے بہت بوجھ چھوڑے جا رہا ہوں لیکن میرا یہ مان اپنی جگہ ہے کہ تم میرے بعد بھی مجھ سے کیا وعدہ نبھاؤ گی اور میرے بھائی اور گھر والوں کو وہ محبت دو گی جس کی میں نے تم سے خواہش کی تھی۔" نوین کے ساتھ ساتھ اب وہ خود بھی رو رہا تھا۔ آنسو تو میری آنکھوں میں بھی تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوئے بغیر خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور اسپتال کے لان میں جا بیٹھا۔ یہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر آنسو بہاتے پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی اور مجھے یاد آتا رہا کہ اقبال نے کہاں، کہاں میرے لیے کون، کون سی قربانی دی تھی لیکن اتنی بڑی قربانی...... اتنی بڑی قربانی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جبکہ وہ نوین سے اتنی شدید محبت کرتا تھا کہ اس کے پاس اس کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں تھا۔
"میں اقبال کو اپنا گردہ ڈونیٹ کروں گا۔" بہت دیر رونے کے بعد میں بینچ سے اٹھا تو فیصلہ کر چکا تھا۔ اپنی جان کی قیمت پر بھی اپنے اتنے چاہنے والے بھائی کو بچانے کا عزم دل میں لیے میں اس کے کمرے تک پہنچا تو سب ختم ہو چکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ مجھ سے آگے رہا تھا اب بھی فیصلہ کرنے میں سبقت لے جا چکا تھا۔ کسی مرنے والے کا اتنا مطمئن چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس چہرے کے ساتھ ہی ایک اور چہرہ بھی میری نظروں کے سامنے تھا۔ شدتِ ضبط سے تڑختا لیکن سارے بھید چھپا کر رکھنے والا چہرہ۔ یہ چہرہ میری محبوب بیوی کا تھا۔ اس عورت نے بڑے عجیب انداز میں رسمِ وفا نبھائی تھی۔ اقبال کو چاہا تھا تو اس کی خواہش پر اپنا آپ مٹا ڈالا تھا اور میری بیوی بنی تھی تو ایک پل کے لیے بھی مجھ سے بے وفائی نہیں کی تھی۔ اس کے اندر ہی اندر بکھرتے وجود کا احساس کر کے میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ اس سے کہیں بڑھ کر چاہے جانے کے لائق تھی۔ جتنا اب تک میں اسے چاہتا رہا تھا۔ ماضی میں وہ اقبال سے محبت کرتی رہی تھی اس انکشاف پر بھی میرے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ شاید یہ بات میری لیے کوئی انکشاف ہی نہیں تھی۔ میرے اندر کہیں یہ احساس موجود تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن اپنی خود غرض محبت نے مجھے کبوتر کی طرح آنکھیں موند لینے پر مجبور کر دیا لیکن آج ان دونوں نے انجانے میں مجھے جو درسِ محبت پڑھایا تھا وہ مجھے ساری زندگی یاد رہنا تھا۔ اس درس کو لینے کے بعد میرے ظرف میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے یقین تھا کہ آنے والے وقت میں نوین سے دُگنی محبت کر رہا ہوں گا کیونکہ اقبال کے حصے کی محبت بھی مجھے ہی کرنا تھی۔





رنگِ خلش

رفاقت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے بھی خلش کی نذر ہوجاتے ہیں اور ہم جوں، جوں اس احساس کو من کے اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے... گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس کے باوجود امیدِ شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت و ریاضت بھی ہے، نشاطِ وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو

حسنات علی رضا فری پیریڈ میں اپنے آفس میں بیٹھے سوچ رہے تھے کیونکہ آج اماں جان نے آخری وارننگ جو دے ڈالی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی ہونے والی شریکِ حیات کے متعلق فیصلہ سنا دے تو اس میں انہی کی بہتری ہے۔ ورنہ وہ خود گھر سے نکل پڑیں گی یہ بینر اٹھائے کہ ڈاکٹر حسنات علی رضا کے لیے ایک عدد رشتے کی تلاش ہے۔ حاجت مند کی عمر ہے چالیس کے پیٹھے میں مگر بتاؤں گی میں پینتیس سال۔'' وہ ماں کی کہی ہوئی بات پر مسکرائے کہ یہ مائیں کتنی معصوم ہوتی ہیں۔'' ہاں تو اور کیا آخر کو میرے اس ہائی کوالیفائیڈ خوبرو جوان کا تعلق کھاتے پیتے ویل ایجوکیٹڈ گھرانے سے جو ہے۔'' الیف 6 میں مقیم یہ خاندان خالص پنڈی وال تھا۔ جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اسلام آباد شہر بنانے کا ارادہ کیا تو اسی امیدوار کے پر دادا نے جی 6 اور الیف 6 میں کوڑیوں کے عوض اپنے تمام بیٹوں کے لیے پلاٹس خرید کر نہایت دانش مندی اور دور اندیشی کا ایسا ثبوت دیا کہ اگلی نسل کے وارے نیارے ہو گئے۔ اور یہ صاحبزادے بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھے۔ موصوف شادی تو ماں کی خوشی کی خاطر کرنا چاہ ہی رہے تھے مگر ابھی تک نظرِ انتخاب کسی پر ٹھہری نہیں تھی۔

''حسنات علی رضا اب تمہارا چھٹکارا نہیں۔ ہوش میں آجاؤ اور اپنی پسند کی لڑکی اپنے آس پاس ہی ڈھونڈ لو۔ ایمر جنسی ڈیکلئر ہو چکی ہے، عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اماں بھی خفا ہی سدھار جائیں گی اور مستقبل بھی تابناک نہیں رہے گا۔'' اپنے دل کی آواز پر وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرائے۔ ''ماں جی سے کچھ بعید نہیں۔ مجھے کان سے پکڑ کر کہیں کہ بولو اب جو بھی اور جیسی بھی ہے کی بنیاد پر قبول کر لو۔ میں تو مارا ہی جاؤں گا کیونکہ ماں کو انکار تو کر نہیں سکتا۔ اپنی ضد منوانے اور جنت گنوانے کا سودا مجھے منظور نہیں۔'' چہرے پر ہلکی سی تمسخرانہ مسکان پھیلی ہوئی تھی۔ اسی اثنا آفس بوائے کافی کی پیالی ٹیبل پر رکھ کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ جب سے انہوں نے اس یونیورسٹی کو جوائن کیا تھا۔ چہرے پر کبھی مسکراہٹ تو کیا اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت کتابوں اور کمپیوٹر میں ہی گم پایا تھا۔ ان کا خمیر ہی رعب و دبدبے سے جو اٹھایا گیا تھا۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔

''آج ضرور کوئی خاص بات ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ حسنات نے کافی کی پیالی اٹھائی اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر لان میں بینچوں اور گھاس پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کافی کا سپ لیا۔ سائرہ بانو انہی کی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ چند کولیگز کے ساتھ گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی اسکریبل کھیل رہی تھی۔ باتونی ہونے کی وجہ سے اب بھی اس کی زبان چل رہی تھی۔

''چراغ تلے اندھیرا......'' وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑائے اور وہیں کھڑے کافی پینے لگے۔ آج کافی کی کڑواہٹ میں شہد کی گھلاوٹ تھی اور دل و دماغ مسرت و انبساط میں جھوم اٹھا تھا۔

''اب اماں جان کو خوشخبری سنا کر قدرے دھیما کرنے میں کامیاب ہونے کے امکان روشن ہو چکے ہیں لیکن اماں اور خاندان بھر کو یہ سن کر حیرت ضرور ہو گی کہ جس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا...... اب اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ اپنی پسند کہاں سے اور کیسے ڈھونڈ لی؟ کون یقین کرے گا، سب مذاق سمجھ کر ٹال دیں گے۔'' وہ سوچتے ہوئے واپس آ کر اپنی چیئر پر بیٹھ کر ٹیک لگائے سائرہ بانو کے بارے میں سوچنے لگے۔ ''میرا فیصلہ جلد بازی میں غلط تو نہیں۔'' اب چہرے پر فکر مندی کے آثار ہویدا تھے۔ وہ پھر اٹھے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر سائرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی دیگر اسٹوڈنٹس حمیرا اور آمنہ کا جائزہ لینے لگے۔ تھوڑے توقف کے بعد قلب و ذہن نے سائرہ بانو کے لیے پسندیدگی کا الارم دے دیا تو پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر

آئے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور ہاتھوں میں لرزش آ گئی۔

''مائی گاڈ، سوڈیفیکلٹ...... جناب والا ذرا اور گہرائی میں سوچ لو، کہیں عمر بھر کے لیے قیدی بن کر اپنی اس آزادی کو کھو نہ دینا۔ آزادی اس اسیری سے ہزار ہا درجے بہتر ہے۔ چاہے اس میں تنہائی ہی کیوں نہ ہو! اس کا اپنا ہی ایک حسین روپ ہے۔'' وہ واپس کرسی پر بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سائرہ بانو کے بارے میں سوچنے لگے۔ اگلے دن پھر وہ دیر تک کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے اور سوچتے رہے۔ جونہی فیصلہ کرتے اگلے لمحے بدک جاتے۔ وجہ عمر میں تفاوت تو ہرگز نہیں تھی بلکہ اپنی آزادی پر کمپرومائز کرنا گوارا نہیں تھا۔

آج پھر عالمِ تذبذب میں گلاس ونڈو کا بلائنڈ سرکا کر باہر فکر مندانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ یونیورسٹی کے لان میں گھاس پر لڑکیوں اور لڑکوں کا وہی گروپ.. اسکریبل کھیلنے میں مصروف تھا۔ ہر لفظ کے بعد فضا میں ان کی نعرے بازی سے جلترنگ بکھر جاتا تھا۔ اور پھر اگلا ورڈ بنانے کی کاوش میں خاموشی چھا جاتی۔ گیم کے آخر میں حسبِ معمول سائرہ بانو نے اپنی جیت کا اعلان کیا۔

''آئی ایم دی ونر...... سائرہ یو آر ٹو مچ...... تمہارا تو جواب نہیں۔'' اس نے اپنے آپ کو سراہتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اوکے گائز اٹس ٹائم ٹو لیو فار کلاس۔'' وہ اپنی رسٹ واچ... پر نظر ڈالتے ہی کھڑی ہو گئی۔ اور وہ سب بھی سرعت سے کلاس روم کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے آفس کے پاس سے گزرتے ہوئے سائرہ نے محسوس کیا کہ سر حسنات کھڑکی میں خاموشی سے کھڑے ان کی تمام ایکٹو ٹیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ سرتاپا ان کے رعب اور جلال کے خوف سے لرز گئی...... اور قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ سخت مزاج، کم گو اور نک چڑھے مشہور ہونے کی وجہ سے سب کے لیے کسی اذیت ناک امتحان سے کم نہیں تھے۔ بزنس مینجمنٹ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری NYU سے حاصل کرنے کے بعد انگلش لٹریچر میں بھی واشنگٹن یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی...... پھر غالب، دانش، فیض، اقبال اور اردو کے مایہ ناز ادبا اور شعرا نے ایسا متاثر کیا کہ اردو لٹریچر میں بھی ڈگری لے بیٹھے۔

انہیں پانچ زبانوں پر ایسا عبور حاصل تھا جیسے پیدائشی اور رہائشی ہی وہاں کے ہوں۔ حُب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنی قوم کے بچوں کو تعلیم دینے کی غرض اور جدید طریقوں سے روشناس کرانے کی چاہ میں پاکستان آ کر مقامی یونیورسٹی جوائن کر لی۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے چند ماہ میں اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ اس ماحول کے ٹیم ورک میں ان کی شنوائی ہونے والی نہیں۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہونے کے باوجود۔ انہیں وائس چانسلر نے انقلابی ہونے کا خطاب دے کر ایک سائڈ پر کر ڈالا تھا۔ اس لیے وہ اس یونیورسٹی کی پالیسی بدلنے میں تو ناکام رہے لیکن انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اپنے اسٹوڈنٹس کی طرف مبذول کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے رزلٹ خاصے تسلی بخش ہو چکے تھے۔ چونکہ سائرہ بانو ذہانت و فطانت کے لحاظ سے ان کی ٹکر کی تھی۔ ان سے کسی بھی موضوع پر ڈسکشن کرتے ہوئے خوف زدہ نہ ہوتی۔ جبھی وہ ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹ بن چکی تھی۔ اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک ان گنت ٹرافیز، سرٹیفکیس اور شیلڈز نے نہ صرف سائرہ بانو کی عزت و تکریم میں اضافہ کیا تھا بلکہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کی بھی اچھی خاصی عزت افزائی ہوئی تھی۔

اپنی بے لوث محنت سے اپنا لوہا منوانے کے بعد حسنات علی نے اس یونیورسٹی میں اپنا مقام اپنی پسند کے مطابق حاصل کر لیا تھا۔

جب ماں نے انہیں شادی کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا تو ان کے قیمتی لمحات سوچ و بچار میں گزرنے





لگے۔ اور آخر کار انہوں نے سیکڑوں لڑکیوں میں سے اپنے لیے اپنی پسند کا ہم سفر چن لیا۔ جو انہیں اپنے ہی calibre اور اپنے ہی آئی کیو لیول کا لگا۔ عمر کا فرق اور جوانِ دوشیزہ۔۔۔ کی سوچ کو بالکل نظر انداز کر کے فیصلہ کرلیا۔ وہ عیاش تھے نہ ہی عورت ان کے ذہن پر سوار رہتی تھی۔ انہیں کتابوں سے لگاؤ تھا۔ وہی ان کے اکیلے پن کی ساتھی تھیں۔ وہ ہر مشورہ انہی سے لیتے اور ہر فیصلہ کرنے سے پہلے انہی کا سہارا لیا کرتے تھے۔ محفلوں میں صرف وقت گزاری، رشتے داروں کو خواہ مخواہ خوش کرنے کی کوشش اور دوست احباب کے ساتھ دنیاداری کے اصولوں پر گامزن رہنے کو وہ وقت کا زیاں سمجھتے تھے۔ انہیں شادی نے کبھی فیسی نیٹ نہیں کیا تھا۔ اپنی تعلیم سے فراغت ملتی تو شاید کسی میں دلچسپی بھی ہو جاتی مگر ایک کے بعد دوسری ڈگریوں کے حصول نے انہیں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ اپنی ہی ذات کے ہالے میں مقید تھے۔ واحد...... ایک ہی ہستی انہیں گھر بسانے کے فریضے سے آگاہ ضرور کیا کرتی تھی اور وہ عمر رسیدہ ماں تھی۔ جسے وہ ناخوش دیکھنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے مگر قابو آنے سے بھی گریز کرتے رہتے مگر اب ماں کی سنجیدگی اور فکر مندی نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس معاملے میں فطرتاً سہل پسند تو تھے ہی...... اِدھر اُدھر مارے پھرنے اور ڈھونڈنے کی کلفتوں سے کیونکر گزرتے...... ماں کا مشورہ دل کو ایسا بھایا کہ ساتھی کے چناؤ میں دیر ہی نہ لگائی اور ہر وہ خوبی جو اُن کے جیون ساتھی میں ہونی چاہیے۔ وہ سائرہ بانو میں پائی گئی۔

جہاں پسندیدگی نے سر ابھارا تھا۔ وہاں مخالف جنس سے لگاؤ اور چاہ کی چنگاری نے بھی اعلانیہ طور پر انہیں باخبر کر دیا...... کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ...... بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی...... وہ اچنبھے میں سوچنے لگے کہ یہ سب کیسے اور کب ہوا...... وہ تو سائرہ بانو کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے تھے، فیصلہ کرنے سے حصول کی تمنا سر پر کیسے سوار ہو گئی۔ ان کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں ہوا تھا۔ دراصل جس خوبی کو وہ ہمیشہ اولیت دیا کرتے تھے وہ انہیں مخالف جنس میں شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی اس لیے دل میں خواہش کبھی ابھری ہی نہیں تھی ورنہ جوان تھے، مغربی تہذیب کا کچھ تو اثر ہوتا...... اور پی ایچ ڈی کے دورانیے میں ہی شادی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

خاموش دل کو اِک جھٹکا سا لگا تھا۔ جب ذہن نے جھنڈی لہرا دی تو پھر نہ وہ متزلزل تھے نہ ہی ان کی سوچوں میں انتشار تھا۔ دل کی گہرائیوں اور روح تک میں طمانیت اور سکون ہی سکون تھا۔ یہ معجزاتی عمل انہیں پھر حیران و پریشان کر گیا تھا۔ اپنی سائڈ کلیئر تھی اب انہیں جو بھی فکر اور پریشانی لاحق تھی جس کا تعلق سائرہ سے تھا کہ وہ اس کے اس پروپوزل کو قبول کرتی بھی ہے یا نہیں...... آخر اس کو بھی تو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ ان خیالات نے انہیں کئی راتیں جگائے رکھا اور آخر ان کی عقل و سمجھ کے مابین انہوں نے اپنی پسند کو پرکھنے کا ارادہ کر لیا۔ امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا وہ تفتیش و تشویش کے رستوں کی کھوج میں مصروف ہو گئے۔

انہیں فطری طور پر سائرہ بانو تک اپنا پیغام پہنچانا اور اس کی رائے معلوم کرنا بہت محال لگ رہا تھا۔ اماں جان بھی اٹھتے بیٹھتے ایک ہی راگ الاپ رہی تھیں اور حسنات، سائرہ تک رسائی اپنی فطرت کی وجہ سے حاصل نہ کر پائے تھے۔ آخر ماں کو یہ مژدۂ راحت سنانے میں عافیت جانی...... ماں نے مارے خوشی کے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس سائرہ بانو کے رشتے کے لیے چل پڑیں۔

سائرہ جو پروفیسر حسنات کے ارادوں سے بے خبر تھی۔ اب ان کی والدہ کے آنے کی غرض و غایت جان کر حیرت زدہ تھی۔ وہ اس سے تقریباً سترہ سال عمر میں بڑے تھے۔ ایک ہمدرد اور قابلِ احترام استاد کی طرح اس

کی راہنمائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے وہ اور کچھ نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی مزاجاً بھی زمین... آسمان کا فرق تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آسمان پر ان کا جوڑا بنا ڈالا تھا۔ اب وہ یونیورسٹی سے بھی فارغ ہوگئی تھی۔ والدین کا آگے پڑھانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے آنکھوں پر ایمان کی پٹی باندھ کر فیصلہ کرنا آسان ہوگیا۔ اپنے رب کے فیصلے پر راضی بہ رضا ہو کر سب نے خوشی، خوشی اس رشتے کو آئیڈیل سمجھ کر دعائے خیر پڑھی اور ایک مہینے کے بعد سائرہ بانو نے حسنات علی کی خاموش، تنہا اور ہر جذبے سے عاری زندگی میں ہلچل مچادی۔ شروع کے چند دن بچے کے شوق کے مانند گزر گئے جو نیا کھلونا پا کر وقتی طور پر بے پناہ خوش ہوتا ہے کہ یک دم حسنات کو محسوس ہوا کہ ان کی ذاتی زندگی کے ہر لمحے پر سائرہ قابض ہو چکی ہے ان کی آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی... پابندیوں کی زد میں جا چھپی ہے۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی انہوں نے یونیورسٹی جانا شروع کردیا تھا۔ سائرہ کا اس وقت مزید کچھ بھی پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ فی الحال وہ اپنی زندگی کو پڑھائی سے نہیں بلکہ فراغت سے انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے ہنی مون کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' سائرہ ان کی اسٹڈی میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کچھ جھجکتے ہوئی بولی مگر انہوں نے کمپیوٹر سے نظریں ہی نہ اٹھائیں۔

''حسنات میں آپ سے بات کر رہی ہوں، شادی ہوئے دو ہفتے ہو گئے ہیں، آپ نے تمام چھٹیاں اسی اسٹڈی کی نذر کردیں۔ کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی پروگرام نہیں؟'' وہ پھر متذبذب لہجے میں بولی۔ ''کیا چند دنوں میں ہی شادی کا نشہ اتر گیا ہے حسنات... یہ نشہ ابدی نہ ہو تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رشتہ ہی انسیت و لگاؤ کا ہے نہ کہ غیریت کا۔''

''ہاں یہ تو ہے مگر اب ہمیں واپس اپنی روٹین پر آجانا چاہیے۔ یار محبت کے سوا اور بھی تو بہت سے جھمیلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ انہیں بھی تو ساتھ لے کر چلنا ہے۔'' وہ کمپیوٹر سے نظریں ہٹائے بغیر بڑی رکھائی سے بولے تو سائرہ ایک دم سے ہراساں و پریشان انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا شادی اسے کہتے ہیں...... بورا اینڈ سو بورڈ۔'' وہ بڑبڑائی۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کہا، تمہاری ادھوری تعلیم تمہاری توجہ کی منتظر ہے، شادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تعلیم کو مکمل کیے بغیر ہی خیر باد کہہ دو۔ شادی دو باہوش انسانوں کے مل جل کر رہنے کا نام ہے، بہت عام اور نازک سا رشتہ ہے یہ...... اگر ایسا نہ ہوتا تو پل بھر میں ٹوٹ نہ جاتا۔ اس لیے بہتر ہے.. ہم دونوں کے لیے کہ شخصی آزادی.. برقرار رہے۔ اس میں گلیمر اور انجوائے منٹ اپنی، اپنی آزادی میں ہی ہے۔'' وہ نرم لہجے میں بولے۔

''دیکھو میں تمہاری زندگی کو پابند نہیں کروں گا۔ تم میرے کام اور مشغلوں میں دخل اندازی نہیں کروگی۔''

سائرہ خفیف سی ہو کر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی اور وہ سنجیدگی سے ڈاکومنٹری کی طرف متوجہ ہو گئے...... سائرہ کے جذبات کی پروا کیے بغیر ان کے چہرے پر بے انتہا سکون تھا جیسے ان کی باتوں میں بھرپور چاشنی ہو.... سائرہ کے اعصاب مشتعل سے ہو کر رہ گئے۔

''حسنات کمپیوٹر آف کر کے میری بات پر توجہ تو دیں۔ کل ہی آپ کی بڑی بھابی بتا رہی تھیں کہ وہ شادی کے چوتھے دن ورلڈ ٹور پر نکل گئے تھے۔'' وہ اب تھوڑا رقت آمیزی سے بولی تھی۔

''اچھا تو یہ بتاؤ کہ منجھلی بھابی نے کیا رپورٹ دی اور چھوٹی بھابی اور میری بہنوں نے کیا پٹی پڑھائی ہے؟

یہ سب کی سب بہت جاہل خواتین ہیں جنہوں نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا ہے، تم نے بھی ان کی شراکت اختیار کرلی تو مجھے تمہاری ذہانت پر شک ہونے لگے گا اور اپنے فیصلے پر پچھتاوا۔'' حسنات کے سخت الفاظ سن کر اسے ایسے لگا جیسے اس کی زبان میں تاب و طاقت ہی نہیں رہی ہو...... آنکھیں ندامت کے مارے جھک گئیں اور وہ ہونٹوں کو دانتوں سے دبانے لگی۔ اس کے اندر ایک توڑ پھوڑ جاری تھی۔ کافی دیر خاموشی طاری رہی۔ وہ رعونت سے بھرپور اگلی جھاڑ کا انتظار کرنے لگی جبکہ چہرے کا رنگ تو متغیر ہو چکا تھا۔

حسنات کی بارعب آواز نے ارتکاز کا لمحہ توڑا۔ تو ایک دم سے سوچتے ہوئے چونک کر اچھلی اور ذہن ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت خوب صورت ذہن بخشا ہے، ان فضولیات میں اسے باؤنڈ نہ کرلینا۔ اسے کھلا اور آزاد رکھو تاکہ زندگی کے تمام حسن کا سلسلہ قائم و دائم رہے...... اگر تمہاری ایسی بچگانہ سوچ رہی تو پھر تو سلسلہ منقطع ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ ہماری لڑکیوں کا مسئلہ ہی یہی ہے کہ رٹو طوطا بن کر ڈگریاں حاصل کرلیں...... استعمال کا سلیقہ تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔''

''سیر و سیاحت بھی تو ذہن کو وسیع کرتی ہے، مجھے پیرس دیکھنے کا بہت شوق ہے، وہاں کا پروگرام بنائیں ناں ایک تیر سے دو شکار سیاحت بھی اور معلومات بھی۔ آپ نے تو پڑھا ہی ہوگا کہ وہاں کی ہسٹری اور آرٹ کا تو جواب نہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں جیسے خواہش کا اظہار بھی کیا اور خوشامدانہ احتجاج بھی کر ڈالا۔

''نیزہ بازی کی کوئی ضرورت نہیں، کیا وقت ضائع کرنے کے مشورے دے رہی ہو، پیرس کیا کوئی بھی جگہ دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، بک ریڈنگ سے انفارمیشن لو، کمپیوٹر کس لیے ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ گھر بیٹھے بیٹھے۔ اور سیر و تفریح کی سائیٹ میں بھی جاؤ۔ بہت کچھ موجود ہے۔'' وہ خوش مزاجی سے بولنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ بات سن کر اس کا جی چاہا سر پیٹ لے اور بال نوچ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

''وہ تو آپ نے درست فرمایا ہے بہانہ تو ہنی مون منانے کا ہے، اس کے پسِ پردہ بہت کچھ ہے، ایک دوسرے کے مزاج سے آگاہی اور بہت کچھ......'' وہ بھی قدرے شگفتہ لہجے میں بولی۔ حالانکہ دل لرز رہا تھا۔

''یعنی بدقسمتی سے مڈل کلاس کے لوگوں کا بھی شعور مغربی سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے، باقی مانوسیت تو سراسر دردِ سر ہے۔ تم کن اذیتوں کا سودا کرنے چل پڑی ہو۔'' وہ طنزیہ مسکرا کر بولے تو وہ جھینپ گئی۔ ان کے بے رحمانہ رویّے پر صابر رہنے پر اکتفا کا سوچ کر اس کی لائٹ براؤن حسین آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اسے لگا جیسے اس نے سر پتھر سے ٹکرا کر شدید زخمی کرلیا ہے۔ آخر اس نے اس نرالے اور انوکھے خیالات رکھنے والے انسان کے سامنے خاموشی ہی میں عافیت جانی...... جو انسان بیوی سے غیریت سے بھرپور زندگی رکھنے کا خواہشمند ہے اس کا اللہ ہی مالک ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اسٹڈی کی ہزاروں کتابوں پر جارحانہ نظر... ڈالتی ہوئی وہاں سے ملحقہ اپنے بیڈروم میں جاکر بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔

''مجھے آج حسنات کا انکار کرنا اتنا ناگوار کیوں گزرا ہے، وہ تو پہلے دن سے ہی رومانس سے عاری انسان ہیں''۔ عمروں کا فرق سوچ و خیالات پر بری طرح حاوی ہوگیا تھا۔'' حالانکہ حسنات نے شادی سے پہلے کون سا مجھے خوشیوں بھرے سبز باغ دکھائے تھے نہ ہی محبت و چاہت سے مغلوب ہوکر وعدے وعید کیے...... نہ ہی آسمان سے تارے توڑ کر مانگ بھرنے کی بات کی...... پھر میرا دل اس درجہ شکستگی، افسردگی اور مایوسی میں کیوں گرفتار ہوگیا۔ میں ہی نکاح کے دو بول پڑھ کر ان پر فریفتہ ہوگئی۔ طوعاً و کرہاً جس کا جواب انہیں دینا پڑا تھا۔'' وہ

یہ سوچ کر اپنے آنسوؤں پر قابو پانے لگی'' اگر یہ مزاج تھا ایسے ارادے تھے، ایسی ظالمانہ سوچ تھی، ایسا یخ بستہ رویّہ روا رکھنا تھا تو بھلا شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ میرا سائبان جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔ کیسا مضبوط اور پختہ تھا۔ آپ نے میرے اس اٹوٹ سہارے کی بنیادیں ہلا دیں۔ اب مجھے وہاں کون خوشی سے واپس ویلکم کہنے کے لیے تیار ہوگا۔ اب کوئی نہیں پہچانے گا اور نہ ہی ہمدردی کے دو بول سے مجھے طمانیت بخشے گا۔ بس اب یہی میرا ٹھکانا ہے، جہاں دلہن بن کر آئی تھی یہاں سے کفن کی پردہ داری میں لحد میں اتاری جاؤں گی۔'' وہ خود کلامی کرتی رہی۔ آنسو تکیہ بھگونے میں پیش، پیش تھے۔ حسنات نے کمرے میں جھانکنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کمرے میں شام اتر آئی تھی جو آہستہ، آہستہ سرمئی ہوتی تاریکی کا روپ دھارتی چلی گئی اور وہ اسی کیفیت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی قسمت کی لکھت کو بدلنے کا سوچتی چلی گئی مگر کوئی راہ بجھائی نہ دی تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے لگی ابھی نئی نئی بات ہے، نیا نیا تعلق جڑا ہے نہ ہی انڈر اسٹینڈنگ ہے، اتنی ٹینشن لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں ہی طبعاً بہت جذباتی ہوں، حسنات دھیمے مزاج کے انسان ہیں، امید ہے وقت کے ساتھ میرے رنگ میں ضرور ڈھل جائیں گے۔ امی کا تو یہی کہنا تھا۔''

☆☆☆

''بیٹا! کچھ یاد ہے کہ بھول گئے، میں ایک ہفتے سے یاد دہانی کرا رہی ہوں کہ سائرہ کی سالگرہ ہے، منانی بہت ضروری ہے، وہ کیا سوچے گی کہ کس قدر بے حس اور روکھا خاوند ہے کہ اس کی خوشی کی رتی بھر پروا نہیں۔ نہ ہی تم ہنی مون کے لیے تیار ہوئے۔ نہ آج تک اسے باہر ڈنر پر لے گئے۔ تمہاری روٹین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی چھڑوں والی آزادانہ حرکتیں اور باتیں۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ وقت نکالو۔ مجھے ڈر ہے، سائرہ کہیں تمہیں چھوڑ کر میکے ہی نہ چلی جائے۔ پہلے ہی سب تمہاری شادی کی مخالفت کر رہے تھے اب مجھے طعنے و تشنے مت سنوانا۔'' ماں نے اسٹڈی میں داخل ہوتے ہی اپنی فکرمندی کا اظہار کیا وہ حیرت سے انہیں دیکھ کر بولے۔

''بڑی عجیب دھمکی دی ہے آپ نے...... سائرہ بانو پاگل یا بے وقوف نہیں۔ بھلا وہ میکے کیوں جائے گی اماں جان، میں نے اسے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے، گھومے پھرے، جہاں جانا چاہتی ہے بصد شوق جائے، ڈرائیور ہر وقت موجود ہوتا ہے، سیاہ و سفید کی مالک ہے وہ۔ اپنی بیٹیوں کی زندگی ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے اُن متلون مزاج شوہروں کی خوشامدیں اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں جبکہ انہیں اس گھر تک آنے کی اجازت نہیں تو سوچیں کہ کسی اور جگہ سائرہ کی طرح منہ اٹھائے جاسکتی ہیں؟ وہ سائرہ کی زندگی پر رشک کرتی ہیں، سو فیصد محتاج ہیں اپنے شوہروں کی جبکہ سائرہ خود مختار ہے ہر لحاظ سے۔ میں نے بینک کا تمام حساب کتاب لین دین اسی کے سپرد کردیا ہے۔ نہ میری طرف سے اعتراض ہے نہ ہی کوئی حساب کتاب... اب آپ بتائیں کہ اسے اور کیا چاہیے۔ جس عورت کے پاس آزادی اور پیسہ ہو، اسے تو مرتے دم تک اپنے شوہر کا احسان مند ہونا چاہیے۔ نا کہ ہر وقت خفگی اور بیزاری کا اظہار کرتے رہنا۔ میں بھی جانتا ہوں بہت اچھی طرح کہ اس معاشرے کا مرد اِن دو قوتوں کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہی اس کی طاقت ہے، بیوی کو قابو میں رکھنے کی اور اپنی دل جوئی کرانے کی۔ میری تو ایسا کرنے کی نیت ہے نہ ہی میری اس سے کوئی ڈیمانڈ ہے۔ اماں میں نے اس پر ایسا ستم تو نہیں کیا مجھے اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ میری طرف سے کوئی کمی نہ ہو۔ آخر کو میں بھی تو جوابدہ ہوں۔'' وہ کتاب ایک طرف رکھ کر طولانی تمہید سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ماں

اِک عورت ہونے کے ناتے بے چین اور پریشان نظر آرہی تھیں۔ سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

''بیٹا ان دو طاقتوں کے ساتھ اپنے ہم سفر کی توجہ و پیار بھی تو چاہیے ہوتا ہے ناں...... جس کے سائے میں جھونپڑی بھی محل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور بھوک و پیاس میں من و سلویٰ کا سا احساس تسکین بخشنے لگتا ہے۔ تمہاری حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں۔ خدا کے لیے خود کو بدلنے کی کوشش کرو۔ تم تو میرے بہت تابعدار بچے ہو۔ میری بات پر غور ضرور کرو گے۔''

''اماں جان! امید ہے کہ اب آپ کو میرے شادی سے انکار کی وجہ سمجھ آگئی ہوگی۔ میں ہر بار آپ کو اپنی تمام مجبوریاں بیان کر کے منا لیتا تھا مگر اگلے روز پھر وہی رونا دھونا۔ اماں میرے پاس چاؤ چونچلے کرنے کا وقت ہی کہاں ہے؟ صبح آٹھ بجے یونیورسٹی جاتا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے واپس آکر کچھ وقت تو میرا اپنا ہونا چاہیے ناں۔ پرائم ٹائم تو یونیورسٹی پر قربان کر آتا ہوں، ان چند گھنٹوں پر میرا بھی تو حق ہے ناں......'' وہ ماں کے بازو دباتے ہوئے بولے۔

''تم کتنے بجے سوتے ہو؟ تمہارا نہ کوئی آرام کا ٹائم ہے نہ ہی کھانے پینے کا۔ بیچاری میری بہوا کیلے ہی کھانا کھاتی ہے اور رات بھر تمہارے انتظار میں کروٹیں بدلتے ہی گزارتی ہوگی۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو دنیا میں تمہاری اس بے پروائی و بے اعتنائی کا ڈھنڈورا پیٹ چکی ہوتی۔ وہ تو بڑی ہی صابر و شاکر لڑکی نکلی، عقلمند ماں کی بیٹی ہے، ورنہ تم یاد ہی رکھتے تمام عمر کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔'' اماں جی اسٹک کے سہارے کھڑی ہوگئیں۔

''اچھا ہوتا اگر اپنی بیوی کو ڈنر کے لیے لے جاتے۔ موسم بھی بہت خوشگوار ہے اور موقع بھی ہے۔'' وہ آہ بھر کر مزید بولیں۔ ''کسی کی بیٹی لا کر میں نے بہت بڑی غلطی کر دی۔ سوچا تھا کہ تم بیوی کے آنے سے ان نامراد کتابوں کی جان چھوڑ دو گے۔ یہ کوئی زندگی ہے جو تم جی رہے ہو، دل دُکھ جاتا ہے میرا۔''

''میری پیاری اماں یہی تو اصل اور حقیقی زندگی ہے، گھر بیٹھے بٹھائے دنیا کی اور آسمان و ستاروں کی سیر کرو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''وہ مجھے جوائن کیوں نہیں کر لیتی۔''

''رہنے دو بابا گھر میں ایک پاگل کافی ہے۔'' وہ نخوت سے بولیں۔ ''تمہارے ابا کیا جاہل تھے جو انہوں نے خاندان کے ہر فرد کو وقت دیا۔ میرے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ یہی اسٹڈی جس میں تم بیٹھے ہو ان کی تھی۔ خوب آباد تھی۔ ہر آنے جانے والے کے لیے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا مگر اب کسی چیونٹی کی بھی جرأت نہیں اندر آنے کی گستاخی کر جائے۔'' یہ سن کر حسنات کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ کیونکہ انہیں خود پر اسی سلوک و رویّے کا زعم تھا کہ انہیں اسے کسی کی پروا ہے ضرورت ہے نہ ہی محتاجی ہے۔ ان کا اپنا وقت اور اپنی پسند کے مطابق گزرتی ہوئی زندگی قابلِ رشک ہے اور ان کے لیے قابلِ تسکین بھی۔ اماں جان ہولے ہولے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اسی اثنا میں سائرہ کے میکے والے کیک اور بے شمار تحائف کے ساتھ گھر میں وارد ہوئے تو ان کے اس طرح اچانک اور بے تکلف رویّے پر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئے کہ بہت ہی عجیب اور سر پھرے شو باز قسم کے لوگ ہیں کہ ان کے خیال میں ایسے تمام بے ہودہ فنکشنز تو بڑے لوگوں نے اپنے نصیب میں پیسہ صرف کرنے کے لیے خود پر مسلط کر رکھے ہیں۔ سائرہ مڈل کلاس کی لڑکی ہے، انہیں یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ ابھی اسی سوچ و بچار میں محو تھے کہ سائرہ چہکتی ہوئی اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ اس نے سفید شیفون کی کامدانی کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ گلے اور کانوں میں ڈائمنڈ کا زیور اور ہلکے میک اپ میں وہ

غضب ڈھا رہی تھی۔ حسنات نے اس پر حیرت سے بھرپور نگاہ ڈالی۔ اس سے پہلے کہ دونوں کی گفتگو شروع ہوتی اس کی بھابیوں اور کزنز نے دھاوا بھول دیا اور انہوں نے چھیڑ خانیاں کیں تو حسنات کی پیشانی پر ناگوار شکنیں ابھر آئیں۔ سب نے سنڈے برنچ کا پروگرام پی سی کا رکھا تو انہوں نے کئی حیلے بہانوں سے جان چھڑانے کی کوشش کی حالانکہ انہوں نے اپنے خاندان میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کو ایسی تمام ایکٹویٹیز میں... بھرپور حصہ لیتے دیکھا تھا۔ مگر وہ ہر وقت اپنی مصروفیت اور وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ان کے ہر پروگرام سے کنارہ کشی اختیار کر جاتے تھے۔ وہ زندگی کی ان دلچسپیوں اور چھوٹی موٹی خوشیوں کو بے ہودگیوں کا نام دیا کرتے تھے اس لیے زندگی کے ان ہنگاموں سے انہیں نہ تو لگاؤ تھا نہ ہی وہ کوئی سروکار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کو نہایت بنیادی، آسان اور سہل اصولوں پر گزارنے کے تمنائی تھے۔ سائرہ بانو انہیں تمام لڑکیوں سے مختلف لگی تھی۔ جسے انہوں نے کتابوں میں گم پایا تھا۔ گولڈ میڈلسٹ ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل تھا جو اس بات کی تصدیق تھی کہ وہ بھی اپنا وقت کسی بیکار کے مشاغل میں ضائع کرنے والی لڑکی نہیں بلکہ اس کی سوچ کا محور بھی کتابیں ہی ہیں وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا اسے منتخب کر بیٹھے تھے۔

سائرہ پر اگرچہ ان کی جانب سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی پھر بھی برتھ ڈے کا پروگرام شوہر کے بغیر اسے... ہرگز مناسب نہ لگا تو وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی۔ بہنوں اور سہیلیوں نے جی بھر کر چھیڑا اسے طیش دلایا۔ اس نے ان کے زور دینے پر حسنات سے ضد کی مصنوعی طور پر رونا دھونا بھی ڈالا۔ دوسروں کے سامنے احساسِ ندامت کا اظہار بھی کیا مگر سب حسنات کے لیے بچپنا اور اس کا لاابالی پن تھا۔ بھلا وہ اس کا حصہ کیونکر بنتے۔ اس وقت تو بات ٹل گئی تھی۔ اب نئی نویلی دلہن ہر شام ایک نئی پیشکش گوش گزار دیتی اور وہ تلملا کر رہ جاتے۔ آخر ایک رات اسے دو ٹوک لفظوں میں اپنا فیصلہ سنایا۔

میں تمہاری ان بے جا خواہشات کے ساتھ دو گام بھی نہیں چل سکتا۔ ایسی ڈیمانڈ جس میں وقت کا زیاں ہو وہ میں پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ بہتر ہے کہ خود کو مصروف رکھو اور اب پی ایچ ڈی کر کے ایک باعزت اور بامقصد زندگی گزارنے کا پروگرام بناؤ۔ ہماری اسی ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت میں زندگی بہت حسین اور پُرسکون طریقوں سے گزر جائے گی۔'' ان کی یہ باتیں سن کر وہ بڑی متحمل مزاجی سے گویا ہوئی۔

''میں اس مشورے کی تہ دل سے قدر کرتی ہوں مگر اس وقت مجھے طویل پڑھائی کے بعد آرام کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے ری لیکس ہونے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ پھر مجھے فیملی ریز کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ میری تمام سوچ کا محور نکاح کے بعد بدل چکا ہے۔ اب میرا رول اِک وفا شعار بیوی کا ہے، اس وقت میرا گھر، میرا شوہر، میری سسرال کا ہر رشتہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے بعد بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش میرے تمام فرائض میں سرفہرست ہوگی۔ مجھے بچوں سے والہانہ لگاؤ بھی حد درجے کا ہے۔ فیملی کمپلیٹ کرنے کے بعد اور... باقی بھی تمام گھریلو ذمے اور فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد تو وقت کا ہر لمحہ میرا اپنا ہوگا۔ اسے مصرف میں لانے کے لیے میں نے ایک ڈھانچا تشکیل دے رکھا ہے۔ یہ آپ کی ہیڈک نہیں...... آپ بے فکر رہیں، میں اپنی پڑھائی کیونکر ضائع کروں گی۔ مجھے خود بھی تو احساس ہے۔'' وہ رسانیت اور سنجیدگی سے کہہ کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ ''میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔ یہ ڈسکشن پھر کبھی سہی۔''

''بیگم کل کس نے دیکھی...... آج کی بات کل پر کیوں چھوڑیں؟ ویسے بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا...... کیسی جاہلانہ باتیں کرتی ہو، کم از کم مجھے تم سے ایسی احمقانہ منطق کی توقع تو ہرگز نہیں تھی۔''

وہ رکھائی سے بولے۔ ”تم تو میری بھابیوں اور بہنوں جیسی اِک عام عورت ہی نکلیں۔ کہاں گئی تمہاری تعلیم اور تمام ٹرافیز اور میڈلز.....؟ اگر تم نے بچے ہی پیدا کرنے تھے، ملازموں والے کام ہی کرنے تھے تو تعلیم پر اپنا اتنا وقت ضائع کیوں کیا۔ بارہ سال کی عمر میں شادی کرتیں اور تیرہ سال کی عمر میں ایک عدد بچہ پیدا کر چکی ہوتیں۔ مجھے افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“

”مجھے آپ کی کسی بات سے اتفاق نہیں۔“ وہ تلملا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میرے اندر کی عورت کو اعلیٰ ترین مقام پر کھڑے ہونے کی خواہش کو آپ رد نہیں کر سکتے۔“

”مجھے بھی تمہارے ان خیالات سے اتفاق نہیں۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ آئی تھنک سائرہ مجھے لگتا ہے کہ ہم ندی کے دو کنارے ہیں، ساتھ چلتے ہوئے بھی بہت دور...... ہم دونوں شاید ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔ تمہیں سمجھنے میں مجھ سے بھول ہوگئی۔“ وہ پژمردہ لہجے میں بولے۔ ”اور تمہیں مجھے جاننے میں غلط فہمی ہوگئی۔ مجھے پارٹنر چاہیے تھا۔ ویل ایجوکیٹڈ...... جو مجھ سے کتابوں کے بارے میں مختلف نظریات کے بارے میں ڈسکشن کر سکتا۔“

”چلیں اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”کیونکہ میں تو اِک عام بیوی ہوں، ڈیمانڈنگ...... خود کو بدل نہیں پاؤں گی، قدرتی امر ہے، حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ دونوں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا، کیا جائے؟“ اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ جیسے یہ بہت معمولی سی بات ہو۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بغور دیکھنے لگی۔ جن پر مہندی کی سرخی اور اس کی مہک وقت کی نذر ہو چکی تھی۔ آڑھی ترچھی لکیریں واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ آج اسے اپنی دادی کی باتوں میں کسی قدر سچائی نظر آنے لگی تھی۔ جو عموماً ہر پوتی، نواسی کی شادی پر ایک فقرہ بولنا نہیں بھولتی تھیں کہ شادی تو اِک جوا ہے، جس کی ہار اور جیت کا اندازہ اس میں شامل ہونے سے ہی ہوتا ہے۔ جو جیت گیا اس کے وارے نیارے جو ہار گیا وہ بدقسمت کہلایا۔

”سچ ہے کہ میں بھی جوئے کی نذر ہوگئی۔ میری تمام عمر داؤ پر لگ گئی۔ اور یہ دنیا میرے لیے دوزخ سے بھی بدتر آماجگاہ بن گئی۔ یہ ہیں میرے بخت۔“

☆☆☆

”حسنات آپ میری بات پر غور تو کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمیں جلد از جلد اپنی فیملی کمپلیٹ کر لیں چاہیے تاکہ میں وقت سے فارغ ہو کر اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کر سکوں۔ تعلیم میں طویل وقفہ آگیا تو مجھے دوبارہ جوائن کرنے میں بہت مشکل ہوگی۔“ وہ اسٹڈی میں ان کی آرام چیئر کے قریب صوفے پر بیٹھ کر اپنی ہمت کو یکجا کر کے آہستگی سے بولی۔

مگر حسنات کی طرف سے کوئی جواب آیا نہ ہی نظریں کتاب سے اٹھیں۔ سائرہ نے ان کی کتاب پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں نے آپ سے بہت ضروری بات کی ہے حسنات...... کتاب بند کیجیے اور میری اس خواہش پر غور کیجیے۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں، ہر عورت کا اِک حسین خواب ہے یہ۔“ وہ سنجیدگی اور .... سختی سے بولی۔ ”خدا کے لیے میرے خواب پر غور کیجیے۔ کیا ہوگیا ہے آپ کو میری کسی بات کی کوئی وقعت ہی نہیں۔“

”اُف جاہلوں والی حرکتیں ہیں تمہاری، تمہاری ایجوکیشن کاغذ کے چند ٹکڑوں تک ہی محدود ہے۔ جاؤ

انہیں جلا دو، میں مذاق یا طنزاً نہیں کہہ رہا، آئی ایم سیریس...... کیونکہ اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ وہ کتاب بند کر کے توہین آمیز لہجے میں بولے۔ تو وہ اپنی اس ہتک پر انہیں تڑپ کر دیکھنے لگی۔ ان کے چہرے پر نفرت و حقارت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔

”جب سے شادی ہوئی ہے میری زندگی ہی بدل گئی۔ نہ رات سونے سے پہلے کتاب پڑھ سکتا ہوں نہ ہی اپنی مرضی سے سو سکتا ہوں نہ جاگ سکتا ہوں، تمہاری پسند کے کپڑے پہنتا ہوں، تمہاری مرضی کے مطابق کھانا کھاتا ہوں، تم نے تو میری زندگی کے ہر لمحے کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ میری سانسیں بھی تمہاری اور میری روح بھی تمہاری۔ میرا تو کچھ نہیں رہا۔ تہی دست ہو گیا ہوں میں۔“ لہجہ زہر آلود تھا۔

”ایسا تو ہرگز نہیں جو آپ نے نقشہ کھینچا ہے۔ آپ تو بیچلر کی طرح بے مہار اور آزاد ہیں حسنات! آپ جیسے ذہین و فطین لوگ نارمل نہیں ہوتے۔ ان کا آئی کیو لیول اِک عام انسان سے بہت ہائی ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی میں کہیں نہ کہیں مار ضرور کھا جاتے ہیں۔ مجھے اب آپ کی مینٹل کنڈیشن کی سمجھ آگئی ہے، کاش حسنات آپ ایک لو آئی کیو لیول کے نارمل انسان ہوتے تو بہتر تھا۔ جسے زندگی کی قدر ہوتی۔ وقت کی اہمیت کا احساس ہوتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا حسنات۔“ وہ روہانسی ہوگئی۔ ”اپنے ذہن و قلب کو مطابقت و مفاہمت کا درس سکھائیں۔ آپ کے پاس علم کی کمی نہیں۔“

”بیگم خدا کے لیے اپنی زندگی میں مصروف رہنا سیکھو، اپنی زندگی کو ضائع مت کرو، تمہاری باتوں میں جذباتی پن کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس نے کتابوں کو اپنا دوست بنا لیا اس نے کوہِ ہمالیہ سر کر لیا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر سختی سے بولے۔ ”مجھے اپنا محتاج بنانے کی کوشش مت کرو۔“

”مجھے اولاد چاہیے حسنات...... میں اپنی زندگی کا مقصد پانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میری یہ خواہش جائز ہے کیونکہ عورت چاہے ان پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، ہر عورت ماں کے مقدس رشتے کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ قدرتی امر ہے، یہ تقدس اور عظمت مجھے سونپ دیجیے پلیز حسنات۔ میری التجا سن لیجیے۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

”مجھے بچے قطعاً پسند نہیں...... میں نے اپنے لیے اپنے جیسا ساتھی ڈھونڈا تھا۔ تم تو مجھ سے بالکل ہی الگ نکلیں۔ سائرہ میں بچے کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں جو اسے .... دے سکوں گا۔“ وہ سنجیدگی اور تلخی سے بولے۔ ان کی باتیں اسے شدید حیرت میں مبتلا کر گئیں۔

”مجھے تنگ کرنا چھوڑ دو، جاؤ اپنا کام کرو، صفائی کرو، کھانا پکاؤ، کپڑے دھلائی اور استری کرو، یہ ہے ایک گولڈ میڈلسٹ کا رول ؟ چلو بھر پانی میں ڈوب مرجانے کا مقام ہے۔ اب بچے پیدا کرنے کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس پر تمہارا نہیں صرف میرا اختیار ہے۔ اس کا فیصلہ تو میری زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ یہ بات غور سے سن لو اور آئندہ مجھ سے ایسی ڈیمانڈ مت کرنا۔ جو میرا سکون غارت کر دے۔“

”اس پر میرے رب کا اختیار ہے، آپ کا ہے نہ ہی میرا۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”جب اس ذات نے حکم کر دیا کہ کن فیکون تو آپ اور میں جھٹلانے والے کون ہوتے ہیں۔“

”اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیارات میں بہت کچھ سونپ رکھا ہے، غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تمہیں۔ آنکھیں بند کیے کنویں میں کودنے کو اختیارات کا نام دینا حماقت اور نادانی ہے، جس میں تم مقید ہو چکی ہو۔“ وہ بھی بے ساختگی سے بولے۔ ”ہماری شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔ رب العزت نے ہمیں اس معاملے میں بااختیار رکھا۔ اس کی مہربانی ہے، مجھے بچے کی چاہ نہیں اور میں نے اپنی تقدیر کا رخ موڑ لیا۔ لکھت

کو مٹا دیا۔ اب دوبارہ کندہ کرنا ناممکن ہے۔ اسی پر راضی ہو جاؤ۔'' یہ سن کر مزید قیل وقال کیے بغیر وہ وہاں سے اٹھی اور تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر رکے ہوئے آنسو کھل کر بہانے لگی۔ پچھلے تین سال سے وہ جب بھی اس ٹاپک کو چھیڑتی تھی تو حسنات کا یہی نامناسب ردِعمل ہوتا تھا۔ پانچ منٹ میں پانچ من بھاری تکلیف دہ طعن لعن سے نوازا جاتا۔ حسنات اس کے جانے کے بعد پھر کتاب میں کھو گئے اور وہ دیر تک آنسوؤں سے دل کے آبلوں کا علاج کرنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر ایک دن اماں جی بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں تو گھر میں کوئی بات کرنے والا نہیں رہا۔ وہ مایوس سی ہو کر رہ گئی تھی۔ حسنات نے کہنا شروع کر دیا تھا۔

''فارغ اور بیکار رہو گی تو تمہارا انجام یہی ہوگا۔ اینگزائیٹی، ڈپریشن اور پھر میڈیسن...... اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پی ایچ ڈی گھر کے چند کلومیٹر کے فاصلے سے کر لو گی۔ اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہو گی تمہاری۔ لوگ اس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ تمہارے گھر میں یہ سہولت میسر ہے۔ تم تو حد درجے ناسمجھ اور بے وقوف نکلیں۔ اپنے دماغ پر تالے مت لگاؤ۔ ورنہ پاگل خانے سدھار جاؤ گی۔ میری بات مان جاؤ، تم سے عمر میں بڑا ہوں، تجربات میں بھی پختہ ہوں۔''

وہ اسے کئی راتوں سے جاگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یونیورسٹی سے واپس آئے تو اسے بھوکا، پیاسا، بے وقت سویا ہوا پاتے۔ رات کبھی لان میں تو کبھی ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے گزر جاتی۔ نہ پہننے اوڑھنے میں دلچسپی رہی، نہ سہیلیوں کے ساتھ ہلا گلا کرنے کی چاہ رہی۔ گھر کی ہر شے اپنی جگہ سے ہل چکی تھی۔ الماریاں الجھ گئیں، کچن کے برتن گھر بھر میں بکھرے ہوئے تھے، نوکر عیاشی منا رہے تھے، اس تبدیلی کو حسنات نے محسوس تو کیا مگر اسے نظر انداز کر ڈالا تھا۔ انہیں ہمیشہ سے ہی ایسی بے ترتیبی میں رہنے کی عادت تھی۔ انہیں بیڈ روم میں بکھرے ہوئے کپڑے، جوتے اور تکیے، چادریں بے سکون نہ کرتیں۔ باتھ روم میں کاؤنٹر پر بکھری ہوئی اشیا، گیلے تولیے اور گیلا باتھ روم پریشان نہ کرتے۔ اسٹڈی تو الامان، جہاں الماریوں، شیلفوں اور کارپٹ پر کتابوں، اخباروں اور رسالوں کے بے ترتیب انبار لگے رہتے تھے جنہیں سلیقے اور طریقے سے رکھنا تو در کنار کسی کو چھونے تک کی اجازت نہیں تھی اس لیے سائرہ اسٹڈی میں جھانک کر دیکھتی تک نہیں تھی کیونکہ بے ترتیبی کو ہضم کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ غیر ارادی طور پر بکھرے ہوئے رسالوں اور اخباروں کو اکٹھا کرنے لگتی تو کڑوی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ ایسی خصلتوں والے شوہر کے ساتھ گزارہ کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا مگر اپنی کمٹ منٹ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ ان کے ساتھ جوانی کے حسین دن کاٹ تو رہی تھی مگر کرب، اذیت اور بے قراری ہمیشہ ہم سفر رہتی تھی پھر بھی اس نے ان سے کنارہ کشی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اتنی مضطرب رہنے لگی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ پڑھائی جاری رکھنے میں ناکام رہی تھی۔ طبیعت میں یاسیت تو رچ بس ہی گئی تھی کتاب اٹھانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ زندگی سے لگاؤ اور دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا اندازہ حسنات کو وقتی طور پر ہوتا مگر زیادہ پریشانی لاحق نہ ہوتی تھی کیونکہ گہرائی میں سوچنے اور مسئلہ حل کرنے کو اُن کے پاس وقت کی کمی تھی۔ لاشعوری طور پر سائرہ گھر میں بند ہو کر رہ گئی۔ رہی سہی کسر دیگر سسرال والوں کی طرف سے ہر وقت کی جانے والی بچے کی ڈیمانڈ نے پوری کر دی۔ ذہنی طور پر وہ بے حد کمزور اور لاغر ہو گئی تھی۔ جسمانی طور پر بھی مریضہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی اس حالت پر حسنات کا رویّہ بدلا...... فکرمندی لاحق ہوئی، اس سے لفظی اپنائیت د انسیت کا اظہار کیے بغیر اسپتال لے گئے، یہ معجزہ شاک کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اتنی بڑی تبدیلی پر وہ خوش

ہونے کے بجائے ہراساں و پریشان ہوگئی۔ حسنات کے پاس اس کے لیے تو ایک پل نہیں تھا آج تین گھنٹے اس پر قربان کرنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیکن یہ معجزہ کیونکر رونما ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

☆☆☆

''تمہاری تمام رپورٹیں آ گئی ہیں، تم جانتی ہو کہ تم نے مجھے کتنا بڑا دھوکا دے ڈالا ہے۔ تم نے ایسا گھناؤنا فریب میرے ساتھ کیوں کیا؟ تب ہی تو میں کہوں کہ تمہارے چہرے پر ہر وقت بارہ کیوں بجے رہتے ہیں؟ مُردنی کیوں چھائی رہتی ہے، میرا شک درست نکلا۔'' وہ جلالی لہجے میں بول رہے تھے، سائرہ نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''معصوم بننے کی ضرورت نہیں......'' حسنات نے آگے بڑھ کر سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر ٹیبلیٹس کا پتا نکالا۔ جس میں سے صرف دو گولیاں کھائی گئی تھیں۔ حسنات نے قہر آلود نظروں سے گھور کر پتا اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''حسنات میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ شاید طبیعت خرابی کی وجہ سے بھول گئی۔ دماغ سے بالکل ہی نکل گیا کہ مجھے میڈیسن میں ناغہ نہیں کرنا۔ او مائی گاڈ، سوری حسنات۔'' وہ مجرمانہ انداز میں بولی۔ ''یہ سوچی سمجھی ترکیب نہیں تھی۔ اِک بھول تھی۔ بھول تو معاف کر سکتے ہیں۔''

''نان سینس...... مجھے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں۔ تمہیں بچہ چاہیے تھا، یاد رکھو کہ مجھے دغا اور فریب دے کر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسی وقت اٹھو، میرے ساتھ اسپتال چلو۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ابھی اور اسی وقت۔'' وہ اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولے۔

''آپ صبر سے کام لیں، اگر اللہ تعالیٰ ہم پر مہربان ہو ہی گیا ہے تو اس کا شکر ادا کریں نہ کہ ہم ایک معصوم بچے کے قاتل بن کر جہنمی کہلائیں۔ حسنات یہ تو خاص نظرِ کرم ہوئی ہے ہم پر۔'' وہ خوشی و غمی کے ملے جلے جذبات میں بول رہی تھی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ میرا شک درست ہے کہ تم نے جانتے بوجھتے مجھے اندھیرے میں رکھا۔'' وہ نہ جانے اسے کیا کیا سنا رہے تھے۔ غصے سے ان کے منہ سے جھاگ ابل پڑا تھا۔ وہ خوفزدہ ہونے کے بجائے دلیر بن گئی تھی۔

''آپ کے رول کے بغیر یہ کیسے ممکن تھا؟'' وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بولی۔

''مجھے جھانسا دے کر تم ماں نہیں بن سکتیں۔'' وہ زور سے چیخے اور اسے گھسیٹتے بیڈ سے اتار کر بولے۔ ''مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ تم کیوں نہیں سمجھتیں۔''

''مگر مجھے بچہ چاہیے۔'' وہ بھی چیخی تو وہ دہل کر پرے ہٹ گئے۔ اس کا یہ روپ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ تھوڑے توقف کے بعد نہایت ملائمت سے بولے۔

''تم میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو، میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، صرف ایک سال کی مہلت دے دو۔''

''حسنات میں آپ کو بچے کی کسی ذمے داری میں شامل نہیں کروں گی۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ مجھ پر نہ سہی اس معصوم پر ہی رحم و ترس کر لیجیے۔ بچے کے معاملے میں آپ کی نفرت اور میری چاہت و پسند کا لیول ایک ہی ہے۔ اگر بچے مارکیٹ میں بک رہے ہوتے تو میں ڈھیر سارے بچوں سے اس گھر کو بارونق بنا ڈالتی۔ میری پسند فطری ہے حسنات۔'' سائرہ نے بڑی لاچاری سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور بڑی بے بسی سے بولی۔

"پھر وہی جاہلانہ و بے وقوفانہ راگ...... میری زندگی میں تو ایسا ہونے والا نہیں، یہاں بچے کی آواز ناقابلِ برداشت ہے۔ بچے کا رونا اور چیخ وپکار۔۔اس گھر کا سکون وقرار غارت مت کرو، ورنہ یہ گھر چھوڑ دوں گا۔" وہ تقریباً چیخ کر بولے۔ "پھر بھی میں ایک سال بعد کا وعدہ کر رہا ہوں، اسٹامپ پیپر لاؤ لکھ دیتا ہوں... فی الحال اس وقت میری طرف سے اجازت نہیں۔"

"اور اس معصوم کا کھیلنا کودنا، قلقاریاں کرنا، توتلی میٹھی، میٹھی باتیں کرنا اسے کیا نام دیں گے آپ؟ گھر کی خاموشی میں گہما گہمی اور رونق سما جائے گی۔ مجھے تو اس دن کا ابھی سے انتظار رہنے لگا ہے۔" وہ بچے کے فسوں میں کھو کر بولی۔

"سائرہ تم میری بات کو نظر انداز کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتیں۔" وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے بولے۔ "فوراً تیار ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے وجود سے گھن آنے لگی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے ہی نکال دوں، ہماری اچھی گزر رہی ہے، اسی طرح اس زندگی کو گزر جانے دو پلیز۔ اتنا اہم اور عظیم فیصلہ کرنے کے لیے مجھے وقت چاہیے۔ ذہنی طور پر تیار ہونے کا فائدہ نہ تو مجھے ہو گا نہ ہی تمہیں بلکہ آنے والے بچے کو اس کا فائدہ ہو گا۔ جسے ہم کوالٹی ٹائم دے سکیں گے۔" وہ اب اسے اپنی بانہوں میں بھر کر نرمی سے بولے تو سائرہ رحم لانہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"حسنات! پلیز صرف ایک بچے کی التجا ہے، دوسرے کا نام نہ لوں گی۔" وہ ان کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنا سر ان کے سینے سے لگا کر التجائیہ انداز میں بولی۔

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" انہوں نے اسے جھٹکے سے پرے کیا تو اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ تکیے پر گر گئی۔ وہ اس کی سائڈ پر بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اس منانے میں کبھی جاڑے کی کپکپی تو گرما کی چبھن کا کھیل جاری تھا مگر وہ ایسی قبیح حرکت ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ جھٹکا لگنے سے اس کا سر چکرانے لگا تھا اور متلی ہونے لگی تھی۔

"مجھے آپ کی ناراضی ... بیکار کے اعتراض اور اس شدید ردِ عمل کی قطعاً پروا نہیں...... کیونکہ مجھے ایک مکمل عورت بننے کا حق قدرتی طور پر انعام کی صورت میں سونپا گیا ہے اس لیے ایک معصوم سی جان کے قتل کے تصور سے ہی میرے رگ وریشے میں ہم دونوں کے زوال اور سزا کا ڈر خوف سرائیت کر گیا ہے۔ حسنات آپ نے ہر مفکر اور مولانا کی تفسیروں کو کھنگال رکھا ہے۔ کیا یہی فرمانِ الٰہی ہے کہ آنے والی روح پر آپ قابض ہو جائیں اس پر تو ہمارے مالک کا اختیار ہے۔" وہ اس لمحے خود سے بے خبر بیزاری اور الجھن سے بولی تو اس کے حوصلے ... ہمت اور مقابلہ کرنے کی جرأت کو محسوس کرتے ہوئے وہ اسے حق دق دیکھنے لگے۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف بھاگی اور اس کی قے کرنے کی آواز سن کر حسنات نے نفرت اور حقارت سے اندر جھانکا اور قہر آلود لہجے میں بولے۔

"تم کان کھول کر سن لو، اگر ایک گھنٹے میں تیار نہیں ہوئیں تو اپنے باپ کے گھر جانے کی تیاری کرنے میں دیر مت لگانا۔ مجھے تم جیسا خودسر، دُہری شخصیت کا مالک جیون ساتھی نہیں چاہیے۔" حسنات نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی ناگوار نظر ڈالی اور وہاں سے چلے گئے۔

"آپ کی اس انہونی خواہش کی میں کبھی تائید نہیں کروں گی۔ میں آپ کی بہترین ہم سفر نہ سہی آپ کی دشمن ہی سہی، مجھے منظور ہے مگر یہ گناہِ کبیرہ کبھی نہیں کروں گی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"سائرہ اگر تم تیار ہو چکی ہو تو بتاؤ، میں تمہارے ساتھ اسپتال چلو یا ڈرائیور تمہیں میکے چھوڑ آئے۔" گھنٹے بھر بعد اُن کی آواز آئی جسے سن کر وہ سر تا پا لرز کر بیڈ سے اتر گئی۔

☆☆☆

"حسنات! مجھے تم سے ایک سوال کا جواب چاہیے۔ اگر ہماری اماں آج زندہ ہوتیں تو وہ بھی تم سے یہی سوال کرتیں۔ آج تو ان کی روح تڑپ اٹھی ہو گی۔" بڑی بہن عصمت آئی سی یو میں سائرہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے حسنات پر برس رہی تھیں۔ لہجے میں خفگی اور افسردگی تھی اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"آپا! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ اماں کی روح بے چین کیوں ہو گی؟ کوئی صدقہ خیرات کیے دیتا ہوں میں۔" وہ انجان بنتے ہوئے بولے۔

"بچے کو اس دنیا میں آنے سے روکنے والے تم ہو کہ سائرہ؟" وہ پژمردگی سے بولیں۔ "دیکھو مجھ سے سیدھی اور سچی بات کرو، خبردار جو کچھ چھپانے کی کوشش کی۔"

"ہم دونوں نے مل کر مشورہ کیا اور فیصلہ بھی ہم دونوں کا ہی تھا...... ایک سال بعد فیملی بڑھانے کے بارے میں سوچا جائے گا۔ فی الحال ہم دونوں ہی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ آپا میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں ایک ایسا بچہ پرورش پا رہا ہو جس کی نہ کوئی اہمیت ہو اور نہ ہی وہ والدین کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ وہ بچہ جوان ہو کر بالکل ہی نامکمل اور ادھوری شخصیت کا مالک ہو گا۔" وہ بڑی خوداعتمادی سے بودا سا جواز پیش کر رہے تھے۔

"تم نے اپنی عمر ملاحظہ فرمائی ہے، جوانی کے بچے والدین کو تمام فرائض سے وقت پر فارغ البال کر دیتے ہیں۔ اب مجھے دیکھو اور باقی بہنوں اور بھابیوں کا موازنہ کرو۔ سب اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد اپنی زندگی کے ہر لمحے سے محظوظ ہو رہے ہیں جبکہ مجھ پر چھوٹی بیٹی کی ذمے داری کیوں ہے؟ کیونکہ وہ دنیا میں لیٹ پہنچی تھی۔ تم نے آج تک اپنے وقت کو ایک روٹین میں سیٹ ہی نہیں کیا۔ ماں جی کہتی تھیں کہ تم شادی کے بعد بالکل بدل جاؤ گے۔ سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کے ساتھ چلنے لگو گے۔ اس کلاک کی ہر سوئی میں اپنا پروگرام فیڈ کرنے لگو گے پھر تمہارے پاس وقت کی کمی نہیں ہو گی۔ بلکہ تمہیں کام کی کمی اور وقت کی زیادتی کا احساس ہونے لگے گا۔ مگر ماں جی کی تھیوری کو ناکام کرنے میں تم تو بے مثال نکلے، کتنے افسوس کا مقام ہے... اپنی تعلیم دیکھو اور اپنی جاہلانہ سوچ کو پرکھو، لگتا ہے، زمانۂ جاہلیت کے دور کے باشندے ہو۔" عصمت آپا نے لمبی سرد آہ بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپا میں انہی صلواتوں اور فضیحتوں کی وجہ سے کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ میری اپنی زندگی ہے اس پر مجھے ہی اختیار ہونا چاہیے۔" وہ بیزاری سے بولے اور سائرہ کی طرف بڑھ گئے۔ جسے ڈاکٹر بلڈ کی دوسری بوتل لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سائرہ کی آنکھوں میں پرلے درجے کی ویرانی اور لاچاری کی تاریکیاں بسیرا کر گئی تھیں۔ لبوں پر نہ ٹوٹنے والی خاموشی تھی۔ حسنات نے اس کے بالوں پر نہایت ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ سائرہ نے ناگواری سے ان کا ہاتھ پرے کو ہٹا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ حسنات نے ندامت بھری نظروں سے عصمت آپا کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں کی زبان پڑھ کر بے نیازی و بے پروائی کا سہارا لیتے ہوئے بولے۔ "اب سائرہ کی حالت بہتر ہے فکر کی بات نہیں۔ آپا! میں اب چلتا ہوں...... آج مجھے ایک بہت اہم میٹنگ کے لیے HEC جانا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی قسم کی فکر نہیں ہو گی۔"

"تم میری غیر موجودگی میں بھی کسی قسم کا کوئی پرابلم محسوس نہیں کرو گے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ اپنے جیون

ساتھی کے لیے بھی اتنے ہی بے حس اور بے پروا ہو گے تو تمہاری شادی نہ ہونے دیتی۔'' وہ دل میں ہی کہتی ہوئی کھول گئیں۔ ان کا دل چاہا اس ارسطو، افلاطون اور سقراط کے نانا کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دیں۔

''میٹنگ کے بعد آنے کی کوشش کروں گا۔ بس سائرہ کو تسلی و تشفی دیجیے گا۔ اور سمجھائیے گا کہ وہ ہے تو بچوں کی قلت نہیں ہو گی۔ اس وقت ری کور کرنا ضروری ہے۔'' وہ آہستگی سے بولے اور سائرہ کی طرف خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑے۔ بیٹی کے مقدر لکھنے کا اختیار والدین کو سونپا جاتا تو کیا ہی خوب ہوتا۔ کبھی دل نالاں نہ ہوتا، آنکھ میں جھڑی نہ لگتی، نیندیں نہ اُڑتیں اور ایسے نا ہنجار مرد ہمیشہ کے لیے تنہائی کا شکار ہو جاتے۔ دوسروں کی لاڈلی بیٹیاں ان کے من گھڑت و من پسند اصولوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی ہوتیں۔ وہ سائرہ کی طرف ترس و رحم لانہ نظروں سے دیکھ کر سوچے جا رہی تھیں۔ اس حالت میں وہ کسی قسم کا سوال پوچھ کر اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے خاموشی سے اس کے قریب ہی رکھے اسٹول پر بیٹھ گئیں اور خود کو لعنت ملامت کرنے لگیں جنہوں نے اپنے بھائی کی تمام خصلتوں اور عادات کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اس کی شادی کی حمایت کر ڈالی تھی محض اسے سدھارنے کی امید و بیم میں ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرتے ہوئے اماں جان کو خوفِ خدا کیوں نہیں آیا۔

☆☆☆

''سائرہ اب کیسا فیل کر رہی ہو؟'' حسنات نے بیڈ روم سے ملحقہ اسٹڈی سے جھانکتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''اللہ کا کرم ہے۔'' وہ منمنائی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ حسنات نے اس کے قریب آنے کے بجائے وہیں سے واپسی کو بہتر سمجھا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کسی ڈیلی نیوز کے لیے لکھے ہوئے آرٹیکلز پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ جب اپنے فسوں سے باہر نکلے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ ایک تسلی بخش بھرپور انگڑائی لے کر انہوں نے وہیں رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگے۔ پھر بیڈ روم میں جھانکا۔ سائرہ نے جنبش نہ کی تھی کیونکہ وہ ٹرینکولائزر لے کر سو چکی تھی۔ انہوں نے ایک طویل سانس لی اور عینک اتار کر واپس اسٹڈی میں چلے گئے۔ لائٹس آف کر کے وہیں کاؤچ پر لیٹ گئے۔ چند سیکنڈ میں ہی ان کے زوردار خراٹے اسٹڈی کے کھلے دروازے سے ملحقہ بیڈ روم کی فضا میں منتشر ہونے لگے۔ ان کی بے ڈھنگی آواز میں اس قدر انتشار تھا کہ سائرہ مصنوعی گہری نیند کے باوجود ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

اس نے بے اختیاری میں حسنات کی سائڈ پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں وہاں موجود نہ پا کر لاشعوری طور پر اس نے اِک طویل آہ بھری اور نیند جو کھل چکی تھی۔ اب تمام سوچوں کے ہمراہ مکمل طور پر کچوکے لگانے لگی تھی۔ ذہن کو ہر سوچ سے بے بہرہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوتی چلی گئیں تو وہ اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''حسنات تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ محض اپنی ماں کو خوش کرنے کی خاطر میری ہنستی مسکراتی زندگی کے خریدار کیوں بن گئے۔ تمہیں بیوی کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی تو پھر اتنا بڑا ظلم کرتے ہوئے تمہارا دل خوفِ خدا سے لرزا کیوں نہ تھا۔ اب مجھے اس سوال کا جوب دو کہ پہاڑ جیسی جوانی کا اتنا طویل سفر کیسے کٹے گا۔ کیا اسی طرح تنہا اور لاوارث و بے کس عورت کی طرح آہ و بکا کرتے ہی ساری زندگی بتا دوں گی؟'' وہ خود ترسی کا شکار تھی۔ ''میرے اندر کے تمام بھیانک احساسات کو اپنی قربت اور پیار سے ختم کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا والوں کے سامنے تمہاری اصلیت کو تار تار .... کر دوں، یہ جو ہم

دونوں نے اپنے تعلق و ربط اور رشتے کا بنا رکھا ہے، ریزہ ریزہ ہی کر دوں۔ ایسا کرنے سے خاندان کی عزت و وقار تاراج ہو جائے گا۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ معاشرہ مجھے قبول نہیں کرے گا۔ میری کمزوریوں اور بزدلی کو سمجھتے ہوئے تم میری قدر دانی کرنے کے بجائے مجھے آلتو فالتو بے جان شے سمجھ کر اپنی خود ساختہ عارضی اور وقتی دنیا میں کھو گئے ہو۔ مجھے مر کر ہی تم سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔ تمہیں تو جب بھی گلٹ (شرمندگی) بیدار نہ کر سکے گا، تم ہو ہی پتھر سے بنے ہوئے انسان، میں تمہیں بھی ایسی مار دوں گی کہ کیا یاد کرو گے؟ کہ تم نے عورت کو اس قدر حقیر جانا، اتنا مجبور سمجھا۔'' وہ خود کلامی کرتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتری۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتی وہ اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کو کھول کر کاؤچ پر سوئے ہوئے حسنات کو دیکھنے لگی۔ وہ پینٹ شرٹ ہی پہنے سکڑ کر لیٹے ہوئے گہری نیند میں تھے۔ گیس ہیٹر آن تھا اس نے آگے بڑھ کر ہیٹر آف کیا اور بیڈ روم سے کمبل اٹھا کر ان پر ڈال دیا۔

☆☆☆

''سائرہ، تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ تم میری بیٹی جیسی ہو اس لیے تمہیں سمجھانا ضروری سمجھتی ہوں۔ ہر وقت ماتمی حالت میں رہنا شوہر کو قطعاً پسند نہیں ہوتا۔ اس کی نظریں کسی اور کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ دل میں کوئی اور بسنے لگتا ہے اور بیوی کو اس وقت خبر ہوتی ہے جب دوسری عورت اس کے گھر پر قابض ہو جاتی ہے۔'' عصمت آپا نے گھر میں قدم رکھتے ہی سائرہ کو اول جلول حالت میں دیکھ کر سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

''آپ کے بھائی کو یہ سب کرنے کا وقت ہی کب ہے؟'' وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''انہیں تو کسی حور پری میں بھی کوئی چارم نظر نہیں آتا۔''

''ہمارے معاشرے کی عورت کا دل گوشت پوست کا نہیں پتھر کا ہو تو تب وہ اپنی زندگی میں کامیاب مانی جاتی ہے۔ دل کو روگ لگا لینا اور اپنے ذہن کو بے لگام رکھ کر سوچ چلے جانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ میری منی سی بھابی اپنی سوچ پر قفل لگا دو تا کہ تمہارے من میں کسی آرزو کا دخل ہی نہ ہو۔ کوئی سوچ ہی نہ ابھرے۔'' وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''اس سوچ کو جس پر میرا حق ہے، عصمت آپا اسے قید کیسے کر دوں؟ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ آپ بھی تو میری ہم نفس ہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کا اختیار رکھتی ہیں۔ آپ تو میرے احساسات و جذبات سے واقف ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ ''مجھے اولاد چاہیے عصمت آپا، بس اور کچھ بھی نہیں۔''

''تو پھر ایک ہی علاج ہے۔'' عصمت نے سوچتے ہوئے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ علاج بتائیے آپا؟'' وہ ایک دم سے چوکنی ہو کر بولی۔

''حسنات کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہو گا۔'' وہ بے اختیاری سے بولیں۔

''نہیں آپا، یہ نہیں ہو سکتا...... آئی لو ہم...... میرے بغیر وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ ان کے کھانے پینے کا، ان کے آرام کا کون خیال رکھے گا۔ وہ تو خود سے بھی اتنے بیگانہ رہتے ہیں کہ دو دن کھانا نہ ملے تو کبھی بھوک کا اظہار نہیں کرتے، کپڑے تیار نہ کروں تو بغیر استری شدہ کپڑے پہن کر یونیورسٹی چل پڑتے ہیں، ایسے لوگ کمزور ہوتے ہیں، کیئر نہ کریں تو فوراً ہی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور نوکروں کی حالت سے تو آپ اچھی طرح

واقف ہیں۔ بھلا وہ پروا کیوں کریں گے۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

''تو پھر بچے، خود کو سنبھالو اور اپنی ان تمام خواہشات کو اپنے دل سے نکال دو، جن سے حسنات کا دور پار کا بھی واسطہ نہیں۔ ورنہ روگ لگائے بیمار پڑ جاؤ گی۔'' آپا نے نہایت پیار و ملائمت سے کہا۔ ''حسنات تو ہمیشہ سے ہی لکی تھا۔ تمہارے جیسی بیوی کا حصول تو اس کی خوش بختی کی نشانی ہے، تم اس کے کہنے کے مطابق اپنی پڑھائی شروع کر دو، دل بھی بہل جائے گا۔ حسنات بھی تم سے خوش ہو جائے گا پھر ممکن ہے کہ تمہاری تمنا پر غور و خوص کرنے پر مجبور ہو جائے۔''

''ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے آپا، ہم روز بروز اپنی عمر میں، آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔'' وہ اِک طویل آہ بھر کر بولی۔ ''مجھ میں مزید پڑھنے کی سکت نہیں رہی، جب دل میں جینے کی امنگ ہی نہ رہے تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی اس بے مقصد زندگی سے پیار ہے نہ ہی اس کی چاہ ہے۔''

''بیٹا اس طرح تو تم ڈپریشن میں جا رہی ہو، کسی کے سامنے ایسی مایوس کُن باتیں مت کرنا، سب تمہیں پاگل کا خطاب دے کر تمہارا تمسخر اڑائیں گے۔ ڈپریشن کا علاج ہے، تم بھی تو اچھی طرح جانتی ہو......'' آپا خوف زدہ سی ہو کر بولیں۔ ''کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ لینے میں کوئی قباحت نہیں، میں ابھی بات کرتی ہوں حسنات سے۔''

''اس کی ضرورت نہیں آپا، میں ٹھیک ہوں، میرے ڈپریشن کو بیماری کا نام دینا درست نہیں۔ یہ تو حالات کی وجہ سے مجھ پر طاری ہوتا جا رہا ہے، اپنے بھائی کو سمجھائیں کہ میری خوشیوں اور راحتوں کو اپنی غرض اور اپنی چاہ کی بھینٹ مت چڑھائیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''آپا جان، یقین کریں میں ضد نہیں کر رہی۔ حسنات سے جب بھی بات کرتی ہوں، مجھے ضدی بچہ کہہ کر میری بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ مجھے تو اب یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے اس دنیا کا ہر فرد مجھے قصوروار ٹھہرا رہا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں...... آپ سب لوگ میرے بچے کے قاتل ہیں، میں کسی کو بھی معاف نہیں کروں گی اور اگلی دنیا میں اپنے اسی معصوم ان دیکھے بچے کی انگلی پکڑ کر پل صراط پار کر کے جنت میں داخل ہو جاؤں گی۔ حسنات اور سب دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ تو عصمت کی آنکھوں سے بھی ساون کی جھڑی پھوٹ نکلی۔

☆☆☆

''ڈاکٹر صاحب، آپا خواہ مخواہ اتنی فکرمند ہو گئی ہیں، میں ٹھیک ہی تو ہوں۔'' سائرہ نے ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ہمایوں سے خود اعتمادی سے کہا تو وہ مسکرا کر اپنائیت سے اسے دیکھنے لگے۔ عصمت نے ہمایوں کے آنکھ کے اشارے کو سمجھ لیا اور چپکے سے باہر ویٹنگ روم میں جا بیٹھیں۔ آپا نے سائرہ کے منع کرنے کے باوجود دو ہفتوں میں ہی ماہرِ نفسیات سے ٹائم لے لیا تھا یہ ایک تجربے کار اور اچھی شہرت کے حامل...۔ ڈیڑھ گھنٹے کی طویل گفتگو کے بعد جب سائرہ باہر نکلی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ناک لال ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود چہرے پر اضطراری کیفیت میں خاصی کمی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ عصمت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل کر پارکنگ کی طرف چل دیں۔

''سائرہ جان، ڈاکٹر ہمایوں کیسے لگے؟'' عصمت نے آہستگی سے کہا۔

''بہت اچھے، مسیحا اور ہمدرد، آپ کا بہت بہت شکریہ، بہت قابل ڈاکٹر ہیں، دل کی بات کو پکڑنا خوب آتا ہے۔'' وہ پُرستائش لہجے میں بولی۔

''کبھی کبھار بڑوں کی بات مان لینے میں بے حساب فوائد ہوتے ہیں، میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم نے آخر کار میری اس تجویز پر غور کیا۔ کسی کے سامنے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ ہر ایک کن سوئیاں لینے لگے گا۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولیں۔ ''اب اگلی سٹنگ کب ہے؟ تا کہ میں تیار رہوں۔''

''ایک ہفتے بعد انہوں نے بلایا ہے، عصمت آپا! اب میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گی، خود ہی آ جاؤں گی۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ میں ہوں بالکل ٹھیک ٹھاک۔'' وہ ذرا سا مسکرائی۔

''وہ تو ہے...... پھر بھی شک کو اپنا رفیق کیونکر بنائیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کچھ تو قیمت ادا کرنا ہی پڑے گی ناں۔ اور وہ قیمت ہے ڈاکٹر ہمایوں۔''

''اور ان کے مشورے پر عمل کرنا۔'' وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو دونوں مطمئن اور پُرسکون سانس لے کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

آخر ڈاکٹر ہمایوں نے اس کی صحت یابی کو محسوس کرتے ہوئے اس کی میڈیسن کو آہستہ، آہستہ کم کرنا شروع کر دیا تھا تا کہ وہ اس عارضی اور وقتی سہارے کے بغیر اپنی زندگی پر گامزن رہ سکے۔ اسے میڈیسن کو خدا حافظ کہنا مشکل نہ تھا۔ مگر ہمایوں کو الوداع کہنا وبالِ جان بن گیا۔ چہرے پر تسکین و طمانیت میں بے چینی و بے قراری کی آمیزش نظر آنے لگی۔ گھر پھر سے بکھرنے لگا۔ خوش لباسی و خوش گفتاری پر منفی سوچوں کی چھاپ لگنے لگی۔ حسنات کی ہر بات اور ہر حرکت پر پھر سے اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی۔ اس کے مزاج کی اس تبدیلی کو حسنات جیسے بے حس و خود غرض انسان نے بھی بری طرح محسوس کر لیا تھا۔ مگر اس سے پوچھنا اور اپنا وقت اس غیر مناسب مسئلے کی نذر کر دینا انہیں قطعی منظور نہیں تھا۔ آج اور کل میں ہی دن گزرتے گئے۔ مگر وہ اس کی

طبیعت کی تبدیلی کی وجہ پوچھنے سے کنی کتراتے رہے اور اپنی زندگی میں مصروف وشاداں رہے۔ یہ نامناسب ردِعمل سائرہ کو بتدریج کھوکھلا کرتا گیا۔ ڈاکٹر ہمایوں سے ملنے کی تڑپ اس کے دل میں بڑھنے لگی۔ وہ ماضی میں گم سی ہو کر حسرت ویاس سے سوچنے لگی۔''وہ دن کتنے اچھے تھے۔ جب میری پہلی ملاقات ڈاکٹر ہمایوں سے ہوئی تھی اور سالوں بعد میں نے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔ دل کو کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا اور وہ میرے دل کے زخموں پر اپنی گفتگو کی چاشنی سے مرہم رکھ رہے تھے اور میرا درد ایک دم سے کم ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بے قرار دل نے سکون واطمینان کی گھنٹی بجا کر میرے ذہن کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اس میں مثبت سوچوں نے بسیرا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ دوسرے وزٹ پر ہی وہ مجھے اپنے مربی اور مسیحا لگے۔ میں نے یونیورسٹی اور حسنات کی سخت مزاجی کے قصے اور اپنی لیاقت کے بارے میں تفصیلاً انفارمیشن دے کر انہیں امپریس کر ڈالا تھا۔ وہ میری ذہنی صحت کے لیے فکر مند رہنے لگے تھے۔ وہ ہر قیمت پر مجھے زندگی کی تمام تر دلچسپیوں اور رعنائیوں میں واپس لانا چاہتے تھے۔ وہ انہماک سے میری ہر بات سن کر اہمیت دیتے اور پھر خوب مدح سرائی کرتے، لطیفے سناتے اور میرے بچپن کی شرارتیں سن کر محظوظ ہوتے۔ میرے ساتھ ایسا سلوک ورویہ حسنات کا تو کبھی نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ہمایوں سائیکی جان چکے تھے میرے مرض کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی شہد میں ڈوبی ہوئی میری پسند کی باتیں سماعتوں میں تحلیل ہو کر مجھے ذہنی طور پر زندگی کے قریب تر کرتی گئیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر اپنی دنیا میں واپس آئی ہوں تو پھر دوبارہ اسی فیز میں کیوں چلی گئی ہوں؟'' وہ سوچنے لگی اور اس سچائی اور حقیقت کو جان کر کہ وہ ڈاکٹر ہمایوں کی کمپنی کو پسند کرنے لگی تھی۔ اسے اپنے دل کے بہت نزدیک محسوس کرتے ہوئے وہ دہل سی گئی تھی۔ اس بے قراری اور اضطرابی کیفیت میں کئی راتیں گزریں۔ خود کو سمجھانے کے باوجود اس کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ دل میں ڈاکٹر ہمایوں سے ملنے کی ہوک تمام ارادوں پر چھا جاتی۔ جب احساسِ گناہ آنکھ کھولتا تو خود کو لعنت ملامت کرتی کہ یہ وہ کس دوار ہے پر چل پڑی ہے۔

آخر اپنی ذہنی طمانیت اور دلی سکون کی خاطر اس نے ڈاکٹر ہمایوں کو فون کرنے سے پہلے خود کو تیار کیا کہ وہ محض ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہے، زبان کی مٹھاس اور شگفتہ وجاندار اندازِ گفتگو اس کا پیشہ ہے اور اس کا یہی انداز مریض کو سب سے زیادہ بھاتا ہے۔ خصوصاً صنفِ نازک کو مگر یہ اس کا پروفیشنل انداز تھا۔ ورنہ وہ نفسیات کا ماہر ڈاکٹر نہ ہوتا بلکہ سرجن ہوتا۔ چھری، قینچی کے ہمراہ۔

''کہیں اس کی میٹھی زبان میرے دل پر چھری کا کام تو نہیں کر گئی۔ اوہ مائی گاڈ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، کیا میں اتنی ہی کمزور واقع ہوئی ہوں، ویری بیڈ۔'' اگلے ہی لمحے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ''اپنے دل کو مضبوط کرو اور ذہن کو جگا کر سوچو۔ تم غلطی پر ہو، ڈاکٹر ہمایوں صرف تمہارا معالج ہے۔ تمہاری ذہنی اختراعات تمہیں کسی اور ڈگر پر دھکیل رہی ہیں، وہ ڈگر آگ ہے، جہنم اور بھڑکتے ہوئے شعلے اور چنگاریاں ہیں۔''

''نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔'' دل کی اس آواز پر ایک دفعہ وہ ہوش میں آئی اور اپنے وجود میں قوت وطاقت کو بحال کرتی رہی۔ جب اس نے خود کو قدرے نارمل محسوس کیا تو ڈاکٹر ہمایوں کو فون ملانے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں پھرتی اور چستی تھی۔ مزاج کا چڑ چڑا پن اور کرب واذیت کا جان لیوا احساس قدرے کم پڑ گیا تھا کیونکہ اس نے اس بات پر سرِ تسلیم خم کر لیا تھا کہ وہ محض اس کا ڈاکٹر ہے اور یہ اس کی پیشنٹ ہے، جونہی اس کی نرم وملائم خوشگوار آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو تمام خود سے کیے گئے عہد وپیمان اور ارادے متزلزل ہونے لگے۔

اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہواؤں کے دوش پر اڑتی جا رہی ہے۔ اس کے دل میں مسرت وراحت کی شہنائیاں بجنے لگی ہیں۔ اس سے وزٹ کا ٹائم لے کر جونہی موبائل آف کیا تو اپنے سامنے قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر اچنبھے سے خود پر غور کرنے لگی۔ میلے کچیلے سلوٹوں سے بھرپور کپڑے اور الجھے ہوئے کھلے بال اور چہرے پر شگفتہ گلاب جیسی لالی اور مسحور کن مسکان کے اس امتزاج میں وہ کس قدر پُرسکون لگ رہی تھی۔ اس نے خود سے ہی سوال کیا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' پر صحیح جواب سننے کی ہمت نہیں تھی۔

''کیا پسندیدگی ہے یا محض اس کی خوشگوار وشگفتہ باتوں کا اثر ہے؟ تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو، خود کو بے وقوف مت بناؤ۔'' انصاف کو مدِنظر رکھ کر وہ اپنی ماں کی باتوں پر غور کرنے لگی۔

''جس رشتے کے سامنے کمزور پڑ جاؤ، سمجھو کہ تم پر زوال آنے والا ہے، جہاں سے سکون ملے، سمجھو کہ تم اپاہج ہو گئی، جس کی چاہ میں پاگل ہونے لگو وہ رستہ چھوڑ دو۔'' اور آخر اس نے اپنے من سے ڈپریشن کے بیج کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی ٹھان لی۔ جس میں ڈاکٹر ہمایوں کی میٹھی اور تسلی بخش باتوں کی ضرورت رہی نہ اس نے کسی دوا کے سہارے کو محسوس کیا۔ وہ اپنی دیرینہ اور اہم خواہش کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی ماہر نفسیات خود ہی بنی۔ یہ اٹل فیصلہ تھا۔''وہ حسنات کی ہے اور اس کے ذہن وقلب پر اسی کی اجارہ داری رہے گی۔ ڈاکٹر ہمایوں کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔''

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کے چہرے پر اطمینان کی سرخی بکھرنے لگی اور اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی صحت پر دے ڈالی۔ بکھرا ہوا گھر اس کے مزاج کے مانند سلجھ گیا تھا اور ایک دن منوں بھاری خبر سن کر اس نے اسے اپنے ہی دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا۔ اس بار وہ حسنات کے ظلم وستم کا نشانہ بننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ ان نازک گھڑیوں سے نکل کر یہ مژدۂ راحت حسنات کے گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔ اسے دھماکے کی خبر تو تھی مگر وہ اسے عارضی لگ رہا تھا۔ ایک معمولی جھٹکا اور پھر ہلکے شاک کے بعد سکون ہی سکون......اور شکرانہ ہی شکرانہ......

☆☆☆

پانچ مہینے کا عرصہ طبیعت کی خرابی کے باوجود نہایت تسلی وتشفی میں گزر گیا۔ حسنات حسبِ معمول اپنی کتابی دنیا میں مگن اس کی نقاہت اور چہرے کی پیلاہٹ کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ سائرہ کی معمولی سی احتیاط نے اس راز پر پردہ ڈالے رکھا۔ جب اس کی بڑھتی ہوئی جسمانی ہیئت پر خاندان کی عورتوں نے معنی خیز سوال کرنے شروع کیے تو سائرہ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ دل اچھل کر حلق میں آنے لگا کہ اب وہ وقت آ چکا ہے کہ اس حسین بھید کی پردہ کشائی کی جائے۔ اس سے پہلے کہ دوسروں کی طرف سے یہ خبر مبارک کی صورت میں حسنات کے کانوں میں زہر انڈیل ڈالے، کیوں نہ خود ہی شیرینی سے بھرپور معجزہ ان کے گوش گزار دے۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا... فی الحال اسے اس مشکل مرحلے کا نہایت دانشمندی سے سامنا کرنا تھا۔ اسے حیرت تھی حسنات اس کی ظاہری حالت سے اس قدر بے پروا تھے۔ حسنات بستر پر نیم دراز اپنا پسندیدہ مشغلہ سائرہ پر مسلط کر رہے تھے۔ space کے معجزات کا ذکر، دنیا کے وجود میں آنے کی تھیوری اور مختلف مرتد رائٹرز کے غیر مناسب اور بے تکے خیالات سنتے ہوئے یہ صرف ہوں، ہاں یا، یس کا ہی سہارا لیا کرتی تھی۔ اسے ان باتوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا مگر وہ جو بڑھتے اسے ٹو ڈی اس سے شیئر کرنا چاہتے تھے۔ یہ بہترین سامع تھی جبکہ وہ اس کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا معیار ان کی سوچ کے مطابق زیرو تھا۔

آج انہیں خوشگوار موڈ میں دیکھ کر سائرہ نے موقع غنیمت جانا اور ان کے سینے پر سر رکھ کر الفاظ کی ادائیگی سے پہلے تھوڑا خوف زدہ ہو کر لرزی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔

”کچھ پریشان سی ہو گئی ہو ایک دم سے...... کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی وسعت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہو گئی ہو؟“ وہ حیرت سے بولے تو بہ مشکل اس کی زبان نے جنبش کی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں دیکھ کر ہر بار رب العزت اور آپا کا شکر ادا کرنے لگتا ہوں کہ آج جو تم ہو، انہی کی مہربانیوں کی وجہ سے ہو، میں نے آپا کی عقلمندی اور دور اندیشی سے ایک سبق عمر بھر کے لیے سیکھ لیا ہے کہ اداسی، بدگمانی، بے یقینی اور مایوسی کے وار دہوتے ہی ماہرِ نفسیات سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ وہ ملائمت بھرے لہجے میں بولے۔

”حسنات! ماہرِ نفسیات کا کوئی کمال نہیں، ہمیں اپنا موازنہ خود کرنا چاہیے اگر ہم پیدائشی طور پر نارمل ہیں، صحت مند ہیں، بالغ ہونے کے ساتھ، ساتھ ہر طرح کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ بچوں کے ذہنی ٹیسٹ لینے سے ہمیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ اپنے خراب رزلٹ کو بچے نے کس طریقے سے لیا ہے۔ ناکامی پر دوبارہ کمر بستہ ہونے کا فیصلہ بہ آسانی کر سکتا ہے یا دل برداشتہ ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا۔ دوسروں کے سامنے شرمندگی مٹانے کے لیے دوسروں کو ہی موردِ الزام ٹھہرائے گا یا اپنی نالائقی اور غلطی کا اعتراف کرنے میں اس کی انا و خودداری کو جھٹکا تو نہیں لگے گا۔ بس آئندہ بھی زندگی میں رونما ہونے والے تمام چیلنجز کو ہنس کر قبول کرتا ہے یا دنیا والوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں بہتری محسوس کرتا ہے، بس یہی بی ہیوئیر اس کے ساتھ عمر بھر چلتا ہے اور جو لوگ اسٹرونگ ذہن کے مالک ہوتے ہیں وہ اپنی ڈپریشن کی وجہ خود معلوم کر کے اپنے ہی ماہرِ نفسیات بن کر علاج کرنے لگتے ہیں کیونکہ ننانوے فیصد لوگ پیدائشی نارمل ذہن لے کر اس دنیا میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔“ وہ تفصیلاً گفتگو اِک خاص مقصد کے تحت کر رہی تھی۔

”بھئی تمہیں تو سائیکاٹرسٹ ہونا چاہیے تھا۔ تمہاری باتوں میں وزن ہے، یعنی ڈپریشن لاعلاج بیماری نہیں۔ اس میں خود کو مطمئن و پُرسکون رکھنے کی ضرورت ہے۔ سائرہ اب تم نارمل ہو، صحت بھی خوب بنالی ہے تم نے، میرا خیال ہے تم اپلائڈ سائیکالوجی میں ماسٹرز کیوں نہ کر لو پھر بعد میں پی ایچ ڈی۔“ وہ اس کی باتوں سے قدرے مطمئن تھے۔

”دیکھو میں نے تو اپنا دماغ اپنے آباؤ اجداد سے لیا ہے اور تمہارے فیملی سیٹ اپ کے حساب سے دیکھا جائے تو تمہاری قابلیت معجزہ ہے جبھی تو اس سے امپریس ہو کر میں نے تمہیں اپنے خاندان کا اہم حصہ بنا ڈالا۔“

”حسنات مجھے یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ آپ کا نام اور قابلیت اسی شان سے جاری و ساری رہنا چاہیے۔ نام کو ہمیشگی نئی نسل دیتی ہے۔ جس کا آپ نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا۔ دو سال ہونے کو آئے ہیں اب تو آپ اس طرف سوچ سکتے ہیں ناں۔“ وہ بولتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔

”بھئی یہ فلسفہ مجھے پسند نہیں آیا۔ پرانی، گھسی پٹی خواہشات ہیں سب...... پھر سے تمہیں کچھ ہونے لگا ہے، خدا کے لیے سائرہ، بھول جاؤ اس آرزو کو۔ تم اِک عام عورت نہیں ہو میری جان۔“ وہ ایک دم سے اچھل کر بیٹھ گئے۔ ”تم نے اِک خاص عورت بن کر مجھے اپنے قریب کر لیا ہے، ورنہ میں تمہاری ابنارملٹی سے تنگ آنے لگا تھا۔ تم بہت چھوٹی لگنے لگی تھیں۔“

”اپنی زندگی کو اپنے وعدے کے ایفا کرنے سے بدلنے کی کوشش تو کریں۔ آپ کو بہت اچھا لگے گا اولاد

کا میٹھا ذائقہ...... میں اسی آس و امید میں ہی تو خاص الخاص ہو گئی ہوں، حسنات ہم بہت ڈل ہو گئے ہیں، کچھ گھر میں رونق، گہما گہمی اور شور شرابا ہونا چاہیے جو دل و دماغ کو ترو تازہ کر دے گا۔ ذہن کی تمام بند راہیں پھر سے کھل جائیں گی، یہ جمود اور سکوت و یکسانیت ختم ہو جائے گی تو میں خوشی، خوشی اپنی تعلیم بھی پھر سے جاری رکھ سکوں گی۔ آپ بخوبی جانتے تو ہیں کہ تعلیم کے حصول کے لیے پیس آف مائنڈ پہلا فارمولا ہے...... اگر اسے بھلا دیا تو پھر ہم بہت جلد حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے موت کے منتظر پائے جائیں گے اور آپ کی تمام پراپرٹی اور دولت آپ کی نسل کے بجائے دوسروں کی اولاد کے کام آئے گی۔“ وہ سردیوں کی دبی ہوئی بارشوں کی طرح رونے لگی۔

آج سائرہ کی زبان سے اپنے عہد کی بازگشت سن کر ششدر ہو کر اسے دیکھنے لگے کہ وہ ان کے وعدے کو بھولی نہیں۔ بیماری کے باوجود یادداشت کمزور نہیں ہوئی۔

”سائرہ بیگم تم جانتی ہو کہ میں پچھلے سال سے دس گنا زیادہ مصروف ہو گیا ہوں۔ اور اب میری مصروفیت میں روز بروز اضافہ ہونے کے امکانات خاصے روشن ہیں۔ سائرہ یہی تو میری کامیابی ہے اور میرے دل کے ارمان پورے ہونے کے دن ہیں۔ تم مجھے ان فضولیات میں الجھانے کی کوشش مت کرو، اچھی فرمانبردار اور تابعدار بیوی وہ ہوتی ہے جو ہر حال میں شوہر کے ساتھ تعاون کرے اور ایک پیار اور عزت کرنے والا شوہر وہ ہوتا ہے جو بیوی کی خامیوں کو درگزر کر کے اس کے ساتھ نبھا کرنے میں کسی قسم کی جھنجلاہٹ محسوس نہ کرے۔ میں نے تمہیں کتنی بار ریکوسٹ کی کہ پی ایچ ڈی کر لو مگر تم نے ہر بار اپنی ہی منطق پیش کر ڈالی۔ میں نے خاموشی اختیار کرنے میں مصلحت جانی۔ اب تم پر یہ فرض لاگو آتا ہے کہ مجھے وعدے یاد دلانے کی کوشش سے باز رہو۔ وعدے اور ضابطے و قانون تو توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ بھول جاؤ سب...... جہاں زندگی کے پانچ سال اس مصیبت و وبال کے بغیر گزر گئے ہیں۔ وہاں چند سال اور سہی، سائرہ بانو اپنی آزاد زندگی انجوائے کرو، خوش رہو اور اپنے شوہر کو بھی خوش رکھو۔ خواہ مخواہ ہی تمہارے دماغ کا کیڑا تمہیں پھر سے اکسانے لگا ہے۔ اپنا اور میرا سکون غارت مت کرو۔ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ میرے پاس بیمار ہونے کا بھی وقت نہیں، سوچ لو۔“ وہ مسلسل نان اسٹاپ بولے جا رہے تھے۔

”حسنات اب سن لیں کہ میں آپ کی کھوٹی نیت، کچے ارادوں سے بخوبی واقف تھی، آپ نے تو اپنے وعدے کی پاسداری ہی نہ کی مگر میں آپ کے وعدے کی قوت پر ماں بننے والی ہوں۔ یہ مژدۂ جانفزا آپ کو سنا کر یاددہانی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی داد وصول کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے باکی اور تیزی سے بولی تو حسنات حق دق اسے دیکھنے لگے۔ چند ثانیے کمرے میں خاموشی نے ڈیرے جمائے اور پھر اِک طوفان برپا ہو گیا۔

”میری اجازت کے بغیر...... مجھے بتائے بغیر، اتنا بڑا فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو، مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ اپنی جان کو تم نے پھر سے نئی آزمائش میں ڈال لیا ہے، پچھلا اپی سوڈ تم بھول گئی ہو؟ تم مرتے، مرتے بچی تھیں، کاش تمہیں میں نے مرنے دیا ہوتا تو آج تم اتنا بڑا دھوکا نہ دے پاتیں۔ خیر اب وہی پروسیجر تو دُہرانا ہی پڑے گا۔“ وہ سخت برہمی سے بولے۔

”آپ کا خیال ہے کہ میں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل تناول کیا ہے اور مجھے جنت سے نکال دیا جائے گا؟ اس دفعہ میں اس ٹائم پیریڈ سے بخیر و عافیت نکل چکی ہوں کوئی لیڈی ڈاکٹر اب مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ میں نے گستاخی اور غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ فیصلہ خالصتاً خدا کی طرف سے ہے۔ اب اسے نہیں

بدلوں گی۔"

"میں اسے اپنا بچہ ماننے سے انکار کرتا ہوں۔" انہوں نے الزام تراشیوں کی انتہا کر دی۔ اشتعال سے آواز اتنی بلند تھی جیسے کمرے کی چھت اڑنے والی ہو۔ "یہ ہے تمہاری اصلیت۔ بڑی نیک پروین ہونے کا دعویٰ کرتی ہو، سب بکواس اور ڈراما تھا۔" اسے لگا کمرے میں بادل گرجا اور پھر چند لمحوں بعد بجلی چمکی۔ جس نے آنکھیں چندھیا دی ہوں۔

"بی ہیو یور سیلف......" سائرہ نے بہ مشکل اٹھ کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔

"شوہرِ نامدار صاحب، آپ خدا نہیں ہیں۔ آپ لگالیں ایڑی چوٹی کا زور اور کر دیں مجھے آزاد، میں آپ جیسے ناشکرے انسان کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ اب یہ بچہ اس دنیا میں آ کر ہی رہے گا۔ اور یہ بچہ آپ کا ہے، اسی وقت اسپتال چلیں، ڈی این اے ٹیسٹ کرواتے ہیں کیونکہ آپ کا یہ شک اور وہم دور ہونا بہت ضروری ہے۔ میں جاہل، بے بس عورت نہیں ہوں کہ اس تہمت کو سینے میں دفن کر دوں گی۔" حسنات نے اپنے ہونٹ صاف کیے جو غصے میں جھاگ اگل رہے تھے اور پاؤں پٹختے ہوئے اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے۔ غصے اور خفگی میں زبان سے نکلے ہوئے تہمت زدہ کلمات پر ندامت تو نہ ہوئی لیکن سائرہ کے ایک فقرے نے بولتی بند کر دی تھی۔

اگلے دن کی شروعات بے حد بے یقینی اور مایوسی میں ہوئی...... حسنات نے اپنے مابین اس سے فاصلہ قائم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے ملازمین کو جو ہدایات دی تھیں وہ ایسی غیر متوقع تھیں کہ پل بھر کے لیے سائرہ پر پچھتاوؤں کی بھرمار ہونے لگی۔ وہ بلک، بلک کر دہائی دینے لگی۔ حسنات اِک چٹان بن چکے تھے۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھر نہ ہلے۔ سائرہ نے توہین و تذلیل کو برداشت کرتے ہوئے ملازمین کے ساتھ مل کر اپنا تمام ذاتی سامان گھر کے عقبی ایک وسیع بیڈروم میں شفٹ کر لیا پر وجود میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ازدواجی زندگی کے محاذ پر اس قدر ناکامی و شکست نے اس کے انگ، انگ کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

چار مہینے سائرہ نے بچے کو خوش آمدید کہنے کی تیاری میں صرف کر دیے۔ بچے کا کمرا وہی تھا جو ماں کا تھا۔ وہ خوشی، خوشی لاڈ پیار اور چاؤ سے کمرے کو سجا رہی تھی۔ جس کی حسنات کو خبر تک نہیں تھی۔ ان کا آمنا سامنا بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ کس حال میں تھی؟ اس کی طبیعت کیسی رہتی تھی۔ انہیں ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

سائرہ پُر امید تھی کہ بچہ آنے پر حسنات کا تمام غصہ اور ناراضی جھاگ کے مانند بیٹھ جائے گی اور آخر کار یہی بچہ ان کی ازدواجی زندگی کو بحال کر کے مسرتیں اور راحتیں بھر دے گا۔ ڈلیوری کے لیے اس کی ماں اور بھابی اسے لینے آئیں تو حسنات نے اپنی ناراضی اور مخالفت کی انہیں بھنک تک نہ پڑنے دی۔ سائرہ کو خوشی، خوشی ان کے ساتھ رخصت کر کے انہوں نے جو پہلا کام کیا کہ سائرہ کے کمرے سے بچے کی تمام چیزیں اٹھوا کر بے دردی سے گیراج میں پھنکوا دیں۔ ان کے سفلے پن اور خبیث پنے کی انتہا تھی۔

وہ کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے مگر سوچ سائرہ کے اردگرد گھوم رہی تھی۔ جس میں بھڑکتے شعلوں جیسی تپش اور جلن تھی۔ جو پل بھر کو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ سائرہ نے منہ پر ایسا چانٹا مارا تھا کہ ان کی تمام حسیات بیدار ہو کر ان پر تازیانے برسا رہی تھیں۔

جاری ہے

یہ ضروری تو نہیں

بشریٰ گوندل



وہ گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر تک آئی تھی مگر اتنے میں وہ ریڑھی والا گلی کا موڑ مڑ کر بغلی گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ غصے سے کھول اٹھی دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جائے اور اس کم بخت کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے کہ تمہیں کوئی اور گلی یا کوئی دوسرا محلہ نہیں ملتا اپنے یہ منحوس دہی بڑے بیچنے کے لیے۔

ایک سرد آہ بھر کے اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے قدم دہلیز پر جم گئے۔ چارپائی کے بیچوں بیچ بیٹھی عظمیٰ...... سی سی کرتی، آنکھوں سے پانی بہاتی ایسے چمچ بھر بھر کے دہی بڑے کھا رہی تھی جیسے کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ آخری چمچ منہ میں ڈال کر اس کی نگاہ دروازے میں حق دق کھڑی اماں پر پڑی تو وہ دنگ

رہ گئی اور منہ میں ڈالا چمچ نکالنا بھول گئی...... وہ پھُرتی سے اٹھی اور آستین سے منہ صاف کرتی پلیٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی حالانکہ پلیٹ وہ ایسی صاف کر دیتی تھی کہ اگر اماں نے گلی کا موڑ مڑتا ریڑھی والا نہ دیکھا ہوتا تو وہ پلیٹ سونگھنے پر بھی انہیں خبر نہ ہو پاتی کہ اس میں کیا ڈال کر کھایا گیا ہے۔

''گیٹ کیوں کھول کے بیٹھی ہوئی تھیں تم......؟'' الگنی پہ چادر لٹکاتے ہوئے اماں نے پوچھا۔

''وہ اماں...... ساجد ابھی ابھی باہر گیا ہے تو وہی کھول کے گیا ہے شاید۔''

''تو تم اٹھ کے بند نہیں کر سکتی تھیں، کوئی زمانہ ہے اس طرح دروازے کھول کے بیٹھ جانے کا اور میں ساجد کو تمہارے پاس بٹھا کے گئی تھی اس کو ایسا کون سا ضروری کام یاد آ گیا کہ میری واپسی کا انتظار بھی نہ کیا اور تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا؟''

''ہونہہ......'' وہ منہ ہی منہ میں بڑ بڑائی۔ ''مجھے اکیلا تو آپ ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں کوئی ننھی کاکی ہوں۔''

''اور میں نے تمہیں کتنا روکا ہے عظمیٰ کہ اس طرح دروازے پر ریڑھی والوں اور پھیری والوں کو نہ روکا کرو مگر تمہاری عقل میں تو کوئی بات ہی نہیں آتی۔''

''اماں...... وہ دہی بڑے کھانے کو بڑا دل کر رہا تھا...... سچی بڑے مزے کے تھے چٹ پٹے اور خوشبو دار......'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے چٹخارا لیا تو اماں نے ناگواری سے اسے دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

''زبان کا یہ ذرا سا چٹخارا عمر کا روگ بن جاتا ہے کبھی کبھی...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری بھولی، معصوم بیٹی......'' وہ چادر تان کر وہیں لیٹ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ دروازے کے سامنے کھڑی بڑی دیر تک ریڑھی والے کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا۔ وہ گلی کے کونے سے آتا دکھائی دیا کئی گھروں کے سامنے اس نے ریڑھی روکی جب اس کے دروازے کے سامنے آیا تو وہ اس سے الجھ پڑی۔

''میں نے تمہیں کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ تم اپنی یہ پھٹیچر اور منحوس ریڑھی لے کر اس گلی سے نہ گزرا کرو۔ خدا جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو کہ تمہیں سمجھ ہی نہیں آتی میری بات۔ آج کے بعد اس گلی سے اگر گزرے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ پھر ساری عمر ریڑھی چلانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔'' وہ مسکین صورت بنائے کھڑا تھا اس قدر کھلی دھمکی پر بوکھلا کر رہ گیا پھر پپڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''آپا میں غریب، مسکین بندہ ہوں اور آپ کو بھی مجھ سے لگتا ہے خدا واسطے کا بیر ہی ہو گیا ہے۔ میرا اور میرے گھر والوں کا رزق اس ریڑھی کے دم سے چل رہا ہے۔ سول کوارٹروں کی ان گلیوں میں میری بِکری زیادہ ہوتی ہے تو میں اِدھر نکل آتا ہوں۔ اس طرح تو جی ساری باجیاں مجھے اپنے بوہے کے سامنے سے گزرنے سے منع کریں گی اور میں غریب کنگال تو مارا جاؤں گا۔'' رقت زدہ لہجے میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔

لنڈے کی گھسی ہوئی پتلون اور شرٹ پہننے والا وہ نوجوان یقیناً کسی انتہائی غریب گھر کا لگتا تھا۔ مسکینی، عاجزی اور غریبی اس کے حلیے کے علاوہ لہجے سے بھی ٹپکتی تھی مگر رابعہ کو اس کی حالتِ زار کی ذرا پروا نہیں تھی تبھی اکثر اس سے الجھ پڑتی لیکن وہ چپ چاپ ریڑھی گھسیٹتا آگے چل پڑتا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے بارے میں جواباً کوئی بات کی تھی۔ سامنے والی ریحانہ کو اس پر ترس آ گیا جو اُن کی باتیں سن رہی تھی اس کے جانے کے بعد فوراً بولی۔

''وہ ٹھیک کہتا ہے رابعہ...... اس وچارے کے گھر کا چولھا اس ریڑھی کی بدولت ہی چل رہا ہے، باپ کی وفات کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے اس نے۔ بوڑھی اور بیمار ماں سمیت سات بندے اس دہی بڑے کی ریڑھی پر پل رہے ہیں، تم خود سوچو اس کمر توڑ مہنگائی میں کیسے پل رہے ہوں گے۔''

''جیسے دوسرے لوگ پل رہے ہیں، یہاں ہر کوئی بہ مشکل ہی گزارہ کر رہا ہے۔'' رابعہ پر ریحانہ کے بیان کا مطلق اثر نہ ہوا۔ ''بس میں صرف یہ چاہتی ہوں وہ اس گلی سے نہ گزرا کرے۔''

''وہ ٹھیک کہتا ہے تمہیں اس کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں وچارے کی روزی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو۔'' ریحانہ تاسف سے بولی۔

وہ لب بھینچ گئی، کچھ بھی نہ بولی وہ اس کو کیا بتاتی کہ جب گلی کے نکڑ سے دہی بڑے لے لو کی بلند صدا اس کی سماعتوں کو چھوتی ہے تو کیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جلے پیر کی بلی کی طرح وہ فوراً دروازے کی جانب لپکتی ہے اور جلدی سے دروازے کی کنڈی چڑھا دیتی ہے ایسا ہر بار ہی ہوتا ہے جب وہ گلی سے گزرتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی عظمیٰ کو دہی بڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر دہی بڑے کھانے کی فرمائش کرتی لیکن رابعہ اسے اس بری طرح ڈانٹ دیتی کہ وہ سہم جاتی پھر اکثر جب وہ دوپہر کو سونے کے لیے لیٹتی یا سوئی دھاگا نکلی، لیس یا دیگر اشیا لینے قریبی مارکیٹ تک جاتی تو عظمیٰ کو موقع مل جاتا۔ دہی بڑے کھانے کا...... وہ فٹافٹ ساجد کو بازار بھیج کر اپنے لیے دہی بڑے منگوا لیتی یا گلی سے گزرتے ریڑھی والے کو روک کر پلیٹ بھروا لیتی اور جلدی سے کھا کر اماں کے آنے سے پہلے پلیٹ دھو کر رکھ دیتی۔ اماں کو نہ جانے کیوں دہی بڑوں سے چڑ تھی بلکہ عظمیٰ کو تو یہ لگتا کہ اماں کو اس کی ہر بات سے خواہ مخواہ کی ضد ہے۔

''تم دروازے میں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟''

اچانک اماں کی آنکھ نیند سے کھلی تھی اور دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہونے پر وہ ننگے پاؤں بھاگی چلی آئی تھیں۔ عظمیٰ دروازہ بند کر کے پلٹی۔

''کہاں گئی تھیں تم؟'' ان کے تیور غضبناک ہوئے۔

''کہیں بھی نہیں اماں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر اندر کی جانب بڑھی تو اماں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''تو پھر دروازے پر کیا کر رہی تھیں تم......؟''

''اماں ساجد ابھی باہر نکلا ہے تو میں نے پیچھے سے دروازہ بند کیا ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر وضاحت دینے لگی۔ اماں نے اس کی کلائی تو چھوڑ دی لیکن مشکوک نظروں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اندر کمرے میں چلی گئی۔

اس کی اماں سخت مزاج اور جھگڑالو نہیں تھیں۔ بس کبھی کبھار بے جا سختی کر جاتیں وہ بھی صرف عظمیٰ کے ساتھ...... ساجد کے ساتھ ان کا رویّہ محبت سے لبریز ہوتا۔

اماں نے اس پر پابندیوں کے انبار لگائے ہوئے تھے۔ کسی سہیلی کے گھر جانے پر بھی پابندی تھی۔ حتیٰ کہ دروازے سے باہر جھانکنے تک پر پابندی تھی اور چھت پر جانے کی تو سخت ممانعت تھی۔ کوئی دور، قریب کا رشتے دار بھی نہ تھا، نہ محلے کے کسی گھر میں آنا جانا۔ کبھی کبھی اس چھوٹے سے گھر میں اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ رو پڑتی۔ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کے علاوہ اماں کے اس سوتیلے رویّے پر...... اماں نے اسے قید بنا کے رکھ دیا تھا صرف دو وقت کی روٹی اور عید...... بقر عید پر نیا جوڑا...... کیا صرف یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی ضرورتیں...... اتنی محدود زندگی، اتنی تھوڑی

ضرورتیں، وہ دل ہی دل میں اماں سے شاکی ہوتی۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن اماں نے آٹھویں جماعت سے ہی اٹھالیا۔ وہ بہت روئی، منتیں کیں لیکن اماں نہ مان کے دیں۔ اس کی سہیلیاں اب میٹرک کے بعد کالج میں جاتی تھیں اور وہ زنگ آلود ٹرنک کی طرح گھر کے کونے میں ڈال دی گئی۔

شاید ابا زندہ ہوتے تو حالات مختلف ہوتے۔ ابا کی بہت دھندلی، غیر واضح سی شبیہ اس کے ذہن کے پردے پر ثبت تھی۔

اس کے برعکس ساجد پڑھائی میں نالائق اور نکما تھا مگر اماں اسے بہت سا پڑھانا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ بہ مشکل میٹرک تک ہی جاسکا تھا، یوں اماں کے خواب ادھورے رہ گئے جن کا انہیں بہت قلق تھا اور وہ جو پڑھائی میں لائق فائق تھی مزید پڑھنے کی خواہش مند تھی۔ اس کے خوابوں پر اماں نے سختی سے پاؤں رکھ دیا اور اسے گھر کے کونے میں ڈال دیا۔ اوپر سے اماں کی شک بھری بے اعتباری نظریں جو ہر وقت اس کا بدن چھیدتی تھیں۔ اس کا دل لہولہو کرتی تھیں۔ وہ سیڑھیوں کے پاس سے گزرتی تو اماں کی سخت آواز اس کے قدموں کو زنجیر کرتی۔

''چھت پہ کیوں جارہی ہو...... چھت پر گئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری۔''

وہ وہیں پہلی سیڑھی پر بیٹھ کر اپنا جرم سوچنے لگتی۔

وہ بند دروازے کے آس پاس پھرتی تو عقب سے اماں پکارتیں۔

''عظمیٰ کہاں جارہی ہو؟ دروازے کے پاس کیا کام ہے؟''

اس کی آنکھیں پانی، پانی ہوجاتیں اور وہ پلٹ کر پنجرے میں بند ساجد کے طوطے کے پاس بیٹھ جاتی جو باہر نکلنے کے لیے چاروں کونوں میں پھیریاں لگاتا، پنجرے کے تاروں کو چونچ مار کر اپنی ہی چونچ زخمی کر لیتا۔ اسے اپنا آپ اس طوطے کی طرح لگتا۔ مجبور بے بس قیدی...... اوپر سے اس کے بدن کے آرپار ہوتیں اماں کی شک بھری نگاہیں۔

''کیا اماں کو مجھ پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے۔'' وہ سوچتی رہتی اور کڑھتی رہتی۔

بالخصوص کوئی ریڑھی والا صدا لگا کے جب گلی سے گزر رہا ہوتا تو اماں کو کوئی غیر محسوس بے چینی سی لگ جاتی۔ وہ جلدی سے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی کنڈی لگادیتیں اور پہلے سے بند دروازے کو اچھی طرح چیک کرتیں۔ عظمیٰ کن انکھیوں سے ان کی ایک ایک حرکت بغور دیکھتی۔

ایک دن وہ اماں سے پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہے اماں...... کیوں کرتی ہیں آپ اس طرح، کون سا وہم ہے جو آپ کے دل کو دہلائے رکھتا ہے؟ ایسی کون سی بے اعتباری ہے، میری ذات پر جو آپ کی نظر میں مجھے سرخرو نہیں ہونے دیتی۔ میں نے کبھی آپ کا بھروسا، آپ کا مان، آپ کا اعتبار توڑنے کی کوشش کی ہے؟ پھر آپ مجھ پر اتنی بے اعتباری کیوں کرتی ہیں؟ اتنے پہرے کیوں بٹھا رکھے ہیں؟ میں تو اماں سانس بھی آپ سے پوچھ کر لیتی ہوں۔ آپ کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی کبھی نہیں اٹھایا...... پھر آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں چھت پر اگر جاؤں گی تو باہر چھلانگ لگادوں گی...... دروازہ اگر کھولوں گی تو کسی کے ساتھ بھاگ جاؤں گی اور اگر کوئی اور نہ ملا تو اس دہی بڑے بیچنے والے کے ساتھ فرار ہوجاؤں گی، اس کی ریڑھی کا ڈنڈا اتھام کر......'' وہ جو اماں کی ہتھیلیوں پر سر رکھ کے زار زار روتے ہوئے اماں کے نامناسب رویّے کی وجہ پوچھ رہی تھی تڑپ اٹھی جب اماں نے ایک جھٹکے سے اس کا سر اپنے ہاتھوں سے اٹھایا اور کھینچ کے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا۔

''اگر آج کے بعد تم نے اس طرح کی بکواس

کی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی۔'' وہ سرخ ہوتے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اندر جاتی اماں کو دیکھتی رہی اور آنکھوں سے نکلتا گرم پانی اس کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا گود میں گرتا رہا۔

☆☆☆

کالے سیاہ اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، آسمان پر آخری تاریخوں کا مدھم چاند تھا۔ جو سیاہ رات کے آخری پہر کی تاریکی کو پوری طرح منور کرنے سے قاصر تھا اور تھکے ماند پڑتے ٹمٹماتے ستارے بھی رات سے جدائی پر اداس تھے۔

پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ وہ اگر پوری رات نہیں سو پائی تھی تو اس کی چارپائی کے ساتھ چارپائی جوڑ کے لیٹی اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ جاگی تھی۔

کچھ راتیں کتنی دکھ بھری اور طویل ہوتی ہیں کہ سویر کا انتظار کرتے، کرتے آنکھیں تھکنے لگتی ہیں۔ کیسی انکشاف بھری رات تھی اماں نے کوئی راز نہیں رکھا تھا کوئی بات بھی نہیں چھپائی تھی۔ پوری کہانی حرف، حرف سنائی دی تھی اسے، محبت کی اولین ساعتوں سے لے کر و چھوڑے کے کرب تک ہر بات لفظ بہ لفظ تکلیف دہ، ورق، ورق اذیت سے پُر۔

آج اس پر راز کھلا تھا کہ اماں کے وہم، خدشے، خوف، اندیشے اور وسوسے بے بنیاد نہ تھے ان کے پس منظر کوئی کہانی تھی۔ جسے سن کر عظمیٰ بلک، بلک کر روئی اور اپنے دل پر جمی سالوں کی گرد دھو ڈالی۔ وہ ہر وقت اماں سے شاکی رہا کرتی تھی وہ سارے گلے شکوے جاتے رہے۔

''عظمیٰ...... میری اماں کہا کرتی تھی کہ ماں بیٹی آپس میں سہیلیاں ہوتی ہیں اور سہیلیوں کے درمیان کوئی راز داری نہیں ہوتی اور بیٹی کو چاہیے کہ اپنی ہر بات ماں سے کہہ دے، کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھے، کوئی راز نہ چھپائے اور......'' اماں کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ ''اور مجھے دیکھو میں کیسی بدنصیب بیٹی تھی اور کیسی بے وفا سہیلی تھی اپنی اماں کی...... کہ ہر بات چھپائی ان سے، دل کے سارے راز پوشیدہ رکھے، ہوا نہ لگنے دی ان کو...... پھر بے وفائی کی سزا تو ملنی تھی ناں، ماں سے بے وفائی کی سزا۔''

☆☆☆

وہ اپنی کہانی کا ایک، ایک لفظ دُہرا رہی تھی۔ زخموں سے چور، چور کھرنڈ سے بے نیاز لفظ، وہ مالی کی بیٹی تھی۔ ابا کوٹھیوں اور بنگلوں میں پکا ملازم تھا ہاتھ میں صفائی اور نیک نیتی نے عزت کی چادر دے رکھی تھی۔ رابعہ سب بہن بھائیوں میں چھوٹی تھی اور گھر بھر کی لاڈلی، ابا سرِ شام گھر لوٹتا تو اس کے لیے پھولوں کا گلدستہ لاتا جسے وہ اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتی اور رات بھر خوشبوؤں کے حصار میں رہتی۔

وہ سب کی لاڈلی تھی بھائیوں کی، بہنوں کی، ابا کی، اماں کی...... بھائی اسکول سے واپسی پر اپنے، اپنے بستوں میں اس کے لیے ٹافیاں لانا نہ بھولتے، ابا پھولوں کے گلدستے کے ساتھ مٹھائی کا لفافہ لاتا جو سب میں برابر تقسیم ہوتی تو بہنیں اپنے حصے کا آدھا اس کی مٹھی میں دبا دیتیں۔ اماں کی تو وہ سہیلی تھی۔

''میری رابی تو میری پکی سہیلی ہے۔'' ماں کوئی لمحہ اس کے بغیر نہ رہ پاتی۔

پھر اس کو دہی بڑے کھانے کا چسکا لگ گیا۔ اب ابا بلا ناغہ اس کے لیے دہی بڑے لانے لگے، سی، سی کرتے ہوئے وہ دہی بڑے کی پلیٹ چٹ کر جاتی، آنکھوں سے ناک سے پانی بہتا رہتا، وہ اور مرچیں ڈال کر مزید چٹ پٹے بنالیتی اور سوں، سوں کرتی کھاتی رہتی۔ اسے مزید کی طلب رہتی۔ حالانکہ ماں اس کی صحت کے خیال سے منع بھی کرتی مگر جب گلی کے نکڑ پر ریڑھی والے کی مخصوص صدا ابھرتی تو وہ بھاگتی دوڑتی مٹھی میں نوٹ دبائے

دروازے سے باہر لمبی چوٹی کمر پر لہراتی جاتی۔

''کبھی کبھار کی بات اور ہوتی ہے رابی...... ہر روز دہی بڑے نہ کھایا کر، یہ مسالے صحت کے لیے اچھے نہیں ہوتے، معدے میں جلن ہو جاتی ہے۔'' اماں اس کی صحت کے لیے فکر مند ہوتی۔

''کوئی نہیں۔'' وہ بے پروائی سے کہتی۔'' اماں تجھے پتا ہے مجھے دنیا میں سب سے زیادہ دہی بڑے پسند ہیں۔ میرا دل کرتا ہے، دہی بڑوں کا بڑسا دیگچا ہو لبالب...... اور میں پیالے میں ڈالتی جاؤں کھاتی جاؤں...... ہائے مزہ آجائے قسم سے۔'' اس نے زور دار چٹخارا لیا۔ اماں سمیت دونوں، بہنیں بھی اس کے بچپنے پر ہنس دیں۔

''اماں...... میرا مشورہ ہے کہ اس کے لیے کوئی دہی بڑوں کی ریڑھی لگانے والا ہی ڈھونڈنا تا کہ دہی بڑوں کا شوق تو پورا ہو اس کا، ڈالتی جائے کھاتی جائے...... رج کے کھالینا دہی بڑے۔'' آپا کی ان دنوں نئی، نئی منگنی ہوئی تھی اماں کو اس کے حوالے سے آپا نے مشورہ دیا۔

''ہائے نی، کیوں خیری صلاّ...... میری دھی رانی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔'' اماں دلار سے بولی اور یہی وہ لمحہ تھا، ظالم اور قاتل لمحہ...... جب آپا کی مذاق میں کہی ہوئی بات اندر کہیں دل کے کسی خانے میں ترازو ہو گئی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

وہ کچی پکی عمر کے کچے پکے پل تھے اور آتی جوانی کی نادان رُتیں۔ بوڑھی دادی کہا کرتی تھیں کہ یہ اندھی عمر ہوتی ہے قدموں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہے پھر لوگ کچھ بھی نہیں کر پاتے، ٹھوکر کھائے بغیر نہیں رہ سکتے اور آدمی کو کیا خبر ہوتی ہے کہ ایک بار جو ٹھوکر لگی تو زندگی پھر ٹھوکروں کی زد میں آجاتی ہے۔

دادی یقیناً ٹھیک ہی کہتی تھیں...... کچھ غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے، کرتے عمر کی نقدی ختم ہو جاتی ہے لیکن سود پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ رابی کی الہڑ آنکھوں میں پہلا... پہلا خواب کیا اترا کہ بدن میں بے چینیاں بھر گئیں، زبان کا چٹخارا دل پر چٹکی لگا گیا، گلی کے نکڑ پر دہی بڑے والے کی مخصوص باجے کی آواز ''پاں'' ہوتی تو وہ ہر کام بھول کر گلی کی طرف لپکتی، ہر کام سے ضروری یہی لگتا، چٹ پٹا سا ذائقہ پورے بدن میں سرور سا بھر دیتا۔ دہی بڑوں سے لبالب پلیٹ پکڑتے ہوئے ہاتھ پکڑانے والے ہاتھ کے ساتھ ذرا کا ذرا مس ہوتا تو اس کے جسم میں جیسے مرچیں سی لگ جاتیں۔ کانپتے ہونٹ، لرزتی پلکیں، نئی، نئی آئی جوانی کے تمام لوازمات...... کوئی انوکھا اور کرارا سا ذائقہ تھا ہر گھڑی اور ہر پل میں، ریڑھی والے ارشد کی نظر بھی اپنے کام سے ہٹ کر اس گھڑی، گھڑی دروازے سے باہر جھانکتی لڑکی پر ٹھہر گئی تھی ایسی من موہنی صورت کہ وہ کاروباری حساب کتاب بھول جاتا۔

''دہی بڑے کی ایک پلیٹ لبالب۔''

''پیسے کتنے؟'' بند مٹھی کھلتی۔

''رہنے دیں، آپ سے پیسے کیا لینے۔'' آنکھیں اس کا سراپا ٹٹولتے نثار ہونے لگتیں۔

''ہائے اللہ......!'' اس کا دل بے ساختہ دھڑکا۔'' توبہ ایسا سخی اور پھر طرزِ تخاطب کتنا خوب صورت۔'' وہ سپنوں کے کسی جہان میں کھونے لگتی۔ ریڑھی کے ہینڈل پر اس کے لانبی انگلیوں والے مضبوط ہاتھوں کو دیکھتی تو اسے دنیا کا عظیم ترین کام یہی لگتا۔ دہی بڑوں کی ریڑھی کو گلی، گلی گھسیٹنا، بڑی آپا کو اماں کا دیا جانے والا مشورہ اسے سچ ہوتا دکھائی دیتا۔

''اماں اس کے لیے کوئی دہی بڑے بیچنے والا بر ڈھونڈنا۔'' اور جواباً اماں نے کہا تھا۔

''میری دھی رانی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے

گا۔'' اماں اس کی نظریں اتارتیں اور شہزادہ تو آ گیا تھا خود چل کر، اس نے اپنے سامنے کھڑے پتلے اور لمبے سے ارشد کو نظر بھر کر دیکھا اور نہیں تو کیا...... اور پھر شہزادہ تو وہی ہوتا ہے جس کو دل راضی خوشی اپنی سلطنت پر بٹھا دے اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ جائے اور رابعہ اس کے قدموں میں ہی بیٹھی تھی جب اس نے کہا تھا۔

''میں تو غریب سا بندہ ہوں رابی۔''

''میں تو جیسے کوئی امیر زادی ہوں ناں۔'' وہ ہنس دی، تحقیر زدہ ہنسی۔

''میرا بہت چھوٹا سا گھر ہے۔'' اس نے اگلی سچائی اُگلی۔

''میرا بنگلا بھی تم نے دیکھ رکھا ہے !'' وہ ایک بار پھر یونہی ہنس دی، بلا جواز، بلا ضرورت کہ ان دنوں ہنسی یوں ہی بلا ضرورت آتی تھی۔

''پھر بھی رابعہ......'' اس کے دل میں جانے کتنے وہم تھے مگر رابعہ بے پروائی سے اس کی سوچوں کو رفع کرتی گئی۔

''کچھ نہیں، تم دل میں کوئی وہم نہ پالو، جب میں خوش ہوں، مطمئن ہوں، مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے، باقی دنیا کی کوئی چیز نہیں۔''

کیسی سخاوت ہوتی ہے محبت کے مزاج میں کہ دنیا کی ہر شے کو ٹھکرا دو...... بس محبت کے لیے......

محبت کی اندھی پگڈنڈی پہ وہ آنکھیں بند کیے چلی جا رہی تھی جب اسے کسی سوچ کی ٹھوکر لگی۔''کیا اماں، ابا مان جائیں گے؟''

''پہلے میری کوئی بات کبھی ٹالی ہے؟'' دل اٹھلایا۔

لیکن یہ خام خیالی ثابت ہوئی ابا کو خبر ہونے سے پہلے ہی اماں نے اسے مار، مار کر نیل و نیل کر دیا تھا۔ اسے درد سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اماں نے جو کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا اب اتنی مار...... دو اس سے بڑی بہنیں، دو بڑے بھائی، چھوٹا سا گھر بھرا تھا بن بیاہے لوگوں سے...... پھر وہ کیسے بیاہ دی جاتی...... یہ سوچ تو اسے آئی ہی نہیں تھی اب اماں نے اچھی طرح سمجھا تو دی مگر سمجھ بوجھ کہاں تھی ان دنوں۔

''میری اماں کسی صورت بھی نہیں مان رہیں تمہارے گھر رشتہ لانے کے لیے۔'' اُدھر سے ارشد پریشان سا اس کے سامنے آیا اور درد میں اضافہ ہی کیا۔

''یہاں کون سا تمہارا رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔'' اس نے پورا دکھ بیان کیا۔

''اب کیا ہوگا ارشد......؟'' اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی ارشد۔'' اس نے سچی بات بتائی۔

''ہوں......'' ارشد کے ماتھے پر کسی گہری سوچ کی لکیر ابھری۔

پھر...... اندھی عمر کا اندھا فیصلہ کرتے ہوئے وہ ذرا نہ ڈگمگائی، اس کا دل ذرا نہ کانپا، اپنے جان سے پیارے رشتوں کو چھوڑتے ہوئے، اپنے باپ کی عزت کو قدموں تلے روندتے ہوئے۔ اپنی ماں کے اعتبار کو تار، تار کرتے ہوئے...... اپنے گھر کو اپنی جنت کو چھوڑتے ہوئے اور لڑکیاں جب جان بوجھ کر اپنی جنت کو چھوڑ دیتی ہیں تو سیدھی دوزخ میں جا گرتی ہیں۔

گھروں سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کو کیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ماں، باپ کا خیال نہیں آتا کیا......؟ زبان کی نوک پر دہی بڑوں کا محسوس کیے جانے والا صرف چند لمحوں کا چٹ پٹا سا ذائقہ اس سے اتنا بڑا فیصلہ کرا گیا کہ وہ راتوں رات گھر سے بھاگ گئی...... اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس کی ماں کیسے، کیسے بین کر رہی ہے، اس کی بہنیں ایسے روئیں جیسے کوئی کسی کے مرنے پر روتا ہے، اس کا

محنتی اور ایماندار باپ اپنی غلطیاں اپنے گناہ شمار کرتا رہا...... اور اس کے بھائی بے غیرتی کی چادر تان گئے۔ جو لڑکیاں، ماں، باپ کی عزت و آبرو کو رات کی تاریکی میں رول کے گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہیں ان کو پھر زندگی میں کہیں عزت نہیں ملتی۔ ارشد کی ماں نے اسے بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیاں بہویں نہیں ہوتیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے بددعائیں دیتی...... اور بددعاؤں کی بنیاد پر بننے والے گھر تو نمک کے مکان ہوتے ہیں۔ قطرہ، قطرہ آنسو سے ٹوٹ جانے والے، اس نے جان لڑادی، گھر نہ ٹوٹے کہ اپنے پیچھے تو وہ اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کرآئی تھی۔

ساس کی نگاہ میں وہ کھٹکتی رہتی۔ اس کا ہر عمل ناقابلِ قبول ہوتا، اسے ہر، ہر جگہ پر گھر سے بھاگی ہوئی، بے حیا لڑکی کا طعنہ ملتا، وہ کان لپیٹ لیتی، ہونٹ سی لیتی...... دل روتا رہتا، بدن دکھتا رہتا، جب ارشد ذرا، ذرا سی بات پر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ وہ نیل و نیل بدن پر ٹکوریں کرتی رہتی۔ اس کے کہیں بھی آنے جانے پر پابندی تھی، بننے سنورنے کی ممانعت تھی، اس کی محبت نے تو بدلے میں گویا اسے عمر قید با مشقت سنا دی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا، کوئی تھکن سی پورے بدن میں پھیلتی پوروں کو چھونے لگتی۔ وہ چھت پر دو گھڑی کے لیے کھلی ہوا میں سانس لینے جاتی تو ارشد کی دہاڑ اسے سہما دیتی۔

”چھت پر کسے دیکھنے جاتی ہو تم روز روز...... کوئی اور ریڑھی والا پھانسنے کا ارادہ ہے، دہی بڑوں سے اور دہی بڑے بیچنے والے سے دل بھر گیا ہے کیا......؟“ وہ چوٹی سے پکڑ لیتا اور بڑی زور کی مار مارتا۔ وہ بے اعتبار عورت تھی پھر وہ اعتبار کیسے کرتا بھلا......!

وہ چپ چاپ ویران و بیابان آنکھوں سے اپنے محبوب کو دیکھے جاتی۔

دیواروں میں چنے، چنے سال صدیاں ہو کر گزرنے لگے، پہلے ساجد زندگی میں آیا پھر عظمیٰ چلی آئی، ٹھیک کہتے ہیں لوگ بچے جینے کا سہارا ہوتے ہیں وہ بھی دونوں بچوں کی آس میں جینے لگی۔

ایک دن نہ جانے اس کے جی میں کیا سمائی وہ ان جانی پہچانی گلیوں میں چلی آئی جہاں ابا کی انگلی پکڑ کر کتنی بے فکری سے گھوما کرتی تھی، بچپن سے لڑکپن اور جوانی تو ابھی آدھی پونی ہی آئی تھی کہ اس نے وہ گلیاں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ اس لمحے اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رو دیا جب خبر ملی کہ وہ لوگ تو بڑا عرصہ ہوگیا کہ یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ ابا کو کتنی محبت تھی اس محلے سے، اس گھر سے جس کی ایک، ایک اینٹ میں گارے کی جگہ ابا کا پسینہ لگا تھا۔

کیا بیٹیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ والدین کو زمانے بھر میں رسوا کر کے در بدر کر دیں......؟ اور شاید اسی خوف کے پیشِ نظر لوگ بیٹیوں کی پیدائش پہ دھاڑیں مار کے روتے ہیں۔

”کاش! میں پیدا ہوتے ہی مرجاتی۔“ اس کا دل اپنے ہی لہو میں ڈوبا، وہ دیر تک روتی رہی جیسے کوئی کسی کے مرجانے پر روتا ہے، اتنا تو وہ پھر زندگی بھر نہیں روئی تھی ارشد کے ایکسیڈنٹ کے بعد دس دن کوما میں رہنے کے بعد مرجانے پر بھی نہیں...... بس وہ آنسوؤں سے بے نیاز خشک آنکھوں سے کورے کفن میں لپٹے اس شخص کو دیکھتی رہی جس کے پیچھے، پیچھے چلتے، چلتے وہ اپنی جنت چھوڑ آئی تھی۔ جس کے لیے اس نے خود سے وابستہ اپنے پیاروں کو کھویا تھا اور خود کو بے سکون کر لیا تھا ہمیشہ کے لیے...... ماں، باپ کو دکھ دے کر کون سکون سے رہا ہے بھلا......؟

ارشد کی موت کے بعد وہ ایک کپڑے کی فیکٹری میں ملازمت کرنے لگی۔ چنانچہ گھر کا چولھا ٹھنڈا ہونے سے محفوظ رہا۔ اس کی ساس جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہار نہ سکی اور چند ماہ کے اندر ہی...... چٹ پٹ ہوگئی۔

جن لوگوں کا جینا دوسروں کے لیے اذیت کا باعث ہوتا ہے، ان کے مرجانے سے زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ساجد کو تعلیم یافتہ بنا کے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا مگر ساجد بھی ارشد کا بیٹا تھا۔ بہ مشکل میٹرک تک گیا اور میٹرک میں بری طرح فیل ہونے کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بھیجنے لگی کہ فارغ رہ کر کسی غلط صحبت میں نہ پڑ جائے۔ عظمیٰ اگرچہ پڑھائی میں لائق تھی اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا لیکن مڈل کے بعد رابعہ نے اسے مزید پڑھنے سے روک دیا۔ اور خود فیکٹری کی نوکری چھوڑ کر گھر میں ہی سلائی کا کام کرنے لگی...... اور اب سارا دن بیٹی کی نگرانی میں گزار دیتی، اس کے پل، پل کی خبر گیری کرتی، لمحے، لمحے کا حساب مانگتی...... وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے ذرا سی چوک ہو اور اس کی بیٹی چور رستے تلاش کر کے ان راہوں کی مسافر بنے جن...... پر چل کر اس نے اپنے قدم آبلہ پا کیے تھے۔

لیکن آج اس کی بیٹی نے اسے کیسا آئینہ دکھایا تھا کہ وہ گہرے صدمے میں تھی۔ اس کی بیٹی نے ٹھیک سمجھا تھا، واقعی یہ خوف اس کے دل کے ساتھ کسی...... امربیل کی طرح چمٹا ہوا تھا کہ وہ اگر ذرا سی بھی چوک گئی تو اس کی بیٹی گھر کی دہلیز پار کر جائے گی...... وہ اس کی رکھوالی کر رہی تھی کیونکہ اسے اپنی ماں سے ہمیشہ یہی شکوہ رہا کہ ماں نے اس کی اچھی طرح رکھوالی نہیں کی...... ایک ماں ہونے کے ناتے اسے پتا ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بیٹی غلط رستوں پر چل نکلی ہے۔ مائیں تو بیٹیوں کے چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ پہچان کر خطرے کی بُو پا لیتی ہیں۔ گھر میں بیٹیاں جوان ہوں تو مائیں سونا بھول جاتی ہیں، وہ کیسی ماں تھی......! اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

”شاید میری ماں کو مجھ پر بھروسا تھا کہ وہ غافل ہوگئی...... اور میں نے اس کے بھروسے کو، مان کو، اعتبار کو راتوں رات مٹی میں ملا دیا۔“ کوئی گلیشئر تھا جو پگھلا تو آنکھوں کو پانی، پانی کر گیا۔

”میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بیٹیاں تو مان ہوتی ہیں، بھرم ہوتی ہیں، عزت و آبرو ہوتی ہیں، رشتوں کا، نسلوں کا، خاندانوں کا...... اور بیٹیوں پر تو بڑی بھاری ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ یہ بھرم نہ توڑیں۔ میری ماں سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ محبت کے ساتھ مجھ پر اعتبار کرتی رہی مگر رکھوالی کرنا بھول گئی۔ اگر غلطی میری ماں سے ہوئی تھی تو صحیح میں بھی نہیں کر رہی، ورنہ میری بیٹی مجھ سے اس طرح شاکی نہ رہتی۔ میں رکھوالی تو کر رہی ہوں مگر بے اعتباری کے ساتھ...... اس طرح تو میں انجانے میں اسے بغاوت کی راہ دکھا رہی ہوں...... میری بیٹی کہتی ہے کہ اماں مجھ پر اعتبار کر کے دیکھو تو......“ اس نے آسمان کے کناروں سے پھوٹتی صبح کی سفیدی کو دیکھا مقدس اور پاکیزہ...... اندھیرے کا نام و نشان بھی نہیں تھا، ایک نیا سورج طلوع ہونے کو تھا۔

آنسو صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک نئے عزم کے ساتھ...... اللہ سے استقامت مانگتے ہوئے وہ پُرسکون تھی۔ اسے اپنی بیٹی کی سہیلی بننا تھا اور نگران بھی...... اور اسے یقینِ کامل تھا کہ اس کی بیٹی اس کا مان نہیں توڑے گی...... یہ ضروری تو نہیں کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوں۔ اس نے اٹھ کر پرانے بکسے کا ڈھکن کھولا جس میں عظمیٰ کی کتابیں رکھی تھیں جن پر اب سورج کی پہلی کرن پڑ رہی تھی گویا روشنی دور نہیں تھی۔

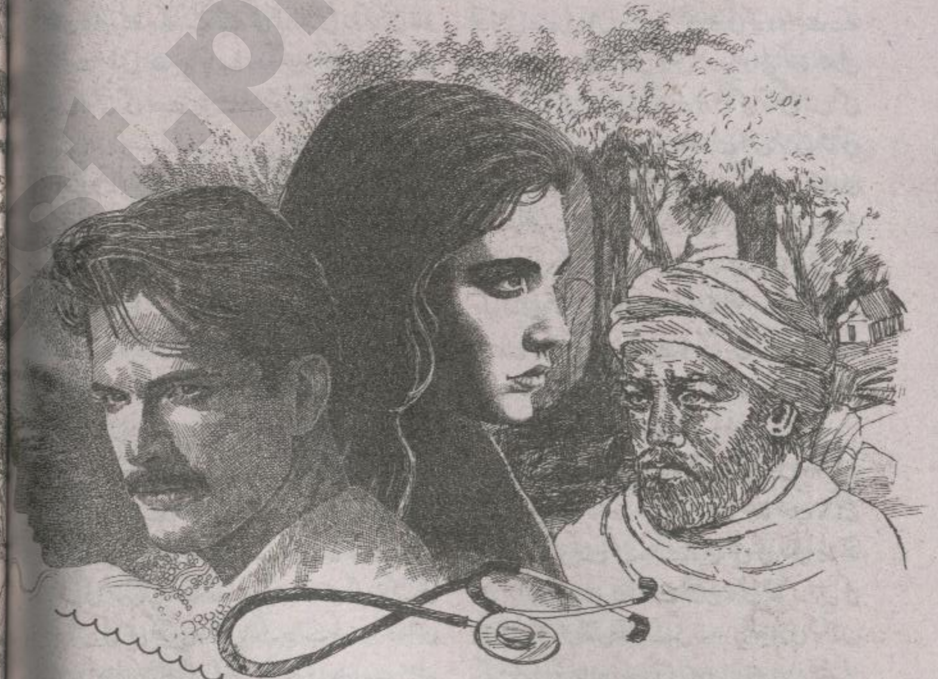


منی ناول

جنگل کا پھول

زاہدہ پروین

دوسرا حصہ



موسم سرما کا آغاز تو ہو ہی چکا تھا اور اب بارش برسنے کی وجہ سے سردی میں معمول سے زیادہ اضافہ ہو چلا تھا۔ ٹھنڈی ٹھار ہواؤں کے بوجھل جھونکے ٹھڑائے دے رہے تھے۔ گھروں کے اندر ہی کچھ سکون کا احساس ہوتا۔

شام کے چار بجے کا وقت تھا مگر بادلوں کے باعث مغرب کے وقت کا گمان ہوتا تھا۔ شاید رات گئے تک بادل دوبارہ برس جانے کا امکان ہو۔ اپنے

گھر کے برآمدے میں ڈاکٹر خاور اس وقت اکیلے ہی ایک آرام کرسی پر آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ فضا میں پُرسکون سی خاموشی کا راج تھا۔

اچانک ان کی بہن معصومہ، ملازمہ سے ٹرے اٹھوائے چلی آئی اور میز پر چائے کے لوازمات سجانے لگی۔ دوسری طرف سے روبی بھی آتی نظر آئی...اور آتے ہی پوچھنے لگی۔۔

''امی جان آرہی ہیں جلدی سے بتاؤ وہ ٹیوٹر کیوں نہیں آئی، اب تک؟'' خاور چونک کے سیدھے ہوئے۔

''اماں سے مار تو کھانی نہیں مجھے۔ کیا فائدہ کل کو میرا نام آئے بیچ میں۔'' وہ آہستہ سے بولے۔

''تمہارا نام کیسے آئے گا؟ یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟'' روبی نے حیرانی سے کہا۔

''کہا تو کسی نے نہیں۔'' انہوں نے بن کر جواب دیا۔ ''بس میرے دماغ نے خود ہی سوچ لیا۔''

''واہ! کیا کہنے جناب کے دماغ کے۔'' روبی نے مذاق اڑایا۔ ''یہ کہیے کہ بے پر کی اڑائی ہوگی۔''

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' وہ سنجیدہ ہوکر بولے۔

''ایک تو کیا دو، دو پر ہیں اس اطلاع میں۔'' اب کے معصومہ نے بھی دخل دیا اور منہ بنا کر بولی۔

''ہمیں تو کوئی پر ور دکھائی نہ دیے۔ اتنی آس بندھ گئی تھی کہ تینوں شیطانوں کا بندوبست ہونے والا ہے مگر کچھ نہ ہوا۔'' اس دفعہ روبینہ نے مصلحت سے کام لیا اور جلدی سے بولی۔ ''یہ وعدہ ہے خاور کہ تمہارا نام کہیں نہ آئے گا۔ ممانی جان کو کانوں کان خبر نہ ہو پائے گی کہ ٹیوٹر کا انتظام کس نے کیا اور کون اسے یہاں تک لایا ہے۔''

''دراصل ان کو کوئی مصروفیت ہوگئی تھی۔ میں نے معلوم کیا تھا بہر حال اب دوبارہ کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔'' خاور نے دل ہی دل میں مطمئن ہوکر کہا۔

''اچھے خاور بھائی صرف کوشش نہیں بلکہ سچ مچ آپ اسے لے کر آجائیں۔ ورنہ یہ تینوں مجھے تو جلا جلا کر ختم کر ڈالیں گے۔'' معصومہ نے آنے والے مصنوعی خدشے کا اظہار کیا۔ خاور کو اس کی آہ و زاری پر ہنسی آگئی۔ اسی وقت ان کی اماں نائمہ بیگم اور پھوپی شمسہ آپہنچیں۔ چائے کے دوران ہی خاور کے بڑے بھائی بابر بھی ڈیوٹی آف کر کے آپہنچے۔ یہ شام کے ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھے۔ دن میں اپنا کاروبار دیکھتے تھے۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ روبینہ انہی سے منسوب تھی جو کہ پھوپی زاد تھی۔

''مہینے بھر سے زیادہ ہوگیا ہے خرم کو ملازمت پر گئے کوئی خیریت نہ ملی۔'' نائمہ بیگم چائے پیتے ہوئے فکرمندی سے بولیں۔

''خیریت سے ہی ہوگا... انشاء اللہ۔ ان اطراف میں غالباً فون کی سہولت نہیں ہے۔'' بابر نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

''جنگل بیابان میں کیسا اکیلا پڑا ہوگا میرا بچہ۔ ہر وقت ہول آتے ہیں۔'' ان کی بات پر پھوپی شمسہ تسلی آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

''اس میں ہولنے کی کیا بات ہے۔ مردوں کو تو پردیس سدھارنا ہی پڑتا ہے۔ مہینہ بھر تو موئی بارش ہی برستی رہی ہے۔''

''ایک تو......خرم بھیا کی ملازمت بھی کس قدر خطرناک ہے جنگلوں ویرانوں کی۔ اُدھر کے کچے راستے تو زیرِ آب آچکے ہوں گے۔'' معصومہ رنجیدگی سے بولی۔

''بی بی کیا یاد دلا دیا تم نے۔ آج رات تو مشکل سے نیند آئے گی۔'' نائمہ بیگم نے بے اختیار جھرجھری لی۔ پھوپی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں معصومہ کو ڈانٹا پھر بظاہر ہنس کر کہا۔

''بھئی تم تو بچوں سے بدتر ہوگئیں بھلا یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہوئی! انشاء اللہ آجائے گا ایک دو دن میں ورنہ ان دونوں میں سے کوئی جا کر خیر صلا معلوم کر آئے گا کیوں بھئی بابر؟'' انہوں نے

بڑے بھتیجے سے تائید چاہی۔

"جی... ہاں...... کیوں نہیں۔ جب اماں چاہیں۔" بابر اور خاور دونوں بیک وقت بولے۔

"تم دونوں خود منہ اندھیرے کے نکلے رات گئے گھر میں گھستے ہو اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" اماں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"ممانی جان، افشاں کو حساب کے مضمون میں بڑی دقّت پیش آرہی ہے، ہر روز مجھ سے مدد چاہتی ہے مگر میرا بھی یہ سبجیکٹ کمزور ہے۔ آخر ان کا ٹیوٹر کہاں گیا... آتا کیوں نہیں؟" روبینہ نے موضوعِ گفتگو بدل دیا اور فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں یہ بات تو درست ہے۔ شام میں خیر سے ایک جگہ بیٹھ کر پڑھتے تو تھے۔ شامی اور نومی نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے بلواؤ بھئی ان کے ماسٹر کو۔" پھوپی شمسہ سر ہلا کر بولیں باتوں کا رخ بالکل بدل گیا۔ سب اپنا اپنا اظہارِ خیال کرنے لگے۔

"ارے بھئی! میں کیا کرسکتی ہوں۔ وہ ٹیوٹر خرم کا رکھا ہوا تھا۔ وہ آئے تو معلوم ہو کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ میں خود ان بچوں کی نالائقیاں سن کر عاجز آچکی ہوں۔ دن رات کھیلنے کودنے اور گیند بلّے سے برتن، کھڑکیاں توڑنے کے سوا کوئی شغل نہیں ہے ان کا۔" نائمہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"یار تمہی دوسرے ٹیوٹر کو دیکھو کہیں۔ اس طرح تو واقعی یہ تینوں بہت حرج کرلیں گے اپنی تعلیم کا۔ خرم جب آئے گا تب آئے گا۔" بابر نے خاور سے مخاطب ہو کر کہا۔ خاور نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔

"بھائی جان میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟ سارا دن تو اسپتال میں گزر جاتا ہے ٹیوٹر ڈھونڈھنے کہاں جاؤں؟"

"ارے بیٹا! کہنے سننے سے سب مسئلے حل ہو جاتے ہیں کسی سے ذکر تو کرو۔" پھوپی اپنی بات کہہ کر پھر بابر سے کہنے لگیں۔

"تم بھی اپنے حلقۂ احباب میں تذکرہ کردو۔ کہیں نہ کہیں سے تو کوئی ماسٹر ہی مل جائے گا۔ ہم بھی اپنے ملنے جلنے والوں سے کہیں گے۔"

ابھی ان کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ سب چونک کر سامنے دیکھنے لگے۔ خرم ابھی ابھی اندر داخل ہوا تھا۔ نائمہ بیگم کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا۔ معصومہ بھاگ کر اس سے جا چمٹی اور چلّا کر بولی۔

"ارے میرے خرم بھائی آگئے۔ ابھی سب آپ کو ہی یاد کر رہے تھے۔"

خرم نے پیار سے اسے ایک چپت لگائی۔ آگے بڑھ کر ماں اور پھوپی کو سلام کیا۔ بھائیوں سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا۔

"کیسے مٹی میں سنے ہوئے آئے ہو جیسے لوٹ کر آئے ہو دھول میں۔" روبی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں واقعی، خاک دھول میں اٹا پڑا ہے۔" شمسہ پھوپی بولیں۔

"سفر بھی اتنا لمبا ہے پھوپی اماں کہ بس تھک کر چور ہو جاؤ۔ لائیں چائے پلوائیں پھر غسل کر کے فریش ہو جاؤں گا۔" خرم نے کہا۔

معصومہ جا چکی تھی۔ خادمہ نے مزید لا کر چائے کا سامان لگایا۔ روبی نے ان کی خاطر تواضع شروع کردی۔

"خرم، تمہارے جنگل میں مرغابیاں، تیتر اور بٹیر تو خوب ہوں گے؟" خاور نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو بابر بھی ان کی طرف متوجہ ہو کر سننے لگے۔

"ظاہر ہے، جنگل میں جنگلی جانور تو ضرور ہی ہوں گے۔" خرم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر ہو جائے کسی دن شکار وکار؟" خاور خوش ہو کر بولے۔ خرم نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"شکار تو ہوسکتا ہے وکار کا معلوم نہیں۔"

"وہ...... مارا......!" خاور خوشی سے اچھل پڑے۔

”جیتے رہو خرم...... تم نے دل خوش کر دیا۔“

”یار! تیتر بٹیروں کا شکار بھی بھلا کوئی شکار ہوتا ہے۔ بچوں کا کھیل، شکار کے لیے جانا ہے تو کسی شیر یا چیتے کا شکار تو ہو۔“ بابر مایوسی سے سر ہلا کر بولے۔

”یہ...... بڑا شکار تو اس جنگل میں دستیاب ہی نہیں ہے۔“ خرم نے چائے کا گھونٹ بھر کر جواب دیا۔

”بیکار ہے پھر۔“

”کیوں، کیوں بیکار ہے؟“ خاور نے بچوں کی طرح بلبلا کر کہا۔ ”بھائی جان، آپ مت جایئے گا مگر میں تو ضرور شکار کروں گا۔ مرغابیوں اور تیتروں کا۔ بہت عرصہ ہوگیا ہے بندوق اٹھائے ہوئے۔“ بابر ہنسنے لگے تو خرم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھئی شور مت مچائیں۔ اس دفعہ میں جاؤں تو چلیے گا میرے ساتھ۔ میرا کیا ہے اپنا شوق پورا کر لیجیے گا۔ پرسوں ایک دیہاتی نے مجھے چند بارہ سنگھوں کا اتا پتا بھی بتایا تھا۔ انہیں بھی دیکھ لیں گے۔“

”بارہ سنگھے؟ بارہ سنگھے کہاں دیکھے اس نے؟“ بابر نے چونک کر پوچھا۔

”میرا ریسٹ ہاؤس جس علاقے میں ہے وہاں سے خاصے فاصلے پر ایک ایسی پگڈنڈی ہے جو دو گاؤں آپس میں ملاتی ہے۔ جہاں گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ ہے۔ گھاس کے قطعے اور پگڈنڈی کے درمیان ایک پتلی سی پانی کی نالی نما ندی بھی بہہ رہی ہے جو ابھی تک برسات کے پانی سے بھری ہوئی ہے۔ اس نے بارہ سنگھوں کو اسی قطعے میں گھومتے پھرتے دیکھا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر شکار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ خرم نے سنجیدگی سے بتایا۔

”اور...... اس فیصلے میں، میں بھی شامل ہوں۔ خاور نے سچ کہا ہے کہ شکار پر گئے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔“ بابر فوراً فیصلہ کن انداز میں بولے۔

تینوں بھائی مل کر شکار کا پروگرام ترتیب دینے لگے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ نائمہ بیگم اور شمسہ پھوپی اٹھ کر جا چکی تھیں ورنہ کم از کم نائمہ بیگم تو ضرور مخالفت کرتیں۔

☆☆☆

مرحوم باقر علی اور شمسہ بیگم دونوں سگے بہن بھائی تھے۔ نائمہ بیگم ان دونوں کی خالہ زاد بہن تھیں بعد میں نائمہ بیگم کی شادی باقر علی صاحب سے ہوئی۔ بنیادی طور سے وہ ایک کھاتے پیتے گھر کے زمین دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے کچھ شہری جائداد بھی تھی۔ شمسہ بیگم کے شوہر متین احمد بھی زمین جاگیر والے تھے۔

باقر علی صاحب کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ بچے ہوشیار ہو چکے تھے۔ بڑے بیٹے بابر علی لیکچرار اور منجھلے بیٹے خاور ڈاکٹر بن چکے تھے۔ خرم محکمۂ جنگلات میں فاریسٹ آفیسر تھا ـــ معصومہ بی ایس سی کے بعد گھر میں امورِ خانہ داری میں منہمک ہو چکی تھی۔ سب سے چھوٹے شامی اور نومی تھے۔ ایک لحاظ سے مرحوم ایک بھرا پُرا...... کُنبہ چھوڑ کر گئے تھے۔ مالی مسائل کوئی نہ تھے مگر نائمہ بیگم بہت تنہا رہ گئی تھیں گو کہ جوان بچوں کی ماں تھیں مگر ان کے دکھ روئے نہ کٹتے تھے۔ شوہر کی جدائی سے وہ اپنے آپ کو قطعی تنہا سمجھنے لگی تھیں۔ انہیں کسی صورت چین و قرار نہ تھا۔

سمجھانے والے سمجھا سمجھا کر تھکے۔ ہر طرح کی دلیلیں اور مثالیں دی گئیں ظاہر ہے قانونِ قدرت میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اوپر والے کے فیصلوں پر سب کو سر جھکانا پڑتا ہے اور پھر وقت بڑے سے بڑا گھاؤ بھر دیتا ہے۔ آتے، آتے قرار آ ہی جاتا ہے۔ جانے والا اگر ان کا شوہر تھا تو کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا بھی تھا۔ ہر کسی کو اپنے، اپنے رشتے کے حوالے سے پیارا اور عزیز تھا مگر نائمہ بیگم فقط اپنی ہی ذات کو مظلوم سمجھ رہی تھیں۔ بات، بات پر ہر بڑے چھوٹے کو کھانے کے لیے دوڑتیں، ذرا، ذرا سی بات پر جھڑک دیتیں۔ برا بھلا کہنے لگتیں...... نہ بچے کو بچہ سمجھنے پر تیار ہوتیں نہ بڑے کو بڑا۔

بڑی سی کوٹھی بھائیں، بھائیں کرنے لگی تھی۔ بچے بڑے ہونے کے باوجود سہم کر رہ گئے تھے۔ بابر، خاور اور خرم آپس میں باتیں کرنے تک سے جھجکنے لگے تھے۔ معصومہ، شامی اور نومی حد درجہ سہمے، سہمے رہتے۔ گھر کے نوکر چاکر خائف رہنے لگے۔ وہی کوٹھی جہاں بچوں کے قہقہے گونجا کرتے تھے ویران سی ہو کر رہ گئی۔ دن دہاڑے الو بولنے لگے مگر افسوس کہ نائمہ بیگم کو ان حالات سے قطعی کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ وہ منہ لپیٹے کمرے میں پڑی رہا کرتیں۔ بجائے اس کے کہ بیٹھ کر بچوں سے رائے مشورہ کرتیں، آگے کا لائحہ عمل طے کرتیں سر پر سو بکھیڑے پڑے تھے۔ سب میں بڑی فکر تو یہی کرنی چاہیے تھی کہ اب شہر سے باہر کی اراضی کے معاملات کون سنبھالے گا؟ لڑکے تو اپنی، اپنی ملازمتوں اور دفتری معاملات میں ہی پورے تھے۔ جب شوہر حیات تھے... کوئی فکر فاقہ نہ تھا مگر اب تو بہر حال اللہ کی مرضی پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے حالات پر خصوصی توجہ کرنی چاہیے تھی لیکن وہ اپنی اولاد کی دلجوئی اور رہنمائی تو کیا کرتیں بلکہ حد سے زیادہ چڑچڑی اور بد مزاج ہو چکی تھیں۔ چوبیس گھنٹے ان کا موڈ خراب ہی رہتا غرضیکہ گھر کے حالات اور ماحول قابلِ رحم ہو چکے تھے۔

اس زبوں حالی کے زمانے میں جبکہ اپنے پرائے سب کے سب نائمہ بیگم کے آدم بیزار اور دل آزردہ رویّے کی بِنا پر مرحوم باقر علی کی فیملی سے کھنچے، کھنچے اور کٹے، کٹے رہنے لگے تھے۔ شمسہ بیگم نے ایک انتہائی قدم اٹھایا۔ ایسا انہوں نے قطعی مجبور اور لاچار ہونے کے بعد کیا تھا اور وہ یہ کہ اپنے شوہر متین احمد کو مجبور کر کے اچانک نقل مکانی کر لی اور بھاوج سے پوچھے بغیر ان کے ہاں اٹھ آئیں۔

یہ ایک ایسا قدم تھا جو عام حالات میں عجیب و غریب معلوم ہوتا مگر قریبی احباب جو بھی ان معاملات کی پیچیدگی کو سمجھ رہے تھے سب نے شمسہ بیگم اور ان کے میاں کی فہم و فراست کو داد دی اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

شمسہ بیگم نہایت بردبار، دور اندیش اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ اپنی بھاوج اور خالہ زاد کے مزاج اور افتادِ طبع سے خوب آگاہ اور واقفِ حال تھیں۔ ان کے ہاں کا رتی، رتی حال جانتی تھیں۔ نائمہ بیگم کے چڑچڑے پن اور بے حسی کو تاڑ کر اندر ہی اندر خوف زدہ رہنے لگی تھیں۔ بھتیجی، بھتیجوں کی ذہنی پریشانیوں، بھاوج کی پیدا کردہ الجھنوں اور مرحوم بھائی کے گھر کی گرتی دیواروں کو سہارا دینے آ پہنچیں۔ خود شمسہ بیگم کی عمر بھر کی کمائی دو ہی بیٹیاں روبینہ اور افشاں تھیں۔ بڑی روبینہ کی نسبت باقر علی کی زندگی میں ہی بابر سے طے ہو چکی تھی۔ سب کے باہمی مشورے سے ان کی کوٹھی کے برابر خالی پلاٹ پر دوسری کوٹھی تعمیر کروائی گئی اور شمسہ بیگم نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان اندر ہی اندر تین دروازے ہمہ وقت سب کی آمد و رفت کے لیے کھلے رہتے۔ یوں دو کنبے بظاہر الگ، الگ لیکن حقیقتاً ایک دوسرے کا سہارا اور غمگسار بن کر رہنے لگے۔

شمسہ بیگم کے آنے سے نائمہ بیگم کو دل ہی دل میں بے حد تقویت اور تسلی کا احساس ہوا۔ گھر کی چہل پہل میں اضافہ ہوا۔ قدرے رونق سی رہنے لگی۔ کوٹھی کا ماحول جو ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ کئی افراد کے اضافے سے بحال ہونے لگا خود نائمہ بیگم کا جی بھی بہلنے لگا۔ وہ کافی سنبھل گئیں۔ ان کا جمود ٹوٹا تو وہ تنہا کمرے کی ویرانی سے نکل کر باہر بیٹھنے لگیں۔ مرحوم کی کمی تو اب تا حشر بھی پوری نہ ہو سکتی تھی مگر کسی حد تک متین احمد نے ازالہ کرنا چاہا اور اپنی خلوصِ دل سے کی گئی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے زمینوں کا نہایت منصفانہ انداز سے مکمل چارج سنبھال لیا تھا اور یہ اہم ترین ذمّے داری اپنے سر لے کر درحقیقت انہوں نے ان یتیم

بچوں کے پھوپا صاحب ہونے کا حق ادا کردیا تھا۔

یہی سبب تھا کہ ان لڑکوں کے دلوں میں پھوپی اور پھوپا کی قدر اور منزلت پہلے سے بھی سوا ہوچکی تھی۔ پھوپا نے اگر بروقت باپ کی طرح سایہ فگن ہوکر سنبھالا دیا تھا تو پھوپی نے انتہائی آزمائش کے موقع پر نقل مکانی کرکے بھائی کے بچوں اور بیوی کا دل موہ لیا تھا۔ حقیقی محبتوں اور بے لوث خلوص کے ایسے ثبوت بھی کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

دراصل نائمہ بیگم فطری طور پر بہت مغرور اور خودسر خاتون تھیں۔ خاندانی روایات اور پرانی اقدار کی سختی سے پابند...... ہر تقریب اور ہر محفل میں خوب رکھ رکھاؤ سے شریک ہونا ان کا طرۂ امتیاز ہوتا۔ خود کو بہت زیادہ لیے دیے ہوئے رکھنے کی عادی تھیں۔ کنبے بھر میں سب سے علیحدہ خیالات کی مالک تھیں۔ ہما شما کو خاطر میں لانا نہیں جانتی تھیں۔ مزاج میں تکبر کوٹ، کوٹ کر بھرا تھا لیکن یہ عجیب حیرت انگیز تضاد تھا کہ خود ان کی اپنی اولاد ایسے معاملات میں ان سے کوسوں دور تھی۔ کسی کی بھی طبیعت ان سے میل نہ کھاتی تھی۔ کسی کے مزاج میں غرور و تکبر نام کو نہیں تھا۔ جبکہ نائمہ بیگم کو اپنی اعلیٰ نسبی، خاندانی شرافت، جائداد اور انتہائی فارغ البالی پر ناجائز حد تک فخر تھا۔ اپنے سے کمتر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے اور درخورِ اعتنا نہ جاننا جیسے ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔

جسمانی طور سے خاصی بھاری بھرکم اور بلند قامت تھیں۔ خوب سرخ و سپید رنگت، گہری اور مغرور سنجیدہ سی آنکھیں، ستواں ناک اور گھنگرالے بالوں نے انہیں ایک پُرکشش اور بارعب شخصیت کا روپ بخشا تھا لیکن فطری سخت گیری اور بے حد دبدبے نے چہرے کی ملاحت، نرمی اور ملائمت کو ایک ہیبت انگیز جلال اور خائف کرڈالنے کی حد تک دُرشت سی کیفیت میں ڈھال دیا تھا۔

اپنے تمام بچوں کے ساتھ ان کا رویہ بس درمیانہ سا تھا۔ دراصل بہت کوششوں اور ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود وہ اپنے بچوں کو اپنے جیسا مغرور اور بے حس نہ بنا پائی تھیں۔ ان کی تربیت میں بقول ان کے معلوم نہیں کیا جھول رہ گیا تھا کہ وہ ان کی دیرینہ خواہشات کے برعکس، نرم مزاج، ہنس مکھ، ملنسار اور خوش خلقی میں یکتا تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے انکساری اور خوش اخلاقی سے ملنا، شائستگی سے مخاطب ہونا ان بہن بھائیوں کا شیوہ تھا۔ یہ سب طور طریقے نائمہ بیگم کو سخت ناپسند تھے۔ اپنے سے کمتر لوگوں کے منہ لگنا انہیں کبھی گوارا نہ تھا۔ وہ خود تو ایسی ہی تھیں مگر بچوں سے لاچار ہوکر رہ گئی تھیں۔ خاص طور پر انہیں اپنے تینوں بڑے صاحبزادوں سے سخت شکوہ تھا کہ وہ ایسے تمام تر معاملوں میں ان کے کنٹرول سے باہر رہتے تھے۔

زمانے بھر میں اگر نائمہ بیگم کسی سے دبتی تھیں تو وہ ان کی نند شمسہ بیگم تھیں۔ خبر نہیں ان کی بڑائی کا لحاظ تھا یا پھر محبوب شوہر کی ہمشیرہ ہونے کا مان...... بہرکیف شمسہ بیگم کی وہ دل سے قدر دان تھیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ بڑی حد تک اپنی نند کی انسیت اور محبت میں گرفتار تھیں۔ ان کے ساتھ بہت الفت و احترام سے پیش آتی تھیں۔ ان کی رائے و مشورے کی قدر دان تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں سے بھی بہت نرم رویہ روا رکھتیں۔ اپنی ہونے والی بہو روبینہ پر تو جان چھڑکتی تھیں بلکہ بعض معاملات میں اپنی حقیقی بیٹی معصومہ پر روبی کو فوقیت دیتی تھیں اور اس کی ہر، ہر ادا پر دل و جاں سے فدا رہتی تھیں۔

مجموعی طور پر نائمہ بیگم کی اپنی اولاد ان سے کچھ دبی، دبی سی رہا کرتی تھی۔ حقیقت میں انہوں نے اپنی اولاد میں سے کسی کے بھی ناز نخرے کبھی نہ اٹھائے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک سخت گیر قسم کی ماں تھیں ان سے زیادہ بچے اپنی پھوپی اماں سے مانوس تھے اور انہیں اپنا

زیادہ قریبی دوست سمجھتے تھے۔

☆☆☆

شکار کا پروگرام تو پہلے دن ہی بن چکا تھا لہٰذا اس دفعہ خرم کی واپسی دونوں بھائیوں کے ساتھ ہوئی۔ وہ لوگ اپنی رائفلوں اور ضروری سامانِ شکار کی تیاری کے ساتھ نہایت اہتمام و انتظام سے روانہ ہوئے۔ سب سے زیادہ خوشی کا احساس خاور کو ہو رہا تھا۔ وہ بچوں کی طرح شاداں و فرحاں گئے تھے۔ نومی اور شامی سے بدّقت تمام بیسیوں وعدوں کے بعد جان چھڑائی تھی ورنہ وہ دونوں بھی جانے کو بضد ہوگئے تھے۔

جس روز صبح کے وقت یہ لوگ رخصت ہوئے اسی شام شرمین اسد اللہ ان کے گھر میں پہلی مرتبہ داخل ہوئی اور غضب یہ ہوا کہ اس نے اپنی آمد کا سہرا نہایت سادگی کے ساتھ ڈاکٹر شاکرہ کے سر باندھ دیا۔ جن کے بارے میں پورا گھر واقف تھا کہ وہ خاور کی کولیگ ہیں۔ معصومہ اور روبی کی تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ صورتوں پر بارہ بج گئے۔ ایک رنگ آرہا تھا تو ایک جا رہا تھا جس خدشے کا اندیشہ تھا وہ بالآخر پورا ہوگیا تھا مگر نائمہ بیگم حیرت انگیز طور پر پُرسکون رہیں۔ دراصل شرمین کو قریب سے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھیں۔ نگاہ تھی کہ اس کی جھکی، جھکی آنکھوں اور لرزتے ہوئے یاقوتی لبوں سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اس درجہ معصوم، بے ریا حسنِ بے داغ دیکھا تھا۔ ایسی مکمل سی آبدار موتی کی طرح دمکتی صورتیں کم، کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

تاہم یہ ان کا ایک وقتی سا تاثر تھا۔ وہ اپنے فرائض سے غافل رہنے والوں میں نہ تھیں۔ پہلی ملاقات اور پہلی نشست ہی میں انہوں نے اس کا بھرپور اور مکمل انٹرویو کرڈالا تھا۔

عصر کی نماز پڑھ کر انہوں نے سلام پھیرا ہی تھا

کہ انہیں ایک نہایت ہی نازک اندام پری چہرہ لڑکی اپنی نماز کی چوکی کے قریب کھڑی نظر آئی۔ وہ رعبِ حسن سے مبہوت رہ گئیں۔ سوچنے لگیں۔

''اے ہئے یہ کون حور پری آ گئی؟'' آنکھیں مل کر دوبارہ ٹھیک سے دیکھا۔ اس دفعہ لڑکی نے انہیں بڑے ادب واحترام سے سلام عرض کر دیا۔ جواب تو انہوں نے دے دیا لیکن سٹپٹا کر سوال بھی جڑ دیا۔

''کون ہو تم، کس سے کام ہے تمہیں؟''

''جی، میں یہاں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے آئی ہوں۔''

''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''

''ڈاکٹر شاکرہ صاحبہ نے۔''

اس کے جواب پر وہ لمحے بھر کے لیے خاموش رہ گئیں۔

''انہوں نے تمہیں کیا کہہ کر بھیجا ہے؟'' کچھ توقف کے بعد مزید کہا۔

''وہ...... بتا رہی تھیں۔'' شرمین نے پھر تفصیلاً بتایا۔ ''کہ آج کل آپ کے بچوں کے ٹیوٹر کافی دنوں سے وجہ بتائے بغیر غائب ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا بہت زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ امتحانات سر پر ہیں کسی دوسرے ٹیوٹر کا انتظام نہیں ہے۔''

''ہاں یہ درست کہا انہوں نے...... اچھا یہ بتاؤ کہ تم کب سے ٹیوشن پڑھا رہی ہو۔ کتنے سال کا تجربہ ہے تمہیں؟'' نائمہ بیگم نے تسلیم کرتے ہوئے پوچھا۔

''چھ، سات سالہ تجربہ ہے میرا...... کئی سالوں سے ڈاکٹر صاحبہ کے بچوں کو پڑھا رہی ہوں آپ ان سے معلوم کر سکتی ہیں۔'' لڑکی نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا۔ اچانک کچھ سوچ کر نائمہ بیگم نے اسے ڈرائنگ روم میں بھیجا۔ خود دعا مانگ کر اطمینان سے وہاں پہنچیں تو معصومہ اور روبی اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ معصومہ چھوٹتے ہی بولی۔

''اماں شامی ٹیسٹ میں فیل ہو چکا ہے۔ کم از کم اسے ضرور ان کے سپرد کر دیجیے ورنہ سال ضائع ہو جائے گا۔'' نائمہ بیگم نے گھور کر بیٹی کی طرف دیکھا پھر لڑکی سے پوچھا۔

''تمہارا نام؟''

''شرمین...... شرمین اسداللہ۔''

''اچھا تو اسداللہ تمہارے والد کا نام ہے۔ کیا کام کرتے ہیں وہ؟''

''جی...... وہ شہید ہو چکے ہیں، فوج میں تھے۔''

''اوہ......'' اچانک نائمہ بیگم کے تاثرات میں تبدیلی آئی اور انہوں نے جانے کیوں انٹرویو موقوف کر دیا فقط اتنا مزید پوچھا...۔ ''تم لوگ کتنے بہن بھائی ہو؟ گزر اوقات کیسے ہوتی ہے؟''

''1971ء کی جنگ میں پاپا شہید ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں میرے جڑواں بھائیوں کی پیدائش ہوئی تھی۔ امی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ بس پاپا کی شہادت اور امی کا انتقال ایک ماہ کے اندر، اندر ہو گیا تھا۔ بہت پریشانی کا زمانہ تھا۔ میں ہائر کلاسز میں تھی بس دادی اماں کا دم غنیمت تھا کہ ہم تینوں بہن بھائی سلامت ہیں ورنہ تو شاید کوئی نہ زندہ بچتا۔ آج بھی اللہ کی مہربانی سے ہم لوگ انہی کے زیرِ سایہ رہ رہے ہیں۔ میں ٹیوشنز پڑھاتی ہوں۔'' اس دفعہ شرمین نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

اس وقت تو نائمہ بیگم نے سکوت اختیار کیا اور تینوں بچوں شامی، نومی اور افشاں اس کے حوالے کر دیے مگر اگلے روز سے خود بہ نفسِ نفیس ملحقہ کمرے میں پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس کی ہر، ہر جنبش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

شرمین کیسا پڑھاتی ہے؟ بلاوجہ کی باتوں میں وقت تو ضائع نہیں کرتی؟ بچوں کے ساتھ اندازِ گفتگو کیسا ہے؟ بے جا ڈانٹ ڈپٹ تو نہیں کرتی؟ بچوں سے رویہ کیسا روا رکھتی ہے؟ زیادہ ہنستی تو نہیں؟ ایک مضمون کو کتنا وقت دیتی ہے؟ نائمہ بیگم کے سارے خدشات ناقابلِ یقین حد تک غلط ثابت ہوئے۔ ٹیوٹر حیرت انگیز حد تک ایمان دار، بااصول، ذہین،

تجربے میں یکتا، وقت کی پابند اور سنجیدہ مزاج تھی۔ اس طرح وہ صورت کے ساتھ، ساتھ سیرت میں بھی عمدہ پائی گئی تھی سو نائمہ بیگم بہت جلد مطمئن ہو گئیں۔ فی زمانہ ایسی ہمہ صفت اور بے ضرر ٹیوٹر کہاں دستیاب ہوتی ہے جبکہ اس نے فیس کا مسئلہ بھی بے چون و چرا بغیر کسی شرط کے انہی کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

اپنی خاموشی سے کی گئی نگرانی اور جاسوسی کے بعد وہ اچھی طرح جان گئی تھیں کہ لڑکی نہایت ٹرینڈ، پڑھانے میں ماہر اور تجربے کار ہے۔ یوں بھی وہ بچوں کی ہر روز کی شکایات، نت نئی شرارتوں اور آئے دن فیل ہونے کی وارداتوں سے عاجز آ چکی تھیں اور دل سے چاہتی تھیں کہ ان نالائقوں کو کوئی سیدھا کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس نکتے پر بھی غور نہیں کیا کہ ڈاکٹر خاور اسے یہاں تک لانے کے ذمے دار ہیں۔

معصومہ اور روبی اس ایک ہی سوال کی جواب دہی سے ڈر رہی تھیں کہ نائمہ بیگم اس بے ضرر سی بات کو کوئی دوسرا معنی نہ پہنا دیں مگر صد شکر کہ ایسا کوئی نکتہ زیرِ بحث نہ آ سکا اور بات بخیر و بخوبی نبھ گئی بلکہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ ڈاکٹر خاور ابھی شکار پر سے واپس بھی نہیں آئے تھے کہ یہاں شرمین اسداللہ پہنچ بھی گئی۔ نائمہ بیگم اس سے مطمئن بھی ہو گئیں اور بچوں کا ٹوٹا ہوا تعلیمی سلسلہ بڑے اچھے انداز سے دوبارہ جڑ گیا۔ بچے بھی اس نئی ٹیوٹر سے خوش تھے۔

یہ معلوم کر کے کہ شرمین ملک وقوم کی بقا اور سلامتی کے لیے مر مٹنے والے ایک شہید کی بیٹی ہے گھر بھر میں اس کے لیے بے حد ہمدردی اور احترام کی لہر دوڑ گئی تھی۔ بچوں، بڑوں سب کے دلوں میں اس کی تعظیم دوچند ہو گئی تھی۔

پھوپی جان تو اس درجہ محبت و شفقت سے پیش آتیں کہ بسا اوقات شرمین کی پلکیں بھیگ، بھیگ جاتیں۔ نائمہ بیگم کی طرف سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد روبی اور معصومہ نے شرمین سے دوستی اور بہناپا قائم کرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں لیکن یہ محسوس کر کے انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اندر سے بہت مضبوط اور اپنے آپ میں سمٹی رہنے والی لڑکی ہے۔ جس نے اپنی ذات کے گرد ایک نامعلوم سا حصار باندھ رکھا تھا۔ شاید فالتو بات کرنے کی وہ عادی ہی نہ تھی۔ پہلے روز جو اس نے نائمہ بیگم کے سوالات کے جواب میں بتایا تھا اس کے بعد اپنے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا تھا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھلے خرم دونوں بھائیوں کے ہمراہ جھیل کی طرف سے جنگل کے اندر داخل ہوا...۔ ریسٹ ہاؤس اس طرف سے قریب پڑتا تھا۔

جاتے مگھر کی تیکھی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں نے ان کا فراخ دلی سے استقبال کیا۔ دوپہر ہونے کے باوجود سرمئی دھند لکا پھیلتا لگ رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں سپید، سپید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ میلی، میلی دھوپ میں فضاؤں پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ سامنے دور تک پھیلے سائیں، سائیں کرتے جنگل پر اب تک پالا پڑ رہا تھا۔

کچھ پل جاتے تھے کہ نیلگوں کہرے کا غبار اور گاڑھا اور زیادہ گاڑھا ہو جاتا مگھر کا مہینہ تو ایسا ہی ٹھنڈ بھرا ہوتا ہے۔

اچانک سناٹے میں چند لوگوں کے زور، زور سے بولنے کی آوازوں کی بازگشت گونجی۔ خرم نے چونک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سامنے کھیتوں کی آخری سرحد پر گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ گھاس پھونس کے چھپر اور گارے کے ٹیڑھے میڑھے اور بے ترتیب مکان۔

پہلے مکان کے ساتھ دھان کے ہریالے کھیت لہلہا رہے تھے۔ تیز ہوا سے دھان کی بالیاں جھومنے

لگتیں۔ لمبی، لمبی لمبوتری سیٹیوں کے درمیان دھیمی دھیمی سیٹیاں بجتی سنائی دے رہی تھیں۔ پوہ کا مہینہ شروع ہوتا تو ان کھیتوں میں جیسے بہار اتر آتی۔ فضاؤں میں ہلکی، ہلکی مہک رچی محسوس ہونے لگتی۔ جھیل کا پانی گہرا نیلگوں ہو جاتا۔ دھان کے یہ کھیت موہن داس کے تھے۔

موہن داس، ریشم کی ہجولی بسنتی کا باپو تھا۔ بہت سارے آدمیوں کے بولنے چالنے کی آوازیں اسی کے باڑے کی طرف سے سننے میں آرہی تھیں۔ خرم چلتے، چلتے ٹھٹک کر تھم گیا۔ موہن داس کے باڑے میں کافی لوگ جمع تھے اور کسی واقعے پر اپنے اظہارِ خیال میں مصروف تھے۔

''دیکھنا پڑے گا کیا قصہ ہے۔'' خرم نے جیسے ان دونوں کو آگاہ کیا اور اپنا رخ باڑے کی طرف کرلیا۔ بابر اور خاور بھی اس کے تعاقب میں چل دیے۔ تھوڑی دیر تک تینوں کھیتوں کی منڈیر منڈیر چلتے رہے۔ دھانوں کی بالیاں، تالیاں پیٹتی رہیں۔ اچانک کوئی تیز آواز میں پکارا۔

''ارے...... جنگل بابو آگیا...... جنگل بابو۔''

سب کے سب اشتیاق کے مارے گردنیں بڑھا، بڑھا کر دیکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے۔

''کیا ہوگیا یہاں بھئی خیریت تو ہے؟'' خرم نے ایک، ایک کی صورت دیکھتے ہوئے دریافت کیا لیکن ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ کسی طرف سے موہن داس نمودار ہوا اور لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا خرم کے قریب آپہنچا اور دہائی دینے کے انداز میں فریاد کرنے لگا۔

''لٹ گیا...... لُٹ گیا صاحب میں لٹ گیا۔ ہائے میری گاؤ ماتا گئی، لٹ گیا...... میں کنگال ہوگیا ہائے رام۔''

''کیا ہوگیا تمہاری گائے کو؟ کہاں گئی وہ؟'' خرم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جاتی کہاں......'' موہن داس رو کر چلاّیا۔ ''کسی نا ہنجار، سنگ دل نے پھاڑ کھایا اسے۔ ٹکڑے، ٹکڑے کر ڈالے۔ ہائے رام میرا سُکھ غارت ہوگیا۔'' اس نے اپنے سر پر دو ہتڑ رسید کیے اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔ خرم حواس باختہ ہوگیا۔

''ارے بھئی روؤ مت۔ حوصلے سے کام لو۔ ٹھیک سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ سرگوشیاں بند ہوگئیں۔

''بتاؤ بھئی؟'' خرم نے دوبارہ اصرار کیا۔

اس دفعہ موہن داس کے ایک رشتے دار نے ان کا ہاتھ تھاما اور باڑے کے بیرونی طرف لے جاتا ہوا بولا۔

''رات تلک تو گاؤ ماتا اچھی بھلی تھی اور جندہ سلامت باڑے میں بند کی تھی مگر صبح کو اس حال میں ملی ہے۔'' خرم آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ باڑے کی کچی زمین پر واقعی موہن داس کی موٹی تازی گاؤ ماتا کے بجائے اس کی ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں اور جگہ، جگہ سے نُچا ہوا گوشت ڈھیر تھا اور خون آلود ڈھیر پر سیکڑوں مکھیاں اور چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ نہایت عبرت ناک منظر تھا۔

''یہ سب...... کیسے ہوا؟'' خرم کی زبان سے حیرت اور افسوس کا کلمہ نکلا۔ غمزدہ لوگ ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ رہے تھے مگر سب کی چہ میگوئیاں بند تھیں۔ فقط موہن داس کی ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

اب خرم نے غور کیا تو موہن داس کے گھر سے بھی عورتوں کی رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ بابر اور خاور وہاں موجود افراد پر توجہ دینے کے بجائے گائے کی باقیات کے اردگرد گھوم پھر کر واردات کی نوعیت کا اندازہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے تھے۔ اندر سے کوئی عورت بین کر رہی تھی۔

''ارے کبھر ممیں کس کی نجر یا کھا گئی۔ اب کی بار دھان کی فصل ایسی زوردار ہوئی تھی کہ سارے دلدّر دور ہو جاتے مگر معلوم نہیں بھگوان کو کیا منجور ہے۔ بھاگ سو گئے ہمارے گاؤ ماتا کے ساتھ ہی۔ ہماری لچھمی روٹھ گئی ہم سے... کیا پاپ کیا ہم نے؟ بھگوان شما کرو ہم پر...... ہم سب بہت پاپی ہیں۔''

''مجھے تو یہ سب...... کسی بڑے درندے کی کارستانی لگتی ہے۔'' بابر نے دبی زبان سے کہا۔

''لیکن خرم تو کہتا ہے کہ جنگل میں بڑے درندے پائے نہیں جاتے۔'' خاور نے دھیرے سے جواب دیا۔

''یہ سب بیکار کی باتیں ہیں ورنہ جنگل، جنگل ہی ہوتا ہے۔'' بابر نے بے پروائی سے کہا پھر انہوں نے کچی زمین پر دور تک اشارہ کیا۔

''یہ دیکھو غور سے دیکھو کسی جانور کے خون آلود پنجوں کے نشانات صاف نظر آرہے ہیں۔ یہ انسانی کارنامہ نہیں ہے۔'' ان کی بات میں سو فی صد سچ تھا۔ خاور بھی بغور مشاہدہ کرنے لگے۔

اس دوران خرم دیگر لوگوں سے اور موہن داس کے احباب کی زبانی پورے واقعے کی تفصیلات سن چکا تھا۔ اس نے مناسب انداز اور الفاظ میں لوگوں کو صبر واستقلال قائم رکھنے کی ہدایت کی اور وعدہ کیا کہ وہ ذاتی طور سے بھی اس واقعے کی پوری تحقیقات کروائے گا۔

تھوڑی دیر بعد لوگ ایک، ایک دو، دو کر کے رخصت ہونے لگے۔ جب سب لوگ تتر بتر ہو چکے تو خرم نے بھی بابر کے طریقۂ کار پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جائے واردات کا معائنہ شروع کردیا۔ تینوں بھائی خاصی دیر تک اسی معمے.... میں کھوئے رہے حتیٰ کہ ہر طرف اندھیاروں کی پھوار پڑنے لگی جو ہر لمحہ گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت محیط ہونے لگا۔ ستاروں کی روشنی اس علاقے میں خوب تیز اور چمکیلی تھی تاہم اس اجالے میں مزید تحقیقات جاری رکھنا ممکن نہیں تھا یوں بھی یہ لوگ ایک طویل سفر سے تھکے ہوئے تھے اس لیے خرم نے سرِدست یہی بہتر خیال کیا کہ اس وقت ریسٹ ہاؤس کا رخ کرلیا جائے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر یہ لوگ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تو مشرق سے روشنی آرہی تھی۔ دور احاطے میں درختوں کی شاخیں زمین پر مدھم، مدھم سائے ڈال رہی تھیں۔ چاند نکل آیا تھا اور کھلی فضاؤں میں مصفا چاندنی کا دھارا بہنے لگا تھا۔ سبزے کی مخصوص نمدار مہک سے لدے پھندے نمناک ہوا کے جھونکے ان کے اردگرد سرسرا رہے تھے فضا میں چاندنی اور جنگلی پھولوں کی باس باہم گلے مل رہی تھی۔ بابر انگلیوں سے بالوں کو کریدتے ہوئے بولا۔

''جہاں تک میری سوچ رہنمائی کرتی ہے، میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ گائے کو ہلاک کرنے والا کوئی خونخوار جانور ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ یہ کام کسی مویشی چور کا ہے۔''

''وہ لوگ مویشی چور نہیں بلکہ کسی اَن دیکھی طاقت کا کارنامہ سمجھ رہے ہیں جو گاؤ ماتا کا خاتمہ کر گئی۔'' خرم نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اَن دیکھی طاقت یعنی کوئی بھوت وغیرہ؟'' خاور نے حیران ہو کر آنکھیں جھپکیں۔

''جی ہاں، کیا خوب سمجھے آپ۔'' خرم نے ہنس کر وضاحت کی۔

''موہن داس اور اس کے پریوار سے ان کا بھگوان کسی خاص سبب سے خفا ہوگیا ہے اس لیے اس نے اظہارِ ناراضی کی وجہ سے ان سے گاؤ ماتا واپس چھین لی ہے۔ اس کے علاوہ چند کہنے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی گاؤ ماتا سے زیادہ زور آور اور زبردست طاقت باڑے کے اوپر سے گزری، دونوں کی جنگ

ہوگئی۔ جنگ میں وہ عظیم طاقت جیت گئی اور جاتے، جاتے گاؤ ماتا کو گھسیٹ کر باڑے سے باہر ڈال گئی۔‘‘

’’کیا خوب رام کہانیاں گھڑ لیں۔‘‘ ڈاکٹر خاور زور سے ہنس دیے۔ بابر بھی مسکرانے لگے اور بولے۔

’’ارے یہ ضعیف الاعتقاد لوگ ہیں۔ وہ کیا جانیں تحقیقات کرنا۔‘‘ خرم بھی ہنسنے لگا پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

’’لیکن یہ مانی ہوئی بات ہے بھائی جان کہ اس جنگل میں خونخوار درندے جیسے شیر یا چیتا تو ہیں ہی نہیں۔‘‘

’’یہ کس بنیاد پر تم کہہ سکتے ہو؟ اتنا بڑا جنگل ہے۔ یہ امر امکانات سے خالی تو نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ بھوت نہ پریت چور نہ چکار یہ یقیناً کسی درندے کا کام ہے۔ جس سے جتنا گوشت کھایا جا سکا اس نے کھا لیا باقی چھوڑ کے وہ جنگل میں روپوش ہو گیا۔‘‘ بابر نے زور دے کر کہا۔

’’جنگل کا پچھلا ریکارڈ ثابت کرتا ہے کہ یہاں شیر یا چیتے ٹائپ کا کوئی درندہ کبھی نہیں پایا گیا۔ ہاں چھوٹے جانور بہت ہیں۔‘‘ خرم نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بحث چند منٹ مزید جاری رہی مگر یہ لوگ کسی نتیجے تک نہ پہنچ پائے بالآخر خاور اکتا کر بولے۔

’’بھئی جنگل کی ایسی خوب صورت اور مہک آور رات کو بیکار کی بحث میں آلودہ مت کیجیے اس معاملے کو صبح پر چھوڑ دیجیے۔‘‘ چنانچہ اس موضوع کو یہیں بند کر دیا گیا اور یہ لوگ بھرپور چاندنی اور خوشگوار ہواؤں کی جادوگری سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پورا چاند آسمان پر روشن تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا گوشہ، گوشہ شفاف کرنوں کے ہالے میں جگمگا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے یہ تینوں بھائی یہاں کے لوگوں کی مضحکہ خیز سی باتیں اور بھوت پریت کے قصوں کو بھول کر اپنی روزمرہ کی ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ ان کی آپس کی ہنسی، دل لگی کی باتوں سے چاند بھری رات کا فسوں مزید نکھر گیا۔ خوشبو بھرے سندیسوں سے اٹی رات رہ، رہ کر مسکرانے لگی۔

اگلی صبح ابھی سورج طلوع ہو رہا تھا کہ اپنے گرد و پیش کی آوازوں سے ان لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے کسی بانکے مرغے کی ککڑوں کوں، ککڑوں کوں بڑی واضح سنائی دے رہی تھی۔ مختلف جنگلی جانوروں کی مختلف بولیاں بھی گونج رہی تھیں۔ دور کسی پیڑ میں چھپی فاختہ رہ، رہ کر تھم، تھم کر بول رہی تھی۔

ڈاکٹر خاور گرم بستر سے نکل کر باہر آ گئے۔ ان کا دل بے اختیار ایک سگریٹ پھونکنے کو چاہ رہا تھا مگر دونوں بھائیوں کا احترام مانع تھا۔ سامنے کھیتوں پر ابھی پالا پڑ رہا تھا۔ چاروں اطراف سرمئی دھند لکا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان کی بیکراں وسعتوں میں کہیں، کہیں سفید، سفید ٹکڑے اڑتے پھر رہے تھے۔ ٹھنڈک آج عام دنوں سے تھوڑی زیادہ تھی۔ سویرے، سویرے سرسراتے یخ بستہ جھونکے تیز طراری کے بجائے سُبک روی سے چل رہے تھے۔

خرم کے باورچی نے مہمانوں کے لیے خصوصی اہتمام سے کام لیا تھا اور اس کوشش میں ہر پراٹھا اور ہر انڈا مکھن میں پوری طرح شرابور کر ڈالا تھا۔ چائے عام دنوں کی نسبت زیادہ میٹھی اور دودھ زیادہ پتی کم کے فارمولے پر عمل کر کے دم کی تھی۔ تینوں بھائیوں نے تعریفی کلمات کی بوچھاڑ میں ناشتا جسے خاور نے نشائستہ کا نام دیا تھا ختم کیا اور فوراً ہی ریسٹ ہاؤس سے نکل آئے۔

ان کا رخ موہن داس کے باڑے کی طرف تھا۔ مطلوبہ مقام پر پہنچ کر بے اختیار انہیں ناک پر رومال رکھنے پڑ گئے۔ مردہ گائے میں سے بری طرح سڑاند اٹھنے لگی تھی۔ بدبو کی وجہ سے ان کا برا حال ہو گیا بلکہ کلیجا منہ کو آنے لگا۔ وجہ فوراً ہی خرم کی سمجھ میں

دعوتِ غور وفکر

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ آپ کی ذات سے دنیا میں کیا پھیل رہا ہے اور لوگ آپ سے کیا سیکھ رہے ہیں......؟ برائی یا بھلائی...... یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی خواہ کسی بھی حیثیت کا ہو، علم و مرتبے کے لحاظ سے کسی بھی مقام پر فائز ہو، اس کی ذات سے برائی پھیلتی ہے یا بھلائی...... اسے دیکھ کر یا تو لوگوں میں نیکی اور بھلائی کے جذبات اٹدتے ہیں یا برے کاموں کی رغبت ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے تعلقات اور اثرات کا ایک دائرہ ہوتا ہے، کچھ لوگ اس کے رشتے دار ہوتے ہیں، کچھ دوست، احباب ہوتے ہیں، کچھ لوگوں کا وہ ماتحت ہوتا ہے اور کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں، کچھ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے محبت نہیں کرتے بلکہ شاید نفرت کرتے ہوں۔ کچھ لوگ اسے بڑا مانتے ہیں، کچھ لوگ اس کے بڑے ہوتے ہیں، کچھ لوگ اس کے پڑوس میں بستے ہیں، کچھ لوگ اس کے شریکِ کار ہوتے ہیں اور یہ سب ہی لوگ اس کی زندگی سے اچھا یا برا کچھ نہ کچھ اثر ضرور لیتے ہیں۔

سوچیے...... آپ بھی اسی طرح کے بہت سے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے آپ کے بھی تعلقات ہیں اور فطری طور پر آپ کے تعلقات اور ان اثرات کا بھی ایک دائرہ ہے۔ آپ سے تعلقات رکھنے والے یہ سب لوگ آپ سے کیا سیکھ رہے ہیں؟ اور آپ کی زندگی ان پر کیا اچھا یا برا اثر ڈال رہی ہے، آپ کی بات چیت اور افکار و خیالات، مشغلے، دلچسپیاں، دوڑ دھوپ، حوصلے، ارادے، تمنائیں، آپ کا سلوک، آپ کا رویہ، آپ کا طرزِ عمل اور بحیثیتِ مجموعی آپ کی زندگی لوگوں کو کچھ نہ کچھ تو ضرور دیتی ہے۔ آپ کو محسوس ہو یا نہ ہو وہ لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے یوں سمجھیں آپ کی زندگی ایک خاموش سبق ہے جو ہر وقت پڑھا جا رہا ہے، یاد کیا جا رہا ہے اور اپنے وقت پر دُہرایا جائے گا۔

عذرا رسول کی ڈائری سے انتخاب

آ گئی۔ کل کسی عقل مند نے معلوم نہیں کیا سوچ کر مردہ گائے پر درختوں کی شاخیں اور گھاس پھونس ڈال دیا تھا چنانچہ ہوا بند ہونے سے گوشت مزید سڑ گیا تھا۔

دن کے اجالے میں ان لوگوں نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ اپنی تفتیش کا آغاز کیا لیکن اول تو دو دن گزر جانے کی وجہ سے گائے کے آس پاس ایک جانور سے زیادہ جانوروں کے پنجوں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ انسانوں کے نقشِ پا بھی کثرت سے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور دھیرے، دھیرے، قدم، قدم چلتے، چلتے گھنے جنگل میں جا پہنچے۔ اس وقت یہ لوگ پانی کے ایک خشک نالے کے کنارے کھڑے تھے۔ خشک نالے کے دونوں کناروں پر کوئی جانور دکھائی نہ دیا۔ جنگل یہاں سے وہاں تک سنسان پڑا تھا۔ خاموشی اپنا پیغام سنا رہی تھی۔ بظاہر خاموشی کے سائے گہرے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چرندوں پرندوں کی تیز و طرار نظریں خطرے سے خبردار نہیں تھیں، خطرہ واضح نہیں تھا۔

خرم گہری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا مگر خشک نالے کے دونوں کناروں پر کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ دفعتاً وہ ٹھٹک کر رہ گئے، گھاس پر ایک بہت بڑا کالا ریچھ بیٹھا ٹکٹکی لگائے انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گھورنے اور دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ابھی جست لگا کر ٹوٹ پڑے گا۔ وقت کی رفتار گویا تھم کر رہ گئی۔ بابر اور خاور بھی اسے دیکھ چکے تھے مگر

اس سے قبل کہ کوئی پیش رفت کی جاتی اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا برق رفتاری سے مڑا چھلانگ مار کر اس نے نالہ پار کیا اور جنگل میں غائب ہوگیا۔

''خس کم، جہاں پاک۔'' خاور نے ہاتھ جھاڑ کر زبان کھولی۔ بابر ہنسنے لگے۔

''کم از کم میں نے اتنا بڑا ریچھ آج تک نہیں دیکھا۔'' خرم ایک گہری سانس کھینچ کر بولا۔

''ہاں واقعی گوریلا لگ رہا تھا۔'' بابر نے اس کی تائید کی۔

عین اس وقت خاور نے دھائیں سے فائر کیا اور دو عدد مرغابیاں تڑپتی ہوئی چند قدم دور آ گریں۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھے اور جیب سے شکاری چاقو نکال کر ان کی گردنوں پر پھیرتے ہوئے فاتحانہ نظروں سے بھائیوں کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ کیا اپنے دستر خوان کے حساب سے شکار کیا تم نے؟ کم از کم دو تین ہرن یا نیل گائے مار گراؤ تاکہ خرم آس پاس کی بستیوں کو گوشت ہدیہ کر سکے۔'' بابر زیر لب مسکرا کر بولے۔

''جس کا گوشت مجھے مرغوب تھا، میں نے شکار کر لیا۔ ہرن سانبھر کے شکار کا شوق تو آپ کو ہے، اپنا ذمہ پورا کیجیے۔'' خاور نے منہ بگاڑ کر جواب دیا۔

''ہاں یہ بھی درست ہے۔'' بابر نے بڑی فراخ دلی سے تسلیم کیا اور غور غور سے نالے کے اندر دیکھنے لگے۔ جلد ہی انہیں اپنی بینائی پر یقین کر لینا پڑا۔ نالے کے اندر ایک جگہ کافی مقدار میں پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ جسے ہرنوں کا ایک جوڑا اپنی جان کے خطرے سے بے نیاز پینے میں مصروف تھا.... یہ مرغابیاں شکار کرنے کے گھنٹے بھر بعد کا عمل تھا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی بندوق کی نالی سیدھی کر کے نشانہ باندھ لیا۔ قبل اس کے کہ وہ خبردار ہوتے ایک زوردار دھماکا ہوا اور ایک ہرن لڑکھڑا کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے نے مڑ کر ایک لمبی زقند لگائی۔ اسی

اثنا میں بابر دوسرا فائر کر چکے تھے۔ ایک دھماکا اور ہوا گولی ہرن کی کھوپڑی میں لگی چند گز کے فاصلے پر وہ تیورا کر گرا اور تڑپنے لگا۔

خرم اور خاور کو ان کی کارگزاری کا علم دھماکے سے پہلے نہیں ہو سکا تھا۔ خرم تیزی سے آگے بڑھ کر ان کے گلے پر چھری پھیرنے بیٹھ گیا۔ خاور بھی اس کی مدد کرنے میں مصروف ہوگئے۔

فائروں کی آواز سن کر چند دیہاتی آ پہنچے اور ان کے چاروں طرف جمگھٹا لگا کر کھڑے ہوگئے۔ ایک نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

''صاحب جی! موہن داس کی گائے کے چور نہیں پکڑے جا سکے؟''

''اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس مسئلے کا حل سامنے آجائے گا۔ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش اور محنت کر رہے ہیں۔ اب تم لوگ دل سے دعا کرتے رہو۔'' خرم نے نرمی سے جواب دیا۔

☆☆☆

صبح کے کوئی دس بجے ہوں گے۔ شدید جاڑوں کی رُت ہونے کے باوجود آج دھوپ خوب تیز نکلی ہوئی تھی اور ایک خوشگوار سی گرماہٹ اور نرماہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ جس سے طبیعت پر خوب اچھا اثر پڑ رہا تھا۔

خلافِ معمول نائمہ بیگم اس وقت گھر کی پچھلی انگنائی میں بہ نفسِ نفیس موجود تھیں۔ ایک پرانے ٹرنک کو کھول کر گرم کپڑے لتوں کو دھوپ میں کھول، کھول کر ڈال رہی تھیں۔ دراصل یہ پروگرام تو کئی دن پہلے سے طے تھا مگر ہوا یہ کہ گھریلو کام کاج سمیٹنے والی ملازمہ آج اتفاق سے آئی ہی نہیں لہٰذا معصومہ اور روبی کی شامت آئی ہوئی تھی اور وہ نائمہ بیگم کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پھرکی کی طرح انگنائی میں گھوم رہی تھیں۔

چند ایک پرانی لیکن نایاب ریشمی رضائیوں کو

دیکھ، دیکھ کر نائمہ بیگم کو سخت دھچکا لگا۔ جس کی ریشمی گوٹ جگہ، جگہ سے بری طرح مسک چکی تھی بلکہ ہاتھ لگانے سے پھٹ رہی تھی۔ انہوں نے قریب کھڑی روبی کو ٹہوکا دے کر مخاطب کیا۔

''اے ہے بٹیا یہ تو بالکل ہی خستہ ہوگئی...... ذری دیکھو تو۔''

''جی ہاں ممانی جان یہ گوٹ تو بالکل ہی جاتی رہی معلوم ہوتا ہے بہت ہی زیادہ پرانی ہے۔'' روبی نے غور سے دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

''نہیں ابھی ایسی بھی غیر معمولی پرانی نہیں ہوئی ہے۔ تمہیں خبر نہیں یہ بہت زیادہ نایاب کپڑا ہے۔ میں نے یہ رضائیاں اللہ رکھے معصومہ کے جہیز میں رکھنے کے خیال سے تیار کروائی تھیں۔ بہت قیمتی اور انمول کپڑا ہے۔'' انہوں نے نفی میں گردن ہلا کر جواب دیا۔

''اللہ اماں جان، یہ سڑی ہوئی رضائیاں ہمارے لیے رہ گئی ہیں ذرا دیکھیں تو کتنی پرانی اور بھاری، بھاری ہیں۔'' معصومہ جو قریب ہی کھڑی تمام گفتگو سن رہی تھی منہ بنا کر بولی۔

''چپ رہ نامعقول کہیں کی۔'' نائمہ بیگم نے بیٹی کو زور سے ڈانٹا۔ ''بغیر سوچے سمجھے بولے چلی جاتی ہے۔ کبھی خواب میں بھی ایسی حسین اور خوب صورت رضائیاں دیکھی ہیں تو نے، چنڈال کہیں کی۔''

معصومہ ان کے گھُرکنے پر منہ بسورنے لگی۔ روبی نے بدقت تمام ہنسی کنٹرول کی اور معصومیت سے پوچھا۔

''آپ نے اتنا پیارا کپڑا کہاں سے منگوایا تھا ممانی جان؟ خاص طور پر یہ شاکنگ پنک گوٹ تو بہت ہی بج رہی ہے۔''

''تمہارے ماموں صاحب بنارس سے لائے تھے۔ میں نے اسی دن جی میں طے کر لیا تھا کہ اس کپڑے کی رضائیاں تیار کروا کر اپنی بیٹی کے جہیز میں دوں گی۔ ہیں ناں خوب صورت؟'' وہ افسردہ ہوگئیں اور ایک گہری سانس کھینچ کر بولیں۔

''بہت زیادہ خوب صورت ہیں۔'' روبی نے ان کی خوشنودی کی خاطر زور دے کر کہا اور کن انکھیوں سے معصومہ کی طرف دیکھنے لگی جو کھڑی، کھڑی ہونٹ چبا رہی تھی۔ وہ روبی کی شرارت کو خوب سمجھ رہی تھی۔ اچانک اسے بھی وقت پر سوجھ گئی۔ اس نے فوراً اپنا موڈ درست کیا اور چند جوڑوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''اماں جان، کیا یہ جوڑے میرے لیے ہیں؟''

''چل بے حیا کہیں کی۔'' نائمہ بیگم نے فوراً اسے جھڑک دیا۔ ''آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو کس قدر دیدے کا پانی ڈھل چکا ہے۔ اپنے منہ سے اپنے جہیز کے تذکرے کر رہی ہیں۔ کچھ چھوٹے بڑے کا خیال ہی نہیں ہے اور یہ بھاری بھرکم جوڑے جہیز کے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ یہ تو میری ہونے والی بہو کے جوڑے ہیں جو میں نے کسی اچھے وقت میں ٹکوا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ ذرا ان جوڑوں کے کپڑے اور ان کی قسم پر غور کرو۔ کس قدر مہنگے اور قیمتی ہیں یہ ٹکڑے۔ آج کل تو کسی مارکیٹ میں دستیاب ہونے بھی مشکل ہیں۔ یہ تو میں بابر میاں کی بری میں رکھوں گی۔'' معصومہ کا وار خالی نہ گیا۔ اس نے مسکرا کر روبی کی طرف دیکھا جو بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو چکی تھی اور اب سر جھکائے بیٹھی تھی۔

نائمہ بیگم ایک، ایک جوڑے کا تاریخ جغرافیہ دُہرا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کو وہ رضائیوں کا غم بھول گئیں۔

''اے ہے بھابی یہ سب کھڑاگ آج کیوں کھول بیٹھیں؟ آج تو تمہاری وہ بوا ڈھڈو بھی غیر حاضر ہیں۔ یہاں کی اٹھک بیٹھک کون کرے گا؟'' اسی وقت شمسہ بیگم بھی آ گئیں اور زور سے بولیں۔ نائمہ بیگم نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

''یہی دونوں کر رہی ہیں اور کون کرے گا ہر

روز ہی کوئی نہ کوئی الجھن درپیش ہوتی ہے یہاں تو کیا معلوم تھا وہ چھٹی کر کے بیٹھ جائے گی۔ آج دھوپ دیکھو کس قدر سنہری سنہری کھلی پڑ رہی ہے اس لیے بکسا کھلوا لیا میں نے۔''

شمسہ بیگم بھی قریب آ کر چیزوں کی الٹ پلٹ میں مصروف ہو گئیں اور بھاوج کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ ان دونوں کو کام اور باتوں میں مستغرق پا کر معصومہ اور روبی وہاں سے کھسک لیں۔ اپنی طرف پہنچ کر روبینہ نے ایک دھموکا معصومہ کے جڑ کر پوچھا۔

''ہاں، ذرا اب بتانا گھر کی بڑی بوڑھی! یہ ممانی جان سے کس ٹائپ کی گفتگو ہو رہی تھی؟ جوڑوں کی فکر ابھی سے لگ گئی۔''

''اچھا کر تو خود رہی تھیں رضائیوں، لحافوں کی تعریفیں اور جڑ دیا سب کچھ میرے سر پر۔ کیسا ہنس، ہنس کر تفصیل پوچھ رہی تھیں۔'' معصومہ نے پیٹھ سہلاتے ہوئے شکوہ کیا۔

''میں تو کچھ نہیں پوچھ رہی تھیں۔ ممانی خود ہی ساری تفصیل بتا رہی تھیں۔ اب اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟''

''ہاں، ہاں ایسی ہی تو بے قصور اور معصوم ہیں آپ تو۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ اگر یقین نہیں ہے تو شام کو شرمین سے پوچھوا دوں گی۔ تم بھی جانتی ہو کہ مجھ سے کس قدر متاثر ہے وہ۔''

''ہاں جی سب میں برے اور خراب تو ہم ہی ہیں۔ تبھی تو امی بھی ذرا، ذرا سی بات پر ڈانٹنے ڈپٹنے لگتی ہیں۔'' معصومہ اس کے مذاق کا برا مان گئی اور چراغ پا ہو کر بولی۔ روبی نے جلدی سے اسے لپٹا لیا اور منانے لگی۔

نائمہ بیگم اس دن شام تک اپنی سٹر پٹر میں الجھی رہیں حتیٰ کہ بچوں کی ٹیوشن کا وقت ہو گیا۔

دھیرے دھیرے بچے شرمین سے بہت مانوس ہو چکے تھے بلکہ اس کی شخصیت کو پسند کرنے لگے تھے۔ بچوں کو اس نے حقیقت میں زبردست طریقے سے گائیڈ کر کے کنٹرول کر لیا تھا۔ گھر کی تمام ہی خواتین نائمہ بیگم سمیت اس کے طریقۂ کار کی گرویدہ ہو چکی تھیں کیونکہ نہ صرف یہ کہ وہ بچوں کو جدید انداز میں پڑھا رہی تھی بلکہ بھرپور انداز میں ان کی اخلاقی تربیت بھی کر رہی تھی اور اس کے طریقۂ تعلیم کا یہ انداز سب کے لیے قابلِ ستائش تھا۔ بچے جو فقط شرارتی ہی شرارتی ہو گئے تھے ان کے کھلنڈرے پن میں واضح کمی آئی تھی اور وہ تمیزدار ہوتے جا رہے تھے۔

خاصے دن گزر جانے کے باوجود وہ ویسی کی ویسی ہی پہلے دن کی طرح ریزرو ہی تھی۔ کم گو اور کم آمیز سی۔ بچوں کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد سے بہت کم بات چیت کرتی۔ بس اپنے کام سے کام رکھتی تاہم روبینہ اور معصومہ نے کچھ نہ کچھ رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فرینڈشپ تب بھی قائم نہ ہو سکی تھی۔

اس روز شرمین ٹیوشن پڑھانے آئی تو نائمہ بیگم نمازِ عصر کی ادائیگی میں مصروف تھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے معصومہ کو پکار کر کہا۔

''جانا ذرا اس پڑھانے والی لڑکی کو بلا کر لانا۔'' معصومہ کو سخت حیرت ہوئی روبی بھی وہیں موجود تھی۔ شمسہ بیگم اپنی طرف کہیں گئی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں معصومہ، شرمین کو بلا لائی۔

نائمہ بیگم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تسبیح پڑھتی رہیں پھر تسبیح چوم کر مصلے پر رکھی اور پاندان کھولتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے شاید ہم سے یہی بتایا تھا کہ تمہاری اماں کا تو انتقال ہو چکا ہے اور تم اپنی نانی اماں کے ساتھ رہتی ہو؟''

''جی ہاں آپ نے درست کہا میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔'' شرمین نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''لیکن وہ نانی نہیں میری دادی اماں ہیں۔''

''تم سے چھوٹے دو جڑواں بھائی ہیں تمہارے؟''

''جی ہاں۔''

''پڑھتے ہوں گے دونوں؟''

''جی ہاں، فورتھ کلاس میں زیرِ تعلیم ہیں۔''

''تب پھر ٹھیک ہے۔'' نائمہ بیگم خود بخود مطمئن ہو کر پان لگانے لگیں۔ تھوڑی دیر کے لیے سکوت چھا گیا۔ روبی اور معصومہ اندر، اندر حیران بھی تھیں پریشان بھی کہ معلوم نہیں شرمین کو کیوں بلایا ہے؟ پان کی گلوری تیار کر کے انہوں نے کلے میں دبائی۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر کمالِ اطمینان سے گویا ہوئیں۔

''پھر تو تمہاری دادی اماں کو فراغت کا کافی وقت مل جاتا ہو گا کیونکہ تم پڑھانے چلی جاتی ہو گی اور تمہارے بھائی پڑھنے کے لیے پھر ان کے پاس بہت وقت بچ رہتا ہو گا۔ تم ایسا کرنا انہیں ہمارا یہ پیغام دے دینا کہ ہم نے ان کے لیے گھر کا کافی کام نکالا ہے۔ اگر وہ یہاں ہمارے ہاں تک نہ آنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہم اپنے ہاں کے ملازم سے کام ان کے پاس بھجوا دیا کریں گے۔ وہ وہیں اپنے گھر میں بیٹھے، بیٹھے سلائی ٹکائی کا کام کر دیا کریں۔ اجرت کی فکر نہ کریں وہ ہم انہیں مناسب دیا کریں گے۔ اس طرح گھر بیٹھے ان کی محنت مزدوری معقول انداز میں ہوتی رہا کرے گی۔'' اپنی طویل بات پوری کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ پاندان کھول لیا اور اس میں کچھ ٹٹولنے لگیں۔

معصومہ اور روبی حیرت زدہ ہی رہ گئیں اور تقریباً بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔ شرمین تو چپ کی چپ رہ گئی۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئی تھیں اور چہرے پر غیر معمولی سرخی جھلکنے لگی مگر زبان سے اُف تک نہ کی۔ بس اپنے ہاتھوں پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ سب کے احساسات سے بے خبر نائمہ بیگم نے ایک سبز الائچی ڈھونڈ کر منہ میں رکھی۔ پاندان بند کر کے گھٹنے کے نیچے دبایا اور سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑ لیا۔

''بلانے کو رکھنے کو تو ہم انہیں یہاں رکھ لیں مگر یہاں پہلے ہی دو، دو کام والی آتی ہیں بس ہم انہیں گھر بیٹھے کام بھیجتے رہیں گے۔ تم گھر کا پتا بتا دینا۔ ملازم چار رضائیاں دے آئے گا سلائی ٹکائی کے لیے۔'' وہ چپ ہوئیں تو کمرے پر ایک سکوت سا چھا گیا۔ ان کی باتوں کا جواب کسی نے نہیں دیا۔

جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ وہ اب تک اکیلی ہی بولتی رہی ہیں۔ کم از کم شرمین نے تو ان کی کسی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا تھا چنانچہ انہوں نے فوراً ٹوک دیا۔

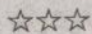
''ہاں لڑکی پھر تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟''

''میں...... کیا بولوں؟'' شرمین کے منہ سے باریک سی آواز نکلی۔ کچھ دیر پہلے کا اس کا تمام اعتماد جیسے متزلزل ہو کر رہ گیا تھا۔

''کل ہم رضائیاں بھجوا رہے ہیں تمہارے گھر۔'' نائمہ بیگم نے تحکمانہ سے انداز میں اسے جتایا۔ اچانک ہی شرمین کی زبان سے نکلا۔

''نہیں آپ ایسا مت کیجیے گا...... میری دادی اماں کے پاس ایسے کاموں کے لیے وقت ہے اور نہ انہیں ضرورت ہے۔ یہ عمر اُن کے آرام کرنے کی ہے، محنت مزدوری کی نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں۔ نہ ہی اس نے کسی طرح کی معذرت یا اجازت کی ضرورت سمجھی بلکہ اٹھی اور سیدھی کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ نائمہ بیگم ہکا بکا بیٹھی رہ گئیں۔

روبی اور معصومہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور آگے پیچھے خود بھی وہاں سے کھسک لیں۔ خلافِ توقع نائمہ بیگم نے زیادہ توجہ نہیں دی دوبارہ اپنے پاندان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔



شرمین گھر پہنچی تو سر سے پاؤں تلک فکر میں مبتلا تھی۔ اتفاق سے دادی اماں نہانے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ دونوں بھائی باہر کھیلنے میں مصروف تھے یہ کافی دیر تک کرسی پر سر جھکائے خاموش بیٹھی سوچوں میں گم رہی۔ سوچوں کا دھارا کہیں سے کہیں بہتا چلا جارہا تھا تاہم دادی اماں کا سامنا ہونے سے پہلے اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو بحال کیا اور روزمرہ کے معمولات میں منہمک ہوگئی۔ جب تک وہ آئیں یہ حسب معمول چائے تیار کرکے دونوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھی ان کا انتظار کررہی تھی۔

"السلام علیکم دادی اماں!"

"جیتی رہو، خوش رہو بیٹی۔" انہوں نے خوش ہوکر دعا دی۔

شرمین نے بھائیوں کے لیے آلو کے چپس تلے تھے۔ دادی اماں کے لیے مٹر کے دانے چاروں نے مل کر چائے پی۔ شرمین برتن اٹھانے کے بعد بھائیوں کو پڑھانے بیٹھ گئی۔ دادی اماں نے اٹھ کر رات کے کھانے کے انتظام میں ماش کی دال بھگودی۔

مغرب کی اذان ہوئی تو شرمین نے دونوں بچوں کو ہوم ورک میں مصروف کیا اور وضو کرکے دادی کے ساتھ نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ جس وقت وہ وظیفہ پڑھ رہی تھیں تو شرمین نے ہوم ورک چیک کرکے بچوں کو دوبارہ مصروف کیا اور خود اپنے مختصر سے باورچی خانے میں آگئی۔ اب اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے لیکن دماغ بھی اسی رفتار سے اپنی کھولا باندھی میں محو تھا۔

شام سے اب تک وہ آندھیوں کی زد میں آئے ہوئے چراغ کی طرح کبھی بجھ رہی تھی تو کبھی جل اٹھتی تھی۔ کسی سے اپنا حال دل کہنے سے عاجز تھی۔ کون تھا جس سے اپنی بپتا کہتی کوئی پرسان حال تھا نہ غمگسار۔

خیالات کی یورش میں غلطاں و پیچاں اس نے دال پکا کر بگھاری پھر چپاتیاں پکا پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھنے لگی۔ بستے بند کرتے ہی بچوں نے کھانے کے لیے شور مچادیا۔

دادی اماں زیر لب مسکراتے ہوئے انہیں میٹھی میٹھی گھرکیاں دینے لگیں لیکن تب تک شرمین کھانا تیار کرکے دسترخوان لگا چکی تھی۔ خود اس کی بھوک تو مرچکی تھی تاہم اس نے سب کا ساتھ دیا اور کسی کو احساس نہ ہونے دیا کہ آج کھانے میں اس کی دلچسپی برائے نام ہے۔ برتن دھو کر اس نے باورچی خانے کی صفائی کی ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکلی ہی تھی کہ عبداللہ اور ولی اللہ نے آ پکڑا۔ رات کو ہر روز اسی وقت وہ ان دونوں کے ساتھ تھوڑی دیر تک آنکھ مچولی کھیل لیا کرتی تھی لہٰذا آج بھی آنکھ مچولی شروع ہوگئی۔ اس کھیل میں دونوں بچوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ جب تک روزانہ دادی اماں آ کر نہ پکارتیں ان کا دل نہ بھرتا۔ ڈانٹ ڈپٹ کھا کر ہی بستر کی راہ لیا کرتے تھے۔

بستر پر ان کی دل بستگی کا ایک اور سامان موجود ہوا کرتا تھا اور یہ آئٹم ان کے دن بھر کا آخری آئٹم ہوتا تھا۔ اس آئٹم کا مرکزی کردار خود دادی اماں ہوا کرتی تھیں۔ ان تینوں کی پیاری دادی۔ جو انہیں پریوں کے دیس کی سیر کراتے، کراتے نیند کی میٹھی وادیوں میں جا اتارتی تھیں۔ جب وہ بہت چھوٹے تھے تو بھی دادی اماں انہیں اپنی رسیلی اور پرسوز آواز میں لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ بڑی اور باشعور ہوجانے کے باوجود ان کی کہانیاں تو شرمین بھی ہر رات بصد شوق سنا کرتی تھی۔

پریوں اور شہزادے، شہزادیوں کے علاوہ دادی ان تینوں بہن بھائیوں کو بے حد نصیحت آموز اور ولیوں، پیغمبروں کی کہانیاں بھی نہایت پیارے انداز میں سنایا کرتیں اور باتوں، باتوں میں سیکڑوں کام کی باتوں اور قصوں سے آگاہ بھی کرتی جاتیں۔

ہر رات کی طرح آج بھی یہی ہوا اور دونوں بھائی کہانی سنتے، سنتے نیند کی میٹھی آغوش میں جا سوئے۔

کہانی سن تو شرمین بھی رہی تھی مگر آج پوری توجہ اور یکسوئی سے سن نہ پائی۔ اس کا دھیان بار بار بھٹک جاتا تھا۔ باوجود ہزار کوشش کے وہ خود کو پرسکون اور یکسو نہ کرپائی۔ بالآخر اس نے سمجھنے کی کوشش ترک کردی۔

اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کسی سنگ دل، بے رحم اور خونخوار دیو کی سخت ترین گرفت میں پھنس چکی ہو جس کی اذیت اور کرب ناک پکڑ سے فرار ناممکن ہوگیا ہو۔ بچوں کو سلانے کے بعد دادی اماں نے نہایت اطمینان سے پرسکون ماحول میں عشا کی نماز اور اپنا طویل وظیفہ پڑھا۔ شرمین نے بھی عشا ادا کی۔ دونوں تھوڑی دیر باتیں کرتی رہیں پھر دادی اماں بھی گہری نیند میں غافل ہوگئیں۔ ہلکی ہلکی مدھم روشنی میں ان کا جھریوں بھرا بزرگ چہرہ بالکل شرمین کے سامنے تھا۔ شرمین اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور محبت پاش نگاہوں سے انہیں تکنے لگی۔ تکتے، تکتے اس کی خشک آنکھوں میں اشکوں کی برسات اتر آئی۔

"اللہ میری دادی اماں کو سلامت رکھے۔" اس نے بہ مشکل اپنی سسکی روکی۔ "کتنی پیاری اور کتنی عظیم ہیں میری دادی۔" اس کی نگاہوں کے سامنے نائمہ بیگم کا سراپا لہرانے لگا۔ سماعت سے ان کے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت ٹکرانے لگی۔ آج سارے دن کے بعد اب اسے سکون سے غور کرنے کا موقع ملا تھا اس نے بڑی بے چارگی سے سوچا۔

"کیا اس عمر میں ان کے قویٰ میں اتنی قوت اور سکت باقی بچی ہے کہ وہ ہمارے لیے محنت مزدوری کریں؟" وہ ایک لمبی سی جھرجھری لے کر رہ گئی۔ "پھر ڈاکٹر خاور کی والدہ نے اتنی دل آزار باتیں کیوں کیں؟ کیا ان کی نظر میں ہماری کوئی قدر و منزلت نہیں ہے؟ ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ وہ ہمارے لیے اس انداز سے سوچتی ہیں۔ کاش میں ان کی غرور اور تکبر سے پر باتوں کا کوئی کڑوا سا، تلخ سا جواب دے کر آتی۔ کوئی ایسا جملہ کہہ دیتی کہ حساب برابر ہوجاتا مگر شاید میں اس قابل نہ تھی.... چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔" اس کے اندر سے ایک ماندگی کا احساس اٹھا اور اسے مایوسیوں کے اندھیرے میں لے ڈوبا پھر مایوس ہوکر ناامیدی کے عالم میں سوچنے لگی۔

"کاش......اے کاش میں ایک لڑکا ہوتی پھر یقیناً ہمارے حالات ایسے نہ ہوتے۔ لوگ ہم سے بھی مرعوب رہتے اور دادی اماں بھی اتنی پریشان نہ رہا کرتیں۔ انہیں مجھ سے بہت سہارا اور آسرا رہتا.... پھر کسی کو ایک حرف بھی کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ نہ تو کوئی ہم پر بلاوجہ رحم کھاتا اور نہ ہمدردی کے پردے میں برچھیاں مارتا۔" اچانک...... مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن چمکی۔

"ارے، ہمارے گھر میں دو لڑکے ہیں تو ماشاءاللہ!"

...... اس نے دو ننھے فرشتوں عبداللہ اور ولی اللہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ جن کے نام دادی اماں نے اپنے

دوست

1۔ دوست ایک ایسا درخت ہے جس کا سایہ تھکن دور کردیتا ہے۔

2۔ ایسا باغ ہے وہ جس میں ہمیشہ بہار رہتی ہے۔

3۔ آسمان کا چاند، گلشن کا پھول، بہاروں کی رونق اور خوشبو کا جزیرہ ہے۔

3۔ چین اور سکون کا نام ہے۔

4۔ اس پاکیزہ رشتے کی قدر ہمیشہ دل سے کریں۔

از: صبا نور، لیہ

مرحوم بیٹے اسد اللہ سے ملا کر بے حد دلار سے رکھے تھے۔ شرمین کی افسردگی بڑی حد تک دور ہوگئی۔ خوش ہو کر سوچنے لگی۔

''یہ دونوں جلدی سے بڑے ہو جائیں تو ہمارے بھی دلدّر دور ہو جائیں گے۔ لوگ ہم سے بھی دب کر رہا کریں گے، ہم بھی اس دنیا میں فخر سے سر اٹھا کر جییں گے۔ تب دادی اماں بھی سکھ کا سانس لے سکیں گی۔'' بے سروپا باتیں سوچتے، سوچتے اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ بالآخر یہ فیصلہ کر کے کہ وہ کل سے ڈاکٹر خاور کے ہاں ٹیوشن پڑھانے ہرگز نہیں جائے گی وہ نیند کی وادی میں جا اتری۔ اگلے دن وہ سچ مچ پڑھانے نہ گئی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔

تیسرے دن اسے پچھتاوے نے آن گھیرا۔

''یا اللہ! یہ میں کیا کر رہی ہوں، لگی لگائی روزی ٹھکرا رہی ہوں۔ اب ڈاکٹر شاکرہ کے بچے بھی کالج لیول کے ہونے والے ہیں۔ ان کے سبجیکٹ پڑھانا میرے لیے ممکن نہ رہے گا۔ ادھر ادھر ٹیوشنز تو بہت ملتی ہیں مگر یہاں تو دیکھا بھالا مانوس سا ماحول ہے۔ اجرت بھی نہایت معقول ہے۔ اوفوہ! یہ میں کیا کر رہی ہوں۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

جتنا وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرتی گئی اس پر بے چینیوں اور بے قراریوں کے در وا ہوتے گئے۔ اسے اپنا فیصلہ سراسر احمقانہ اور فضول سا لگنے لگا۔ مرے پر سو دُرّے اس وقت لگ گئے جب دادی اماں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''بیٹی! پرسوں تو تم نے چھٹی کی تھی کیا آج بھی پڑھانے نہیں جا رہیں؟'' شرمین کے کاٹو تو لہو نہیں۔ اس نے دل میں خیال کیا دادی اماں شاید فیس کے خیال سے پوچھ رہی ہیں کیونکہ انہی تاریخوں میں اسے فیس ملا کرتی تھی۔ جلدی سے بولی۔

''جا رہی ہوں دادی اماں۔ آج تو جاؤں گی۔'' اور پھر واقعی وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔

جی ہی جی میں سوچتی گئی۔

''ہاں تو اور کیا اپنی محنت میں کاہے کی شرم۔ محتاجی کی نسبت محنت مشقت کرنا عبادت ہے۔ میرے تو ہاتھ پیر چل رہے ہیں۔ میں کیوں نہ محنت کروں۔ ابھی تو میرے پاس ان کے ہاں پہنچ جانے کا چانس ہے کیونکہ میں منع کر کے تھوڑی آئی تھی۔ اگر زیادہ دن ہو گئے تو مشکل ہو جائے گی۔ بس میں آئندہ ان کی کسی بات کا جواب ہی نہ دوں گی بس اپنے کام سے کام رکھوں گی۔ جب عبداللہ اور ولی اللہ بڑے ہو جائیں گے تو میں بھی گھر پر آرام کیا کروں گی۔'' وہ دادی اماں سے زیادہ اپنے آپ کو تسلیاں دیتی بالآخر ڈاکٹر خاور کی کوٹھی میں جا ہی پہنچی۔

یہاں سب کو اپنا منتظر پایا۔ کسی نے کچھ پوچھا نہ جرح کی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اسے دیکھ کر تینوں بچے خود بخود اپنی، اپنی کتابیں لے کر آ پہنچے۔ دو دن کے بعد اسے پا کر وہ بہت خوش ہوئے۔ شرمین نے دل ہی دل میں مطمئن ہو کر حسبِ معمول انہیں پڑھانا شروع کر دیا۔ تاہم اندر سے نائمہ بیگم کا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ خدانخواستہ وہ کسی طرف سے وارد ہو کر اپنی اُس روز والی تجویز کے بارے میں باز پرس نہ شروع کر دیں۔ پڑھانے کے دوران وہ چونک کر چور نظروں سے بار بار اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی لیکن خدا کا کرم شاملِ حال رہا اور نائمہ بیگم سرے سے ہی وہاں نہ آئیں۔ البتہ روبی اور معصومہ نے ضرور دو تین چکر لگائے۔ نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ اس کا حال احوال دریافت کرتی رہیں۔

معصومہ چائے کے ساتھ ایک دو لوازمات بھی میز پر رکھ گئی تھی۔ اتفاق سے نائمہ بیگم اس روز شمسہ بیگم کے ساتھ کہیں مدعو تھیں جس کا شرمین کو آخر تک علم نہ ہو سکا۔

(باقی آئندہ)



روشن راہیں

اُمِ ایمان

''بکواس بند کرو منحوس عورت۔'' احسن زور سے چلّا کر بولا۔

''ہاں، میں منحوس عورت ہوں اور تم کیا ہو۔ عورت کو کمزور جان کر اس پر اپنی زبان کے تیر چلا کر ہاتھ اٹھا کر خود کو طرّم خان سمجھتے ہو۔'' جواباً وہ بھی اس سے زیادہ زوردار آواز میں چلّا کر بولی تو احسن کو اور بھی زیادہ غصہ آ گیا۔

''صحیح کہتے ہیں سیانے کہ زیادہ پڑھی لکھی اور نوکری کرنے والی لڑکیاں کبھی گھر نہیں بسا سکتیں لیکن میری عقل پر تو پتا نہیں پٹی بندھی ہوئی تھی کہ تم......''

وہ غصے سے بولا تو رباب کب چپ رہنے والی تھی وہ بھی ترکی بہ ترکی بولی۔

''سیانوں نے تو تم جیسے پڑھے لکھے جاہلوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا ہے لیکن وہ شاید تمہیں یاد نہیں۔'' اب کے اس نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔ احسن جو دانت پر دانت جمائے بہ مشکل اپنا ہاتھ اٹھنے سے روکے ہوئے تھا کرسی کو ٹھوکر مارتا بیرونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

رباب جو اَب تک اس سے دو بدو مقابلہ کیے جا رہی تھی سر ہاتھوں میں پکڑ کر کرسی پر بیٹھی اور نئے سرے سے اپنی تذلیل پر آنسو بہانے لگی۔

☆☆☆

وہ دونوں شادی سے پہلے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ احسن کا اپنا چھوٹا سا ذاتی مکان تھا۔ ماں باپ اور کوئی رشتے دار نہیں تھے اس نے جب بھی گھر بسانے کا سوچا تو ذہن میں رباب کا ہی سراپا در آیا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتی، خوش شکل سی رباب کب اسے اچھی لگنے لگی تھی پتا نہ چلا۔ رباب کے بھی ماں باپ وفات پا چکے تھے۔ بھائی کے گھر رہتی تھی، تعلیم بی اے تک تھی۔ بھابی کے تیوروں کو دیکھتے ہوئے ایک آفس میں اس نے ٹائپسٹ کی جاب کو ذریعۂ معاش بنالیا اور کچھ رقم بھابی کے ہاتھ پر بھی رکھنے لگی تو ان کے تیوروں کے بل ختم تو نہیں کم ضرور ہو گئے تھے۔ باقی رہے بھائی تو وہ خود بیوی کی آنکھوں سے دیکھنا اور انہی کے کانوں سے سننا پسند کرتے تھے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا کہ اُن کے گھر جوان بہن ہے اس کی بھی ضروریات اور خواہشات ہوں گی۔ سو اس کی نوکری سے جب بھابی کو کوئی اعتراض نہیں تھا تو بھائی کون ہوتے تھے منع کرنے والے۔

پچھلے کچھ دنوں سے احسن کے بدلے، بدلے انداز وہ آفس میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے کئی بار احسن کی نظروں کا ارتکاز اپنے اوپر محسوس ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے پر وہ نگاہ بدل جاتا تھا۔ آخر ایک دن لنچ ٹائم میں جب سب لوگ اپنے، اپنے لنچ میں مصروف تھے۔ وہ بھی گھر سے لایا ہوا ٹفن کھول کر اپنی کرسی پر بیٹھی تھی کہ احسن چلا آیا۔ اس سے بیٹھنے کی اجازت طلب کی اور حال چال پوچھ کر سیدھے سبھاؤ اس سے اپنے رشتے کی بات کی۔ رباب نے بھی اسی کے انداز میں اسے اپنے بھائی سے ملنے کو کہا تھا۔ اسی شام اس نے بھابی کو بھی مختصراً اس کی آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے قناعت پسند رہی تھی سو جب احسن نے اسے اس حوالے سے پسند کیا تو اسے بظاہر احسن میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ آخر دو تین سال سے اکٹھے کام کر رہے تھے اس نے اس میں کوئی بڑی خامی نہ دیکھی تھی۔ ایک گھر اور چار دیواری کا خواب تو ہر عورت اور لڑکی دیکھتی ہے۔ اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ جو کوئی بھی اس کا شریکِ سفر بنے اس کی عزت کرے، اسے محبت دے اور دو وقت کی روٹی کھلا سکے بس کوئی بہت بڑے خواب نہیں تھے اس کے۔

بھابی تو پہلے ہی اس کا بوجھ کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتی تھی سو معمولی سی چھان بین کے بعد رشتے کے لیے ہاں کر دی گئی۔

دو ماہ بعد وہ احسن کے ہمراہ بیاہ کر اس کے چھوٹے سے گھر میں چلی آئی تھی۔ نوکری جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ احسن نے اس کی صوابدید پر چھوڑا تھا۔ کوئی خاص ذمّے داریاں نہ ہونے کے باعث ابھی اس نے فی الحال نوکری جاری رکھنے کا سوچا تھا۔

شادی کے شروع دن تو جیسے پر لگا کر اڑ گئے۔ احسن اور وہ ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ وہ دونوں صبح ساتھ ہی بیدار ہوتے۔ رباب ناشتا بناتی دونوں ساتھ ناشتا کرتے اور ساتھ ہی آفس جاتے۔ احسن اس کے لیے ایک محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ خدا کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

گزرتے دنوں میں جہاں، دونوں پر ایک دوسرے کی خامیوں، خوبیوں کے در وا ہوئے تھے وہاں

اسے احسن کی ایک عادت بہت بری طرح کُھلی تھی کہ کبھی چھوٹی موٹی لڑائی اور غصے کے دوران وہ ایسے نازیبا الفاظ استعمال کرتا جو رباب جیسی حساس لڑکی کو بہت گراں گزرتے تھے لیکن وہ درگزر سے کام لیتی تھی کہ سمجھوتا ہمیشہ عورت کی گٹھی میں ہی ڈالا جاتا ہے۔

ان کی شادی کو چھ ماہ ہونے کو آئے تھے کہ کسی بہت ہی معمولی بات پر دونوں کے درمیان جھڑپ ہوئی تو جہاں احسن کے منہ سے اس کے لیے گالی نکلی وہ بھی چپ نہ رہ سکی جواباً اسے اتنا ضرور سنا دیا تھا کہ آئندہ وہ گالی برداشت نہیں کرے گی لہٰذا وہ اس سے گریز کرے لیکن وہ مرد ہی کیا جو اپنی غلطی مان لے۔ احسن الٹا زیادہ غصے میں آ گیا تھا اور اسے تھپڑ دے مارا جس پر رباب کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچتی.... یا خدا احسن کا اصلی روپ کون سا ہے وہ جو آفس میں ہوتا تھا۔ دھیمے دھیمے، سلجھے اور سنجیدہ انداز میں بات کرتا ہوا...... یا یہ جو اَب ہے بیوی کو گالیاں دینا، چنگھاڑنا، غصے سے اس پر ہاتھ اٹھانا۔ یوں اب لڑائیاں ان کے گھر کا معمول بن گئی تھیں۔ عام حالات میں احسن کا رویہ بہت اچھا اور محبت بھرا ہوتا تھا وہ اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا بے حد خیال رکھتا لیکن جہاں اسے ذرا غصہ آتا اس کے منہ سے ناشائستہ الفاظ یا گالیاں... نکلتیں وہیں رباب بھی چپ نہ رہتی اور گھر میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا ہوتا۔

آج بھی کچھ ایسا ہی دن تھا رباب کی طبیعت کچھ دنوں سے مضمحل سی تھی، اسے صبح اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی جس پر باس سے دونوں کو لیٹ پہنچنے پر ڈانٹ یقینی تھی تو احسن جو خود ہی ناشتا بنانے میں لگا ہوا تھا گرم، گرم گھی کے چھینٹے پڑنے پر اسے غصہ آیا اور اس کے منہ سے رباب کے لیے جہاں گالی نکلی وہاں رباب بھی مقابلے میں چپ نہ رہی نتیجتاً ناشتا بھی رہ گیا تھا اور احسن بکتا جھکتا اسے چھوڑ کر خود ہی

غزل

دریا کی طرح کا نہ سمندر کی طرح کا
دل ہے کسی صحرا کے مقدر کی طرح کا

سرشار کیا جس کی زباں نے ہمیں برسوں
اب لہجہ ہے اس شخص کا خنجر کی طرح کا

آنکھوں کے جزیروں پہ کہاں خواب ٹھہرتے
اشکوں میں تلاطم تھا سمندر کی طرح کا

کل مجھ پہ شبِ ہجر قیامت کا تھا عالم
اب صبح کا منظر بھی ہے محشر کی طرح کا

راہبر کی قبا پہن کے ملتے رہے راہزن
راہبر نہ ملا کوئی بھی راہبر کی طرح کا

بھٹکے ہوئے انساں کو جو منزل کا پتا دے
ہے کون زمانے میں پیمبر کی طرح کا

پیکر تو ترے حُسن کے لوگوں نے تراشے
فنکار نہ تھا کوئی بھی آذر کی طرح کا

اس حسن کی دیوی کی گلی سے جو میں گزرا
ہر شخص لگا مجھ کو ستمگر کی طرح کا

جس پھول بدن کا میں طلب گار تھا شاکر
تھا سینے میں دل اس کے بھی پتھر کی طرح کا

شاعر: ڈاکٹر شاکر کاشمیری

مرسلہ: نور افشاں، شکارپور

سخت سسرال

پانی کا ایک قطرہ کسی جگہ لگاتار ٹپکتا رہے تو آخرکار وہ ایک مضبوط چٹان میں بھی سوراخ کر دیتا ہے لیکن جلد باز لہریں زور شور سے آتی ہیں اور چٹان سے گزر جاتی ہیں اور ان کا نشان تک پیچھے نہیں رہتا۔

سخت سسرال...... کسی بھی دلہن کے لیے چٹان کے مانند ہوتی ہے...... مگر اس کا صبر... بہر حال اس چٹان کو توڑ ہی دیتا ہے۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

آفس چلا گیا۔ اس نے اٹھ کر ساری چیزیں سمیٹیں اور ٹائم دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ آفس ٹائم گزر چکا ہے سو اپنے لیے چائے بنا کر کمرے میں آئی اور دکھتے سر کے ساتھ چائے پیتے ہوئے احسن کے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔

رات تک دونوں کے درمیان ایسا کچھ نہیں تھا۔ معمول کے مطابق ہلکی پھلکی بات چیت کے دوران دونوں نے کھانا کھایا تھا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے تھے۔ اپنی طبیعت کی پژمردگی بتانے پر احسن نے آج اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا وعدہ کیا تھا اور اپنے معمول کے وقت پر دونوں سو بھی گئے تھے۔ رات دیر تک اسے نیند نہ آسکی تھی۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی تھی، صبح کے قریب جا کر اس کی آنکھ لگی تھی اور جب آنکھ کھلی تو اچھی خاصی دیر ہو چکی تھی، وہ جلدی سے کچن کی طرف آئی جہاں احسن کو اس نے ناشتا بناتے ہوئے پایا اور اسے دیکھتے ہی اس نے غصے کا اظہار کیا تھا۔ کیا تھا جو وہ چپ رہ جاتی تھوڑا برداشت کر لیتی تو شاید احسن بھی اتنا نہ بڑھتا لیکن وہ کیا کرتی کہ جتنی اس کی طبیعت میں شائستگی تھی وہ دوسرے سے بھی اسی رویے کی توقع کرتی تھی اور اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی شدید غصے میں بھی وہ آپے سے باہر ہوئی ہو اور اس نے نازیبا الفاظ استعمال کیے ہوں سو دوسروں سے بھی ایسی ہی توقع رکھتی تھی اور احسن تو اس کا شوہر تھا جس سے وہ محبت بھی کرتی تھی اور اسے تمام برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتی تھی اور اس کی یہ عادت تو اسے سخت ناپسند تھی۔ اس کی ہمیشہ خواہش رہی تھی کہ اس کا شریکِ سفر بے شک روکھی سوکھی کھلائے لیکن اس کی عزت کرنے والا ہو اس کے پندار کو کبھی چوٹ نہ پہنچائے لیکن احسن کے نازیبا کلمات وہ برداشت نہ کر پاتی۔ وہ سوچتی رہی اور روتی رہی۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے صبح سے صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا لیکن پھر بھی دل اتنا خراب ہو رہا تھا کہ کچھ کھانے کو ہی نہ چاہا۔

وہ بس سوچے گئی کہ یہ اس کا لنچ ٹائم ہوگا روزانہ تو وہ لنچ ساتھ کرتے تھے وہ گھر سے ہی لنچ بنا کر لے جاتی تھی آج تو وہ ناشتے کے بغیر چلا گیا تھا اس نے لنچ کیسے کیا ہوگا اور کیا بھی ہوگا یا نہیں؟ کیا اس نے بھی سوچا ہوگا اپنی زیادتی کے بارے میں؟ نہیں سوچا ہوگا کیونکہ ایسی ہر لڑائی کے بعد احسن سب کچھ بھول بھال کر اس سے معمول کے انداز میں پیش آتا۔ اس نے اس سے معذرت کرنا تو ایک طرف کبھی اپنے رویے کو بے جا بھی نہ جانا تھا۔ اس کے نزدیک وہی ٹھیک تھی جو اس کے سامنے بول کر اسے زیادہ غصہ کرنے پر اکساتی تھی۔ وہ اگر چپ ہو جاتی تو شاید آئے روز بات اتنی نہ بڑھتی جبکہ رباب چاہتی تھی کہ وہ بے شک اس سے معذرت نہ کرے لیکن کم از کم اپنی غلطی سدھارنے کی کوشش تو کرے تا کہ آئندہ ایسی صورتِ حال پیش ہی نہ آئے لیکن مرد تھا ناں جو ازل سے صرف اپنا حق ہی جتاتا آیا ہے۔

سارا دن انہی سوچوں میں گزرا کہ اسے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی ساتھ ہی اشتہا انگیز کھانے کی خوشبوئیں بھی۔ یقیناً احسن آتے ہوئے بازار سے کھانا لایا تھا۔

”رباب! ارے بھئی باہر آؤ، دیکھو تمہارے فراق میں، میں نے آج لنچ بھی نہیں کیا اور بھوک سے برا حال ہے۔ آجاؤ کھانا ٹیبل پر لگاؤ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ مجھے پتا تھا محترمہ نے غصے میں کسی کام کو ہاتھ نہ لگایا ہوگا اس لیے آتے ہوئے کھانا بھی لے آیا۔“ احسن کی آواز باہر سے آئی۔ حسبِ معمول وہ صبح اپنے منہ سے نکالے جانے والے الفاظ بھول چکا تھا اور اس سے معمول کے مطابق پیش آرہا تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی، جہاں احسن کے وہ لفظ نہیں جیسے برچھیاں گزری تھیں اور جو زخم تھے ان سے اسے لہو

ٹپکتا محسوس ہو رہا تھا۔ الفاظ کا مرہم جس طرح دنیا کا سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے اسی طرح الفاظ کے گھاؤ بھی ایسے گھاؤ ہوتے ہیں جو نظر تو نہیں آتے لیکن ان کی کاٹ انسان کے اندر تک کو کاٹ ڈالتی ہے۔

”کاش احسن تمہارے اندر یہ بری عادت نہ ہوتی تو شاید میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرتی۔“ وہ ٹیبل پر کھانا لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”شکر ہے یار آج باس کے نہ آنے سے تمہاری بچت ہو گئی...... ورنہ پتا تو ہے کہ اُن کو چھٹی سے کتنی چڑ ہے۔ خیر میں تمہارا ٹیبل ورک تو تقریباً مکمل کر آیا تھا اب صبح جا کر ایک نظر دیکھ لینا۔“ وہ محبت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اور ہاتھ سے پکڑ کر اسے کرسی پر لا بٹھایا۔ ”کھانا کھالو تو پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، مجھے تو تمہاری طبیعت اب بھی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“ وہ آہستہ، آہستہ نوالے توڑتی رباب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کتنے محبت بھرے انداز اور الفاظ ہیں تمہارے پاس احسن...... نہیں ہے تو صرف معذرت کا ایک لفظ۔ گویا یہ غلطی تمہارے نزدیک غلطی تو کیا ایک عام سی بات ہے۔ روز تم اپنی محبوب بیوی کو اپنے چند برے الفاظ سے کیسے اندر تک روند ڈالتے ہو۔“ وہ قنوطیت سے سوچتے ہوئے آہستہ، آہستہ کھا رہی تھی گویا زبردستی احسن کا ساتھ دے رہی ہو...... پتا تھا کہ جہاں اس نے کھانا چھوڑا وہ بھی چھوڑ دے گا چاہے کتنی ہی بھوک کیوں نہ ہو۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ ڈاکٹر کے پاس آئے۔ معمولی سے چیک اپ اور ٹیسٹ کے بعد جو خوش خبری ملی اس نے جہاں دونوں کو بے حد خوش کیا وہاں رباب بھی تھوڑی دیر کو کھل گئی۔ صبح والی تلخی بھول گئی۔

احسن اسے آج کل بہت خوش رکھتا اس کا بہت خیال رکھتا کافی دنوں سے ان دونوں کے درمیان کوئی جھڑپ نہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں جب بھی بات کرتے ان کا موضوع ان کا آنے والا بچہ ہوتا۔ احسن کو بیٹی اور رباب کو بیٹے کی خواہش تھی۔ اپنی طبیعت کے پیشِ نظر اور اپنی خوشی سے رباب نے آفس سے ریزائن کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں مصروف رہتی۔ چھوٹے، چھوٹے کپڑے سی کر خوش ہوتی رہتی۔ کافی دنوں کے بعد ان کے درمیان معمولی سی بات پر جھگڑا ہوا۔ احسن بغیر بتائے آفس سے اپنے کسی دوست کے ساتھ چلا گیا تھا۔ جس کی طبیعت اچانک آفس میں خراب ہونے پر اسے اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ رباب کئی ناگوار باتیں سوچ، سوچ کر ہولتی رہی کہ احسن نے آج تک ایسی غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ اسے بتا کر کہیں جاتا اور آج اس کے آنے پر رباب جب بری طرح بگڑی تو حسبِ معمول احسن جو اپنے دوست کی حالت کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھا اس کے منہ سے جونہی غصے میں ناشائستہ کلمات سنے وہیں رباب کا بھی پارہ ہائی ہوا۔ وہ بھی زور، زور سے بولنے اور چیخنے لگی جس پر اس کی طبیعت بگڑ گئی اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ قبل از وقت ڈلیوری کی وجہ سے اس کی نارمل ڈلیوری نہ ہو سکی تھی۔ ڈاکٹرز نے آپریشن تجویز کیا تو احسن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وقت کو پیچھے لے جائے کہ جب رباب اس کی وجہ سے پریشان تھی تو اسے اس کی کنڈیشن اور پریشانی کا خیال کر کے چپ ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے تسلی دینی چاہیے تھی لیکن اس نے الٹا اسے گالیاں دے کر زور، زور سے چیخ کر اپنی مردانگی دکھائی تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اتنی بگڑ جائے گی۔ اسے پتا تھا کہ رباب اس کی اس عادت کو سخت ناپسند کرتی ہے لیکن اپنی ہزار کوشش کے باوجود وہ اسے بدل نہیں سکا تھا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باعث اسے اچھا برا سمجھانے والا کوئی نہ رہا تھا۔ کچھ دوستوں

کی محفلوں میں اس کی اس عادت کو فروغ ملا تھا۔ جاب ہو جانے کے بعد وہ دوست تو اس سے چھوٹ گئے لیکن عادت نہ چھوٹ سکی نہ ہی اس نے کبھی دانستہ ایسی کوشش کی۔ اسے یاد آیا رباب نرم لہجے میں ایسے برے کلمات منہ سے نکالنے والوں کے حوالے سے اقوال اور احادیث وقتاً فوقتاً اس کے سامنے دُہراتی رہتی تھی لیکن اس کے نزدیک یہ خامی تو کوئی خامی نہ تھی، وہ رباب سے محبت کرتا تھا اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی ضروریات کا اس سے زیادہ خیال رکھتا تھا لیکن آج جب رباب نے اسے کہا تھا۔

''احسن کاش آپ میری کوئی خواہش پوری نہ کرتے، مجھے بھوکا مار دیتے تو بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی آپ کی گالیوں سے میں محسوس کرتی ہوں۔ میری روح سنگسار ہو جاتی ہے۔ وہ چند لفظ سن کر میری روح پر آپ کے لفظوں سے جو آبلے بن گئے ہیں وہ ایک دفعہ پھوٹ گئے تو میں بچ نہ پاؤں گی ان کے زہر سے۔ مجھے چھوڑیں اپنی اولاد کا سوچیں کہ ہر اولاد کے لیے اس کے والدین آئیڈیل ہوتے ہیں۔ بڑا ہونے پر آپ کا بیٹا یا بیٹی جب بھی یہ نازیبا الفاظ اور ناشائستہ کلمات سنیں گے تو ان کے آئیڈیل کا بت کیسے پاش، پاش ہوگا۔ میں نے ہر ممکن برداشت کرنے کی کوشش کی کہ آپ کی اس خامی کو قبول کرلوں لیکن نہ کر سکی۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا اور پسینہ، پسینہ ہوتے ہوئے اس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ احسن کو تو کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی دانست میں جو بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی وہ کسی کے لیے اتنی جان لیوا ہو سکتی تھی۔ خود اس نے اپنے ابا کو اماں کے اوپر چیختے، چلّاتے اور ہمیشہ مغلظات ہی منہ سے نکالتے دیکھا تھا اس کی اس عادت کی بنیاد تو وہیں سے پڑی تھی جو محلے کے دوستوں کے ساتھ ان سب کی محبت میں پختہ ہوتی گئی تھی۔ اماں کو تو اس نے رباب کی طرح کبھی واویلا کرتے نہ دیکھا بلکہ اماں تو کہتیں کہ غصہ تو مرد کی شان ہے، وہ مرد ہی کیا جو غصے نہ کرے۔ رباب بھی اسے بیٹھ کر طریقے سے پیار سے سمجھاتی تو وہ شاید سمجھ جاتا اس نے بھی تو اس سے کھل کر کبھی اس بارے میں بات نہیں کی تھی نہ اس کی ذات کی اس گتھی کو سلجھانے میں کوئی معاملہ فہمی برتی تھی۔ وہ تو جواب میں بس چلّائے اور روئے جاتی اور برابر مقابلہ کرتی تھی جس پر اسے مزید غصہ آتا اور وہ اپنی زبان کو کنٹرول نہیں کر پاتا تھا۔ آج آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے ہٹ رہے تھے تو وہ اللہ کے حضور سر بسجود تھا کہ ایک دفعہ وہ اس کی رباب کی زندگی بچا لے۔ وہ اپنی ذات سے اسے کوئی دکھ نہ دے گا۔ وہ اللہ سے معافی طلب کرنے لگا جو رحیم و کریم ہے، جو توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہے۔ وہ غلطیوں کو سدھارنے کے مواقع بار بار مہیا کرتا ہے تاکہ انسان پلٹ آئے بس ایک قدم اٹھانے کی دیر ہوتی ہے۔

احسن کو ابھی ڈاکٹرنی نے بیٹی ہونے اور رباب کے ہوش میں آنے کی نوید دی تھی وہ ایک بار پھر سجدے میں چلا گیا تھا۔

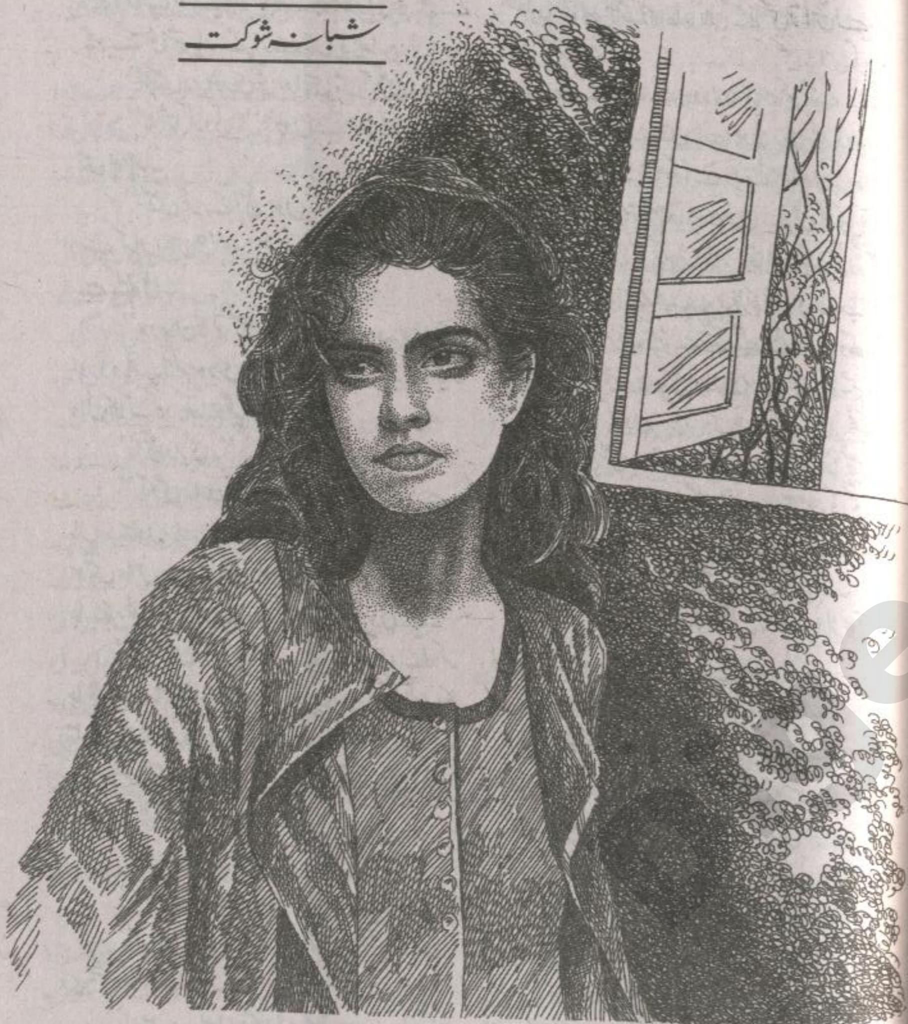
آنکھ کھلنے پر رباب کو اپنے سامنے آنکھوں میں نمی لیے احسن نظر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔

''دیکھو رباب اللہ نے ہمارے گھر ننھی سی امید کو بھیجا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی کوئی نازیبا الفاظ اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا...... مجھے تمہاری روح کے آبلوں پر نہ صرف پھاہے رکھنے ہیں بلکہ اپنی ''امید'' کے لیے بھی ایک آئیڈیل باپ بننا ہے اور تم اس کوشش میں میرا ساتھ دوگی۔'' اس نے رباب کا ہاتھ تھام کر وعدہ لیا تھا اور رباب نے سر اثبات میں ہلا کر طمانیت سے آنکھیں موند لی تھیں۔ زندگی کی روشن راہیں اُن کی منتظر تھیں۔



اہلِ صبر

شبانہ شوکت



''شہر یار مجھے ممی کی طرف چھوڑ دیجیے گا۔'' رومعہ تیزی سے اندر آئی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔

''کیوں، آفس نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں۔'' رومعہ نے اسی تیزی سے جواب دیا۔

''چلو......'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ شانے پر لٹکایا اور چپل تبدیل کر کے اس کے ساتھ ہی باہر آگئی تھی۔

''واپس کب آؤ گی؟''

''آفس سے واپسی پر لے لیجیے گا۔'' اس نے سر ہلایا اور دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔ وہ اسے باہر ہی سے ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔ وہ اندر آئی تو ممی نے چھوٹتے ہی شہریار کے بارے میں پوچھا۔

''انہیں دیر ہو رہی تھی، واپسی میں آئیں گے۔''

''ناشتا کرو گی؟'' انہوں نے ممتا بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں کر کے آئی ہوں، چائے پلوا دیں اور سب کہاں ہیں؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ماں سے کہنے لگی۔

''روحان کا تو تمہیں پتا ہے اور لامعہ یونیورسٹی اور ذوباریہ بیگم سو رہی ہیں۔'' رومعہ نے بے اختیار وال کلاک کو دیکھا جو گیارہ بجا رہا تھا۔

''اتنی دیر ممی۔''

''آدھی رات تک تو وہ فون پر لگی رہتی ہے۔ ماں، بہنوں اور رومان سے باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں، اس سے کہتی بھی ہوں کہ اسے ساتھ ہی لے جائے، خواہ مخواہ میرے لیے ٹینشن بنائی ہوئی ہے۔''

''تو انہیں ریزیڈنس ملے گی تو ہی لے کر جائیں گے ناں، اچھا چھوڑیں آپ...... ان لوگوں کا بتائیں جو لامعہ کا پروپوزل لانے والے ہیں۔'' اس نے موضوع تبدیل کیا اور شکر ہی تھا کیونکہ اسی وقت ذوباریہ آگئی تھی۔

''کیسی ہو رومعہ؟''

''شکر ہے اللہ کا، تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے۔''

''بس بوریت...... سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، ڈپریشن سا ہو رہا ہے۔''

''اوہو...... کیوں بھئی ڈپریسڈ ہونے والی کیا بات ہے؟ ایسا کرو میری طرف چلی چلو، شاید دل بہل جائے۔'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''نہیں یار، ممی بھی کہہ رہی تھیں آنے کو لیکن رومان پرسوں تک آنے کو کہہ رہے ہیں، دیکھو۔''

''ایک تو رومان بھائی کو بھی ریزیڈنس کا نہ ملنا مصیبت بنا ہوا ہے ورنہ ان کے ساتھ تو بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ مسکرا کر بولی تو ذوباریہ بھی مسکرانے لگی۔

چائے پینے کے دوران شام کو آنے والے مہمانوں کے بارے میں بات ہوتی رہی پھر ذوباریہ کچن میں چلی گئی۔ شام کو آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع کا خاصا اہتمام تھا جو دونوں نے مل کر کیا تھا۔ اچھے لوگ تھے، لڑکا کمپیوٹر انجینئر تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اریب نام تھا، ذوباریہ نے صرف کپڑے چینج کیے تھے اور رومعہ کے لاکھ کہنے پر بھی جیولری پہنی اور نہ ہی میک اپ کیا۔

''کیا کروں گی بس، ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' لڑکا بھی ساتھ آیا تھا۔ رومان تو تھا نہیں، روحان اور پاپا نے ان لوگوں سے ملاقات کی تھی۔ انہیں بھی اریب بہت پسند آیا تھا۔ جب تک وہ لوگ چائے سے فارغ ہو کر اٹھتے شہریار بھی آگیا تھا۔

''آپ کو کیسے لگے وہ لوگ، خصوصاً لڑکا؟'' واپسی پر رومعہ نے شہریار سے پوچھا۔

''اچھے لوگ تھے، لڑکا تو کافی اچھا لگا۔''

''چلو شکر ہے، اب لامعہ کی کشتی پار لگے تو بس روحان ہی رہ جائے گا۔'' وہ ہنسی، شہریار نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''کوئی ہے نظر میں؟''

''نہیں ابھی تو نہیں، ذرا سیٹ ہو جائے تو پھر ظاہر ہے کرنی ہی ہے۔''

''رومان بھی آرہا ہے؟'' اس نے رومعہ کے بھائی کا پوچھا۔

''جی...... دو دن بعد آرہے ہیں، پندرہ دن کی چھٹی پر۔''

''اچھی بات ہے، بھابی کچھ اداس سی لگتی ہیں، آج بھی کام میں تو لگی ہوئی تھیں مگر چپ، چپ

تھیں۔'' شہریار نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''فوجی لوگوں کو سوچ سمجھ کر شادی کرنی چاہیے، گھر ملتا ہے تو ٹھیک ورنہ شادی کو بھی کچھ آگے بڑھا دیں۔''

رومعہ کو خود بھی احساس تھا کہ ذوباریہ کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں تھا، ممی کے ٹوکنے پر وہ مائنڈ کر جاتی تھی۔ کام تو کر لیتی تھی مگر احسان کی طرح اور یہی چیز ممی کو غصہ دلانے کا باعث بنتی تھی۔ ممی کا خیال تھا وہ رومان کو ایک، ایک بات بتاتی ہے۔

''بتاتی رہے، اچھا ہے رومان بھائی یہی احساس کر کے اسے جلدی ساتھ لے جائیں گے۔'' رومعہ نے چڑ کر کہا تھا۔ ''جب آؤ یہی موضوع۔'' اسے کوفت ہوتی تھی، دو دن بعد رومان آیا تو وہ بھی ملنے آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے یہی پوچھا تھا۔

''آخر آپ کو گھر کب مل رہا ہے بھائی؟''

''انشاء اللہ دو ماہ بعد...... میجر انصار صاحب ٹرانسفر ہو کر جا رہے ہیں، ان کی جگہ وہ گھر مجھے مل جائے گا۔''

''چلیں، آپ کو مبارک ہو بھابی۔'' ذوباریہ ہنس پڑی تھی، دونوں گھومتے پھر رہے تھے، اس کے پاس بھی آئے تھے اور اس نے کھانا کھلا کر ہی بھیجا تھا، اس دن رومعہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے آئی تھی۔ اس کی پریگنینسی کا پانچواں مہینہ چل رہا تھا۔ معمول کے چیک اپ سے فارغ ہو کر وہ ممی کی طرف چلی آئی تھی۔ وہاں سب کے موڈ بگڑے ہوئے تھے۔ ذوباریہ کو اس نے سلام کیا تو وہ بہت رُکھائی سے جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ حیران رہ گئی۔

''کیا ہوا ہے ممی...... آج تو بڑا تناؤ ہے ماحول میں؟'' اس نے ممی ہی سے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا، کل کھانے کو دیر ہو گئی اور میں نے کہہ دیا تو میڈم نے تو رومان سے پوری لڑائی کی کہ

آپ کی والدہ مجھ پر خواہ مخواہ رعب ڈالتی ہیں، اپنی بیٹی کو تو پڑھنے میں لگایا ہوا ہے اور میری جان عذاب کی ہوئی ہے۔'' ممی کا مزاج بھی خاصا برہم تھا، اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

''ممی آپ ہی رہنے دیا کریں، آخر جب وہ چلی جائیں گی تو بھی کوئی سیٹ اپ کرنا پڑے گا ناں تو ابھی سے کوئی ایسا انتظام کر لیں جس سے یہ تلخیاں نہ پیدا ہوں۔''

''حد ہو گئی، وہاں جا کر کیا ہاتھ بھی نہیں ہلائے گی؟''

''افوہ ممی۔'' وہ جھنجلا گئی، وہ تو فریش ہونے کے لیے یہاں آئی تھی الٹا اور ٹینشن میں پڑ گئی۔ ویسے بھی اس کی طبیعت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ اس نے دو دن کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ اس نے ایم اے اکنامکس کیا ہوا تھا اور بینک میں اچھے عہدے کی جاب کر رہی تھی۔ شہریار سول انجینئر تھا اور گورنمنٹ جاب میں ہینڈسم سیلری کے ساتھ بہت اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے تو رومعہ کو مزید جاب کرنے سے منع کر دیا تھا لیکن وہ اتنی پُرکشش جاب بغیر کسی معقول وجہ کے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ گاڑی اس کی اپنی تھی اور وہ خود ہی ڈرائیو بھی کر لیتی تھی، اب بھی وہ خود ہی ڈاکٹر کے ہو کر ممی کی طرف آئی تھی کہ یہاں کی صورتِ حال نے اسے ٹینس کر دیا تھا۔ کچھ دن بعد پتا چلا ذوباریہ اور رومان کا خاصا زوردار جھگڑا ہوا ہے۔

''اب کیا ہوا؟'' اس نے انتہائی کوفت کے عالم میں پوچھا۔

''کہہ رہی ہے اس دفعہ میں ساتھ ہی جاؤں گی چاہے کرائے کا گھر لے کر رکھو...... اسے رومان پر شک ہے کہ وہ کسی اور میں انوالو ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ!'' وہ یہی کہہ سکی تھی۔

لامعہ کے سسرال والے رومان کے آنے کے بعد پہلی بار آئے تھے۔ اتوار کا دن تھا سو وہ اور شہریار بھی آگئے تھے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو ان دونوں

نے بھی اٹھنے کا قصد کیا مگر رومان نے جانے نہیں دیا۔
''یار میں کچھ دنوں تک چلا جاؤں گا۔ اب آج تھوڑا سا ٹائم دے دو اگر آہی گئے ہو تو۔''
آج تو ذوباریہ بھی چہک رہی تھی، خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ تھی ہی بہت اچھی شکل صورت کی، ذرا سا سج سنور کر اور بھی اچھی لگنے لگتی۔ رومان کی نگاہیں بھٹک، بھٹک کر اسی کی طرف جارہی تھیں۔ رات گئے وہ لوگ واپس آئے تھے۔ دوسری صبح وہ تیار ہورہی تھی کہ لامعہ کے فون نے ان کے حواس گم کردیے۔
''رومان بھائی نے بھابی کو طلاق دے دی۔''
''یہ، یہ، کک، کیسے ہم، میرا مطلب ہے...... رات کو تو......'' وہ ہکلا سی گئی۔
''پتا نہیں ہماری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا، کمرے میں جانے کے بعد ان دونوں کا نہ جانے کس بات پر جھگڑا اتنا بڑھا کہ یہ نوبت آگئی۔ بھابی تو روتی ہوئی گھر سے چلی گئیں تو ممی کے بے حد پوچھنے پر بھائی نے بتایا۔''
''اللہ، یہ تو بہت ہی برا ہوا؟'' وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔
''کیا ہوا؟'' شہریار اس کے پاس آیا۔ ''کیا کہہ رہی تھی لامعہ؟'' اس نے بہ مشکل اسے بتایا۔ وہ بھی حیران پریشان رہ گیا۔ وہ لوگ پہلے تو سیدھے وہیں پہنچے جہاں ماتمی فضا بنی ہوئی تھی۔ ممی، پاپا تو شہریار کے سامنے شرمندگی محسوس کررہے تھے۔ وہ تو پوری رات سو نہیں پائے تھے۔ بیٹے کا گھر اجڑ گیا تھا۔ ایک شادی شدہ بیٹی، ایک کی ہونے والی سسرال، کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا، کیا جواز پیش کریں گے سب کے سامنے۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ اپنی، اپنی جاب پر چلے گئے۔ یہ مسئلہ اتنا چھوٹا تو تھا نہیں کہ چٹکی بجاتے حل نکل آتا۔ رومعہ اپنی جاب سے جلدی چھٹی لے کر ماں کے پاس آپہنچی۔
''رومان بھائی سے پوچھا، کیا ہوا تھا؟''
''اب کوئی فائدہ ہے ان باتوں کا؟ اس نے جو کرنا تھا جذباتی ہو کر کردیا۔ اب آگے کا سوچ کر مجھے ہول اٹھ رہے ہیں۔''
''بھابی کے میکے سے کسی نے کانٹیکٹ کیا؟''
''اس کے ممی، ڈیڈی کا فون آیا تھا، ان کا خیال ہے کہ کسی مفتی یا عالم سے رائے لی جائے جبکہ ذوباریہ کا کہنا ہے اسے رومان نے تین طلاقیں ایک ساتھ دی ہیں۔''
''خدایا......'' وہ کراہی۔ ''یہ کیا، کیا رومان بھائی نے۔'' شام تک ذوباریہ کے ممی، ڈیڈی بھی آگئے، رومان کو بھی بٹھایا گیا، وہ بھی سخت پریشانی اور پشیمانی میں گھرا ہوا تھا۔ تمام مفتیوں اور علما کی رائے کے مطابق طلاق ہوچکی تھی۔ اب اگر وہ دونوں اپنے کیے پر پشیمان تھے اور دوبارہ ایک ہونا چاہتے تھے تو اس کی اجازت انہیں حلالہ کے بعد ہی مل سکتی تھی۔
''حلالہ......؟'' رومان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
''اس سے تو بہتر ہے کہ عدت کے بعد ذوباریہ کی کہیں اور شادی کردی جائے۔'' اس کے ڈیڈی نے تلخی سے کہا۔ رومان کا سر جھک گیا۔ ذوباریہ نے تو اتر سے جھگڑے کرکے اسے اتنا غصہ دلایا تھا کہ وہ بھیانک الفاظ اس کے منہ سے نکل گئے تھے۔ وہ دراصل امید سے تھی، اسی لیے وہ اتنے پریشان تھے۔ اس کی تو عدت بھی اب ڈلیوری سے مشروط تھی کہ جب بچہ ہوجاتا تو طلاق صادر ہوتی اور پھر عدت کی مدت...... وہ سب ایسی پریشانی کا شکار ہوگئے تھے کہ جس سے نکلنے کے لیے ایک عرصہ درکار تھا۔ اب تو صرف یہ سوچنا تھا کہ وہ حلالہ کے لیے کسے تلاش کریں، کوئی ایک ایسا قابلِ اعتماد بندہ جو اسے آسانی سے چھوڑ بھی دے۔ سب سے پہلے تو روحان کا ہی خیال آیا تھا لیکن اس نے واضح الفاظ میں منع کردیا۔ سب یوں خاموش ہوگئے کہ ابھی کافی

وقت تھا لیکن ذوباریہ اتنی ذلت اور ٹینشن برداشت نہیں کرپائی اور ایک دن واش روم میں چکرا کر گری اور اس کا مس کیرج ہوگیا۔ خود اس کی زندگی کے لالے پڑگئے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ سو اب پے درپے مصائب کا ایک سلسلہ سا چل پڑا تھا۔ جو نہ جانے کہاں جاکے رکنا تھا۔

☆☆☆

رومان اس دفعہ جلدی چھٹی لے کر آیا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر آیا تھا اس لیے آتے ہی رومعہ اور شہریار کے پاس چلا آیا۔
''میں آپ دونوں سے ایک التجا کرنا چاہتا ہوں۔''
''کھل کر کہو کیا بات ہے؟'' شہریار نے اسے حوصلہ دیا۔
''میں چاہتا ہوں شہریار بھائی آپ ذوباریہ سے نکاح کرلیں، میرا مطلب ہے حلالہ کے لیے۔'' وہ ایک دم کہہ گیا...... لاؤنج میں سناٹا چھا گیا۔ رومعہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ یہ اس کا بھائی کہہ کیا رہا تھا؟ شہریار بالکل چپ ہوگیا تھا۔ رومان مجرمانہ احساس میں گھر گیا۔
''آئی ایم سوری، اگر آپ کو برا لگا ہے تو......''
''نہیں برا لگنے کی کوئی بات نہیں، میں اگر تمہاری مشکل آسان کرسکتا ہوں تو ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔'' کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے بہت آرام سے کہا تھا۔
رومعہ کو لگ رہا تھا اس کی حیرت اور غصے کی انتہا یہیں ختم ہوگئی ہو۔ اس سے رائے تک نہیں لی گئی تھی۔ بھائی نے یہ خوفناک خیال پیش کیا اور میاں اس کا ہم نوا بن گیا۔ اس کے جذبات و احساسات کی ہر دو کو کوئی پروا ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ، ایک رات کے لیے بھی کسی اور بلکہ اور کیا اپنی سابقہ بھابی کو برداشت کرپائے گی؟ وہ گم صم ہوگئی تھی۔
''رومعہ سے پوچھ لو، اسے شاید یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔'' رومان کچھ جھجک سا گیا۔
''رومعہ پلیز میرے لیے یہ قربانی دے دو، ممی بھی یہ تجویز سن کر کچھ ناراض سی ہوگئی تھیں لیکن میں اپنے کیے کی تلافی کے لیے یہی کرسکتا ہوں۔ میرے لیے بھی یہ سب آسان نہیں ہے، بس یہ ہے کہ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔''
وہ کتنی دیر اسے سمجھاتا رہا تھا۔ بالآخر اس نے ہار مان لی تھی۔

☆☆☆

عدت کے بعد بہت سادگی سے ان دونوں کا نکاح ہوگیا تھا۔ دوسرا کمرا انہیں دیا گیا تھا۔ رومعہ، ممی کی طرف آگئی تھی، وہ یہ خوفناک منظر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں جو طوفان آرہے تھے اس میں یہی بہتر تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ جاتی۔ ممی، پاپا اور رومان سب اس سے نظریں چرا رہے تھے۔ سب اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے، اس لیے ان کی شرمندگی بھی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ دوسرے دن شام کو وہ بے دلی سے تیار ہوگئی کیونکہ شہریار کو اسے لینے آنا تھا۔ شام رات میں بدل گئی مگر نہ وہ خود آیا نہ ہی اس کا فون آیا تھا۔ ان کی شرمندگی اب پریشانی میں بدل گئی تھی۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا تو رومان ہی سب سے پہلے اشتعال کی لپیٹ میں آیا تھا۔
''یہ کیا تماشا ہے، شہریار بھائی سے یہی طے ہوا تھا کہ وہ اسے دوسرے دن طلاق دے دیں گے۔''
''انہوں نے ہامی بھری تھی؟'' رومعہ کی آواز میں بہت ٹھنڈک تھی۔ رومان کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ممی تو تھرا گئیں۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب رومان بھائی سے پوچھیں جنہوں نے یہ آئیڈیا پیش کیا تھا۔'' وہ زہر خند سے کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ رومان اور ممی اس کے ساتھ چلنے

کے لیے تیار ہوئے۔ اس نے بھی یہی مناسب سمجھا اور ان کے ساتھ اپنے گھر چلی آئی۔ دروازہ شہر یار نے ہی کھولا تھا۔

"آئیں......" وہ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ تینوں اندر آگئے، ممی اور رومان تو لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنا ہینڈ بیگ اور موبائل، گاڑی کی چابیاں وغیرہ رکھ کر وہ بھی ان کے پاس ہی آبیٹھی تھی۔ رومان نے ہی بات شروع کی تھی۔

"شہر یار بھائی آپ نے زوباریہ کو طلاق نہیں دی؟"

"نہیں۔" وہ بہت پُرسکون اور فریش تھا۔ "وہ طلاق نہیں لینا چاہتی۔"

"کیا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ کھڑا ہوگیا۔

"وہی جو تم نے سنا۔" وہ بھی کھڑا ہوگیا تھا۔

"بلکہ بہتر ہوگا زوباریہ خود ہی بات کرلے۔"

"زوباریہ۔" اس نے آواز دی، وہ چلی آئی، نکھری ہوئی، کھلی کھلی، خوب صورت لباس اور جیولری میں ہلکا پھلکا میک اپ اسے مزید نکھار کرنئی نویلی دلہن کا بھرپور تاثر چھوڑ رہے تھے۔

"رومان پوچھ رہا ہے میں نے تمہیں طلاق کیوں نہیں دی؟"

"آپ نے کیا کہا؟" وہ دلکشی سے مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ جُڑ کر کھڑی ہوگئی۔ ان تینوں کی طرف تو دیکھا تک نہیں تھا۔

"تم بتاؤ، کیا کہنا چاہیے بلکہ تم کیا چاہتی ہو؟" وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"میں تو اب ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" کمرے کی دیواریں ان تینوں کے اوپر آگری تھیں، رومان طیش میں آکر اٹھا اور اس سے پہلے کہ وہ پل پڑتا، زوباریہ چیخ مار کر شہر یار سے لپٹ گئی۔ اس نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔

"خبردار رومان اگر ایک قدم بھی آگے بڑھے تو......"

"تو کیا کریں گے آپ؟" اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"مثلاً..." اس نے دانت پیسے۔

"میں رومعہ کو طلاق دے دوں گا۔" اس کے ٹھنڈے لہجے نے رومعہ کو جلتے الاؤ میں پھینک دیا تھا۔ رومان وہیں ساکت ہوگیا تھا۔ ممی نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا تھا۔

"تم اب جاؤ کمرے میں۔" شہر یار نے زوباریہ سے کہا۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ "تمہیں کچھ اور کہنا ہے تو کہو اور جاؤ۔" وہ سرد مہری سے رومان سے مخاطب ہوا۔

"چلو رومان۔" ممی اٹھ گئیں۔ "اور تم؟"

"میں یہیں رہوں گی، سارے فیصلے آپ لوگوں نے خود کیے ہیں، اس لیے اب حقیقت کو قبول کریں اور گھر جا کر آرام کریں۔" وہ بہ مشکل اٹھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے اردگرد جیسے آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ دل، دماغ سب ایک ہیجان میں مبتلا تھے۔ جب شہر یار نے اسے طلاق کی دھمکی دی، وہ چاہتی تو اسی وقت اٹھ کر چلی جاتی لیکن اسے بہت کچھ دیکھنا تھا۔ رومان اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ اب اگر اسے بھی طلاق ہوجاتی تو لامعہ کے سسرال والے تو لامحالہ یہی سمجھتے کہ یہ بہن بھائی گھر بسانے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اسے اپنے بچے کا بھی سوچنا تھا جو ابھی اس دنیا میں آیا ہی نہیں اور اس کی بے گناہ ماں کیسے گرداب میں پھنس گئی تھی۔ وہ شل ہوتے دماغ کے ساتھ ہر بات سوچ رہی تھی، وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی، کبھی کسی موقع پر کمزوری نہیں دکھائی۔ دورانِ تعلیم کتنے لڑکے اس سے متاثر ہو کر آگے بڑھے لیکن اس نے پوزیٹو رسپانس نہیں دیا۔ شہر یار سے شادی کے بعد وہ تہ دل سے اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی وہ بھی اس سے محبت

کرتا تھا یا کم از کم اسے ایسا ہی لگتا تھا۔ اس کے بھائی کی جذباتیت نے اس کی زندگی کو ایسی آزمائش میں مبتلا کردیا تھا جس سے نکلنے کی کوئی سبیل کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اسے شک تو تبھی ہوا تھا جب کل شام... شہر یار اسے لینے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ وہ جس طرح زوباریہ سے شادی کے لیے تیار ہوا تھا۔ اس کے دل میں کھٹکا تو تھا کہ کہیں زوباریہ کی خوب صورتی نے... شہر یار کو بھی متاثر تو نہیں کردیا لیکن اب تو سب واضح ہوچکا تھا۔ جس طرح اس نے سب کے سامنے اسے بے باکی سے بانہوں میں لیا تھا۔ استحقاق سے بلایا تھا۔ اس نے زوباریہ کی حیثیت واضح کردی تھی۔ یہ تو بعد میں جب رومعہ کی ممی نے زوباریہ کی ممی سے فون پر وعدہ خلافی کی شکایت کی تو انہوں نے بتایا کہ زوباریہ، رومان جیسے مشتعل مزاج اور بات، بات پر بھڑکنے والے مرد کے مقابلے میں شہر یار کے دھیمے مزاج اور اچھے اخلاق کی گرویدہ ہوگئی ہے۔ سب سے بڑی بات شہر یار کے ساتھ، اس کے لیے ساس، نندوں کا ٹنٹا بھی نہیں تھا۔ رومعہ کو یاد آیا وہ پہلے بھی اس کی زندگی پر رشک کرتی تھی۔

"تم تو خوب مزے میں ہو جہاں آؤ، جاؤ کوئی پوچھنے والا نہیں، اوپر سے ہر وقت شہر یار بھائی کا ساتھ بھی میسر ہے۔" اتنا تو رومعہ کو بھی اندازہ تھا کہ زوباریہ نے وہ باتیں بتائی تھیں جو بیان کے قابل تھیں، نہ جانے شہر یار نے اسے اپنے کن جذبات سے ایسا گرویدہ کیا تھا کہ وہ اپنے طے کیے ہوئے پروگرام سے منحرف ہوگئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ بہت صبح اٹھ گئی تھی۔ نماز پڑھ کر اپنے لیے چائے بنائی اور برتن دھو کر کمرے میں آگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ تیار ہو کر گھر سے نکل آئی۔ قریبی پارک میں اس وقت جاگنگ کے لیے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اسے یہاں آفس ٹائم شروع ہونے تک رکنا تھا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہاں اخبار رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے پڑھنے لگی پھر جب آفس ٹائم شروع ہوا وہ وہاں سے اپنے بینک چلی آئی۔ شام کو واپسی پر اپنے لیے ایک برگر لیتی آئی تھی۔ اس نے اپنی روٹین سیٹ کرلی تھی۔ صبح سویرے نکل جاتی اور شام کو جب آتی تو اپنے لیے کچھ بھی لے آتی، گھر میں کیا بنتا تھا کیا نہیں اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ شہر یار آفس سے آکر اس کی طبیعت پوچھنے ضرور آتا تھا۔ وہ معمول کی طرح ایک ہی جملہ کہتی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کے بعد اس کے لبوں پر قفل لگ جاتا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہتا پھر چلا جاتا۔ وہ روز رات کو سونے سے پہلے دروازے کو چٹخنی ضرور چڑھاتی تھی۔ کئی بار اسے شہر یار کے قدم اپنے دروازے کے آگے رکتے محسوس ہوئے تھے، اگر وہ صرف دروازہ لاک کرتی تو وہ بڑے آرام سے کھول سکتا تھا لیکن وہ چٹخنی چڑھا کر ہر راہ مسدود کردیتی تھی اور وہ دن بھی آگیا جب اسے تخلیق کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ صبح، صبح کا وقت تھا اس نے روحان کو فون کیا جلد ہی اس کے ساتھ ممی بھی آگئی تھیں مگر وہ گیٹ سے باہر ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ وہ جیسے تیسے باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی اسپتال کی جانب چل دی۔ اسپتال پہنچ کر ڈاکٹر نے اسے فوراً ایڈمٹ کرلیا اور کچھ گھنٹوں بعد اس کے بہت پیارے سے بیٹے نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ شام کو شہر یار کا فون آیا۔

"تم کہاں ہو رومعہ؟"

"اسپتال میں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"خیریت......؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ کچھ دیر چپ رہی پھر آہستگی سے جواب دیا۔

"کیا ہوا؟" وہ بے چین سا تھا۔

"بے بی ہوا ہے۔"

''کیا......؟'' وہ چیخ پڑا۔ ''تم اس کنڈیشن میں خود......'' رومعہ نے فون بند کردیا۔ اس شخص سے کوئی بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں آگیا تھا۔ ممی، پاپا، روحان اور لامعہ سب وہیں موجود تھے۔ سب کے چہروں پر اسے دیکھ کر تناؤ آگیا تھا۔ وہ بے پروائی سے انہیں نظر انداز کرتا اس کے پاس آگیا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' عین وہی وقت تھا جب وہ آفس سے آکر اس کی خیریت پوچھنے آتا تھا اور وہ یہی جواب دیتی تھی۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر شاید نرسری کی طرف چلا گیا تھا، اسپتال سے اسے ممی گھر لے گئی تھیں۔ پندرہ دن وہاں رہ کر وہ واپس اپنے گھر آگئی تھی۔ اب ظاہر ہے اس کی روٹین چینج ہوگئی تھی۔ اس لیے اسے کچن میں بھی جانا پڑتا تھا مگر پھر بھی اس کی ذوباریہ سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ذوباریہ کی ظاہری حالت بتارہی تھی کہ وہ بھی پریگننٹ ہے۔ اس کے دل میں ایک زخم کا مزید اضافہ ہوا تھا حالانکہ یہ تو ہونا ہی تھا پھر اسے کیوں دکھ ہورہا تھا۔ ''شاید دکھوں کی عادت ابھی ہوئی نہیں ہے۔'' اس نے اپنے دل کو سنبھالا۔ انہی دنوں رومان کی اپنے بریگیڈیئر کی بیٹی سے منگنی کی خبر سننے کو ملی۔

''اگر یہی کچھ کرنا تھا تو یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' ممی تو پھٹ ہی پڑی تھیں، اُدھر لامعہ کی سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔

''مجھے کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔ لامعہ نے انکار کردیا۔

''پاگل ہوگئی ہو، اتنا عرصہ منگنی کو ہوگیا، اب تو یہ ان شریف لوگوں کے ساتھ بھی ظلم ہے۔'' رومعہ اسے سمجھا رہی تھی۔ لامعہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''آپ کو کیا مل گیا شادی کرکے، الٹا اذیت میں ہیں، اس سے میں ایسی ہی اچھی۔''

''پاگل مت بنو، ہر کسی کی قسمت ایک جیسی نہیں ہوتی، پتا نہیں تمہارے مقدر میں کتنی خوشیاں لکھی ہوں اور میری فکر نہ کرو، میں تمہیں خوش رہ کر دکھاؤں گی انشاءاللہ۔'' لامعہ کے ساتھ ہی روحان کی شادی بھی تھی۔ وہ اکیلی ہی شریک ہوئی۔ رومان کی شادی میں سب لوگ گئے علاوہ رومعہ کے، اس نے جانے سے انکار کردیا تھا، ممی کے اصرار پر اس نے فقط اتنا کہا۔

''میں رومان کی ایک اور بیوی کو شہریار کی بیوی نہیں بنانا چاہتی، اس لیے میرا نہ جانا ہی بہتر ہے۔''

☆☆☆

وہ اپنے بیٹے اسفر کو صبح ممی کے پاس چھوڑ کر آفس جاتی اور شام کو واپسی پر لیتی ہوئی آتی تھی۔ ان دنوں ذوباریہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں میکے گئی ہوئی تھی۔ شہریار بھی روز ساری شام وہیں گزارتا تھا۔ صبح رومعہ جب اپنا ناشتا اور اسفر کا سیریل بنانے آتی تو عموماً وہ بھی اٹھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ اس کا ناشتا بنا کر ٹیبل پر رکھ کر خود اپنے کمرے میں آجاتی تھی۔ وہ اسے بات کرنے کا کوئی موقع نہیں دیتی تھی۔ وہ ناشتا کرکے تیار ہوکر کمرے میں آتا اور اسفر کو اٹھا کر پیار کرنے کے بعد چلا جاتا۔ اس دن اتوار تھا وہ اسفر کو سلا کر اپنے کچھ کام کرنے کا سوچ رہی تھی کہ شہریار کمرے میں چلا آیا۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''جی۔''

''تم سے کچھ بات کرنی تھی۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے تمہاری ناراضی کافی لمبی ہوچکی ہے، اب اس کا اینڈ ہوجانا چاہیے، ہم میاں بیوی ہیں اور آپس میں بات تک نہیں کرتے، یہ کچھ ٹھیک تو نہیں۔''

رومعہ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

''تم میری بیوی ہو، تمہارے جو بھی حقوق ہیں وہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں سو......!'' وہ اسے دیکھتے

ہوئے مسکرایا۔ ''آج دروازے کو اندر سے چٹخنی نہیں چڑھانا۔'' وہ پھر بھی نہیں بولی، وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا پھر اٹھ کر چلا گیا، اس کے جاتے ہی اس نے اٹھ کر اپنے بیگ میں اپنے اور اسفر کے دو، دو سوٹ ڈالے اور ممی کی طرف چلی آئی۔

''اب ذوباریہ بیگم میکے میں ہیں تو میں ان کی تنہائی بانٹوں۔'' وہ زہر خند سے سوچ رہی تھی۔ رات کو اس کا فون آ گیا۔

''تم کہاں ہو؟''

''ممی کے پاس؟'' وہ کچھ چپ سا ہو گیا۔

''کب آؤ گی؟''

''پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے... جیسے ہی وہ ٹھیک ہوتے ہیں، میں آجاؤں گی۔'' اس نے رسان سے جواب دیا پھر وہ پورے ایک ہفتے بعد آئی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ذوباریہ تشریف لا چکی تھی۔ ایک استہزائیہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ جس وقت وہ لاؤنج میں داخل ہوئی، ذوباریہ صوفے پر نیم دراز تھی اور... وہیں صوفے پر شہریار چھوٹے سے بچے کو بازوؤں میں لیے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اسی طرح جھکے، جھکے اس نے نظریں اٹھائیں اور اسے دیکھ کر سیدھا ہو گیا، بغور اسے دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرنا چاہا مگر وہ تیزی سے گزر کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسفر باپ کو دیکھ کر ہمکا تھا مگر وہ رکی نہیں، باپ کے پاس تو ایک اور بچہ موجود تھا وہ اسے کیسے لیتا، اسفر کو بیڈ پر بٹھا کر اپنا بیگ ایک سائڈ پر رکھ کر اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔ ٹانگیں سیدھی کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

''مائے بوائے۔'' اپنے نزدیک شہریار کی آواز سن کر اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ جھک کر اسفر کو اٹھا رہا تھا۔ اسے اٹھا کر چومتا ہوا باہر لے گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، اب اس کی

مچھلی

سمندر کے کنارے ایک مچھیرا چلا رہا تھا۔

''جی ہاں! یہ جدید ایجاد ہے، میں اس آئینے کی مدد سے بہت ساری مچھلیاں پکڑ کر خوب دولت کماؤں گا۔''

وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے پوچھا۔ ''یہ آئینہ کس طرح کام کرتا ہے؟''

مچھیرے نے جواب دیا۔ ''میں ضرور بتاؤں گا مگر اس کے لیے تمہیں مجھے دو سو روپے فیس دینا ہو گی۔''

اس شخص نے تجسس سے مجبور ہو کر دو سو روپے دیے اور اس سے مچھلی پکڑنے کی ترکیب پوچھی۔

مچھیرے نے بتایا۔ ''میں آئینے کا رخ پانی کی طرف کر دیتا ہوں کوئی مچھلی قریب سے گزرتی ہے تو آئینے سے نکلنے والی شعاؤں سے گھبرا جاتی ہے اور میں اسے پکڑ لیتا ہوں۔'' اس شخص نے غصے سے کہا۔

''یہ تو انتہائی احمقانہ بات ہے کہ تم اس طرح مچھلیاں پکڑتے ہو، یہ بتاؤ کہ تم نے اب تک کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں؟''

''تم پانچویں مچھلی ہو؟'' مچھیرے... نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک گئے تھے۔

☆☆☆

جیسے ہی اسفر ایک سال کا ہوا اس نے شہر یار سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا، وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''کیوں اب کیوں تم الگ رہنا چاہتی ہو؟''

''چاہنے کی تو بات ہی نہیں، میں صرف اسفر کی اچھی پرورش کے لیے الگ ہونا چاہتی ہوں، میں اپنا اور اپنے بچے کا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں، اس لیے آپ سے مجھے کچھ نہیں چاہیے، نہ روپیہ نہ کوئی سپورٹ۔''

''تمہارا دل کیسے چاہے گا اکیلے رہنے کو؟''

''دل......؟'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ''دل تو اسی دن مر گیا تھا جب رشتے بدل گئے تھے، ان کی نوعیت بدل گئی تھی، اب تو یہ جسم ہے جو صرف تب تک جینا چاہتا ہے جب تک اسفر کچھ بن نہیں جاتا۔'' وہ کچھ دیر خاموش کھڑا اس کے تاثرات دیکھتا رہا اتنے عرصے میں وہ آج اتنا بولی تھی ورنہ تو ایک چپ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی اس نے، اب لب کھولے بھی تو کیا کہنے کے لیے۔

''تم اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو جاؤ اگر ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو...... یا میں ذوباریہ کو اوپر......''

''نہیں......'' اس نے بہت سختی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ ''میں باقاعدہ الگ ہونا چاہتی ہوں یعنی ڈائیورس لے کر۔'' اس نے ایک، ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''لیکن کیوں...... تمہیں کیا تکلیف ہے یہاں؟'' وہ غصے میں آ گیا تھا۔

''میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔''

''تمہیں اصل غصہ یہی ہے کہ میں نے ذوباریہ کو چھوڑا کیوں نہیں، اسی لیے......''

''پلیز، مجھے کوئی غصہ نہیں، پہلے پہل رومان بھائی پر بہت غصہ تھا لیکن اب میں ان کی مشکور ہوں کہ ان کے اس فیصلے نے کھرا کھوٹا الگ کر دیا، مجھ سے شادی آپ کے گھر والوں نے کروائی تھی جبکہ ذوباریہ کو آپ نے اپنی دلی آمادگی سے اپنایا تھا۔ اس لیے اس کی حیثیت مجھ سے بڑھ کر ہے، اب بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے آزاد کر دیں۔ ہمارا ساتھ، ہماری زندگی میں تلخیاں تو پیدا کر سکتا ہے خوشی نہیں، مجھ سے آپ کو کچھ نہیں مل سکتا اور آپ سے توقع رکھنی میں کب کی چھوڑ چکی ہوں۔''

''بہت سے مرد دوسری شادی کر لیتے ہیں تو ان کی بیویاں یونہی علیحدگی مانگ لیتی ہیں؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''وہ یقیناً اپنی بیوی کی بھابی سے دوسری شادی نہیں کرتے ہوں گے، میں بھی سب بھول جاتی اگر آپ اتنا بڑا دھوکا نہ دیتے، آپ نے نہ صرف میرا بلکہ میرے بھائی کا، ہم سب کے اعتماد کا خون کیا...... اگر آپ کی فطرت میں ہرجائی پن تھا، آپ ایک عورت پر قناعت کرنے والے نہیں تھے تو بھی آپ کسی اور کو چنتے، میں اپنے بیٹے کی خاطر برداشت کر لیتی مگر جو کچھ آپ نے کیا وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ ذوباریہ کے ساتھ یہاں رہنا نہ صرف میرے لیے بلکہ میری پوری فیملی کے لیے ایک اذیت ہے، میرے میکے والے یہاں پاؤں نہیں رکھ سکتے، کل جب میرے بیٹے کو ان سب باتوں کا علم ہوگا تو اس کے ذہن پر ان باتوں کے کتنے خوفناک اثرات پڑیں گے، ان سے بچنے کے لیے ہماری مکمل علیحدگی ضروری ہے۔''

''میں نے ذوباریہ سے شادی تمہارے بھائی کی طلاق کے بعد کی تھی، وہ تمہاری بھابی نہیں رہی تھی۔''

''کبھی تو رہی تھی ناں، رومان اس سے محبت کرتا تھا تو ہی اس سے دوبارہ شادی کے لیے اس نے اتنے جوکھم اٹھائے تھے ورنہ وہ جہنم میں جاتی، اسے کیا...... میرا بھائی کوئی برا انسان ہوتا تو آپ دونوں کو ٹیز کرنے کے لیے وہ یہاں بار بار آتا، میری موجودگی میں اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا لیکن ہماری تربیت ہی

بہترین اصولوں پر کی گئی ہے جس میں کسی کے لیے اذیت کا باعث بننا ہمارے لیے ایک شرمناک مقام ہے میں جو اتنا عرصہ یہاں رہی تو صرف اپنے بہن بھائیوں کے لیے، اب سب شادی شدہ ہو کر اپنے گھروں میں بس چکے ہیں ورنہ تو ایک تہمت تھی ہمارے لیے، اللہ کا شکر ہے کہ آزمائش گزر چکی ہے، میں اپنے بچے کو اس ماحول میں نہیں پالنا چاہتی، بہتر ہوگا آپ مجھے خود آزاد کر دیں ورنہ میں کورٹ سے خلع لے لوں گی۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''اگر میں اسفر کو نہ لے جانے دوں تو......؟''

شہر یار کا سوال تھا یا کوڑا...... وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔

''آپ ایسا نہیں کریں گے۔''

''کیوں، کیوں نہیں کروں گا۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''تم اپنے بارے میں جو چاہو وہ فیصلہ کرو لیکن اسفر کے لیے تم اکیلی کیسے فیصلہ کر سکتی ہو، وہ میرا بھی بیٹا ہے۔ یہ یاد رکھا کرو اور اس کے متعلق کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچ لو کہ اس کے متعلق صرف تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔''

وہ بت بنی کھڑی رہ گئی، یہ تو اس نے واقعی نہیں سوچا تھا کہ وہ اسفر کو روک سکتا ہے، وہ لب بھینچے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر باہر چلا گیا۔ وہ پلٹ کر اسفر کے پاس آ کر لیٹ گئی جو بچپن کی معصوم بے خبر نیند سو رہا تھا۔ اپنی قسمت کے فیصلے سے بے خبر، رومعہ کی آنکھوں سے آنسو گر، گر کر اسفر کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا دل کی دل میں رکھتے ہوئے۔ اس نے کبھی عام بیویوں کی طرح شکوہ شکایت نہیں کی تھی، کبھی شاپنگ کے لیے تنگ نہیں کیا تھا اور اس سب کا صلہ اس شخص نے یہ دیا تھا، وہ کس دل سے اس گھر میں رہ رہی تھی جہاں وہ، ذوباریہ کے ساتھ سب کچھ شیئر کرتے ہوئے رہ رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اس کے دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی لیکن مرنا اتنا آسان کب تھا۔ وہ یہ سب اذیتیں برداشت کرتے ہوئے وہ تمام مشکل دن نکال گئی تھی، حالانکہ شہر یار کے اس عمل نے ان سب کو ہمیشہ کے لیے بے یقین کر دیا تھا۔ رومان آتا تو بیوی کو ساتھ نہیں لاتا تھا۔ روحان اپنی بیوی علیزہ کو اریب کے سامنے بھی نہیں آنے دیتا تھا۔ شہر یار کا وہاں جانا تو کب کا بند ہو چکا تھا، لامعہ خود بھی اریب کے بغیر ہی زیادہ تر میکے آتی تھی، ان سب کا ان رشتوں پر سے اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ پتا نہیں کب تک وہ روتی رہتی کہ دروازے پر دستک نے اسے چونکا دیا۔

''کون؟'' اس نے جلدی، جلدی چہرہ صاف کیا، دروازہ کھلا اور ذوباریہ اندر آ گئی۔ رومعہ کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ وہ آ کر خود ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''تم چاہے مجھ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرتی ہو لیکن میرے دل میں تمہارے لیے کوئی غلط بات نہیں ہے، مجھے ابھی شہر یار نے بتایا ہے کہ تم اس سے طلاق مانگ رہی ہو، پلیز رومعہ تم میری وجہ سے طلاق مت لو، میں تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں دوں گی۔ میں نے اتنا عرصہ تمہیں تکلیف دینے کا سوچا تک نہیں۔''

''تمہیں سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، تم نے جو تکلیف پہنچانی تھی پہنچا چکیں۔'' اس کے لہجے میں زہر امڈ آیا تھا۔ ذوباریہ ہونٹ چبانے لگی۔

''مجھے پتا ہے تمہیں مجھ پر بہت غصہ ہے، میں نے وعدہ خلافی کی، تمہارے شوہر کو شیئر کیا مگر میں کیا کرتی، شہر یار سے طلاق لے کر دوبارہ رومان سے شادی کر لیتی تو چاہے اس کے ساتھ کہیں بھی چلی جاتی، کہیں نہ کہیں تو شہر یار سے سامنا ہو ہی جاتا پھر وہ سامنا میں کیسے کرتی، روز، روز کی ذلت سے بہتر میں نے یہی سمجھا کہ شہر یار کے ساتھ ہی رہ لوں...... میں نے شہر یار سے بھی یہی کہا۔ وہ مان گیا، اس نے کہا وہ آرام سے دو بیویاں افورڈ کر سکتا ہے۔ ہمارے دین میں بھی اس کی گنجائش موجود ہے۔ اسے تم سے اتنے سخت رویے کی امید نہیں تھی۔ اس کا

خیال تھا تم کچھ عرصہ ناراض رہ کر پھر مان جاؤ گی کیونکہ تم اس کے بچے کی ماں بھی تو ہو۔ پلیز رومعہ ایسامت کرو، شہریار بہت ڈسٹرب ہے۔''

''کچھ عرصے کی ڈسٹربنس ہے، ختم ہو جائے گی، ہر نیا زخم شروع میں بہت تکلیف دیتا ہے پھر رفتہ، رفتہ ٹھیک ہو جاتا ہے، میرا اور اس کا تعلق صرف چند ماہ پر مشتمل تھا اور تمہارا اور اس کا تعلق اس سے دُگنے عرصے پر، اس لیے وہ تمہارے ساتھ باقی زندگی بھی بہت آرام سے گزار لے گا۔''

ذوباریہ نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن رومعہ نے روک دیا۔

''مجھے نیند آرہی ہے، تم اب جاؤ، مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔'' اس کے جاتے ہی اس نے چٹخنی چڑھائی اور بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ اب وہ بری طرح رو رہی تھی، وہ ولی نہیں تھی کہ اسے پتھر مارے جاتے اور وہ پھر بھی دعا دیتی، اس کے دل میں ان دونوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی پھر وہ انہیں کیسے معاف کردیتی، صبح وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوئی تو اسفر کو تیار نہیں کیا تھا۔ جب وہ گھر سے باہر آئی تو اسفر کے رونے کی آواز باہر تک آرہی تھی اور اپنے جذبات تو کچلتی ہی تھی آج دل کچلنا تھا۔ اپنے دل پر خود ہی پاؤں رکھ کر چلنا تھا، پتا نہیں وہ کیسے ڈرائیو کر رہی تھی، آنسو بار بار اس کی آنکھوں کو دھندلا رہے تھے، بہت برا دن گزار کر وہ ممی کے ہاں چلی آئی۔ اس کی حالت نے انہیں پریشان کردیا تھا۔

''اسفر کہاں ہے اور یہ تم کیسی ہو رہی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں ممی، آپ مجھے چائے پلوادیں۔'' اس کا کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ ممی کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی تو اسی طرح گزرنی تھی، چاہے ہنستی، چاہے روتی تو بہتر تھا کہ وہ درمیانہ راستہ نکال لیتی۔

''ممی میں نے اپارٹمنٹ لیا ہے، اب میں وہاں رہوں گی۔''

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے، اکیلی عورت ذات، کیسے اکیلی رہو گی۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے ممی، میں سارا دن تو آفس میں گزار دیتی ہوں، پیچھے ٹائم ہی کیا بچتا ہے۔''

''تم اس سے الگ ہو کر دوبارہ کیوں نہیں......''

''ممی پلیز...... یہ بات آئندہ کبھی مت کیجیے گا، میں ایک ہی سے بھر پائی، میری زندگی میں آئندہ کوئی مرد نہیں آئے گا، ہرگز بھی نہیں۔''

''اسفر کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟'' انہوں نے جھلّا کر موضوع ہی تبدیل کردیا۔

''وہیں ہے، اپنے باپ کے پاس۔'' وہ افسردگی سے مسکرائی، ممی دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔ رات کو بارہ بجے کا عمل تھا، اس کے سیل نے وائبریٹ کیا۔ اس نے سائلنٹ پر لگایا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا شہریار تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر اٹینڈ کرلیا۔ ''فرمائیں۔''

''تم گیٹ کے باہر آؤ، مجھے کچھ کام ہے تم سے۔''

وہ کچھ دیر سوچتی پھر اٹھ کر باہر آگئی، گیٹ سے کچھ دور اس کی گاڑی کھڑی تھی، اسے دیکھ کر وہ باہر نکلا، اسفر اس کے بازوؤں میں تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا مگر وہ آگے نہیں بڑھی۔

''مما، مما!'' اسفر اس کی طرف لپکا۔ اس نے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ شہریار نے اسے نیچے اتار دیا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''پچھلی باتیں تو اب ماضی بن گئیں مگر یہ اتنا بڑا ظلم میں نہیں کرسکتا تھا، یہ تمہارا بیٹا ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا، میں آئندہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔ کبھی اسفر سے بھی نہیں ملوں گا، ہاں اگر کبھی اس کے لیے تمہیں میری ضرورت پڑے تو میں جب اور جہاں کہو گی آجاؤں گا ورنہ دوسری صورت میں تم مجھے کبھی اپنے راستے میں نہیں پاؤ گی... اور یہ......''

اس نے گاڑی میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''تمہارا رہائی کا مطالبہ ان کاغذات کی صورت میں لفافے کے اندر موجود ہے۔ او کے اللہ حافظ......!'' وہ فوراً مڑا اور گاڑی میں بیٹھ کر زن سے لے اڑا۔ رومعہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ اس شخص سے اسے کسی اچھائی کی امید نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک نظر لفافے پر ڈالی اور اسفر کو خود سے لپٹا لیا۔

☆☆☆

اب جبکہ اسفر پانچ سال کا ہوگیا تھا، وہ منیجر کی پوسٹ پر آچکی تھی۔ اس نے اپنا عزم پورا کیا تھا، وہ بہت ہلکی پھلکی ہو کر اپنا کام سرانجام دے رہی تھی۔ کئی مردوں نے اسے اپنانے کی خواہش ظاہر کی مگر اب اس کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں تھی، رومان کئی بار آیا، وہ اپنے دوست کے ساتھ اس کی شادی کروانا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی زندگی خراب بھی اس کے احمقانہ فیصلے سے ہوئی اور اب دوبارہ اس کا گھر وہی بسائے گا، رومعہ نے صاف انکار کردیا۔ اسے مرد کے نام سے وحشت ہوتی تھی، حالانکہ اس کے دونوں بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ اریب، لامعہ کے ساتھ وفادار تھا لیکن اس کا ذاتی تجربہ اس کے لیے بہت کافی ثابت ہوا تھا۔ وہ مضبوط مالی پوزیشن کے ساتھ اچھے گریڈ کی جاب کر رہی تھی، اس کے بعد بھی وہ اپنی ذہنی اذیت بڑھاتی رہتی تو یہ اس کا اپنی ذات پر کیا جانے والا ظلم تھا۔ وہ ظالم نہیں تھی ہاں مگر ظالموں کو معاف بھی اس نے نہیں کیا تھا۔ ایک کسک، ایک چبھن ان کے لیے بھی چھوڑ دی تھی، جو ان کی ساری زندگی کے لیے کافی تھی۔

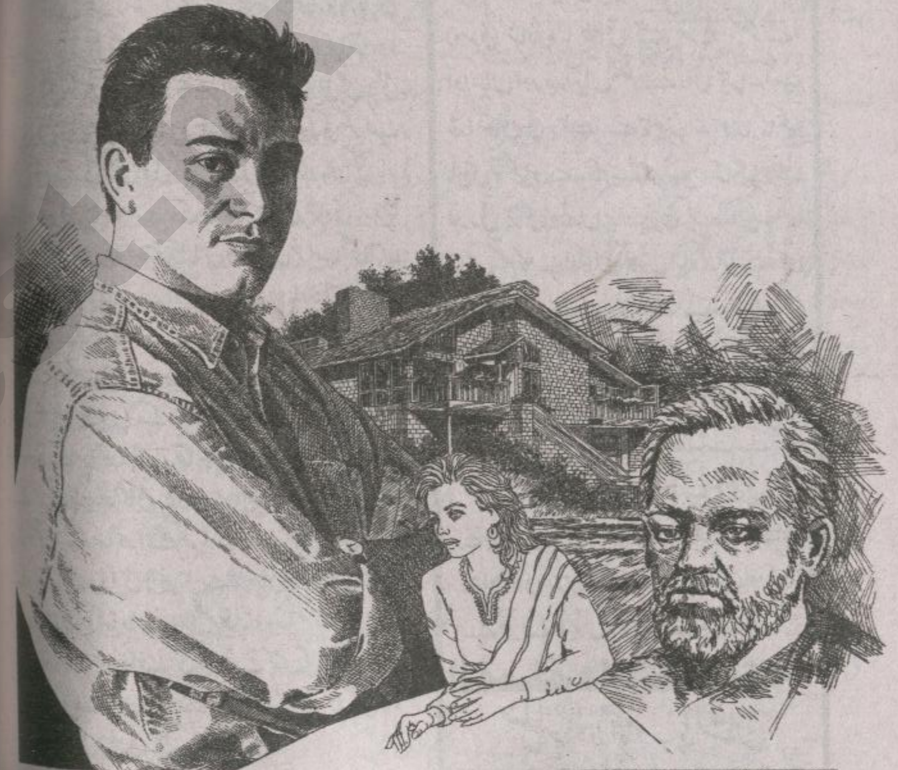
سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے، پسِ بامِ شب نہ سحر کوئی
عجب اِک عرصہ دراز ہے، نہ گمان ہے نہ خبر کوئی
نہیں اب تو کوئی ملال بھی، کسی واپسی کا خیال بھی
غمِ بے کسی نے مٹا دیا، میرے دل میں تھا اگر کوئی

ناولٹ



جنجوعہ ہاؤس

صائمہ اکرم



''مبارک ہو نوجوانو ......! تُندیِ بادِ مخالف نے ''دوعقاب'' گرادیے ہیں۔''

کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور مہروز کا اعلان کرتا ہوا منہ اسی زاویے میں جو کھلا تو پھر بند ہونا ہی بھول گیا......اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ٹی وی لاؤنج میں پورے کا پورا اندر داخل ہو چکا تھا اور اس سے بھی بڑی بدقسمتی تھی کہ وہاں بیٹھے داجی اسے اپنی عقابی نظروں سے تاڑ چکے تھے حالانکہ ان کی سنہری

زنجیر والی عینک ان کے سر پر ٹکی ہوئی تھی۔
''انشاء اللہ زندگی رہی تو اس فسادن شرمیلی کا مقبرہ خود اپنے ہاتھوں سے ڈیزائن کروں گا......'' مستقبل کا آرکیٹیکٹ مہروز اپنے کان کھجاتے ہوئے غصے سے بڑبڑایا، گھر کی ملازمہ شرمیلی بیگم کی غلط مخبری کی وجہ سے وہ داجی کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ جس کا کہنا تھا کہ داجی کسی ہنگامی دورے پر ''ہیڈ کوارٹر'' گئے ہوئے ہیں۔ سامنے ہی اس کا بڑا بھائی احسن اور دونوں چچا زاد کزنز فیضان اور شرجیل داجی کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔

ان کے چہروں پر چھائی بیزاری سے وہ بخوبی اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ سب کس اذیت سے گزر رہے تھے۔

''برخوردار یہ منہ میں بڑبڑ بعد میں کر لینا، ذرا اپنا چہرہ مبارک بھی اس بڈھے کو اندر آ کر دکھا دو۔ اگر غلطی سے آ ہی گئے ہو۔'' داجی کے طنزیہ انداز پر تابندہ نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔ وہ خود بھی پچھلے ایک گھنٹے سے اقبال کا نظریہ ''عقل و عشق'' جمائیاں لیتے ہوئے سن رہی تھی۔

''لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا......'' احسن کو اس نئے ''شکار'' کو دیکھ کر بڑی خبیث سی خوشی ہوئی۔ حالانکہ یہ شکار اس کا سگا بھائی تھا۔ وہ خود بھی ایک گھنٹے سے داجی کی ٹانگیں دبانے جبکہ اس کے چچازاد کزنز فیضان اور شرجیل ان کے کندھوں کی سروس کرنے میں مصروف تھے۔

احسن نے اسے دیکھ کر فوراً ایک ٹانگ رضا کارانہ طور پر اس کے حوالے کی جس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ اب چاروں کزنز احسن، مہروز، فیضان اور شرجیل داجی کی سروس کرنے میں مصروف تھے۔

تابندہ کو جنجوعہ ہاؤس میں آئے ہوئے بہ مشکل تین دن ہی ہوئے تھے لیکن ان تین دنوں میں اسے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ پورے خاندان کو بات گھما پھرا کر کرنے کا ''چسکا'' ہے۔ اکثر باتیں تابندہ کے سر سے کسی جیٹ طیارے کی طرح گزر جاتیں اور وہ احمقوں کی طرح ان سب کو ایک دوسرے کے ''کوڈز'' کو ''ڈی کوڈ'' کرتے دیکھتی رہ جاتی......وہ ایک دوسرے کے مبہم اشاروں کو بھی اس قدر سرعت سے سمجھتے تھے کہ تابندہ ہکا بکا رہ جاتی۔ پہلے دو دن تو وہ داجی کے تینوں بیٹوں کی نو عدد اولادوں کے ناموں میں الجھی رہی۔ حالانکہ گھر میں موجود تینوں لڑکیاں اپنی ایک چچی کے ساتھ کوئی شادی اٹینڈ کرنے سیالکوٹ گئی ہوئی تھیں اور گھر پر آج کل صرف چھ لڑکوں کی اجارہ داری تھی، جن میں احسن، مہروز اور رضوان تین بھائی، فیضان اور شرجیل دو اور فراز اکلوتا بھائی تھا۔

''برخوردار، یہ تُندیِ بادِ مخالف نے خیر سے کون سے دو عقاب گرا دیے ہیں......؟'' داجی کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی نے مہروز کی روح فنا کی۔

''ایسے ہی بونگیاں مار رہا تھا مہروز......'' فیضان کو اشارہ سمجھ میں آ گیا تھا اس نے داجی کا دھیان ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ان کے کندھوں کو اور زور سے دبانا شروع کر دیا۔

''بونگیاں تو خیر تم سب ہی مارتے ہو، اب میں مہمان بچی کے سامنے کیا کہوں......'' داجی نے عینک آنکھوں پر رکھتے ہوئے کڑے تیوروں کے ساتھ مہروز کا ہراساں چہرہ دیکھا۔ جبکہ مہمان بچی خود بھی پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔

''کچھ نہیں داجی میں تو ویسے ہی شعر پڑھ رہا تھا......'' مہروز نے بوکھلا کر صفائی دینے کی ناکام کوشش کی۔

''دفع کریں داجی مہروز کو۔ اس کی تو اردو شروع سے ہی کمزور ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ اقبال ہمیشہ عشق کو ہی عقل پر کیوں فوقیت دیتے تھے......؟'' فیضان نے اپنی طرف سے مہروز کی جان چھڑانے کی عمدہ کوشش کی لیکن یہ کوشش اسی کے گلے پڑ جائے گی اس کا اندازہ نہیں تھا۔

''برخوردار......! مہروز کی اردو کمزور ہے پر میری یادداشت نہیں......'' انہوں نے یہ کہتے ہوئے ایک زوردار گھوری ماری۔

''خیر سے تم نے ایف ایس سی کے امتحانوں میں جو ''چن'' چڑھایا تھا اور اردو کے پرچے میں گریس مارکس کا پُھندنا لٹکایا تھا مجھے وہ بھی یاد ہے اور اس دن تمہارے باپ نے جو تمہاری چھترول کی تھی تو آئیوڈیکس میں نے ہی تمہارے پنڈے پر لگائی تھی۔'' داجی نے گھر کا ایک انتہائی واہیات راز فاش کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی اپنی چھڑی اس کے گلے میں ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ جو اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اچھل کر کارپٹ پر تابندہ کے قدموں میں جا گرا۔

تابندہ اس ڈرون حملے پر بوکھلا کر جو کھڑی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں پکڑی میڈیکل کی بھاری بھرکم کتاب فلور کشن پر مزے سے بیٹھے احسن کا سر توڑ گئی۔

''ہائے میں مر گیا......'' احسن نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔

''اُف آج میں نہیں بچوں گا......لگتا ہے کہ میرے دماغ کی چُولیں ہل گئی ہیں......'' احسن نے سر پر ہاتھ رکھ کر کمال کی اداکاری کی۔ تابندہ کا خفت کے مارے برا حال ہو گیا۔

''برخوردار، آرام اور سکون سے بیٹھ جاؤ، داجی کو زیادہ ''دا'' لگانے کی ضرورت نہیں۔'' داجی نے اپنی تیر مار کہ موچھوں کو تاؤ دیا۔

''ہاں اپنی اوور ایکٹنگ بھی بند کرو۔ جو چیز تمہارے سر میں موجود ہی نہیں اس کی چولیں ہلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......'' داجی نے شانِ بے نیازی سے کہتے ہوئے اپنی ٹانگیں اور زیادہ پھیلا لیں اور آنکھ کے اشارے سے انہیں دوبارہ دبانے کا اشارہ کیا۔

''داجی آپ کسی ''آئے گئے'' کا ہی خیال کر لیا کریں......'' احسن نے دُہائی دیتے، دیتے انہیں مفت مشورے سے نوازا۔ یہ ''آئے گئے'' کا خطاب خالصتاً تابندہ کے لیے تھا۔ جو وہ پچھلے تین دن سے کثرت سے سن رہی تھی۔

''میں تو خیال کر ہی لوں گا، تم بھی کچھ بوڑھے دادے کا خیال کر لیا کرو۔'' داجی نے احسن کے سر کو سہلاتے ہوئے مہروز اور فیضان کو گھورا۔

''یہ احسن کے دائیں بائیں کھمبے بن کر کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں......آ کر ٹانگیں دباؤ میری شرافت سے......'' انہوں نے شاہی انداز میں حکم دیا۔ تینوں نے ہی بے دلی سے دوبارہ اپنی اپنی پوزیشنز سنبھال لیں جبکہ اس سچوئشن میں شرجیل آرام سے کھسک گیا تھا۔

''یہ داجی کو بھی اکبرِ اعظم بننے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ سارے شوق ہی آخری مغل بادشاہوں کی طرح کے ہیں......'' مہروز کی بیزاری سے کی گئی بڑبڑاہٹ تابندہ کی سماعتوں تک آرام سے پہنچی جو اس ساری سچوئشن میں انتہائی خفت زدہ انداز میں کھڑی تھی۔ ویسے بھی جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی رنگ برنگے رویے اس کو بوکھلا رہے تھے۔

''بیٹا آرام اور سکون سے بیٹھ جاؤ، اس گھر میں ایسے ڈرامے تو دن رات چلتے ہیں تم ابھی نئی ہوناں، اس لیے گھبرا رہی ہو......'' داجی نے ہونق بنی تابندہ کو کھڑے دیکھ کر شفقت سے لبریز لہجے میں کہا تو وہ بادلِ ناخواستہ صوفے کے کنارے پر ٹک گئی۔

ایک تو اسے جنجوعہ ہاؤس میں آئے ہوئے کم ہی دن ہوئے تھے اور ابھی تک وہ اپنے کزنز کے ناموں اور شکلوں سے بھی اچھی طرح آشنا نہیں ہوئی تھی۔ جنجوعہ ہاؤس میں آ کر اسے پتا چلا کہ اس کے دادا کے چھوٹے بھائی کرامت اللہ خان اس گھر میں اپنے تین بیٹوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ مقیم تھے۔

بڑے دادا اپنے جس بھائی کی اولاد کو سارے

جہاں کی ''نکمی اولاد'' کا ٹائٹل دیے ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ابرار صاحب کا بڑا بیٹا احسن سول انجینئر نگ، اس سے چھوٹا مہروز آرکیٹیکچر اور سب سے چھوٹا رضوان ایم بی اے کے تیسرے سیمسٹر میں تھا۔

کرامت اللہ صاحب کے دوسرے بیٹے احمد صاحب کا بڑا بیٹا فراز سول انجینئر نگ کے آخری سال میں تھا۔ اس سے چھوٹی ماہ رخ فارمیسی میں اور اس سے چھوٹی دعا فائن آرٹس میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

ان کے تیسرے بیٹے امجد صاحب کا بڑا بیٹا شرجیل الیکٹریکل انجینئر نگ، اس سے چھوٹا فیضان بائیو ٹیکنالوجی میں بی ایس اور سب سے چھوٹی بیٹی انعم بی بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔

وہ دل ہی دل میں اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے بیڈروم سے ٹی وی لاؤنج میں آنے کی غلطی کی اور داجی کے ہتھے چڑھ گئی جو ٹی وی لاؤنج میں کرفیو لگائے ''اقبالیات'' پڑھنے میں مصروف تھے اور ان کی بہویں جن کے پسندیدہ ڈرامے کا وقت نکلا جا رہا تھا، آنے بہانے سے وہاں کے پھیرے لگا رہی تھیں۔

''کیوں برخوردار، جان نہیں ہے ہاتھوں میں، جو مرئے مرے سے انداز میں دبا رہے ہو، ویسے انجینئرز بنے پھرتے ہو......'' انہوں نے کارپٹ پر بیٹھے مہروز اور فیضان کو ٹوکا جب کہ احسن صوفے کے پیچھے کھڑا ان کے کندھے دبا رہا تھا۔

''داجی انجینئرز بن رہے ہیں کوئی یونیورسٹی میں مالشی بننے کی ٹریننگ نہیں لے رہے......'' احسن چونکہ پیچھے کھڑا تھا اس لیے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی جرائت کر ہی گیا۔ اس کے دل جلے انداز پر داجی کے چہرے پر بڑی مبہم لیکن تابندہ کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی۔

''کون، کون سا عقاب گرا ہے......؟'' فیضان نے دنیا جہاں سے بیزار مہروز سے قدرے آہستگی سے پوچھا۔ جو یہ پھلجڑی چھوڑ کر خود داجی کی بمباری کے نیچے آ گیا تھا۔

''اوپر والوں کا ''نیلا'' اور نیچے والوں کا ''تیلا''......'' مہروز کے لہجے میں دنیا جہاں کی رنجیدگی ایک دم ہی ٹپک پڑی۔

''ہش شاوش اے، خیر سے احسن اور فراز پھر اُڑ گئے......'' داجی کے بالکل درست اندازے پر ان تینوں کا ہی رنگ فق ہوا۔

''نہیں............'' احسن نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی فلمی سی چیخ ماری اور صدمے سے کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

''ہائے میرے بھائی کو کیا ہو گیا......؟'' مہروز نے بھی جذباتی اداکاری کی انتہا کر دی۔

''اب اپنا، اپنا بیمہ کروالو، ابرار کا تو ویسے ہی بی پی آج کل بہت ہائی ہے، اس نے بڑی پشاوری چپلیں اکٹھی کر رکھی ہیں۔'' داجی نے پھونک مار کر اپنی عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کا نام لے کر انہیں ڈرایا جو احسن اور مہروز کے والدِ محترم تھے جبکہ تابندہ کو ان کی بات کچھ پلے نہیں پڑی۔

''داجی آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم ''نیلا'' اور ''تیلا'' کسے کہتے ہیں............؟'' شرجیل اپنے کزنز کے فیل ہونے کا غم بھول کر اس فکر میں پڑ گیا۔

''واہ جی واہ ......! یہ کل کے ''باندر'' اپنے بزرگوں کے ساتھ ''باندر کلہ'' کھیلتے ہیں۔ گدھو، جہاں تم سوچنا ختم کرتے ہو ناں، ہم تمہارے باپ دادا وہاں سے سوچنا شروع کرتے ہیں......'' داجی نے کوئی ضرورت سے زیادہ ہی لمبی چھوڑی۔ جو اُن تینوں کو ہی ہضم نہیں ہوئی۔ اس لیے ایک دبی دبی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ابھری۔

''خیر اب ایسا بھی کوئی ایٹم بم بنانے کا فارمولہ نہیں۔ سارے جہاں کو پتا ہے کہ احسن کو ہر وقت نیلے رنگ کی پینٹ شرٹیں پہننے پر ہم ''میں نیل کرائیاں نیلکاں، میرا تن من نیلو نیل'' کہہ کر

چھیڑتے ہیں اور فراز کے قحط زدہ جسم کی وجہ سے اسے ''تیلا پہلوان'' کہتے ہیں......'' ایک اور خاندانی راز تابندہ کے سامنے افشا ہوا۔

''تم لوگ جو مرضی خود کو نیلا، پیلا یا تیلا کہو لیکن یہ سوچو کہ رات کو اپنے ظالم باپ ابرار کرامت اللہ سے کیسے بچنا ہے۔ جب سے اس کے دوسی این جی پمپ بند اور گورنمنٹ سے مذاکرات ناکام ہوئے ہیں وہ تو اپنے باپ کو یعنی مجھے بھی پہچاننے سے انکاری ہے......'' داجی نے ایک اور بم عین ان کے سروں پر پھوڑ کر آرام سے آنکھیں بند کر کے ٹانگیں پھیلا لی تھیں۔

''اوئے، تم دونوں تو پاس ہو گئے ہو ناں، چلو اس خوشی میں پھر ٹانگیں دباؤ......'' داجی کے اس حکم پر مہروز اور فیضان دونوں نے ہی ناگواری سے پہلو بدلا۔

''داجی ہم اپنے بھائیوں کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اس غم کی وجہ سے ہم آج کوئی کام نہیں کریں گے......'' مہروز نے آج بہادری کے سارے ہی ریکارڈ توڑ دیے۔

''اچھا، چلو میں ابھی ابرار کو فون کر کے تمہارے فیل ہونے کی خوشخبری بھی سنا دوں اور یہ بھی کہہ دوں کہ رات کو آتے ہوئے باڑے سے دودھ اور بیکری سے تازہ ڈبل روٹی بھی لیتا آئے کیونکہ چاروں صاحبزادے فیل ہونے کی خوشی میں گھر میں ہی دھرنا دیے بیٹھے ہیں اور کوئی کام نہیں کر رہے......'' ان کی بات پر مہروز کے منہ سے بے ساختہ چھت پھاڑ قہقہہ برآمد ہوا۔

''کوئی فائدہ نہیں داجی، رات گلابی سُنڈی نے آپ کے فون سے پھر امریکا میں نیلسن منڈیلا کی بھانجی کو کال ملا لی تھی اور حسبِ سابق خیر سے ٹوں، ٹوں کی آواز سے ہی کال بند ہوئی تھی، آپ اس وقت فل والیوم میں خراٹے لینے میں مصروف تھے۔'' مہروز نے انہیں اطلاع دی۔

گلابی سنڈی کا لقب انہوں نے اپنی پھوپھو زاد عروج کو دیا ہوا تھا۔ جس کی انٹرنیٹ پر ایک سیاہ فام لڑکی سے ہونے والی دوستی سے سارا خاندان بیزار تھا۔ اب بات انٹرنیٹ سے فون پر آ گئی تھی تب سے ہر کوئی اس کی آمد پر اپنا سیل فون چھپائے پھرتا تھا۔

''کوئی مسئلہ ہی نہیں...... بیٹا کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا......؟'' داجی نے میڈیکل کی کتاب میں زبردستی سر دیے سامنے بیٹھی تابندہ کو مخاطب کیا۔ جس کا سیل فون اس کے پاس ہی پڑا تھا اور وہ اس ساری گفتگو کو سخت حیرت سے سن رہی تھی داجی کے ساتھ پوتوں کی بے تکلفی اس کے لیے انتہائی حیران کن تھی۔

''میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا......'' داجی نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''جی...... تابندہ......'' اس نے ان تین دنوں میں کوئی چھٹی دفعہ ان کو اپنا نام بتایا تھا۔

''ٹینشن نہ لیں، ان کو بھی ''ببلیے'' کی ''مومو'' کی طرح نام بھولنے کی بیماری ابھی ابھی لگی ہے......'' مہروز نے سنجیدگی سے اسے تسلی دی۔

''یہ ذرا بیٹا اپنے موبائل سے ابرار کا نمبر تو ملانا، یہ گدھے تو اپنا باجا دیں گے نہیں، ان سب کی ابھی طبیعتیں فریش کرواتا ہوں۔ تھوڑی سی ٹیوننگ سے یہ کافی عرصہ صحیح چلتے ہیں۔'' داجی کی اس قدر صاف گوئی پر تابندہ ہکا بکا جبکہ بے مروتی کے اس عظیم مظاہرے پر وہ تینوں گرتے، گرتے بچے۔

''کیا ہے داجی، اب کیا آپ مہمانوں کا خرچا کروائیں گے......'' مہروز نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''دفع کریں، مٹی ڈالیں، ہم اگر تھوڑے سے جذباتی ہو ہی گئے تو آپ نے بھی آخیر ہی مچا دی، دودھ ہی لانا ہے ناں باڑے سے، میرا احسن بھائی اگر غم زدہ ہے تو میں تو زندہ ہوں ناں......'' فیضان بالکل شاہ رخ خان اسٹائل میں جذباتی ہوا۔

''اور بیکری سے ڈبل روٹی اور انڈے لانے ہیں ناں، میں لے آؤں گا۔ اب اتنی سی بات کے پیچھے

رُلائیں گے کیا......؟'' مہروز بھی سینہ تان کر بالکل نانا پاٹیکر اسٹائل میں میدان میں اتر آیا تھا۔ ان کی ایکٹنگ دیکھ کر تابندہ کا دل چاہا کہ کاش کوئی آسکر ایوارڈ اس کے پاس ہوتا تو وہ ان دونوں کو ہی دے دیتی۔

''فکر نہ کرو، تم دونوں نے بھی کون سا آسمان کو ''ٹاکی'' لگانی ہے، تمہارا ابھی رزلٹ آنے والا ہے۔ پھر تمہارے حصے کا کام وہ دونوں نالائق کرلیں گے، آخر ایسے ہی تو ''امدادِ باہمی'' کے اصولوں پر تمہارا کام چل رہا ہے......'' داجی نے شاید نہیں یقیناً طنزیات میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ وہ دونوں پہلو بدلنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پائے۔

''اس کھوتے دے پتر کو بھی میرے صوفے کے پیچھے سے ہٹاؤ جو بال پوائنٹ سے اللہ جانے میری پشت پر کون سی داستانِ غم لکھ رہا ہے......'' داجی کو صوفے کے پیچھے بیٹھے احسن کا خیال آیا۔ جو کافی دیر سے صوفے کے پیچھے سے برآمد نہیں ہوا تھا۔

''داجی کیوں مہمانوں کے سامنے میرے ابا کو ''کھوتا'' کہہ رہے ہیں، کوئی صحیح کا نام لیں۔'' مہروز نے اپنے اندر اٹھتی اشتعال کی لہر بہ مشکل دبا کر انہیں سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

''ہاں تو تم لوگوں نے میرے بیٹے کو کھوتا ہی تو بنایا ہے، دو دو سی این جی پمپ اور ایک فیکٹری چلا کر دن رات محنت کر کے تم مسٹنڈوں کو پڑھا رہا ہے اور تم لوگ ''سپلی'' کا تمغہ گلے میں لٹکا کر بے شرموں کی طرح گھر آجاتے ہو......'' داجی بالکل ہی آؤٹ آف کنٹرول ہوئے اور تابندہ کے سامنے اس عزت افزائی پر وہ خجل ہوئے۔

''جانے دیں داجی، سی این جی پمپوں کی پچھلے پندرہ دن سے ہڑتال ہے اور جہاں تک سپلی کی بات ہے تو وہ انسانوں کی ہی آتی ہے، جانور تو امتحان دینے سے رہے۔ باقی رہی بے شرموں کی طرح گھر آنے کی بات تو ظاہر ہے اپنے ہی گھر آتے ہیں۔ کہیں اور تو نہیں جاتے ناں......'' مہروز کے دلائل پر فیضان ایک دم ہی متاثر ہوا۔ ایک لمحے کو تو داجی کو بھی اس قدر مختصر مگر مؤثر جواب پر حیرت کا جھٹکا لگا۔

''داجی کسی ''آئے گئے'' کا ہی خیال کرلیا کریں، مہمان کیا سوچتے ہوں گے......'' فیضان نے ان کے کندھے دبا کر ہائی بلڈ پریشر کو کم کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی۔

''پتر ''یہ آئے گئے'' والے ''لامے'' (طعنے) تم کسی اور کو جا کر دینا۔ یہ بچی تم لوگوں کی طرح نالائق پانڈی نہیں، ماشاء اللہ ہاؤس جاب کرنے آئی ہے، تمہاری طرح انجینئرنگ کے آخری سال میں نہیں لٹکی ہوئی......'' انہوں نے غصے میں فیضان کا ہاتھ جھٹکا۔

''ظاہر ہے وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں کیسے لٹکیں گی جبکہ وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ داجی آپ کو بھی سادہ سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' احسن خود ہی صوفے کے پیچھے سے اٹھ کر آگیا تھا اور خونخوار نظروں سے مہروز اور فیضان کو دیکھ رہا تھا جو پرائی لڑکی کے سامنے داجی سے ''آڈا'' لگائے بیٹھے تھے اور جبکہ یہ بھی پتا تھا کہ وہ اپنے زمانے کے کامیاب وکیل رہے ہیں اور آدھا خاندان ان کی زبان درازی کی وجہ سے انہیں ''گالہڑ'' (باتونی) کہتا ہے۔

''بیٹا میری ساری باتوں کو چھوڑو اور بس اپنے پنڈے (کمر) کی زیتون کے تیل سے مالش کروا لو، تمہارے باپ نے یاد نہیں آخری دفعہ کیا دھمکی دی تھی کہ اب ''سپلی'' آئی تو پشاور کی ساری چپلیں لاہور میں منگوا کر چھترول کروں گا......'' داجی نے انہیں ابرار صاحب کا شرانگیز بیان یاد کروایا جو انہوں نے پورے خاندان کے سامنے چھ ماہ پہلے جاری کیا تھا۔

''آپ تو فوراً ہی ''شریکوں'' کی طرح طعنوں پر اتر آتے ہیں۔'' مہروز نے کسی ناراض بیوی کی

طرح کہا۔

''میں نے تو ایسے، ایسے عظیم دادے دیکھے ہیں جو ایسے موقعوں پر اپنے پوتوں کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ بس ہماری ہی قسمت خراب ہے......'' احسن نے بالکل شمیم آرا کی طرح آہ بھری۔

''خیر سے کسی ایک دادے کا نام بتادو، جو اپنے کسی نالائق، نانہجار پوتے کے لیے دیوارِ چین بن کر کھڑا ہوگیا ہو......'' داجی نے ناک پر انگلی رکھ کر چیلنج کیا، تابندہ سخت حیرت سے اس پانی پت کی لڑائی کو دیکھ رہی تھی۔

ان کے گھر میں تو کوئی بڑے ابا کے سامنے بولنے کی جرأت تک نہیں کرتا تھا۔ جبکہ یہاں دادا اور پوتوں میں کمال کی بے تکلفی تھی حالانکہ داجی تابندہ کے دادا کے سگے چھوٹے بھائی تھے لیکن عادتوں میں ان سے بالکل مختلف۔

''ہاں بتاؤ ناں، میں بھی تو دیکھوں، کون سا ایسا عقل کا اندھا دادا ہے......'' داجی نے بازو لہرا کر انہیں للکارا۔

''وہ پھپھو کے پڑوس میں رہنے والے عامر کا دادا، جن کی بیگم سفید غرارہ پہن کر چکنی چمبیلی بنی اپنے میاں کے ساتھ ہر وقت ٹیرس پر ہوتی ہیں۔'' مہروز کو بروقت ہی سامنے والے گھر کی مثال مل گئی تھی۔

''وہ......'' داجی اچھلے...... ''مجھے ایسا بے غیرت دادا نہیں بننا، جو صبح، صبح واک کے بہانے پارک میں اپنے پوتے کے ساتھ لڑکیاں تاڑنے جاتا ہے۔ کل ٹیرس میں بیٹھا انارکلی ڈسکو چلی گا رہا تھا۔'' داجی کے انداز میں بچوں کی سی بے ساختگی تھی۔

''زندہ دل ہے زندہ دل، صحیح لہوری دادا ہے عامر کا، آپ کی طرح نہیں جو اوپر نیچے کرفیو لگائے رکھتے ہیں......'' احسن بھی اپنا غم بھول کے میدان میں اتر آیا۔

''بیٹا ذرا ملانا ابرار کا نمبر...... بھلا کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا......؟'' داجی نے پیشانی پر ہاتھ مار کر تابندہ سے کہا جو اس سچویشن پر ہکا بکا تھی۔

''لو ہماری بے عزتی کے سارے واقعات سیاق وسباق کے ساتھ یاد ہیں جبکہ ان کا نام ایک گھنٹے میں کوئی چوتھی دفعہ بھول رہے ہیں۔'' فیضان کے جل کر بولنے پر داجی بے ساختہ ہنس پڑے تھے انہیں ہنستا دیکھ کر وہ چاروں چوڑے ہوئے۔

''پلیز داجی، اس دفعہ بچالیں، اگلی دفعہ پوری تیاری کروں گا، تیاری تو پوری کی تھی لیکن کم بخت شرجیل کا بچہ میرے بوٹ پہن گیا۔'' احسن کی بات پر داجی کے ساتھ تابندہ کو بھی جھٹکا لگا۔

''یہ شرجیل کے بوٹوں کا تمہاری سپلی سے کیا تعلق ہے......؟'' داجی نے کسی تھانیدار کی طرح احسن کو گھورا۔

''داجی ساری رات بیٹھ کر بوٹیاں مائیکرو کاپی پر بنا کر بوٹوں میں چھپائی تھیں۔ اس منحوس کی جلدیاں مجھے مروا گئیں۔'' احسن کی گفتگو پر تابندہ کو کرنٹ لگا جبکہ وہ اس قدر جذباتی ہوا تھا کہ جذبات کے شوریدہ بہاؤ میں باقی راز اگلتا جا رہا تھا۔

''اوپر سے اس گھٹیا سپرنٹینڈنٹ نے میری کرسی بدل دی۔ سارے فارمولے اسی پر لکھے ہوئے تھے۔ ایک سوال فراز نے کروانا تھا مگر وہ خبیث مکر گیا۔ اچھا ہوا کہ خود بھی فیل ہوا۔ گھٹیا لوگوں کو اپنے گھٹیا پن کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے مگر وہ شعور نہیں رکھتے......'' تابندہ منہ کھولے ساری داستانِ امیر حمزہ سن رہی تھی لیکن داجی شاید ایسی وارداتوں سے بخوبی واقف تھے اس لیے آنکھیں بند کیے سکون سے بیٹھے تھے۔

وہ داجی سے زبردستی لپٹا انہیں جذباتی کررہا تھا۔ فیضان اور مہروز داجی کی ٹانگیں دبوچے بیٹھے تھے جبکہ احسن ان کی گود میں گھسا جا رہا تھا۔ تابندہ ان کے اس

طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے پر ہکا بکا تھی۔
”یہ کیا ٹوپی ڈراما ہو رہا ہے؟ عقل ہے تم لوگوں کو، گھر میں ”کسی“ ”آئے گئے“ کی ہی تمیز کر لیا کرو......“ ابرار صاحب بریف کیس اٹھائے ابھی ابھی ٹی وی لاؤنج میں آئے تھے۔ اندر کا منظر دیکھ کر ان کا دماغ بھک کرکے اڑ گیا۔ ابھی تو تابندہ کا لحاظ کرکے انہوں نے الفاظ کم اور لہجہ زیادہ سنگین اختیار کیا تھا۔ اپنے لیے ”آئے گئے“ کا لفظ ایک دفعہ پھر تابندہ نے بہ مشکل ہضم کیا تھا۔ جب سے وہ آئی تھی اس کے لیے ”آئے گئے“ کی اصطلاح استعمال کی جارہی تھی۔
”لاڈ کر رہے ہیں بوڑھے دادے کے ساتھ اور دادے سے لاڈ کرنا کیا ٹوپی ڈراما ہے......؟“ داجی نے عینک اتار کر اپنے بڑے بیٹے کا لال سرخ چہرہ دیکھا۔ جنہوں نے شاید تابندہ کا خیال کرکے اپنے ابا جی کے ساتھ پنگا لینے سے گریز کیا تھا۔
”چلو بھئی نوجوانو...... جاکر اپنے کمرے میں پڑھو، پہلے ہی گلی کے نکڑ والے درانی صاحب بتا رہے تھے کہ اس دفعہ یونیورسٹی والوں کی بے پروائی سے کچھ انجینئرنگ کے پرچے گم ہو گئے ہیں اور وہ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے معصوم بچوں کو دھڑا دھڑ فیل کیے جا رہے ہیں، تم لوگ اپنی خیر مناؤ......“ داجی کے منہ سے اتنی عقل مندانہ برمحل بات سن کر ان تینوں کے ساتھ ساتھ تابندہ کو بھی سکتہ ہو گیا جبکہ وہ سب ابرار صاحب کے ڈر سے کسی کلاشنکوف کی گولی کی طرح اڑتے ہوئے کمرے سے نکلے تھے۔
”اور بیٹا دل لگ گیا آپ کا......؟ مجھے تو جب تمہارے باپ نے تمہاری ہاؤس جاب کا بتایا تو میں نے کہا کہ بھئی میں تمہارا چچازاد بھائی سہی لیکن تمہاری بیٹی کے لیے ہمارے گھر کے دروازے کھلے ہیں......“ اب ابرار صاحب انتہائی محبت بھرے لہجے میں تابندہ سے مخاطب تھے اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے داجی کے ساتھ بیٹھ گئے تھے جو کوئی ترکی ڈراما ذوق شوق سے دیکھنے میں مگن ہو گئے تھے لیکن کان انہی کی گفتگو کی طرف تھے۔
”جی انکل، جب لاہور میں ہاؤس جاب کا پتا چلا تو بابا بہت اپ سیٹ ہو گئے تھے کہ میں اتنی دور اکیلے کیسے رہوں گی۔“ تابندہ نے سنجیدگی سے مزید بتایا۔ ”انہی دنوں چھوٹے دادا ہماری طرف آئے ہوئے تھے انہوں نے تو فوراً ہی کہہ دیا کہ میرے گھر کے علاوہ کہیں نہیں رہنا، تب بابا کے ساتھ ساتھ بڑے ابا بھی خاصے مطمئن ہو گئے تھے ......“ تابندہ کا سلجھا ہوا انداز ابرار صاحب کو بہت اچھا لگا۔ ان کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی، صرف تین بیٹے ہی تھے۔ اس لیے اس کمی کا احساس انہیں کافی رہتا تھا۔
”بھئی تابندہ، تمہارا دادا ہے تو میرا بڑا بھائی لیکن یقین مانو کہ اس سے زیادہ کھڑوس اور پڑھائی کا شیدائی بندہ میں نے نہیں دیکھا، فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی بچوں کو اٹھا کر پڑھنے بٹھا دیتا تھا۔“ داجی نے ٹی وی کی اسکرین سے بہ مشکل نظریں ہٹاتے ہوئے ایک پرانی یاد تازہ کی۔
”ہاں تو اسی سختی کا فائدہ ہوا ناں جو اس کا باپ اتنی اچھی جاب کرکے لاکھوں میں تنخواہ لے رہا ہے اور اس کا چچا مظہر سی ایس ایس کرکے فارن سروس میں ہے۔ ہماری طرح تو نہیں آپ نے لاڈوں میں لگائے رکھا اور پھر بزنس میں دھکیل دیا۔ ہر وقت اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ پر نظریں ٹکائے بیٹھے رہتے ہیں......“ ابرار صاحب کو اعلیٰ تعلیم نہ حاصل کرنے کا سخت دکھ تھا اس لیے اب اپنے تینوں بیٹوں احسن، مہروز اور رضوان پر خوب سختی کرتے تھے۔
”ظاہر ہے جب تمہاری پہلے ایف اے میں پھر بی اے میں تیسری دفعہ سپلی آئی تو میں نے کاروبار ہی کروانا تھا۔ اب کہیں کمشنر لگا کر تو بٹھانے سے رہا......“ داجی نے اپنے بیٹے کی فوراً ہی طبیعت درست کی جو اس

قدر صاف گوئی پر پہلو بدل کر رہ گئے۔
”اور وہ تم سے چھوٹا احمد یار، اس کو تو جب بھی کان سے پکڑ کر تابندہ کا دادا کالج چھوڑ کے آتا تھا تو وہ واپسی پر وحید مراد کی فلم دیکھ کر خیر سے ناز سینما ہی سے برآمد ہوتا تھا......“ داجی کو ابرار صاحب سے چھوٹے بیٹے کا کارنامہ بھی فوراً ہی یاد آیا۔ تابندہ نے ابرار صاحب کے چہرے کے بگڑے ہوئے زاویے دیکھے تو خجل سی ہو گئی۔
”اور وہ سب سے چھوٹا اسجد تو پورا ہی نواب تھا......“ داجی نے شاہانہ انداز سے کہا، ویسے بھی جب وہ شروع ہو جاتے تھے تو ان کی زبان کے آگے کوئی اسپیڈ بریکر نہیں آتا تھا، یہ ان کے پتا نہیں کون سے والے پوتے کی رائے تھی۔ تابندہ کو ابھی ان کی شکلوں کے ساتھ نام یاد نہیں ہوئے تھے۔
”ہاں تو خیر سے میرے سب سے چھوٹے صاحبزادے نے کرکٹر بننے کے جنون میں کئی دفعہ سر پھڑوایا، فیل ہوا، مجھ سے جوتے کھائے، آخر میں کچھ اور نہ ہوا تو سیالکوٹ میں گیند بلّے بنانے کی فیکٹری لگا لی۔ اب ان سب سے زیادہ کما رہا ہے......“ داجی آج فل موڈ میں تھے۔
ابرار صاحب کچھ دیر اور وہیں بیٹھے رہتے تو نقصِ امن کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے تھکن کا بہانہ کرکے وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت سمجھی۔
”دیکھا کیسے بھگایا میں نے......“ ان کے کمرے سے نکلتے ہی داجی کی شرارتی آواز پر تابندہ نے خوشگوار حیرت سے انہیں دیکھا۔
”خواہ مخواہ جنجوعہ ہاؤس کے بچوں کی جان ہلکان کیے رکھتا ہے۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا ہے ہر طرف ایمر جنسی لگ جاتی ہے......“ انہوں نے منہ بناتے ہوئے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کا چینل تبدیل کیا اور اس کے ساتھ ہی ان کے مزاج کی گنگا الٹی سائڈ کو بہنے لگی۔
”ویسے ایک لحاظ سے تو سختی کرکے اچھا ہی کرتا ہے......“ ان کے فوراً ہی بیان بدلنے پر تابندہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
”ورنہ میرے ان تین بیٹوں کی اولادیں تو ہمیں ہی منڈی میں بیچ آئیں، ایسے گدھے ہیں کہ سارا دن ڈرامے کرتے ہیں اور پڑھائی پر دھیان نہیں۔“ تابندہ نے اب داجی کا دوسرا چینل حیرانی سے دیکھا۔ وہ بیان بدلنے میں سیاستدانوں کو بھی مات دے رہے تھے۔
”میرا خیال ہے داجی، میں چلتی ہوں، مجھے کچھ پڑھنا تھا......“ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی، دماغ کی چولیں ہل سی گئی تھیں۔
”ہاں، ہاں بیٹا ضرور، ماشاء اللہ ذہین اور فرمانبردار ہو، اللہ قسمت اچھی کرے، اس گھر میں کوئی مسئلہ تو نہیں......؟“ انہیں اچانک ہی یاد آیا کہ دو گھنٹے پہلے انہوں نے تابندہ کو کس مقصد کے لیے روکا تھا۔ وہ ان کے اتنی ”جلدی“ یاد آنے پر زبردستی مسکرا کر نفی میں سر ہلانے لگی۔
”ہوں...... اچھی بات ہے، اس گھر کی تینوں بچیاں بھی ایک دو دن میں سرگودھا سے واپس آ جائیں گی پھر تمہیں بوریت کا احساس نہیں ہوگا۔“ ان کا اپنائیت بھرا انداز تابندہ کو اچھا لگا تھا۔
”ہاں بھئی اپنے بوڑھے دادا کے پاس چکر لگا جایا کرو، تمہارے دادا کا چھوٹا بھائی ہوں اب اتنا بھی نالائق نہیں جتنا اس نے میرے بارے میں پروپیگنڈا کر رکھا ہوگا گھر میں۔“ ان کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
”مجھے اقبال کی ”اسرارِ خودی“ بہت پسند ہے، کسی دن وقت نکال کر آنا، تمہیں بیٹھ کر فارسی سکھاؤں گا۔“ ان کی پیشکش پر تابندہ کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے سامنے سیڑھیاں اترتے احسن کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر

بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔

''جی، جی...... ضرور سیکھیے گا، داجی کو بہت آتی ہے کیونکہ بی۔اے میں ان کی اسی مضمون میں تین دفعہ سپلی آئی تھی۔اس لیے خوب پڑھ رکھا ہے انہوں نے۔'' احسن کی بات پر داجی نے کڑی نگاہوں سے اپنے سب سے بڑے پوتے کو دیکھا جبکہ تابندہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فوراً ہی وہاں سے کھسک گئی۔

☆☆☆

ایم بی بی ایس کے بعد ہاؤس جاب کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے اس کا اندازہ تابندہ کو ڈاکٹر بننے سے پہلے نہیں تھا۔ اسلام آباد کے کسی اسپتال میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے بعد بھی کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملی تو اسے مجبوراً لاہور کا رخ کرنا پڑا۔ ہاسٹل میں رہنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بڑے ابا نے اپنے چھوٹے بھائی کی دعوت پر حکم جاری کیا کہ ان کے چھوٹے بھائی کرامت اللہ کے ہاں بوریا بستر اسمیٹ کر جاؤ اور ساتھ میں وارننگ بھی دی۔

''وہ خود تو ایک نمبر کا نکما وکیل تھا اوپر سے اس کے تینوں بیٹے بھی پڑھائی میں باپ پر ہی چلے گئے تھے۔ البتہ آگے ان کی اولادوں کا کچھ پتا نہیں کہ نہلے پر دہلے ہیں یا کوئی ایک آدھ کام کا پیس نکل آیا ہے۔اس لیے وہاں جا کر ان کے رنگ میں رنگنے کے بجائے پوری محنت اور توجہ سے ہاؤس جاب کرنا......''

بڑے ابا (دادا) کی اس بات پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''لیں ابا جی اتنا ہی آپ کو ڈر ہے تو پھر ہاسٹل میں رہنے دیں تابی کو...... ضرور کسی کو تنگ کرنا ہے......'' ماما نے محتاط انداز سے اپنے سسر کو مشورہ دیا جو انہوں نے فوراً ہی رد کر دیا۔

''لو ڈر کس بات کا ہے......'' انہوں نے بالکل چنگیزی خان اسٹائل میں اپنی بہو کو دیکھا۔

''وہ گدھا اور اس کی نکمی اولاد آخر کس دن کام آئے گی۔ خود ہر چھ ماہ بعد اپنا بکسا اٹھا کر ہمارے گھر آجاتا ہے۔ اب کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں۔'' ان کے درشت لہجے پر ماما کے ساتھ، ساتھ تابندہ کا بھی رنگ اڑا۔ ویسے بھی بڑے ابا کے غصے سے سبھی کی جان جاتی تھی۔

بڑے ابا اسے جنجوعہ ہاؤس کے دو کنال کے گھر میں بھانت، بھانت کے لوگوں کے چنگل میں چھوڑ کر جو داجی کے کمرے میں گھسے تو پھر رات کو ائرپورٹ جانے کے لیے ہی باہر نکلے۔ جاتے، جاتے ہزار روپے داجی کے ہاتھ میں تھمائے کہ اپنی آل اولاد میں بانٹ دینا وہ تو تابندہ کو اگلے دن ہی پتا چلا کہ سب کے حصے میں صرف سو، سو روپیہ ہی آیا تھا تب سے داجی اپنے بڑے بھائی کو سرِعام ''کھڑوس'' کہنے سے بالکل بھی نہیں کترا رہے تھے۔

''دیکھو ذرا اس کھڑوس کا حال، بیٹے لاکھوں کما رہے ہیں لیکن کنجوس اتنا ہے کہ اپنا بخار تک کسی کو نہ دے۔'' داجی نے چاولوں کی پلیٹ میں رائتے کی ندی بہاتے ہوئے ایک دفعہ پھر جل کر کہا۔

''داجی......! دھیان کریں، ''کسی آئے گئے'' کا ہی خیال کر لیں۔'' مہروز نے کھانے کی میز پر کہنی مار کر ان کو تابندہ کی موجودگی کا اشارہ کیا تو وہ پھٹ پڑے۔

''وہ اس لڑکی کا دادا بعد میں میرا بڑا بھائی پہلے ہے۔ میں اس کو کھڑوس کہوں یا ہٹلر، کسی کو کیا تکلیف ہے؟ زیادہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بننے کی کوشش نہ کرو۔'' انہوں نے مہروز کو سب کے سامنے ہی جھاڑ پلائی تو اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

''خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے، ابھی تک عید پر سب کو سو، سو روپیہ عیدی، سو، سو باتیں سنا کر دیتے ہیں، وہ بھول گئے۔'' فراز نے کھانے کی میز پر تایا اور چچا کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بے دھڑک انداز میں کہا تو تابندہ کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ اسے لگا کہ ابھی جنگِ عظیم سوم شروع ہو جائے گی۔

''میری مرضی......'' داجی نے چاولوں کی پلیٹ میں اب بھنڈیوں کا سالن ڈالتے ہوئے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''صدقے جاؤں آپ کی مرضی کے......''

مہروز نے بھی غصے سے اکھٹے تین کباب اپنی پلیٹ میں ڈالے اور گھر کی خواتین کے حواس باختہ چہروں پر نظر ڈالی جو تابندہ کے سامنے اس ڈرامے پر سخت خفت کا شکار لگ رہی تھیں۔

''آپ تینوں کیوں انڈر ٹیکر کی طرح مجھے گھور، گھور کر دیکھ رہی ہیں......'' مہروز سخت جھنجلایا۔ ''ہم سے نہیں تمیز میں رہنے کا ڈراما کیا جاتا، ویسے بھی داجی اپنی مہمان کے سامنے سارے خاندانی قابلِ اعتراض واقعات دُہرا چکے ہیں۔'' مہروز کی صاف گوئی پر تابندہ کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ اندر سے اچھل، اچھل کر باہر آنے والی ہنسی کو روکنے کی کوشش میں اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ اس نے فوراً پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ جب کہ احسن دلچسپی سے اس کا لال ہوتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے تابندہ نے بھی آنکھ اٹھا کر دیکھا اور اسے ذوق شوق سے دیکھتے ہوئے گڑبڑا سی گئی، اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان چھ لڑکوں میں سے ہر وقت نیلے رنگ کی شرٹ میں ملبوس لڑکے کی آنکھوں میں اسے دیکھتے ہی جگنوؤں کی بارات اتر آتی تھی۔

☆☆☆

جنجوعہ ہاؤس کے اوپر والے پورشن میں ابرار صاحب اور امجد صاحب اپنی آل اولادوں کے ساتھ جبکہ نیچے والے پورشن میں احمد صاحب مقیم تھے۔ ناشتا اور رات کا کھانا اوپر البتہ لنچ نیچے والوں کی ذمّے داری تھا اس لیے اوپر نیچے کی دوڑیں سارا دن لگی رہتیں۔ جنجوعہ ہاؤس کے بالکل سامنے والے گھر میں کرامت اللہ صاحب کی بیوہ بیٹی اپنی چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی کا نام عروج تھا۔

ان کے گھر کو اندرونِ خانہ ''ہیڈ کوارٹر'' کا نام دیا گیا کیونکہ دادو اپنی بڑی بیٹی کے ہمراہ رہتی تھیں اور درمیانی سڑک کے فاصلے کو خاطر میں لائے بغیر ''جنجوعہ ہاؤس'' کے مکینوں پر پورا چیک اینڈ بیلنس رکھتی تھیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کے مکین ان سے بڑا چڑتے تھے، کچھ دادو کو اپنے بیٹوں کے مقابلے میں اکلوتی بیٹی سے زیادہ محبت تھی۔ اس لیے اکثر وہ اپنی بیٹی اور اس کی اولاد کی ناجائز طرفداری کر جاتی تھیں۔

وہ اپنی نائٹ کال بھگتا کر تھکی ہاری گھر آئی تو ٹی وی ہال میں شکیلہ چچی ڈھیروں پالک ٹرے میں ڈالے صاف کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے ساتھ مسز احمد پھلیوں کے طوفان کے ساتھ نبرد آزما تھیں۔ وہ ان کے ساتھ سلام دعا کرنے کی غرض سے بیٹھی ہی تھی کہ دھڑام سے دروازہ کھول کر فراز اندر داخل ہوا۔ یہ کرامت صاحب کے دوسرے نمبر والے بیٹے کا اکلوتا بیٹا تھا اور اپنے تایازاد احسن کا کلاس فیلو بھی، دونوں کی اکھٹے ہی انجینئرنگ میں سپلی آئی تھی، آج کل اسی مشترکہ غم کی وجہ سے دونوں اکثر ہی اکھٹے ہی نظر آرہے تھے۔

''امی اس گلابی سنڈی کو اپنی زبان میں سمجھا لیں ورنہ میں ہیڈ کوارٹر جا کر کھری، کھری سنا آؤں گا پھر نہ کہیے گا کہ بتایا نہیں......'' فراز اس کی موجودگی کا خیال کیے بغیر شروع ہو گیا۔

''اب کیا آفت آگئی؟ کیوں نیلے پیلے ہو رہے ہو؟'' زبیدہ بیگم نے بلیو جینز پر سفید ٹی شرٹ پہنے اپنے صاحبزادے کو دیکھا جس کا مزاج خاصا برہم تھا۔

''یار میرا تو خیال ہے کہ اس گلابی سنڈی پر اب ایک آدھ اسپرے کرنا ضروری ہو گیا ہے......'' احسن بھی گاڑی کی چابی گھماتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔

''شرم کرو، تمہاری پھوپی زاد بہن ہے اور سوچ

سمجھ کر بولا کرو......'' اس کی والدہ نے تنبیہی نظروں سے گھور کر اسے تابندہ کی موجودگی کا اشارہ کیا۔

''کوئی بہن وہن نہیں ہے میری ......'' فراز نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ''ہر روز اپنی سارے جہاں کی شوخی، پینڈو اور بے سوادی سہیلیوں کو لے کر میرے ڈیپارٹمنٹ پہنچ جاتی ہے، جن میں سے ایک بھی کام کی نہیں......'' دبلے پتلے سے فراز نے ہاتھ میں پکڑا کشن کھینچ کر دوسرے صوفے پر پھینکا تو مسز ابرار یعنی شکیلہ بیگم نے تاسف بھری نظروں سے اپنے دیور کے بیٹے کو دیکھا اور کھانے کی ٹرے تابندہ کے سامنے رکھی۔

''ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ کسی کے الٹے سیدھے نام نہیں رکھتے......'' زبیدہ بیگم نے ناراضی سے اپنے بیٹے کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا۔

''تو اس کو کس نے کہا ہے کہ ہر روز گلابی سوٹ، گلابی جوتا، گلابی بیگ اور گلابی میک اپ تھوپ کر کیمپس پہنچ جائے۔ پچھلے ہفتے میں محترمہ کے نوٹس فوٹو کاپی کر کے پہنچانے گیا اور اس کی کلاس فیلو سے پوچھا تو ساتھ کھڑی دوسری لڑکی تمسخرانہ انداز سے بولی یار ''گلابو'' کا پوچھ رہا ہے۔ اندازہ کریں......''

''فکر نہ کرو یار، ہیڈ کوارٹر میں دادو کو بتا کر آیا ہوں اس کا کارنامہ......'' احسن نے تابندہ کے آگے رکھی سلاد کی پلیٹ سے کھیرا اٹھاتے ہوئے اطلاع دی۔ اس کی بات پر دونوں خواتین کا رنگ اڑا جبکہ تابندہ اس کی بے تکلفی پر حیران رہ گئی۔ وہ اب مزے سے تابندہ کی پلیٹ میں رکھے سالن کے ساتھ روٹی لے کر شروع ہو چکا تھا۔

''پتا نہیں عقل کب آئے گی ان لڑکوں کو، کیا کہہ کر آئے ہو اپنی دادی کو......؟'' شکیلہ بیگم نے اپنے بیٹے کو کڑی نظروں سے گھورا۔

''بتا کر آیا ہوں دادو کو ان کی نواسی صاحبہ کا کارنامہ......'' احسن نے فراز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ''دادو صاحبہ فرما رہی تھیں، بچی ''مخول'' کر رہی ہو گی تم لوگ دل پر لے گئے۔'' احسن بھی ناک چڑھا کر دادی کی بلغمی آواز کی بالکل ٹھیک ٹھاک نقل اتار کر بولا۔

''لیں بھابی، یہ اب شکایتی پروگرام نشر کر آئے ہیں اب ان کی پھپھو غبارے کی طرح منہ پھلا کر بیٹھ جائیں گی، شامت ہماری آئے گی۔'' زبیدہ بیگم نے پریشانی سے اپنی جیٹھانی (شکیلہ) کا چہرہ دیکھا جو اس اطلاع پر خود بھی تناؤ کا شکار ہو گئی تھیں۔

''چچی، آپ اس غبارے میں سوئی مار کر ساری ہوا نکال دیجیے گا......'' احسن نے جل کر مشورہ دیا تو تابندہ کے لیے اپنی ہنسی روکنا دشوار ہو گیا جبکہ چچی کی پریشانی کا گراف ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ احسن نے شرارتی نظروں سے تابندہ کو دیکھا۔

''بھئی بھوک زیادہ لگی ہوئی تھی، اس لیے آپ کے ساتھ ہی شروع ہو گیا، مائنڈ مت کیجیے گا۔'' تابندہ مسکرادی۔

''دیکھا بھابی، پہلے ہی مسئلے کم نہیں ہیں، اوپر سے ان صاحبزادوں نے دماغ خراب کر رکھا ہے......'' زبیدہ بیگم نے شکایتی نظروں سے پھر انہیں دیکھا۔

''لو ویسے آپ دیورانی، جیٹھانی کی بنتی نہیں ہے لیکن پھپھو اور دادو کے خلاف فوراً میثاقِ جمہوریت کی میز پر چڑھ بیٹھتی ہیں......'' فراز کے منہ پھٹ انداز پر وہ دونوں تو کھسیا کر ہنسنے لگیں جبکہ تابندہ کو اندازہ ہوا کہ اس گھر میں آزادیِ اظہار پر کوئی پابندی نہیں جس کی وجہ سے ہر وقت کوئی نہ کوئی ٹاک شو جاری رہتا تھا۔

''اس قدر منحوس فطرت پائی ہے آپ کی نند کی بیٹی نے کہ بتا نہیں سکتا......'' فراز کا غصہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''آخر ہوا کیا ہے کچھ تو بتاؤ......؟'' شکیلہ بیگم نے دبے، دبے لہجے میں پوچھا۔

''ہونا کیا ہے آج اپنا سہیلیوں کا جتھا لے کر میرے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہنس، ہنس کر گا رہی تھی۔

پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصرؔ
غم کو پینے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے''

''لو بھلا اس کا کیا مطلب ہوا......؟'' زبیدہ بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر حیرت سے پوچھا انہیں حقیقتاً سمجھ نہیں آئی۔

''اوہ میری بھولی ماں، آپ کے لیے ہی شاید کسی نے کہا ہے کہ ''تو کی جانیے، بھولیے مجے، انارکلی دیاں شاناں......'' فراز ماتھے پر ہاتھ مار کر جل کر بولا۔

''زیادہ زبان نہ چلاؤ، یہ فلسفے ہماری سمجھ میں نہیں آتے، اس لیے آسان زبان میں بتاؤ......'' انہوں نے تپ کر اپنے بیٹے کا سرخ چہرہ دیکھا۔

''ہاں تو میں کون سا الجبرا کا سوال حل کرنے کو کہہ رہا ہوں......'' فراز کی بدلحاظی بھی عروج پر تھی۔

''آپ لوگوں کے اسی بھول پن کا ناجائز فائدہ پھپھو اور دادو اٹھاتی ہیں۔ آپ تینوں دیورانیاں، جیٹھانیاں بس آپس میں ہی لڑنے میں شیر ہیں......'' احسن کو بھی غصہ آ گیا۔ تابندہ نے کسٹرڈ پیالی میں ڈالتے ہوئے ان سب کو دیکھا جو اب اس کی موجودگی کو بالکل ہی فراموش کیے بیٹھے تھے۔

''زیادہ فضول بولنے کی ضرورت نہیں، بتانا ہے تو بتا دو، ورنہ ہم لوگ کچن میں جا رہے ہیں۔'' شکیلہ بیگم کی بیزاری پر فراز نے شکوہ کناں نظروں سے احسن کو دیکھا۔

''آپ لوگوں کو اپنی اولاد کی عزت اور بے عزتی کا کوئی احساس نہیں۔'' فراز بدگمان ہوا۔

''لو اب ایک نیا تماشا......'' احسن کی والدہ شکیلہ بیگم نے تعجب سے ناک پر انگلی رکھی۔

''او ہماری سارے جہان کی بھولی ماؤں......''

کشن صوفے پر پھینکتے ہوئے فراز صدمے سے کراہ اٹھا۔

''وہ گلابی سنڈی ہم دونوں کے امتحانوں میں آنے والی ''سپلی'' کا مذاق اڑا رہی تھی شاعری کی زبان میں۔'' فراز نے وضاحت کی۔

''وہ کیسے......؟'' دونوں خواتین نے سخت حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''محترمہ فرما رہی تھیں۔

پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصرؔ
غم کو پینے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے''

''اب سمجھ آیا؟'' فراز کی بات پر تابندہ بے ساختہ مسکرادی۔

''لو بی مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا ویسے اردو میں کبھی ڈھنگ کے نمبر نہیں لیے لیکن شعر سارے مطلب کے یاد کر رکھے ہیں۔'' احسن کی والدہ شکیلہ بیگم کو بھی غصہ آ گیا۔

''لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ان کو تمہارے فیل ہونے کا بتایا کس نے......؟'' زبیدہ بیگم نے بات تو پتے کی تھی لیکن اسے سنتے ہی فراز تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

''امی ہزار دفعہ بتایا ہے کہ ایک ہی مضمون میں سپلی آئی ہے آپ ایسے منہ پھاڑ کے فیل ہونے کا اعلان کرتی ہیں کہ مجھے لگتا ہے جیسے سارے ہی مضامین میں اڑ گیا ہوں۔'' وہ خفا ہوا۔

''چلو ایک ہی سہی لیکن ان کو بتایا کس نے......؟'' ان کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''تمہارے دا جی نے ہی بیگم کے کان میں پھونک ماری ہو گی۔ کل دونوں کافی عرصے بعد ہنس، ہنس کر اکھٹے جلیبیاں کھا رہے تھے۔'' شکیلہ بیگم کو ابھی ابھی یاد آیا۔

''ہو ہی نہیں سکتا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' احسن نے ان کی بات کو سختی سے جھٹلایا۔ ''دا جی اپنے پکے یار ہیں۔ ہماری مخبری کر دی تو ان کو پتا ہے راحت بیکری سے برفی اور گلاب جامن کون لا کر دے

گا۔" احسن کے لہجے کا یقین تابندہ کو حیران کر گیا۔

"شرم کرو شوگر کے مریض کے ساتھ ایسی محبت دشمنی ہی ہوتی ہے......" زبیدہ بیگم نے تاسف بھری نظروں سے اپنے بیٹے فراز کو دیکھا۔

"اور سینما میں چوری، چوری فلم کون دکھانے لے کر جائے گا......" فراز، احسن کے کان میں سرگوشی کر کے ہنسا۔ قریب بیٹھی تابندہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جبکہ خیریت رہی کہ دونوں خواتین اپنی نند کے گناہ بخشوانے میں مصروف تھیں۔

"پھر آخر اس "عروج" کی بچی کو ہمارے "زوال" کی کہانی کس نے سنائی......؟" فراز کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"گھر کی تینوں بچیاں تو اپنی خالہ کے پاس سیالکوٹ گئی ہوئی ہیں اور گھر میں سوائے ہمارے اور گھر کی ملازمہ کے ہے ہی کون؟" زبیدہ بیگم کو بڑی فطری سی پریشانی لاحق ہوئی لیکن ان کی اسی پریشانی کے اندر چھپا جواب دونوں کو مل گیا۔

"اوہ......!" فراز کے دماغ میں آخر کوئی چیز کلک کر ہی گئی۔

"گھر کی ملازمہ ......" وہ تڑپ کر اٹھا اور دوٹوک انداز میں اپنی والدہ اور تائی اماں کی طرف دیکھا۔ سارا معاملہ اسے سمجھ آ گیا تھا۔

"آج اس شرمیلی عرف "شرلی بیگم" کو میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا، جو ہر وقت دوسروں کے سروں پر پٹاخے پھوڑتی ہے۔ اس کی لگائی بجھائی والی عادت ہی اسے کسی دن میرے ہاتھوں مروائے گی۔" وہ خطرناک ارادوں کے ساتھ کچن کی طرف بڑھا جہاں شرمیلی بلند آواز میں نور جہاں کا گانا "وے چھڈ میری وینی نہ مروڑ، وے کچ دیاں ونگاں نہ تروڑ" گاتے ہوئے برتن دھو رہی تھی۔

"آج اس کی "وینی" (بازو) کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی کاٹ کر پانی میں بہا آنا، سارا "سیاپا" ہی ختم ہو جائے گا......" احسن نے بھی اسے مزید بھڑکایا...۔ تابندہ نے خوفزدہ انداز سے کچن کی طرف دیکھا جہاں سے فراز کے گرجنے برسنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

"توبہ ہے، ایک تو میں ان لڑکوں سے سخت بیزار ہوں، کسی آئے گئے کا خیال کیے بغیر اپنی زبانیں چلاتے رہتے ہیں۔" زبیدہ بیگم سخت کوفت کا شکار ہوئیں۔ جبکہ ایک دفعہ پھر اس "آئے گئے" کے خطاب پر تابندہ نے جھنجلاہٹ سے پہلو بدلا۔

"دیکھ کر آؤں کہیں اس ماسی پھاپھا کٹنی کی زیادہ ہی طبیعت سیٹ نہ کر دے اور وہ کام چھوڑ کر چلی گئی تو پھر ایک نیا پواڑا پڑ جائے گا۔" زبیدہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھیں جہاں فراز بالکل "دبنگ" کے سلمان خان کے اسٹائل میں "شرلی" کو دھمکیاں دینے میں مصروف تھا۔

"سوری بیٹا، تم بھی کیا سوچتی ہو گی کہ اس گھر میں ہر روز ہی ایک نئی فلم چل رہی ہوتی ہے......" شکیلہ بیگم نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتی سنجیدہ سی تابندہ کو مخاطب کر کے خفت زدہ لہجے میں کہا۔ انہیں یہ کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی سمجھدار سی لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔

"اچھا ہے ناں انہیں بغیر ٹکٹ کے لائیو فلم دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے......" احسن نے گہری نظروں سے اس سنجیدہ سی لڑکی کی گھنی پلکوں کو غور سے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں آنٹی، میں تو ویسے بھی مصروف رہتی ہوں پھر مجھے تو گھر میں رہنے کا موقع ہی کم، کم ملتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کی بھرپور تسلی کروانے کی کوشش کی جو کچن میں شرلی کے بلند آواز میں بولنے پر خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

"دیکھوں تو سہی، یہ شرمیلی کیوں زبان چلا رہی ہے......؟" وہ بھی پریشانی کے عالم میں کچن کی طرف گئیں۔

"ہیڈ کوارٹر والوں کی شہہ پر چیخ رہی ہے۔ جن کے لیے مخبریاں کرتی ہے اور پھر وہاں سے انعام میں سوہن حلوے کھاتی ہے۔ ایسے ہی نہیں اس کا کاروبارِ زندگی چل رہا ......" احسن نے منہ بناتے ہوئے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔

"آپ اپنے پھپو کے گھر کو "ہیڈ کوارٹر" کیوں کہتے ہیں......؟" تابندہ کی زبان پھسلی اور احسن تحیر کے عالم میں اٹھ بیٹھا۔

"ہیڈ کوارٹر کی وضاحت تو میں بعد میں کروں گا لیکن شکر ہے کہ آپ نے بھی گھر کے کسی فرد سے بات نہ کرنے کی قسم توڑی......" اس نے دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر باقاعدہ شکر ادا کیا تو تابندہ ڈھیروں خفت کا شکار ہوئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، ایک تو میں فطرتاً کم گو ہوں...... پھر گھر میں آج کل کوئی لڑکی بھی نہیں۔ اس لیے چپ رہتی ہوں ......" اس نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"کیوں، ہم لڑکے بیچاروں کا کیا قصور ہے؟" اس کے لہجے میں اتنی حیرت تھی کہ تابندہ حقیقتاً شرمندہ ہوئی۔

"یقین مانیں ہم سب لڑکے نکھے، بڑبولے اور نالائق ضرور ہیں لیکن ہم سب میں کوئی بھی ایسا "ڈان" نہیں کہ لڑکیاں ہم سے ڈرتی پھریں اور ہم سے تو گھر کے ملازم نہیں ڈرتے۔" وہ اپنا مذاق خود اڑاتے ہوئے مزید بولا۔

"وہ جو گیٹ پر خنجر مارکہ مونچھوں والا پٹھان چوکیدار ہے ناں۔ وہ بھی ہم پر رعب جما کر سگریٹ، پان منگواتا ہے اور نہ لا کر دینے پر اباجی سے ٹیوننگ بھی کروا دیتا ہے......" وہ اس کی بات پر ابھی جی بھر کے حیران بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے مزید انکشاف کیا۔

"اور یہ جو ہمارے گھر میں سارے جہاں کی جعلی معصومیت چہرے پر سجائے محترمہ شرمیلی صاحبہ آتی ہیں ناں انہوں نے خاصی "شر انگیز" طبیعت پائی ہے۔" تابندہ نے سخت حیرت سے اس کا پُرجوش انداز دیکھا جو آج ہی ساری معلومات اسے دینے پر تُلا بیٹھا تھا۔

"ہمارے گھر میں خواتین کی ساری عالمی جنگوں کے پیچھے اسی محترمہ کا ہاتھ ہوتا ہے، اسی ہاتھ کو توڑنے فراز کچن میں گیا ہے۔ ابھی تو میں نے کسی کو بتایا نہیں، یہ مجھ سے اپنے سبزی فروش منگیتر کو برتھ ڈے گفٹ دینے کے لیے ہزار روپے ادھار لے کر گئی تھی اس کے اس تارکول کے ڈرم جیسے منگیتر کی اگلی سالگرہ آنے والی ہے پر وہ پیسے واپس نہیں ملے......" احسن کی دکھی داستان پر تابندہ کھلکھلا کر ہنسی تو احسن نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں آپ جو ہیڈ کوارٹر کا پوچھ رہی تھیں تو ایسا ہے کہ اس گھر کے سبھی بڑے فیصلے پھپو کے گھر میں ہوتے ہیں کیونکہ دادو کا قیام وطعام وہیں ہے۔ اس لیے ہم لوگوں نے اسے "جی ایچ کیو" یعنی جنرل ہیڈ کوارٹر کا نام دے رکھا ہے......" اس کی دلچسپ وضاحت پر تابندہ کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

"اللہ پوچھے فراز تمہیں، زندگی خراب کر کے رکھ دی ہے۔" زبیدہ بیگم سخت غصے میں کچن سے نکلیں۔

"چلی گئی ہے شرمیلی نوکری چھوڑ کے، اب برتنوں کے پہاڑ سے کون نبٹے گا"؟ شکیلہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑی چھری ٹرے میں پٹخ کر احسن کو غصے سے دیکھا۔ جو صوفے پر نیم دراز تھا۔

"خس کم جہاں پاک......" احسن نے بلند آواز میں شکر ادا کیا۔ "میں تو آج ہی زردے کی دیگ پکوا کر پوری کالونی میں بانٹتا ہوں......"

"ہونہہ، ہاتھوں میں رکھ کر بانٹ کر آنا، جھولیوں میں ڈال کر لے کر جانا۔ برتنوں کا طوفان تم لوگوں کی بیویاں آ کر دھوئیں گی......" زبیدہ بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے فراز کو دیکھا جو اَب بڑے آرام سے مولی کھاتا ہوا باہر آ رہا تھا ایک مولی اس

نے احسن کی طرف اچھالی جو اس نے فوراً ہی کیچ کی۔

''ہاں تو کردیں ناں شادیاں، آپ لوگوں کو تو اپنے بیٹوں کے سہرے کے پھول دیکھنے کا کوئی شوق ہی نہیں، قسم سے صرف اپنے ہی گھر میں، میں نے ایسی غیر جذباتی مائیں دیکھی ہیں۔ جنہیں اپنے پوتے پوتیاں کھلانے کا کوئی شوق نہیں......'' فراز نے احسن کے پاس ڈھیر ہوتے ہوئے بہت اطمینان سے مشورہ دیا۔ جو دونوں خواتین کو پتھر کی طرح لگا۔

''ہمیں کوئی شوق نہیں، پہلے تم لوگوں کو پال رہے ہیں پھر تمہاری زبان دراز بیویوں کو لا کر اپنے سروں پر بٹھالیں......'' زبیدہ بیگم نے تپ کر پالک کاٹنی شروع کردی۔

''واہ امی، زبان درازی کیسے کریں گی، ہم مر گئے ہیں کیا، کھینچ کر رکھیں گے انہیں۔ آپ ایک دفعہ ہمیں آزما کر تو دیکھیں......'' احسن نے آنکھ کا کونا شرارت سے دباتے ہوئے فراز کی طرف دیکھا جو بڑے ذوق شوق سے مولی کے چھلکے اتار رہا تھا۔

''سبحان اللہ......'' انہوں نے طنزیہ نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ ''بیٹا اس شکل اور کرتوتوں کے ساتھ کون اپنی بیٹی دے گا......'' شکیلہ بیگم نے ابرو چڑھا کر دیکھا۔

''آپ ایک دفعہ ہاں تو کریں۔ کیا پتا کسی خوب صورت لڑکی کی کوئی آپ جیسی ظالم، سوتیلی ماں ہو۔ وہ اپنی بیٹی کو بوجھ سمجھ کر سر پر سے اتارنا چاہتی ہو......'' احسن نے مولی کو نمک لگاتے ہوئے دونوں خواتین کے جذبات پر نمک پاشی کرتے ہوئے شرارت سے تابندہ کو دیکھا۔

''دفع کریں بھابی، آپ بھی کن پاگلوں کے منہ لگ رہی ہیں۔'' زبیدہ بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے دونوں کو گھورا۔

''سارا ان کے داجی کی ڈھیل کا نتیجہ ہے کہ ان کو ماؤں سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں رہی۔ بات یوں کرتے ہیں جیسے ہم ان کی مائیں نہیں سہیلیاں ہوں......'' شکیلہ بیگم کا پارہ بھی ایک دم ہی ہائی ہوا۔

''اچھا ہے ناں، آپ کی بہویں آ کر بابرا شریف کی طرح اچھل، اچھل کر گا یا کریں گی کہ ''میری ساس ہے میری سہیلی، ساری سکھیوں سے البیلی......'' احسن اب میز کو طبلہ سمجھ کر گا رہا تھا...... دونوں خواتین تابندہ کا لحاظ کر کے بہ مشکل ضبط کے کڑے مراحل سے گزریں۔ کچن میں پڑے گندے برتن ان کے حواسوں پر سوار تھے۔

''ارے ٹینشن نہ لیں، شام تک وہ شرمیلی عرف شرلی صاحبہ واپس آجائیں گی......'' فراز کو ان کی اصل ٹینشن کا بخوبی اندازہ تھا۔

''اس پیٹو کو پتا ہے کہ آج گھر میں حلیم پکے گا اور پھر لڑکیاں بھی شام کو واپس آرہی ہیں جن سے اس نے سرخی پاؤڈر اور رنگ برنگے پراندے منگوائے ہیں......'' احسن کی بات پر ان دونوں خواتین کا غصہ کچھ کم ہوا۔

''ویسے بھی وہ کون سا پہلی دفعہ واک آؤٹ کر کے گئی ہے۔ سیاسی لوٹوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتی رہتی ہے۔ یہاں سے ہیڈ کوارٹر اور وہاں سے یہاں......'' احسن کی تسلی پر دونوں خواتین اب اچھی خاصی مطمئن ہوگئی تھیں۔

''آنٹی آپ لوگوں میں سے چائے کون، کون پیے گا، میں کچن میں اپنے لیے بنانے جا رہی ہوں......'' تابندہ کی بات پر وہ چاروں چونکے اور اس کی موجودگی کا خیال آیا۔

''اُف، ایک تو آپ خود دھان پان سی ہیں اور اوپر سے بولتی انتہائی کم ہیں، قسم سے دھیان ہی نہیں رہتا کہ آپ بھی یہاں موجود ہیں......'' فراز نے مولی کا آخری ٹکڑا بھی منہ میں ڈالتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ مسکرادی۔

''تم لوگوں کی مشین کی طرح چلتی زبانیں رکیں گی تو کسی اور کو بولنے کا موقع ملے گا......'' زبیدہ بیگم نے طنزیہ انداز سے دونوں کو ڈھیٹوں کی طرح ہنستے دیکھا۔ فراز اور احسن کا ڈیپارٹمنٹ ایک ہی تھا اس لیے خوب بنتی تھی۔

''یہ دنیا کا پہلا گھر ہوگا جہاں کی لڑکیاں کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی اور لڑکے سارے کے سارے چلتے پُرزے اور چُھرے......'' شکیلہ بیگم نے اپنا دُکھتا ہوا سر دبایا۔

جبکہ وہ ان کی باتوں پر کوئی تبصرہ کیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ چائے کا پانی رکھتے، رکھتے اس نے شرمیلی کے چھوڑے ہوئے برتن جلدی، جلدی دھو کر شیلف صاف کی اور چائے کے پانچ کپ لے کر باہر آئی تو دونوں خواتین نے سکون کی سانس لی جبکہ وہ دونوں وہاں سے غائب تھے۔

☆☆☆

''ہاں بھئی تابندہ دل لگ گیا تمہارا ہمارے گھر میں......؟'' ماہ رخ نے دوستانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

وہ ابھی ابھی ڈھیر سارے فرنچ فرائز اور بھاپ اڑاتے چائے کے کپ لے کر لان میں پہنچی، جہاں ان تینوں لڑکیوں نے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ ان کی آمد کی خبر کے ساتھ ہی شرمیلی بیگم سارے اختلافات بھلائے سرخ پراندہ پہنے انجمن اسٹائل میں آن پہنچی۔ اس کی آمد سے گھر میں موجود تینوں بہوؤں نے سکون کی سانس لی۔

''ہاں اب تو کافی دل لگ گیا ہے۔ شروع میں کچھ بوریت ہوئی تھی کیونکہ گھر میں کوئی بھی لڑکی نہیں تھی......'' تابندہ نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں یار میری کزن کی شادی تھی۔ میں اور دعا تو جا رہے تھے ہم نے سوچا کہ انعم پیچھے سے اکیلی بور ہوگی تو اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔'' ماہ رخ خاصی زندہ دل اور ہنس مکھ سی لڑکی تھی۔ رشتے داری ہونے کے باوجود یہ ان لوگوں کی پہلی دفعہ ملاقات تھی لیکن ان کے دوستانہ مزاج کی وجہ سے تابندہ کو بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ ویسے تو جنجوعہ ہاؤس کی خواتین نے بھی اس کا کافی خیال رکھا تھا لیکن اپنی تینوں کزنز کے ساتھ مل کر اسے واقعی خوشی ہوئی۔

''ہم لوگوں کو بھی جب تمہاری آمد کا پتا چلا تو بڑی بے چینی ہوئی۔ امی بہت تعریف کر رہی تھیں۔'' ماہ رخ کی بات پر وہ خوشگوار حیرت کا شکار ہوئی۔

''اچھا......؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''حالانکہ میری تو گھر میں بہت کم کسی سے بات ہوتی تھی، میڈیکل لائف بندے کی ساری سوشل لائف ختم کردیتی ہے۔'' تابندہ نے سادگی سے کہا۔

''تابندہ آپی، میری امی تو سخت اپ سیٹ تھیں کہ ان لڑکوں نے ہمیشہ کی طرح گھر میں اودھم مچا رکھا تھا اور ان کو آپ کے سامنے کافی شرمندگی ہوتی رہی......'' انعم اپنی چائے کا بڑا سا مگ لے کر ان کے پاس ہی آگئی۔ اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ انعم، شرجیل اور فیضان کی اکلوتی بہن تھی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں نے تو بہت انجوائے کیا۔'' تابندہ نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ ''اصل میں میرے تینوں بھائی حد درجہ سنجیدہ اور کم گو ہیں اوپر سے ہمارے دادا جان کا مزاج خاصا سخت ہے ان کی موجودگی میں ویسے ہی کرفیو لگا رہتا ہے۔ اس لیے میرے لیے تو یہ ماحول بہت مزے کا اور حیران کن تھا۔'' تابندہ نے فرنچ فرائز کھاتے ہوئے ان تینوں کے مسکراتے ہوئے چہروں کو دیکھا۔

''ایکچوئیلی یار ابرار تایا کے صرف تین بیٹے ہی ہیں اور ہمارا ایک ہی بھائی فراز اور اسجد چچا کے دو بیٹے، اس طرح اس گھر میں لڑکوں کی تعداد ڈبل ہے ہم سے۔'' ماہ رخ نے وضاحت دی۔ ''پھر ان سب کی آپس میں حد درجہ دوستی اور پیار ہے۔ باہر سے آنے

والوں کو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کون کس کا بھائی ہے......" ماہ رخ کی بات پر اسے فوراً ہی یقین آگیا۔

"یہ سارے لڑکے، داجی کے انتہائی چہیتے ہیں۔ خواتین کے قابو ہی نہیں آتے۔" دعا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ ماہ رخ کی چھوٹی بہن تھی جبکہ ان کا اکلوتا بھائی فراز تھا۔

"لیکن ماہ رخ آپی سچ بات تو یہ ہے کہ اس گھر کی ساری رونق انہی کے دم سے ہے، یاد نہیں ایک دفعہ احسن بھائی، فراز بھائی اور شرجیل لوگ کسی ٹرپ پر ایک ہفتے کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئے تھے اور گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔" انعم جو سب سے چھوٹے چچا کی بیٹی تھی۔ اس نے بھی شرارتی انداز میں یاد دلایا۔

"ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں لیکن پھر بھی اصل رونق اس گھر کے داجی ہیں۔ وہ بہت زندہ دل، ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج کے حامل ہیں۔ بظاہر بڑے روکھے سے اور سخت مزاج لگتے ہیں لیکن بالکل اخروٹ کی طرح باہر سے سخت اور اندر سے نرم......" ماہ رخ کا لہجہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

تابندہ کو سخت حیرت ہوئی۔ اس کے گھر میں بڑے ابا کی بے جا روک ٹوک اور پڑھائی کے معاملے میں حد سے زیادہ سختی نے عجیب سا ماحول بنا دیا تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں جاتے تو تابندہ کی امی کھل کر سانس لیتیں۔ اس قسم کے ماحول میں رہتے ہوئے تابندہ کے بھائیوں کے مزاج میں عجیب سی سنجیدگی اور روکھا پن سا آگیا تھا۔ تابندہ نے انہیں کبھی آپس میں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے اسے جنجوعہ ہاؤس میں کھل کر سانس لینے کا موقع ملا تھا۔

"واہ جی واہ یہاں چوری، چوری دعوتیں اڑائی جارہی ہیں اور ہمیں کوئی لفٹ نہیں۔" ایک دراز قد سی خوب صورت لڑکی کیاری پھلانگ کر لان میں اچانک آئی۔ وہ سب چونک گئیں۔

"بہت بے مروت ہو عروج تم، کچھ گھر میں آئی مہمان کا خیال کر کے ہی چکر لگا جاتیں، یہ سامنے تو گھر تھا۔" ماہ رخ نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

"کیوں، مہمان صاحبہ کے پیروں میں کون سا مہندی لگی ہوئی تھی۔ یہ خود چکر لگا لیتیں، ہمارے ساتھ بھی اتنی ہی رشتے داری بنتی ہے۔" عروج خاصی منہ پھٹ تھی۔ آتشی گلابی لان کے سوٹ میں اس کی سنہری رنگت دمک رہی تھی۔ اس نے آتے ہی فرنچ فرائز کی پلیٹ اٹھائی اور بے تکلفی سے کیچپ ڈال کر کھانے لگی۔

"اس بیچاری کو کیا پتا، سامنے والے محاذ پر آپ رہتی ہیں۔ ورنہ سب سے پہلے اسی مورچے میں سلامی دینے آتی۔" دعا نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا تو ماہ رخ نے ماحول کو بگڑتے دیکھ کر دانستہ خوشگوار انداز میں کہا۔

"تابندہ یہ ہماری پھوپی زاد کزن عروج ہے۔ سامنے سرخ اینٹوں والا بڑا سا گھر انہی کا ہے......"

"ارے رہنے دو میرا تعارف، وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہوں گی ایک ہفتے سے اس گھر میں مقیم ہیں، صبح شام اس گھر میں میرے گناہ بخشوائے جاتے ہیں۔ انہوں نے غائبانہ بہت کچھ سن لیا ہوگا۔" اس کے استہزائیہ انداز گفتگو پر تابندہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ جس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔

"خیر ایسا بھی اس گھر میں کسی کے پاس فالتو وقت نہیں جو تمہاری شان میں صبح شام قصیدے پڑھتا رہے......" دعا کا انداز بہت کچھ جتاتا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری دور ہی سے نظر آرہی تھی۔

"کسی اور کے پاس وقت ہو نہ ہو، فراز اور احسن کے پاس تو ضرور ہوتا ہے......" اس کے لہجے میں بھرپور یقین اور چہرے پر کمال بے نیازی تھی۔

"ظاہر ہے جب تم آتے جاتے کبھی گھر میں تو کبھی یونیورسٹی میں ان سے پنگے لو گی تو وہ تمہاری شان میں چوبیس توپوں کی سلامی دینے سے تو رہے۔" دعا کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا۔ اس کے تعلقات اپنی اس کزن کے ساتھ سخت کشیدہ تھے اس کا اندازہ تابندہ کو فوراً ہی ہوگیا تھا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی، یہ فراز کو ہی کوئی نہ کوئی کیڑا کاٹتا ہے جو وہ ہر تیسرے دن میرے ڈیپارٹمنٹ پہنچ جاتا ہے......" عروج کی زبان میں گویا کانٹے اگے ہوئے تھے اور وہ تابندہ کا لحاظ کیے بغیر اس بے معنی بحث میں الجھی ہوئی تھی۔

"اس کے کیڑے کا تو مجھے پتا ہے کہ وہ کون سا ہے؟ اور کیوں کاٹتا ہے؟ لیکن تمہیں پتا نہیں کون سا ابال اٹھتا ہے جو مہروز کے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہی ختم ہوتا ہے۔" دعا کے بہت کچھ "جتاتے" انداز پر عروج کا چہرہ سرخ ہوا۔

"افوہ کیا ہوگیا ہے دعا تم لوگوں کو...... جہاں بیٹھتی ہو وہیں چونچیں لڑانا شروع کر دیتی ہو، کچھ تو آئے گئے کا لحاظ کرلیا کرو......" ماہ رخ کے تنبیہی انداز پر تابندہ نے بڑے کوفت بھرے انداز سے پہلو بدلا۔ یہ "آئے گئے" کا لفظ تو اس کے لیے چڑ ہی بنتا جا رہا تھا۔ جبکہ عروج نے گود میں رکھی فرنچ فرائز کی پلیٹ سامنے رکھی میز پر پٹخی تھی۔ وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"ماہ رخ آپی، کل ہمارے گھر میں میلاد ہے۔ امی اور دادو نے آپ سب کا بلاوا بھیجا ہے۔ میں یہ ہی کہنے آئی تھی۔" اپنی بات مکمل کر کے اس نے پھر مور پنکھ کی باڑ کسی چھلاوے کی طرح پھلانگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گیٹ عبور کرگئی۔

"تھینکس گاڈ، عروج آپی نے کچھ تو فرنچ فرائز چھوڑ دیے، میرا تو دل بیٹھا جا رہا تھا ان کو کھاتے دیکھ کر......" انعم کی بات پر تابندہ اور ماہ رخ دونوں کو ہی نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔ جبکہ دعا کا

ٹیچر

کسی کو اس کے الجھے بالوں اور ملگجے لباس کی وجہ سے غریب نہ سمجھو ہو سکتا ہے کہ وہ ٹیچر ہو اور اس کی چھٹیاں ہوں۔

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

کیا خوب

آج کا انسان اپنے دکھ سے نہیں بلکہ دوسروں کے سکھ سے دکھی ہے۔

مرسلہ: انیقہ انا، چکوال

بہتر کام

زندگی سے جو بھی بہتر سے بہتر کام لے سکتے ہو لے لو کیونکہ جب زندگی کچھ لینے پر آتی ہے تو سانس تک بھی نہیں چھوڑتی۔

مرسلہ: عزیزہ غنی، پاک پتن

قابلِ غور

پریشانی میں مذاق، خوشی میں طعنہ زنی اور غصے میں تنقید نہ کرو کیونکہ اس سے رشتوں میں موجود محبت ختم ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: فرحانہ ناز ملک، ڈی جی خان

مزاج ہنوز برہم تھا۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی، اس کے منہ لگنے کی خواہ مخواہ......" ماہ رخ نے محتاط انداز میں اپنی چھوٹی بہن کا خفا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اس کے منہ لگتی ہوں......؟" اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا کپ ٹرے میں رکھا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ "وہ محترمہ جان بوجھ کر ایسے بے ہودہ ڈرامے کرتی ہیں۔ فضول میں مہروز کے

پیچھے ہاتھ منہ دھو کے پڑ گئی ہے۔" دعا کے منہ پھٹ انداز پر ماہ رخ نے گڑبڑا کر تابندہ کو دیکھا جو اپنے سیل فون پر کوئی ٹیکسٹ لکھنے میں مگن تھی۔

"ہمیں اس سے کیا، وہ جو کچھ بھی کرے۔ اس کے لیے شکیلہ تائی کافی ہیں......" ماہ رخ نے اپنی طرف سے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"ہمیں کیوں کچھ نہیں ہے......؟" دعا نے کڑے تیوروں سے اپنی بڑی بہن کو دیکھا جو تابندہ کی وجہ سے سخت ٹینس تھی۔

"آپ لوگوں کو کوئی پرابلم ہو یا نہ ہو، مجھے تو ہے۔" دعا نے جل کر کہا۔ "پہلے پھپھو نے دادو سے کہہ کر انعم کی رضوان کے ساتھ بچپن سے طے شدہ بات ختم کروائی اور اپنی بیٹی سارے زمانے کی فیشنی ذوباریہ کا زبردستی رشتہ کروایا اب مہروز پر ان کی نظر ہے......" دعا کے لہجے میں سارے جہاں کی تلخی تھی۔

تابندہ نے اس انکشاف پر سر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی معصوم سی انعم کا تاریک اور دھواں دھواں چہرہ غور سے دیکھا۔ اسے بھی حقیقتاً افسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

"حد ہوتی ہے ظلم کی، حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی......" فراز کی خود ساختہ مظلومیت سے لبریز آواز نے تابندہ کے قدم روک لیے۔

"حد ہوتی ہے بے انصافی کی اور حد ہوتی ہے بے شرمی کی، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے داجی کہ آپ نے یہ ساری حدیں دن دیہاڑے توڑ دی ہیں......" احسن کی مصنوعی صدمے میں ڈوبی آواز پر تابندہ نے سامنے ٹی وی ہال میں جھانک کر دیکھا تو اسے اندر داخل ہوتے ہی جھٹکا سا لگا۔

کھانے کی میز پر آلتی پالتی مارے فراز، احسن اور مہروز بڑی فرصت سے بیٹھے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر دعا اور ماہ رخ بیزار شکلوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر براجمان تھیں۔ ٹی وی ہال کے بڑے صوفے پر داجی کسی "دلن" کی طرح اور ان کے عین قدموں میں شرجیل اور فیضان مرے مرے انداز سے ان کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ جبکہ ان کے سامنے والے صوفے پر جنجوعہ ہاؤس کی خواتین تاسف بھرے انداز میں اپنے سسر کو دیکھ رہی تھیں۔

"ناں میں نے کسی سیاستدان کی طرح اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کا اعلان کر دیا ہے جو تم لوگ حکومتِ وقت کی طرح یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہو۔" داجی نے بھی ایک ادائے دلبرانہ سے ساری عوام کو دیکھا اور جیب سے تسبیح نکال لی۔

"یا اللہ رحم کر، ایسی قاتل ادائیں دنیا میں کسی کے داجی کی ہوں گی بھلا......؟" انہیں تسبیح کرتے دیکھ کر فراز تڑپ کر بولا۔ تابندہ بھی خاموشی سے سنگل صوفے پر آ کر بیٹھ گئی کسی نے بھی اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا ہاں احسن نے ضرور اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔ اسی لمحے داجی نے بھی احسن کی مسکراہٹ کو بطورِ خاص نوٹ کیا اور اپنی جگہ پر بے چین ہوئے لیکن اس وقت حالات ان کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں تھے۔

"میں پوچھتی ہوں ابائی (اباجی) آپ کو بھلا سینما ہاؤس جانے کی ضرورت کیا تھی......؟" شکیلہ بیگم نے قدرے محتاط انداز میں اپنے سسر کو دیکھا جو آنکھیں بند کیے کسی پہنچے ہوئے درویش کی طرح بیٹھے تسبیح کر رہے تھے۔

"میری ضرورت کو چھوڑو، ذرا اپنی نالائق اولاد سے پوچھو یہ وہاں کون سا چلّہ کاٹنے گئے تھے......" داجی نے آنکھیں کھول کر بڑے جلالی انداز میں ساری عوام کو دیکھا لیکن اس وقت ان کے جلال پر بھی کو ملال نے گھیر لیا۔

"واہ جی واہ، میں کروں تو سالا کیریکٹر ڈھیلا ہے......" احسن مارے صدمے کے چھلانگ لگا کر میز سے اتر آیا۔

"تم دونوں کی تو تمہارے باپ سے ایسی چھترول کرواؤں گا کہ لگ پتا جائے گا......" داجی نے سرِعام دھمکی دی اور تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے لگے۔

"بس، بس داجی یہ امریکا کی طرح دھمکیاں نہ دیں، ہم نے ہاتھ میں پکڑا کشکول اب پھینک دیا ہے......" فراز نے خاصی لمبی بڑک ماری۔

"ہونہہ، جب انجن ہی خراب ہے تو ڈبے کیسے ٹھیک چلیں گے؟" وہ طنزیہ انداز میں فراز اور احسن کو دیکھ کر بولے کیونکہ وہ دونوں سب کزنز میں بڑے تھے۔

"آپ انجن کی فکر نہ کریں، ہمارے حالات تو پاکستان ریلوے کی طرح مخدوش ہو ہی چکے، آپ کیوں اپنی آخرت خراب کر رہے ہیں۔" فراز کون سا کسی سے کم تھا۔

"یہ فیل ہونے کے بعد تمہاری زبان زیادہ نہیں چلنے لگی......" داجی مشتعل ہوئے۔

"بہو، ذرا ان خبیثوں سے پوچھو یہ مجھے تو کہہ کر گئے تھے کہ ہم اکیڈمی جا رہے ہیں کسی پروفیسر صاحب سے ملنے......" داجی نے سخت رنجیدہ انداز میں بیٹھی شکیلہ بیگم کو اپنا ہمنوا بنانے کی ناکام کوشش کی۔

"ہاں تو آپ بھی گھر میں بیان جاری کر کے گئے تھے کہ کسی دوست کے ......" احسن نے بات ادھوری چھوڑی۔ تابندہ کو ابھی تک سارا معاملہ سمجھ نہیں آیا تھا۔

"دُر فٹے منہ تم لوگوں کا......" دادو اپنی لاٹھی گھسیٹتی ابھی ابھی کمرے میں خاصے فلمی انداز سے داخل ہوئیں تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"ستیاناس ہو، تمہارے دادے کی اتنی شوقینی کا............" دادو نے اندر آتے ہی زوردار لاٹھی فراز کی کمر پر رسید کی جو سامنے ہی کھڑا تھا۔

"لو میرا کیا قصور ہے............؟" فراز غصے سے اچھلا۔ "اپنے میاں پر بس نہیں چلا تو مجھ پر قاتلانہ حملہ کر دیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ میں دو جوان جہان بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں، کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو میری بہنوں کی ڈولی کو کندھا کون دے گا......" فراز نے اپنی کمر سہلاتے ہوئے بڑا جذباتی ڈیزی کٹر حملہ کیا۔

"ایک کی ڈولی کو تو میں کندھا دے دوں گا......" مہروز نے شرارتی نظروں سے اپنی چچا زاد کزن دعا کو دیکھا جو اس جملے سے بلش ہوئی تھی جبکہ سب دادو کی طرف متوجہ تھے۔

جبکہ دادو کو دیکھ کر داجی کے تسبیح چلاتے ہاتھوں میں تیزی آ گئی اور ان کے قدموں میں بیٹھے شرجیل اور فیضان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں پتا تھا کہ دادو کو منہ سے باتیں کرنے کا کم اور اپنی لاٹھی چلانے کا زیادہ شوق تھا۔

"وے جا وے جا، زیادہ بڑکیں نہ مار، وڈا آیا ڈولی کو کندھے دینے والا، خود بانس کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتا پھرتا ہے اور باتیں دیکھو دس، دس من کی کر رہا ہے۔" دادی نے خالصتاً لاہوری اسٹائل میں فراز کو کھری، کھری سنائیں تو تابندہ نے دلچسپی سے سفید بالوں اور پوپلے سے منہ والی دادی کو دیکھا جن کے ساتھ اس کا پہلی دفعہ سامنا ہوا تھا۔

تابندہ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر احسن نے وکٹری کا نشان اسے دکھایا تو وہ فوراً خفت زدہ انداز سے دائیں بائیں دیکھنے لگی وہ تو شکر تھا کہ سب دادو کے اس ہنگامی چھاپے پر بوکھلائے ہوئے تھے۔

"ناں کرامت اللہ، یہ مسٹنڈوں والی حرکتیں کب چھوڑے گا، قبر میں تیرے پاؤں ہیں اور حرکتیں تیری کالجیوں (کالج میں پڑھنے والوں) والی ہیں۔ کیوں اس عمر ے اپنے اور میرے چٹّے چاٹے میں کھے ڈلواتا ہے......" دادو کی توپوں کا رخ ان کی طرف مڑتا دیکھ کر سب نے سکون کی سانس لی لیکن یہ

سکون عارضی تھا۔

''لو میں نے کیا، کیا ہے......؟'' داجی صاف مکرے۔ ''میں تو ان خبیثوں کا پیچھا کرتے ہوئے سینما گیا تھا......'' ان کی بات پر احسن اور فراز نے سخت صدمے سے انہیں دیکھا۔

''ہاں دادی، ان کو پیچھا کرنے کی اتنی چاہ تھا کہ یہ ہم سے پہلے ہی سینما ہاوس میں پہنچ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے......'' احسن نے طنزیہ انداز میں داجی کی طرف دیکھا جو اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے بوکھلا گئے۔

''دیکھ کرامت اللہ مجھے تیرا نہ پتا ہو تو چلو میں تیری گھسی پٹی کہانی پر اعتبار کرلوں، تیری فلم بینی کی عادت جب فراز کے باپ میں آئی تھی تو تب تجھے مرچیں لگتی تھیں۔ کچھ حیا کو ہاتھ مار اور ان جوان ہوتے بچوں کا کچھ سوچ، ان کا بھی کوئی ''سیاپا'' کرنا ہے کہ نہیں......'' داجی نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی فضا میں لہرائی۔

''واہ دادو نے اتنی خوب صورت بات کتنی بدصورتی سے کی ہے یار، قسم سے دل ہی توڑ دیا......'' فراز صدمے سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''چل وڈے سیاپے تو وی بلے جا......'' فراز نے احسن کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔

''تو لفظوں پر نہ جا، یہ سوچ کہ ہم خواہ مخواہ دادو سے بدگمان ہوتے رہے لیکن اس گھر میں واحد خاتون ہیں جن کو ہمارا خیال ہے، ورنہ ہماری ماؤں نے تو بے حسی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔'' احسن نے بلند آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے اپنے جگری یار کو تسلی دی۔

''یار دادو آخر اپنا یہ حسین جوڑا پہن کر ہیڈ کوارٹر سے نکلی کس ارادے سے ہیں......'' مہروز بھی ان کے قریب آن بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تجسس ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ جبکہ تینوں خواتین بیزاری سے پہلو بدل رہی تھیں ان کو معلوم تھا کہ جب بھی وہ اپنا چکن بریزے کا یہ سوٹ پہن کر نکلتی تھیں تو کوئی نہ کوئی دھماکا ضرور کرتی تھیں۔

''آپ نے کچھ سوچا بیگم صاحبہ ان سیاپوں کا......'' داجی نے بڑی مہارت سے بات کا رخ بدلتے ہوئے اپنے پوتوں کو طنزیہ انداز سے دیکھا۔

''ہک ہا...... میں بڈھی جان کہاں، کہاں متھا دوں۔'' دادو نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''میں تو کہتی ہوں کہ رضوان کے ساتھ مہروز کو بھی ایک ہی قسط میں نبیڑ دو......'' دادو کی بات پر کمرے میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آ ہی گیا۔

''بیگم صاحبہ پہلے اپنی گنتی ٹھیک کرلیں آپ کا حساب کتاب خاصا خراب ہے۔'' داجی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''یہ اوپر والے گستاخ شہزادے آپ کو نظر نہیں آئے جو درمیان والی پود پر حملہ کردیا ہے۔'' داجی نے کینہ توز نگاہوں سے احسن اور فراز کی طرف اشارہ کیا۔ جو خود بھی اس ناانصافی پر سخت صدمے کا شکار تھے۔ جبکہ مہروز کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ دادو بس ایسے ہی اپنے فیصلے سنا کر مارشل لا نافذ کر دیتی تھیں۔ مہروز اور دعا دونوں خوفزدہ نگاہوں سے دادو کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یار یہ دادی کو گنتی دوبارہ یاد کرواؤ، ہمیشہ الٹی گنتی ہی اسٹارٹ کرتی ہیں۔ مہروز اور رضوان کے بڑے بھائی نے کون سا دادو کی بھینس چوری کر رکھی ہے......'' احسن رنجیدگی کے عالم میں اول فول بکے جا رہا تھا۔

''ان بچوں کے رشتے تو گھر میں ہی موجود ہیں کرامت اللہ، کچھ ہوش کے ناخن لو......'' دادو آہستہ، آہستہ اپنے جرنیلی موڈ میں آ رہی تھیں۔ زبیدہ بیگم اور ساجدہ بیگم نے ایک بامعنی سا اشارہ کرکے اپنی جیٹھانی شکیلہ بیگم کو اکسایا، جو سخت

بیزاری سے پہلو بدل رہی تھیں۔ ویسے بھی مہروز اور رضوان دونوں ان کے بیٹے تھے۔

''اماں برا نہ منائیے گا، میرا رضوان اور مہروز کی شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں، ایک تو رضوان کے ایم بی اے کا تیسرا اور مہروز کا آخری سمسٹر ہے۔ سب سے بڑی بات کہ جب ان دونوں سے بڑے احسن کی ابھی کہیں بات چیت طے نہیں تو میں کیوں دونوں چھوٹوں کی پہلے کردوں؟'' شکیلہ بیگم کے دو ٹوک انداز پر دادو نے سخت برہمی سے اپنی سب سے بڑی بہو کا چہرہ دیکھا۔ جو اس وقت پھولن دیوی کی طرح آہنی دیوار بن کر سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔

''واہ میری ماں واہ، تم جیو ہزاروں سال......'' احسن نے ایک ہلکا سا نعرہ بلند کرتے ہوئے محبت پاش نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا۔

''یہ کس کتاب میں لکھا ہے، چھوٹوں کی شادی پہلے نہیں ہوسکتی......؟'' دادو کا لہجہ غضب ناک ہوا۔

''اسی کتاب میں لکھا ہے، جہاں یہ تحریر ہے اپنی سب سے بڑی اولاد کی شادی سب سے آخر میں کرنی چاہیے۔'' شکیلہ بیگم کی بات پر دادو بھڑک اٹھیں۔

''جب ابرار کو اعتراض نہیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے......؟''

''شادی ابرار کی نہیں میرے بیٹوں کی ہے......'' شکیلہ بیگم کھل کر میدان میں اتریں۔ ویسے بھی وہ تین جوان بیٹوں کی ماں تھیں کیوں دب کر رہتیں۔

''کیوں، تم بیٹے جہیز میں لے کر آئی تھیں کیا......؟'' دادو نے لاٹھی کارپٹ پر مار کر غصے سے حاضرین کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''میں ''جہیز'' میں نہیں لائی تو ابرار بھی بیٹے ''بری'' میں نہیں لے کر آئے تھے......'' شکیلہ بیگم کا وار خاصا جاندار تھا۔ داجی نے توصیفی نظروں سے اپنی جی دار بہو کو دیکھا جو اُن کی بیگم کا ٹھیک توڑ ثابت ہوئی تھیں۔ دعا کا چہرہ فق ہوا تو وہ غیر ارادی طور پر تابندہ کے پاس آن بیٹھی۔ سارے ہی کمرے کا ماحول ایک دم سرد ہوگیا۔

''بہو، مجھے تم سے بات نہیں کرنی، میں اب ڈائریکٹ ابرار سے ہی بات کروں گی۔'' دادو لاٹھی کو زمین پر ٹکا کر حتمی لہجے میں بولیں۔

''آپ بہت شوق سے بات کریں، رضوان کی بات تو آپ نے اپنی مرضی سے طے کردی، مہروز اور احسن کے معاملے میں مجھ سے کوئی امید مت رکھیے گا......'' شکیلہ بیگم نے آج بہادری کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

اپنی سب سے بڑی بہو کو پہلی دفعہ باغی لہجے میں بولتے دیکھ کر ایک دفعہ تو دادی کو بھی سوواٹ کا چھوٹا سا جھٹکا لگا تھا۔ جبکہ شکیلہ بیگم پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے واک آؤٹ کرچکی تھیں۔ ان کی دیورانیوں نے سخت خوفزدہ نظروں سے اپنی ساس کا انار کی طرح ہوتا سرخ چہرہ دیکھا، وہ لاٹھی لہراتی ہوئی بالکل سلطان راہی کے اسٹائل میں اٹھیں۔ ان کو دروازے کی طرف آتا دیکھ کر وہاں کھڑا فراز اچھل کر صوفے کے پیچھے جا کھڑا ہوا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ غصے کے عالم میں لاٹھی کا حملہ جان لیوا ہی ثابت ہوگا۔

☆☆☆

''بھئی آج سے کئی سال پہلے اسلام آباد گئی تھی میں ابائی (اباجی) کے ساتھ۔'' بڑی پھپو جو آج بطورِ خاص اس سے ملنے آئی تھیں، خاصے روکھے سے انداز میں بولیں۔ ان کی نک چڑھی عروج بھی ساتھ تھی جس نے بالوں میں سرخ رنگ کی اسٹریکنگ کروا رکھی تھی۔ اس وقت بیزاری سے کسی فیشن میگزین میں سر دیے بیٹھی تھی۔

''لیکن سچ پوچھو تمہارے گھر جا کر کوئی مزہ نہیں آیا......'' کرخت چہرے والی پھپو نے منہ پھاڑ کر کہا تو تابندہ ہکا بکا رہ گئی۔

''پھپو، آپ کون سا جلو پارک یا چڑیا گھر گئی

تھیں، جو مزہ نہیں آیا......" احسن نے گفتگو میں ٹانگ اڑائی اور پھپو نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے تایا جان یعنی تمہارے دادا نے گھر میں دفعہ چار سو بیس نافذ کر رکھی تھی، جہاں کوئی چار بندے اکھٹے بیٹھے دیکھتے تھے۔ ان کو ہول اٹھنے لگتے تھے......" انہوں نے برا سا منہ بنا کر کافی پہلے کا واقعہ یاد کیا۔ (اور دفعہ بھی اپنی مرضی سے بنالی)

"میں نے تو ابائی سے گھبرا کر کہا کہ یہ کون سی سینٹرل جیل میں لے آئے ہیں مجھے......" وہ منہ پھاڑ کر ہنسیں تو سامنے لیپ ٹاپ پر کام کرتے احسن نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"حالانکہ پھپو آپ تو بالکل ٹھیک جگہ پہنچی تھیں۔" اس کے طنزیہ انداز پر پاس بیٹھے فراز نے بہ مشکل اپنا قہقہہ دبایا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" بڑی پھپو نے کڑے تیوروں سے اپنے بھتیجوں کو دیکھا جن کی زبان درازی ان کو زہر لگتی تھی۔

"میرا مطلب ہے، تابندہ کی ماما تو خاصی خوش مزاج سی ہیں..... آپ کو مزہ کیوں نہیں آیا۔" احسن کی خود ساختہ معصومیت کم از کم تابندہ کو سخت حیران کرتی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا ہے......؟" انہوں نے ابرو چڑھا کر طنزیہ انداز سے دیکھا۔

"میں پچھلے سال گیا تھا داجی کے ساتھ......" اس کی بات پر تابندہ چونکی...... "محترمہ آپ کسی ٹرپ کے ساتھ مری گئی ہوئی تھیں......" احسن نے اس کے آنکھیں پھیلانے پر وضاحت کی۔

"ہاں، ماں تو اس کی اچھی ہے لیکن سسر نے خوب دبا کر رکھا ہوا ہے، ساس کی کمی بھی وہ ہی پوری کردیتے ہوں گے۔" وہ ٹھٹھا لگا کر ہنسیں۔

"ظاہر ہے تایا کس کے ہیں......" فراز منہ میں ہی بڑبڑایا تھا یہ تو خیریت رہی کہ پھپو اور ان کی نازک مزاج بیٹی کی سماعتوں تک اس کا جملہ نہیں پہنچا تھا، ورنہ یہاں اچھا خاصا دنگل لگ جاتا۔

"تمہارے بھائی کیا کرتے ہیں......؟" پھپو نے تابندہ کی خاموشی سے اکتا کر یونہی پوچھا۔

"جی ایک بھائی نے سی اے کیا ہے۔ اسٹیٹ بینک میں جاب ہے اس کی، دوسرا آرمی میں میجر ہے اور تیسرا اسپشلائزیشن کرنے آسٹریلیا گیا ہوا ہے۔" تابندہ کی بات پر پھپو اور عروج دونوں کو ہی جھٹکا لگا۔ ان کے چہرے کے تاثرات گرگٹ کی طرح بدلے۔

"شادیاں، وادیاں ہوگئی ان کی......؟" پھپو فرطِ اشتیاق سے تھوڑا سا آگے کو جھک آئیں۔

"نہیں، ابھی تو نہیں، ماما لڑکیاں دیکھ رہی ہیں آج کل......" تابندہ کی اطلاع پر دونوں خواتین کے چہروں سے چھلکنے والی مسرت بڑی فطری سی تھی۔

"اُف، محترمہ نے کام کی بات تو اب کی ہے......" فراز اور احسن اپنا کام چھوڑ کر پھپو اور ان کی لاڈلی کو پینترا بدلتے دیکھ رہے تھے۔

"اے بیٹا، پورے دس دن ہوگئے ہیں تمہیں یہاں آئے ہوئے، ایک دفعہ بھی دل نہ چاہا کہ پھپی اور بوڑھی دادی سے مل آؤں، بس آج رات کا کھانا تم نے ہماری طرف ہی کھانا ہے۔" پھپو کے محبت سے لبریز لہجے پر تابندہ ہکا بکا رہ گئی جبکہ عروج بھی بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اب اس سے محوِ گفتگو تھی۔

"میں اکیلے کیسے ان کی طرف جاؤں، میں تو کبھی ان کے گھر نہیں گئی۔" شام سات بجے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ ماہ رخ اپنے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھی جبکہ دعا اور انعم نے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا تھا۔

"بھئی اب کوئی تو چلا جائے تابندہ کے ساتھ۔" زبیدہ بیگم نے اس کے ہراساں چہرے کو دیکھ کر ہمدردی سے کہا۔

"کیوں، وہ کون سا کوئی بھوت بنگلا ہے جہاں ڈاکٹرنی صاحبہ اکیلے نہیں جاسکتیں......" مہروز نے کچن سے جھانکتے ہوئے لقمہ دیا۔

"کسی بھوت بنگلے سے کم بھی نہیں ہے......" دعا نے بیزاری سے منہ کھول کر جمائی لی۔

"ایسا کرو، دعا بیٹا تم چلی جاؤ بہن کے ساتھ......" زبیدہ بیگم کی بات پر دعا کو جھٹکا لگا اور ساری سستی بھک کرکے اڑ گئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں امی......" وہ تڑپ کر بولی۔ "یاد نہیں، پھپو بطورِ خاص میری طرف منہ کرکے کہہ کر گئی تھیں کہ رات تابندہ کا ڈنر ہماری طرف ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہی ہوا ناں کہ باقی لوگ سکون کریں اور منہ اٹھا کر آنے کی زحمت نہ کریں۔" دعا کو شدید غصہ آیا۔

"چلو انہوں نے تمہاری طرف منہ کرکے کہا تھا تم دادو اور عروج کی طرف منہ کرکے بیٹھ جانا، پھپو کی طرف متھا ہی نہ کرنا......" احسن نے کچن میں کھڑے، کھڑے گفتگو میں حصہ لیا۔

"ان کو متھا دینا ویسے بھی آپ کا ہی کام ہے، میرے جیسوں کی تو وہ چٹنی بنا کر کھا جائیں......" دعا کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"جانے دو بیٹا، اب ایسی بھی کوئی ایمرجنسی نہیں نافذ کر رکھی انہوں نے......" زبیدہ بیگم نے سلائی بکس سے فراز کی شرٹ پر لگانے کے لیے بٹن ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ اس لیے بڑے مطمئن انداز سے اپنی بیٹی کے تپتے رخساروں پر نگاہ ڈالی۔

"لو ایک آدھ بندے کے جانے سے وہاں کیا فرق پڑے گا......" فراز بھی چپل گھسیٹتا ہوا وہاں آن پہنچا۔

"اگر اس ایک آدھ بندے کا نام دعا ہو تو بہت فرق پڑتا ہے۔" دعا کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ "ویسے بھی میری کہاں بنتی ہے پھپو کی بیٹیوں کے ساتھ اور پھپو کا بس نہیں چلتا کہ مجھے مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دیں۔" دعا ان سب سے ضرورت سے زیادہ بدگمان تھی۔

"ویسے بات تو دعا تم نے سولہ آنے درست کی ہے لیکن ذرا سوچو کہ تم مکھی بن کر کتنی عجیب لگو گی......" مہروز جو کچن میں احسن کے ساتھ کافی بناتے ہوئے اس بحث کو سن رہا تھا۔ اس کی شرارت پر دعا کے چہرے پر پھیلنے والے انوکھے رنگ اتنے دلکش تھے کہ سخت پریشانی میں بھی تابندہ ان کا نوٹس لینے پر مجبور ہوگئی۔

"ہاں، اور ساتھ میں تمہیں "مکھا" بنا کر چپکا دیا جائے تو یقین مانو دیوار بھی صدمے سے گر پڑے گی۔" احسن نے بھی پیچھے سے حملہ کیا۔

"مجھے بتائیں ناں کہ میں کیا کروں......؟" تابندہ نے وال کلاک پر آٹھ کے ہندسے کو عبور کرتی گھڑی کو سخت پریشانی سے دیکھا۔ وہ سب تو حسبِ عادت اپنی ہی نوک جھوک میں مصروف ہوگئے تھے۔ مہروز کو تابندہ کے چہرے پر پھیلی پریشانی کا احساس ہوا۔

"بھئی یہ کون سا مسئلہ کشمیر ہے جو سلجھایا نہیں جا رہا۔ انعم کدھر ہے، اسے ساتھ لے جائیں ناں۔" مہروز نے اپنی طرف سے معاملہ حل کرنے کی کوشش کی۔

"اسے سخت زکام ہو رہا ہے......" دعا نے اطلاع دی۔ "پھپو کی بیٹیوں کا تو پتا ہے ناں کہ کتنی نازک مزاج ہیں، انہیں ہر وقت یہی وہم رہتا ہے کہ جراثیموں کی فوج ان کے تعاقب میں ہے......" دعا نے بیزاری سے مزید وضاحت کی تو وہ سب مسکرادیے۔

"چچی آپ چلی جائیں ناں......" مہروز نے چچی کو دیکھا جو اپنے دانتوں کے ساتھ بڑی مہارت سے دھاگا کاٹ رہی تھیں۔

"توبہ کرو......" انہوں نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "وہاں ساسو ماں کا مزاج سوا نیزے پر ہے، ان کو لگتا ہے، میں شکیلہ بھابی کو سب کے خلاف بھڑکاتی

ہوں۔ اس رشتے سے انکار والے واقعے کے بعد سے وہ غبارے کی طرح منہ پھلائے پھر رہی ہیں۔"

"لو سارا مسئلہ ہی حل، یہ جس سوئی سے آپ بٹن لگا رہی ہیں اسی کو مار کر ان کے غبارے کی ہوا نکال دیں۔" فراز کے مفت مشورے پر انہوں نے گھور کر اسے دیکھا جو مہروز کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہا تھا۔

"ویسے چچی، آپس کی بات ہے......" احسن کافی کا کپ میز پر رکھ کر تھوڑا سا جھکا۔ "دادو کا خیال کچھ ایسا بھی غلط نہیں، میری بھولی بھالی ماں کو آپ ہی پیچھے سے پمپ کرتی ہیں۔" احسن کی شرارت پر وہ بے ساختہ ہنسیں۔

"شکر کرو کہ تمہاری ماں نے ظالم حکمرانوں کے آگے کلمۂ حق بلند کر دیا، ورنہ تم سے چھوٹے دونوں کی شادیاں ہو رہی ہوتیں اور تم ان کے تنبو اور قناتوں کا حساب کرتے رہ جاتے۔" بات کا رخ اور طرف نکلتے دیکھ کر تابندہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آنٹی بتائیں ناں، میں کیا کروں، میرا بالکل بھی اکیلے جانے کو دل نہیں کر رہا......" تابندہ کے روہانسی انداز پر سبھی چونکے۔

"ابھی تو پہلی دعوت ہے محترمہ، آپ نے شام میں ان کو اپنے گھر کا جو چیلنج بتایا ہے۔ پھپھو کو اپنا ٹارگٹ پورا کرنے کے لیے صبح شام آپ کے لیے کوئی لنگر بھی چلانا پڑا تو چلائیں گی۔" احسن کے معنی خیز انداز پر تابندہ نے حیرانی سے سب کے ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھا۔

"کون سا چیلنج......؟"

"محترمہ آپ کے تین عدد، پڑھے لکھے، ویل سیٹلڈ، کنوارے بھائیوں کا پرکشش پیکج، جس کے منظرِ عام پر آتے ہی اس ہنگامی ڈنر کا انعقاد کیا گیا ہے۔" احسن خاصا منہ پھٹ سا تھا لیکن اس کی یہ بات تو اسے بہت عجیب لگی۔

"مجھے آپ کی بات کی سمجھ نہیں آئی......؟"

اس کی سنجیدگی پر زبیدہ بیگم نے ایک تنبیہی سا ہنکارا بھر کر احسن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن احسن کی زبان کے آگے تو خندق تھی۔

"جب آپ کو جی ایچ کیو میں چار عدد فیشن کی دلدادہ کنواری لڑکیاں نظر آئیں گی تو ساری بات خود ہی سمجھ میں آ جائے گی۔" احسن نے اپنی بات کی وضاحت کر کے حیرت سے میز کی طرف دیکھا اس کی کافی کا مگ فراز کے لبوں سے لگا ہوا تھا۔

"چلیں آپ یہ مفکرِ پاکستان کی طرح سوچنے والا پوز کل بنا لیجیے گا......" احسن کی بات پر اس نے کنپٹی سے اپنی انگلی ہٹائی اور حیرت سے اسے دیکھا۔ "اب کوئی اور تو نہیں جا رہا تو چلو میں ہی آپ کے ساتھ دادو کا دیسی ککڑ اڑا آتا ہوں، ویسے تو ان کے گھر کی کوئی چیز مجھے ہضم نہیں ہوتی لیکن آپ کی خاطر گھر آ کر اسپغول کا چھلکا پی لوں گا۔" احسن کی اداکاری عروج پر تھی لیکن وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یار آتے، آتے ایک جھانکی "اُدھر" بھی مار آنا اور دیکھ لینا کہ جان ریمبو نے کچھ جان وان بنا لی ہے یا نہیں......؟" فراز کے لہجے میں چھپی شرارت کو احسن نے ایک لمحے میں بھانپا تھا۔ جبکہ تابندہ کو ان کی "خفیہ" باتیں کم ہی سمجھ میں آتی تھیں۔

"بھئی آج تو ساری فوجیں وہاں دسترخوان پر اکٹھی ہوں گی اور حالات بھی خاصے سازگار ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ وقت ضائع نہ ہی کیا جائے۔" احسن نے جاتے، جاتے فراز کو کوئی ہدایات جاری کیں۔ اس کے اشارے پر فراز اور مہروز کا چہرہ کسی ٹیوب لائٹ کی طرح چمکنے لگا۔

"آپ لوگ بہت عجیب باتیں کرتے ہیں......" لان سے گزرتے ہوئے تابندہ کی سنجیدگی پر احسن ٹھٹکا۔ وہ دونوں پھپھو کی طرف جا رہے تھے۔

"ہماری باتیں عجیب نہیں ہیں، اصل میں آپ کو سمجھ نہیں آتیں......" احسن نے ہنستے ہوئے وضاحت دی۔

"ہاں ہو سکتا ہے کیونکہ آپ لوگ شروع سے اکٹھے رہتے آئے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ کیمسٹری بھی میچ کرتی ہے۔ اس لیے فوراً ایک دوسرے کے آنکھ کے اشاروں کو بھی سمجھتے ہیں۔" تابندہ نے کھلے دل سے اس بات کو تسلیم کیا۔

"جب آپ بھی یہاں کچھ عرصہ رہیں گی تو آپ کو بھی ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں گی......" احسن نے سڑک پار کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "ویسے ایک بات تو بتائیں، آپ کو ہمارا گھر کیسا لگا......؟"

"بہت اچھا، بہت فرینڈلی اور مزے کا ماحول ہے......" تابندہ نے سادگی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، اگر آپ کو مستقبل میں یہاں رہنا پڑے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا......" احسن چلتے، چلتے رکا اور معنی خیز لہجے میں بولا تو تابندہ کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا......؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنی۔

"بھئی داجی کا خیال ہے، جنجوعہ ہاؤس میں ایک عدد ڈاکٹر کی سخت ضرورت ہے، میں نے سوچا چلو یہ قربانی میں ہی دے دیتا ہوں۔" احسن نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مسکراتے ہوئے کہا تو تابندہ کے گال سرخ ہوئے۔ وہ دانستہ خاموش رہی جبکہ دل کی دھڑکنوں میں عجیب سا ارتعاش برپا تھا۔ وہ لوگ دو تین منٹ کے بعد پھپھو کے لان میں تھے۔

"ابھی جس جان ریمبو کا فراز ذکر کر رہا تھا اس کا آستانہ وہ ہے......" احسن نے ہاتھ کے اشارے سے سرونٹ کوارٹر کے پاس بنے مرغیوں کے بڑے سارے ڈربے کی طرف اشارہ کیا تو تابندہ نے خوشگوار حیرت سے اس طرف دیکھا۔



غزل

سب ادھورے سے خواب چھوڑ آئے
اپنے پیچھے سراب چھوڑ آئے
اس کی چوکھٹ پہ آج آتے ہوئے
زندگی کی کتاب چھوڑ آئے
درد جب حد سے بڑھ گیا تو پھر
جسم و جاں کے عذاب چھوڑ آئے
باتوں ، باتوں میں یاد کچھ نہ رہا
دلِ خانہ خراب چھوڑ آئے
آج کمرے میں اس کے بستر پر
ایک تازہ گلاب چھوڑ آئے
منزلِ عشق و معرفت مت پوچھو
سب گناہ و ثواب چھوڑ آئے
اک وفا کے سوال پر سیما
اس کو ہم لاجواب چھوڑ آئے

شاعرہ: پروفیسر سیما سراج
پرنسپل، عثمانیہ گرلز کالج

''اس آستانے میں دادو بطورِ خاص سرگودھا اور سیالکوٹ سے دیسی ککڑ منگوا کر رکھتی ہیں۔ ویسے تو انہیں بٹیروں سے بھی خاصا شغف ہے لیکن جو عقیدت اور محبت انہیں مرغیوں سے ہے۔ اس کا نصف بھی داجی سے ہو جائے تو یقین مانیں داجی کا بڑھاپا سنور جائے۔'' احسن کی غیر سنجیدگی پر اسے ہنسی آ گئی۔

جبکہ ان دونوں کو اکٹھے آتا دیکھ کر پھپو کے چہرے پر آنے والی ناگواری کی تہ ان کے ڈھیروں میک اپ کے باوجود صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''شکر ہے احسن نے بھی ہمارے گھر آنے کی قسم توڑی......'' انہوں نے مسکرانے کی کوشش میں اپنے جبڑوں کو زبردستی پھیلایا جبکہ ان کی چاروں بیٹیاں شاید کسی پارلر والی کے عیش کروا کر آئی تھیں۔

''یار تم لوگوں کو گرمی نہیں لگتی......'' احسن نے معصومیت سے ان چاروں کو دیکھا جو تابندہ سے مصنوعی محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس کی بات پر چاروں نے چونک کر اپنی کاجل سے لبریز آنکھوں کو پھیلایا تو ایک لمحے کو تو احسن بھی ڈر گیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' تیسرے نمبر والی عانیہ جل کر بولی۔

''بھئی یہ جو تین، تین انچ کی تم لوگوں نے چہروں پر بیس چڑھا رکھی ہے۔ کیا کہیں سے مفت میں فاؤنڈیشن کا ٹب مل گیا تھا۔'' احسن نے صوفہ سنبھالتے ہی فراز کو ٹیکسٹ کیا کہ ڈائننگ میز پر دعوتِ شیراز کا اہتمام ہو چکا ہے۔

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' عروج نے سب سے بڑی بہن ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے احسن کو گھور کر دیکھا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا اسیل فون گڑبڑا کر جیب میں ڈال لیا۔

''بھئی، میرا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کی اسکن ہی اتنی فریش، بے داغ اور تروتازہ ہے کہ تمہیں کسی مصنوعی ہتھیار کی ضرورت نہیں......'' احسن نے حتی الامکان اپنے لہجے کو خوشگوار رکھا۔

''ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے مصنوعی ہتھیاروں کی۔'' عروج کے صاف جھوٹ پر اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اک لمبی سانس لی۔

''یا اللہ خیر، اس جھوٹ پر کوئی چھوٹا موٹا زلزلہ ہی نہ آ جائے......'' اندر داخل ہوتے فراز کی بڑبڑاہٹ احسن کے ساتھ، ساتھ تابندہ کی سماعتوں تک بھی پہنچی جبکہ وہ سخت حیرت سے ان کی آمد و رفت کو دیکھ رہی تھی۔

''بھئی دادو، آپ مجھے بہت یاد آ رہی تھیں، میں نے سوچا کہ آج تو کھانا میں اپنی سویٹ دادو کے ساتھ ہی کھاؤں گا......'' فراز نے پھپو کے ساتھ اندر داخل ہوتی دادو کو دیکھتے ہی جذباتی حملہ کیا۔

''ارے جانے دو، سیاستی ماں کی اولاد ہو، ساری منہ دیکھے کی محبتیں ہیں......'' دادو نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ان کا مزاج خاصا بگڑا ہوا تھا جبکہ احسن کے ساتھ فراز کی آمد پر پھپو کی پیشانی کے بلوں کی تعداد میں ایک دم ہی اضافہ ہوا تھا۔

''میں تو انتہائی محبت کرنے والی دادو کا پوتا ہوں اور یہ ہی میرا آئندہ انتخابات میں منشور ہوگا......'' فراز کی انتہائی بے تکی بات پر احسن نے کان میں انگلی پھیر کر ٹیڑھی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سے مہروز آ رہا تھا۔

''بھئی داجی کا حکم ہے کہ وہ رات کے کھانے پر بچی کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ وہ ایک انگریزی فلم دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے ان کا کھانا ٹرے میں لگا کر دے دیا جائے......'' مہروز کی اطلاع پر دادو نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں تو اس فلمی بابے کو کھانے پر انوائٹ کس نے کیا تھا......؟'' دادو نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔

''جی، میں نے کیا تھا......'' فراز نے گردن

جھکا کر کہا۔ ''میں سمجھا کہ آپ تابندہ کے ساتھ ان کو بلانا بھول گئی ہیں......'' فراز کی اطلاع پر دادو کے ساتھ ساتھ پھپو کے چہرے پر بھی برہمی چھلکی لیکن تابندہ کی موجودگی میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کرنے سے قاصر تھیں۔ اس لیے داجی کے لیے کھانا لینے وہ بادلِ ناخواستہ کچن کی طرف چل دیں۔ جبکہ احسن اور فراز وہیں جم کر بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد فیضان اور شرجیل بھی خراماں خراماں چلے آئے۔ پھپو کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہو گیا تھا۔

''احسن بھائی، آپ لوگوں کو دیکھ کر تو لگتا ہے کہ انجینئرنگ بس ''ویلے'' اور ''فارغ'' لوگوں کا ہی کام ہے۔'' پھپو کی دوسرے نمبر والی بیٹی رشنا نے اپنی طرف سے خاصا بڑا وار کیا تھا۔ وہ دونوں جو سب سے پہلے ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ اس کے کمنٹس پر مسکرائے۔

''اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں بہنا، ویلے اور فارغ لوگوں کو اکثر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے......'' فراز نے اسی کا وار اسی پر پلٹ دیا، جس کی وجہ سے اس کے منہ کے زاویے بڑی تیزی سے بگڑے۔ شرجیل اور فیضان بڑے عجلت بھرے انداز میں کھانا شروع کر چکے تھے۔

''بیٹا، اپنی امی سے بھی کہو ناں، کبھی چکر لگائیں لاہور کا......'' پھپو کے لہجے سے ٹپکنے والی مصنوعی محبت پر فراز کے گلے میں پھندا لگا۔ اس نے بڑا ذومعنی قسم کا احسن کو اشارہ کیا۔ جو اس وقت روسٹ کے ساتھ بھرپور انصاف کرنے میں مصروف تھا۔ کھانا بڑے بے تکلف ماحول میں کھایا گیا۔ شرجیل اور فیضان تو فوراً ہی کھسک گئے۔

وہ احسن اور مہروز کے ساتھ گھر واپس پہنچی تو سامنے ہی لاؤنج میں شرجیل اور فیضان دونوں داجی کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھے۔ جبکہ سامنے سلطان راہی کی کوئی پرانی فلم چل رہی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر داجی چونکے۔

''رات کو سونے سے پہلے کارمینا یا کوئی چورن کھا لینا، تمہاری پھپتی کا بنایا ہوا کھانا، کسی کسی کو ہی ہضم ہوتا ہے۔'' داجی نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر سب کو ہی کہا تھا۔ سامنے ہی اسکرین پر سلطان راہی مرحوم، انجمن کے ساتھ کسی کھیت کو اجاڑنے میں مصروف تھے۔

''داجی شرم کریں، ہماری پھپتی، آپ کی سگی بیٹی لگتی ہیں......'' شرجیل نے منہ بنا کر انہیں یاد دلایا۔

''تو میں نے کب انکار کیا، جب سگی اولاد کو باپ کو کھانے پر بلانا یاد نہ رہے تو پھر ایسے ہی بیانات سامنے آتے ہیں۔'' داجی نے کھل کر ناراضی کا اظہار کیا۔

''آپ کا کھانا لے کر تو آیا تھا مہروز......'' احسن کے منہ سے نکلنے والی بات پر داجی اچھلے۔

''وہ کھانا میرے لیے تھا کیا......؟'' ان کے غضب ناک لہجے پر احسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن تب تک تیر کمان سے نکل کر داجی کے سینے میں لگ چکا تھا۔

''وہ مسٹنڈا، تو میرے سامنے بیٹھ کر کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا، پھپتی نے یہ ٹرے خالصتاً اس کے لیے بھجوائی ہے......'' داجی کی بات پر چاروں ہی بوکھلا گئے۔ تابندہ کو پتا تھا اب یہاں ایک لمبی عدالت لگے گی، اس لیے وہ نظر بچاتے ہی کھسک گئی۔

☆☆☆

''اللہ کرے برباد ہو جائے وہ گھٹیا انسان، اس کی داڑھ میں کیڑا لگے......'' دادو صبح، صبح ہی لاٹھی لہراتی ہوئی ناشتے کی میز پر پہنچیں تو سارے ہی لڑکے گڑبڑا سے گئے۔

''اماں، کیا ہوا......؟'' شکیلہ بیگم نے گھبرا کر اپنی سیٹ ساس کے لیے خالی کی لیکن آج کل وہ اپنی ساس کی سب سے ناپسندیدہ بہو تھیں، اس لیے انہوں نے لاٹھی فراز کی کمر پر مار کر اسے سیٹ خالی

کرنے کا اشارہ کیا۔
"دادو، لاٹھی کی زبان میں بات مت کیا کریں، نازک سی میری کمر ہے....." فراز نے دہائی دی۔
"ایسے ہی تو ہم اسے "تیلا" نہیں کہتے....."
احسن شرارت سے بڑبڑایا۔تابندہ نے حیرت سے دادی کو دیکھا۔
"زوجہ محترمہ، ہوا کیا ہے آخر، کچھ پتا تو چلے....." اسی افراتفری میں داجی نے اپنی ڈبل روٹی پر جیم لگا لیا تھا۔شوگر کی وجہ سے ان کی بہویں چیک اینڈ بیلنس کا نظام خاصا سخت رکھتی تھیں۔اس وقت سب کی توجہ دادو کی طرف تھی۔
"ہائے ہائے، میرا شیر جوان، مستانہ ککڑ رات سے غائب ہے، اللہ جانے کس مردود نے اغوا کر لیا....." دادو نے رنجیدہ لہجے میں اطلاع دی تو بھی لڑکوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"کیا.....وہ جان ریمبو.....؟" احسن نے مصنوعی صدمے سے کہا۔
"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا....." مہروز کی شوخی اس دفعہ تابندہ کو فوراً ہی سمجھ آئی۔ان سب کی نظروں سے ٹپکتی شرارت سے اسے شک ہوا اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔سبھی بہویں اپنی ساس سے جان ریمبو کا افسوس کرنے میں مصروف ہوگئیں۔
"رات کو دیسی ککڑ کے تکے بنائے جائیں گے، آپ کو خصوصی دعوت ہے....." وہ اسپتال کے لیے نکل رہی تھی، جب احسن نے اس کے پاس آکر رازدارانہ انداز میں اطلاع دی۔
"اس کا مطلب ہے....." تابندہ نے حیرت سے بات ادھوری چھوڑی۔
"جی، اس کا وہی مطلب ہے جو آپ کو سمجھ آیا ہے۔" احسن کھل کر مسکرایا۔"یہ خفیہ مشن رات داجی کی سرکردگی میں سرانجام پایا تھا۔اس وقت دادو کا مرحوم مرغا اوپر والے کچن کے فریج میں آرام فرما رہا ہے۔" احسن نے اپنے بوٹ کے تسمے باندھتے ہوئے مزید اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"اوہ مائی گاڈ....." تابندہ کا اندازہ درست تھا، اس نے حیرت سے داجی کی طرف دیکھا جو اس وقت انتہائی معصوم شکل بنائے دادو کو تسلی دینے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔
"بہت تیز ہیں آپ لوگ....." تابندہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔
"اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے ہر انسان کو تیز ہی ہونا پڑتا ہے....." احسن گاڑی کے پاس پہنچ کر سنجیدگی سے بولا۔
"ویسے یہ ہے بہت غلط بات....." تابندہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔
"بھئی داجی کا بہت دل کر رہا تھا اور ان کے لیے تو ہم سب کزنز جان کی بازی لگانے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔" احسن کے لہجے میں داجی کے لیے چھپی محبت تابندہ کو اچھی لگی اور اس کا ثبوت تو اسے آنے والے چند دنوں میں ہی ہو گیا تھا، جب اگلے اتوار رات دو بجے کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ زور، زور سے بجایا۔
"داجی کی طبیعت خراب ہے، آپ کو بابا بلا رہے ہیں....." احسن کے چہرے کی سنجیدگی سے وہ پریشان ہوئی، اگلے ایک گھنٹے میں داجی پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار تھے۔ان لمحات میں تابندہ نے ان سب کے ہراساں چہروں کے پیچھے چھپی داجی کی محبت کو بڑے دل سے محسوس کیا۔اسے حقیقتاً داجی پر رشک آیا تھا۔
"وہ ٹھیک ہو جائیں گے ناں.....؟" احسن کی آنکھوں میں نمی لہرا رہی تھی۔
"انشاء اللہ....." تابندہ نے خلوصِ دل سے کہا۔
"ان کو کچھ ہوگا تو نہیں.....؟" فراز کے لہجے

میں ہزاروں اندیشے پنہاں تھے۔
"کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو...حوصلہ کریں....." تابندہ سبھی کو حوصلہ دیتی پھر رہی تھی۔داجی کی حالت خطرے سے باہر آگئی تھی اور یہ سب ان کی دعاؤں کا کرشمہ تھا۔انعم، دعا اور ماہ رخ سورۂ یٰسین پکڑے بیٹھی تھیں۔جبکہ سبھی لڑکے ان کے کمرے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ڈاکٹرز کی گھوریاں، نرسوں کی بڑبڑاہٹ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔
"ابا جی بس اٹھیں، گھر چلیں، سارا گھر ہی ویران لگ رہا ہے....." داجی کی بہویں الگ بوکھلائی ہوئی تھیں۔
"لو ایویں گھر چل پڑوں، ابھی تو خدمت کروانے کا موقع ملا ہے....." داجی کی نقاہت زدہ آواز میں اب بھی دم خم باقی تھا۔
"کرامت اللہ بڈھے ہو گئے ہو لیکن تمہارے چونچلے ختم نہیں ہو رہے....." دادو اپنے سفید چکن کے سوٹ کے ساتھ آن پہنچیں۔
"ڈاکٹرز نے بتایا ہے کہ تمہاری بدپرہیزی کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے....." انہوں نے ناگواری سے کہا۔
"جبکہ میرا خیال ہے کہ یہ سب جان ریمبو کی کارستانی ہے۔وہ ہی داجی کو ہضم نہیں ہوا....." فراز کی زبان بڑے غلط موقع پر پھسلی۔
"یہ جان ریمبو کون ہے.....؟" دادو نے اپنی زنجیر والی عینک سر سے اتار کر آنکھوں پر لگائی اور فراز کو غور سے دیکھا، جو اب بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔
"یہ منحوس ایک دفعہ پھر داجی کو ہارٹ اٹیک کروائے گا....." احسن نے شرجیل کے کان میں سرگوشی کی۔
"دادو، وہ پی ٹی وی کے ڈرامے گیسٹ ہاؤس میں جان ریمبو نہیں آتا تھا۔اس کی بات کر رہا ہے فراز!" مہروز نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
"لو اس کا یہاں بھلا کیا ذکر.....؟" دادو نے ناک چڑھائی، تابندہ نے دلچسپی سے ان چاروں کو دیکھا، جو اس وقت حواس باختہ کھڑے تھے۔
"دادو، جس رات داجی کو ہارٹ اٹیک ہوا، اس رات وہ یہی ڈراما دیکھ رہے تھے....." تابندہ نے ان سب کی مشکل آسان کی۔
"تھینکس گاڈ....." سب نے پُرسکون سانس لی اور شکر گزار نگاہوں سے تابندہ کی طرف دیکھا جو داجی کا بی پی چیک کر رہی تھی۔
"آپ بھی ان کے ڈراموں میں شامل ہو گئی ہیں۔" ماہ رخ نے مسکرا کر تابندہ کو ہلکی سی آواز میں چھیڑا۔
"صحبت کا اثر تو ہونا ہی تھا....." تابندہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔اسے یہ سب زندہ دل، شوخ مزاج لوگ بہت اچھے لگے تھے۔اس نے تو فون کر کے اپنی والدہ کو ماہ رخ کے رشتے کے لیے بھی کہہ دیا تھا، ویسے تو اسے دعا بھی پسند تھی لیکن اس کا انٹرسٹ مہروز کی طرف دیکھ کر وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

"پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا، مجھے اپنے کسی ایک بچے کو ڈاکٹر بھی بنانا چاہیے تھا....." داجی نے تابندہ کی امی کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔تابندہ کی والدہ اپنے سسر کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے اگلے دن ہی پہنچ گئی تھیں۔اس وقت اسپتال میں وہ احسن کی والدہ شکیلہ بیگم اور والد ابرار صاحب کے ساتھ موجود تھیں۔
"بھئی تابندہ بھی تو تمہاری ہی بیٹی ہے....." تابندہ کے بڑے ابا کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے نے داجی کو حیران کیا۔
"ویسے کرامت اللہ پوتے، پوتیاں تو تمہارے بڑے لائق فائق نکل آئے، مجھے اس کی

امید ذرا کم ہی تھی۔'' تابندہ کے بڑے ابا کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے کو سن کر دادو نے بے اختیار پہلو بدلا۔

''ایسی بھی کوئی بات نہیں بھائی صاحب، کیا ہوا میرے بچے زیادہ نہ پڑھ سکے لیکن پوتے پوتیوں نے تو یہ کمی پوری کردی ناں۔'' دادو اپنی لاٹھی کے زور پر کھڑی ہوئیں۔ لہجے سے جھلکتی ناگواری پر تابندہ کے دادا نے اپنی چھوٹی بھابی کو بطورِ خاص دیکھا۔ جو اَب دوبارہ بیٹھ گئی تھیں۔

''جی، جی چچی، ماشاء اللہ آپ کے سبھی پوتے پوتیاں لائق نکلے، مجھے تابندہ اکثر فون پر بتاتی ہے۔'' تابندہ کی والدہ نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ دادو، رشتے میں ان کی چچی ہی تو لگتی تھیں۔ ان کی بات پر دادو کا پارہ کچھ ڈگری نیچے آیا۔

''آپ لوگ پلیز گھر جائیں، ایسے داجی کے اردگرد جمگھٹا لگانا مناسب نہیں۔'' تابندہ نے بڑوں کی کچہری کو برخاست کرنے کے لیے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''اِدھر آؤ بھئی ڈاکٹر صاحبہ......'' داجی نے محبت بھرے انداز سے تابندہ کو بلایا۔

''جی داجی......'' اس نے فوراً فرمانبرداری سے سر جھکایا۔

''بھئی بھائی جان، بس آج آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنی ہے، اگر ناگوار نہ گزرے......'' داجی کی بات پر بڑے ابا نے چونک کر اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا، جو ہارٹ اٹیک کے بعد انہیں کچھ زیادہ ہی اپنے دل کے قریب لگ رہا تھا۔ اسی لمحے احسن بھی میڈیسن کا لفافہ ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوا تھا۔ اندر کا ماحول اسے خاصا سنجیدہ لگا تو دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

''ہاں، ہاں بولو کرامت اللہ، چپ کیوں ہو گئے......؟'' بڑے ابا کی رعب دار آواز کمرے میں گونجی۔

''دیکھیں ناں بھائی جان، میرے گھر میں ماشاء اللہ انجینئرز، بینکر، وکیل، بزنس مین سب موجود ہیں، بس ایک ڈاکٹر کی کمی ہے، وہ آپ پوری کر دیں۔'' داجی نے بڑے طریقے سے بات شروع کی۔

''یار، اب ڈاکٹر کہیں سے ملتے تو میں ضرور تمہیں خرید کر لا دیتا......'' بڑے ابا نے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

''خرید کر لانے کی کیا ضرورت ہے، اپنی تابندہ ہمیں دے دیں......'' داجی کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے سب کو حیران کیا۔

''کیا مطلب......؟'' بڑے ابا کو اتنی سیدھی سادی بات نہ جانے کیوں سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''بھئی دیکھیں ناں، میں ٹھہرا بیمار شیمار بندہ، کسی بھی لمحے گھر میں ڈاکٹر کی ضرورت پڑ سکتی ہے، ایسا کریں، آپ تابندہ بیٹی کو میرے احسن کی دلہن بنا دیں۔'' داجی کی بات پر تابندہ نے بوکھلا کر دروازے میں کھڑے احسن کو دیکھا جو داجی کو دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر ہلاشیری دے رہا تھا، وہ تو شکر تھا کہ بڑے ابا اور باقی لوگوں کی دروازے کی طرف پشت تھی، ورنہ بڑے ابا نے احسن کی دو انگلیوں کے بجائے پانچوں انگلیاں توڑ کر داجی کے ہاتھ میں پکڑا دینی تھیں۔

''واہ بھئی واہ کرامت اللہ، رشتہ بھی مانگنا نہ آیا، آج تو مجھے پکا یقین ہوگیا کہ تم واقعی بزنس مین بچوں کے باپ ہو۔ بات بھی شروع کی تو اپنے ہی فائدے کے لیے۔'' بڑے ابا نے اپنا سگار نکال کر سلگاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''بڑے ابا، اسپتال میں آپ سگار نہیں پی سکتے، پلیز بند کریں۔'' تابندہ کی ڈاکٹری کی رگ صحیح وقت پر پھڑکی تھی۔ بڑے ابا نے چونک کر سگار بجھا دیا۔

''پھر میں کیا سمجھوں......؟'' داجی نے تھوڑا جھجک کر پوچھا۔

''بھئی یہ تابندہ کی ماں بیٹھی ہے، اس سے پوچھ لو، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں......'' بڑے ابا نے ہاتھ جھاڑے۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں اباجی، آپ بڑے ہیں، بہتر سمجھتے ہیں......'' تابندہ کی والدہ نے گھبرا کر جواب دیا۔

''ویسے وہ جو اتنی بڑی لڑکوں کی بارات ہے، ان میں سے کون سے والے کی تم بات کر رہے ہو......؟'' بڑے ابا نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آپ کے پیچھے ہی کھڑا ہے نالائق......'' داجی کی بات پر احسن بوکھلایا، جس کے نتیجے میں میڈیسن کا شاپر ہاتھ سے گرا اور ساری دوا کے پتے فرش پر پھیل گئے۔

''سوری......'' احسن نے گڑبڑا کر فرش سے دوائیاں اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ تابندہ کے لیے اپنی مسکراہٹ روکنا دشوار ہوگیا۔

''اچھا تو یہ ہے تمہارا انجینئر پوتا......'' بڑے ابا نے تنقیدی نگاہوں سے احسن کا جائزہ لیا۔

''ماشاء اللہ بہت ذہین اور فرمانبردار ہے میرا بیٹا......'' شکیلہ بیگم نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا انہیں تابندہ اپنی بہو کی حیثیت سے پسند آئی ہے۔

تابندہ کی والدہ نے بھی توصیفی نگاہوں سے اس ہینڈسم سے لڑکے کو دیکھا جو اَب سر جھکائے بڑی شرافت سے داجی کی ٹانگیں بغیر کہے دبا رہا تھا۔

''ہوں...... پوتے تمہارے فرمانبردار ہیں یا میرے سامنے ہی ایکٹنگ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔'' بڑے ابا کے شانِ بے نیازی سے کہے گئے جملے پر احسن نے بے چینی سے پہلو بدلا اور داجی نے بروقت ٹانگ مار کر اپنے پوتے کو چپ رہنے کا اشارہ کیا جو اس کی سمجھ میں بھی آگیا تھا۔

''نہ صرف فرمانبردار بلکہ ذہین و فطین بھی...... ماشاء اللہ انجینئرنگ کے پہلے تین سالوں میں یونیورسٹی میں ٹاپ کرتا رہا ہے۔'' داجی نے احسن کی محبت میں کچھ لمبی ہی چھوڑ دی۔ ابرار صاحب اور تابندہ دونوں نے بوکھلا کر داجی کی طرف دیکھا۔ جبکہ بڑے ابا، تابندہ کی والدہ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بہانے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی آپ......؟ کیوں مروائیں گے......'' ابرار صاحب گھبرائے۔

''چپ رہو، اس نے کون سا یونیورسٹی سے ریکارڈ نکلوا کر چیک کرنا ہے......'' داجی نے شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔

''پھر بھی ایسے کسی سے جھوٹ بولنا مناسب نہیں......'' شکیلہ بیگم کو بھی اعتراض ہوا۔

''لو، بچی کو تو پتا ہے ناں، جب اسے کوئی اعتراض نہیں تو تم لوگوں کو کیا مسئلہ ہے۔'' داجی نے محبت بھری نظروں سے تابندہ کو دیکھا جو احسن کی شوخ نگاہوں سے بوکھلائی ہوئی تھی۔

''دیکھ لو بیٹا، سوچ لو، موقع اچھا ہے، ورنہ تمہارے کھڑوس دادے نے اپنے جیسا کوئی اور کھڑوس تمہارے لیے بھی ڈھونڈ لینا ہے۔'' داجی کی بات پر تابندہ خوفزدہ ہوئی۔ اس پوائنٹ پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ایک دم ہی اسے داجی پر پیار آیا۔ اب تو اسے جنجوعہ ہاؤس کے مکینوں کے ''کوڈز'' بھی سمجھ آنے لگے تھے، رہی بات احسن کی ''سپلی'' کی وہ بھی کلیئر ہو ہی جانی تھی۔ اس لیے اب یہ سودا اسے مہنگا نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

''ویسے ہم اتنے بھی نالائق نہیں، جتنے آپ کے ہٹلر بڑے ابا سمجھتے ہیں......'' وہ بڑی خاموشی سے تابندہ کے ساتھ اسپتال کے لان میں ایک بینچ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں ''سپلی'' تو بڑے، بڑے لائق لوگوں کی

بھی آ جاتی ہے، ہے ناں......!'' تابندہ نے اپنے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو دبا کر سنجیدگی سے کہا۔

''ویسے طعنے دینے میں آپ بھی داجی سے کم نہیں......'' احسن جل کر بولا تو وہ مسکرا دی۔

''اس کے باوجود آپ داجی کو ''دا'' لگانے سے باز نہیں آتے......''

''یہ سب تو محبت بھری شرارتیں ہیں، جو ایک محبت کرنے والا دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ یقین کریں ہمارے گھر میں آپ کو کبھی بوریت کا احساس نہیں ہوگا۔'' احسن اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''تو میں نے کب کہا، میں اس گھر میں بور ہوتی تھی......'' تابندہ مسکرائی۔

''میں نے خود اپنے گناہ گار کانوں سے سنا تھا، جب آپ ماہ رخ سے اپنی حسرتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔'' احسن کی بات پر وہ گڑبڑائی۔

''وہ تو میں اپنے اور جنجوعہ ہاؤس کے لوگوں کا موازنہ کر رہی تھی۔''

''پھر اس موازنے میں جنجوعہ ہاؤس کے مکینوں کا پلڑا بھاری نکلا ناں......!'' احسن کے لہجے میں یقین اور اعتماد کی فراوانی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں......'' وہ صاف مکری۔

''ٹھیک ہے پھر آزما لیں، ہم جیسے محبت کرنے والے بہادر لوگ آپ کو پوری دنیا میں نہیں ملیں گے۔'' احسن نے سینہ تان کر دعویٰ کیا۔

''ابے، یہ محبت اور بہادری کے دعوے بعد میں کر لینا، تابندہ کے بڑے ابا، اِدھر ہی آ رہے ہیں......'' فراز بینچ کے پیچھے سے اچانک ہی سامنے آ کر بدحواس انداز میں بولا۔

''مروا دیا تم نے......؟'' احسن خوفزدہ ہو کر اچھل کر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کہاں ہیں وہ......؟'' تابندہ بھی گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

''خبیث انسان، میں نے کہا بھی تھا دھیان رکھنا......'' احسن نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بوکھلا کر کہا۔

''کچھ شرم کرو، خود تو اس گرمی کے موسم میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کوؤں کے شور کے درمیان اظہارِ محبت کر رہے ہو اور مجھے سخت دھوپ میں نگرانی کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ اوپر سے لعن طعن بھی مجھے ہی کر رہے ہو......'' فراز نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے جل کر کہا۔

''یہ تقریر بعد میں کر لینا، یہ بتاؤ وہ ہٹلر بڑے ابا کہاں ہیں......؟'' احسن نے گھبرا کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

''وہ تو اے سی والے کمرے میں بیٹھے فالودہ کھا رہے ہیں جو میں اُن کو مصروف رکھنے کے لیے اندر دے کر آیا ہوں......'' فراز کی بات پر احسن کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

''دیکھ لی آپ نے ان کی بہادری......؟'' فراز نے قہقہہ لگا کر تابندہ سے آنکھ کے اشارے سے پوچھا تو ان دونوں کو اس کی شرارت سمجھ آ گئی تھی۔

''ارے...... بڑے ابا......'' تابندہ نے گھبرا کر ان کی پشت کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں گھبرا کر اچھلے۔

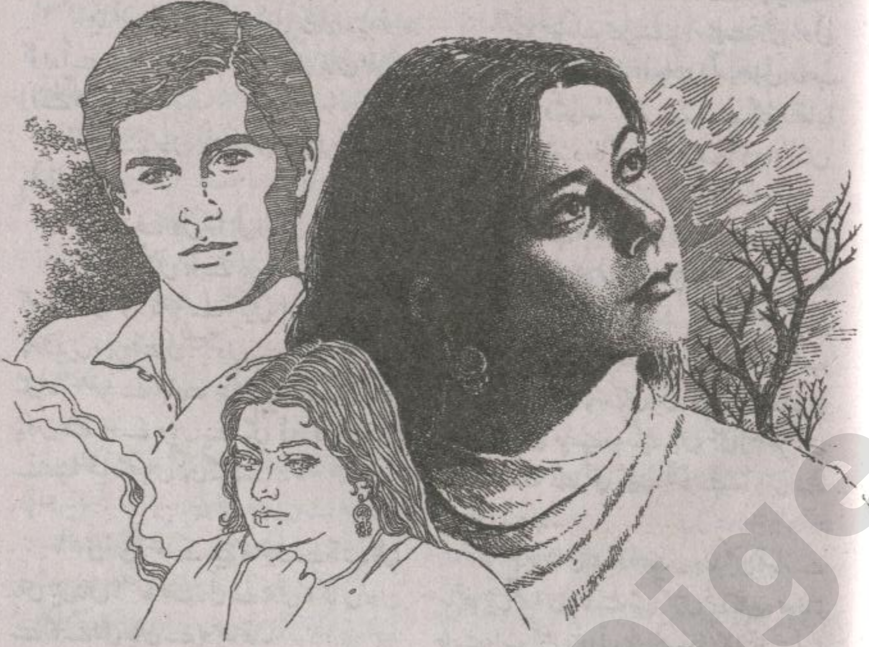
''کہاں ہیں......؟'' دونوں خوفزدہ انداز میں مڑے۔ تابندہ کے حلق سے نکلنے والی ہنسی بڑی بے ساختہ تھی۔ دونوں کو ... ایک سیکنڈ میں اس کا مذاق سمجھ آ گیا تھا۔

''دیکھ لی، میں نے آپ کی بہادری بھی......''

تابندہ کی شرارت پر دونوں ہنسے اور پھر ہنستے ہی چلے گئے۔ ان کو اندازہ ہو گیا تھا، جنجوعہ ہاؤس کے زندگی سے بھرپور ہنستے مسکراتے لوگوں میں ایک اور اضافہ ہونے والا تھا۔

کچھ ہم بدل گئے

رضوانہ آفتاب



''آج ان دونوں لڑکیوں میں سے مجھے کوئی ایک بھی پسند نہیں آئی۔'' عاکف زئی جو کچھ دیر قبل ہی آفس سے آیا تھا سٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی امی جان کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ عاکف نے کوفت بھری نظروں سے امی جان اور بہن عفرا کو دیکھا تھا۔

''عفرا بیٹا پانی پلانا۔'' صوفے پر براجمان ہوتے اس نے قدرے بیزاری سے کہا اور صوفے

کی پشت سے سر ٹکالیا۔

"یہ لیں۔" سادہ... بلکہ قدرے گرم پانی کا گلاس عفرا نے اس کی جانب بڑھایا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے عفرا تم مجھے گرم پانی پلا رہی ہو، آخر تمہیں کب آئے گی عقل؟" عاکف نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹا تم نے بھائی کو گرم پانی کیوں دیا، خواہ مخواہ اُسے ناراض کر دیا تم نے۔" امی جان عفرا کو ڈانٹنے لگیں۔

"میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا، ٹھنڈا پانی تھا ہی نہیں۔"

"تو بیٹا برف نکال کر ڈال دیتیں۔"

"مجھ سے نہیں ہوتے یہ سارے فضول کام، آپ بھائی کی بیگم لے آئیں اور میری جان چھوڑ دیں، ہر وقت کی نصیحتوں سے تنگ آ چکی ہوں میں۔" عفرا نے نہایت بد تمیزی سے کہا.... اور پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ عاکف زئی نے بے اختیار مٹھیاں بھینچی تھیں۔

☆☆☆

"امی آج اسفر کے بیٹے کا عقیقہ ہے، آپ چل رہی ہیں ناں؟" عاکف زئی نے جوس کا گلاس لبوں سے لگائے امی جان سے پوچھا تھا۔

"نہیں بیٹا میں تو نہیں جا سکتی، میں اور عفرا تمہارے لیے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔" امی نے تحمل سے جواب دیا۔

"امی روزانہ ہی آپ لوگ کہیں نہ کہیں جاتی ہیں۔ پھر بھی آپ لوگوں کو آج تک ایک بھی لڑکی پسند نہیں آئی؟" عاکف نے کوفت زدہ لہجے میں کہا تھا۔

"کیا کریں بیٹا ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نگاہوں سے گزری ہی نہیں جسے دیکھتے ہی پسند کر لیا جائے۔ کچھ نہ کچھ خامی ضرور ہوتی ہے، بس جس دن تمہارے لیے موزوں لڑکی مل گئی پھر دیر کیے بغیر اسی دن تمہارے سر پر سہرا سجا دوں گی۔" امی جان شیریں لہجے میں گویا تھیں اور عاکف عجب بیزاری سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"بہت بہت مبارک ہو یار۔" اسفر سے گلے ملتے، گفٹ اسے تھماتے، عاکف نے اسے وش کیا تھا۔

"خیر مبارک میرے یار، بہت خوشی ہوئی تم آئے، یہ خوشی دوبالا ہو جاتی اگر بھابی صاحبہ بھی ساتھ ہوتیں۔" اسفر نے اسے چھیڑا تھا۔ دیگر دوستوں حمزہ، فائز اور عامر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"جگر اب تم بھی ڈبل ہو جاؤ، ہماری شادی ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔" عامر نے قدرے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں یار، امی اور عفرا کو اب تک ایک بھی لڑکی پسند نہیں آئی، واقعی اب تو میری شادی ہو جانی چاہیے، اکیلے یوں فیملی فنکشنز میں آتے ہوئے مجھے بھی عجیب لگتا ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"تم پریشان نہ ہو، ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں مگر اس معاملے میں تمہیں خود سنجیدہ ہو جانا چاہیے، اب تمہیں خود اپنے لیے بیوی کا انتخاب کرنا ہے۔" حمزہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مشورے سے نوازا تھا۔

"بالکل درست کہا ہے حمزہ نے۔" عامر، اسفر، فائز نے بھی اس کی تائید کی تھی۔

عاکف ڈھیروں سوچوں کے ہمراہ گھر آیا تھا۔

☆☆☆

"امی کل آپ لڑکی دیکھنے گئی تھیں پسند آئی یا وہ بھی ریجیکٹ؟" عاکف نے امی جان کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"لڑکی کی عمر ذرا زیادہ تھی، میں نے منع کر دیا۔" امی جان نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ انہیں عاکف سے ہرگز اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"اچھا، اب کب جائیں گی کوئی اور لڑکی دیکھنے؟" عاکف نے بے حد عام سے لہجے میں استفسار کیا تھا مگر امی جان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔

"رخسانہ کی بہن کی نند کے لیے خود رخسانہ نے مجھے کہا تھا، کل اسے ہی دیکھنے جاؤں گی۔" امی نے بتایا۔

"کون رخسانہ......؟" عاکف نے پوچھا۔

"ارے تمہارے بڑے ابو کی بہو، زین کی بیوی۔" امی جان نے زچ ہو کر کہا تھا۔

"آپ مجھے رخسانہ بھابی کا فون نمبر دے دیں۔" عاکف نے بے پروائی سے کہا۔

"ڈائری میں ہے لے لو مگر تمہیں رخسانہ سے کیا بات کرنی ہے؟" امی جان... حیران تھیں۔

"میں بھی جاؤں گا آپ کے ساتھ لڑکی دیکھنے، یہی انہیں بتانا تھا۔" عاکف نے گویا انوکھی بات کہی ہو، وہ حیران رہ گئیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا ہے، میں اور عفرا دیکھ آئیں گے لڑکی۔" امی جان نے اسے سمجھانے کی سعی کی تھی۔

"نہیں امی، میں بھی چلوں گا آپ لوگوں کے ساتھ، میں رخسانہ بھابی سے بات کر لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ فون اسٹینڈ کی جانب بڑھا تھا۔

"السلام علیکم......رخسانہ بھابی، میں عاکف زئی بات کر رہا ہوں۔" عاکف نے باتوں کا آغاز کیا تھا۔

"وعلیکم السلام، ہاں بھئی خیریت تو ہے؟" رخسانہ بھابی نے تعجب سے ریسیور کو گھورا تھا جیسے وہ نظر آ رہا ہو۔

"جی بھابی! خیریت ہے، کل امی اور عفرا آپ کی سسٹر کی نند کو دیکھنے جا رہی ہیں، میں بھی لڑکی دیکھنا چاہتا ہوں۔" عاکف نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"ایسا تو ممکن نہیں ہے عاکف بھائی پھر بھی میں ان کی امی سے پوچھ کر آپ کو بتا دوں گی۔" رخسانہ بھابی نے جواب دیا۔

"بہت شکریہ بھابی آپ ان سے پوچھ کر میرے نمبر پر کال کر لیجیے گا۔" اپنا پرسنل نمبر انہیں لکھوا کر اس نے لائن منقطع کر دی تھی۔

رخسانہ بھابی نے افشاں کی امی سے بات کر لی تھی ایک نظر دیکھنے پر ان کی امی کو کوئی اعتراض نہیں تھا سو رخسانہ بھابی نے عاکف کو مطلع کر دیا۔ اس نے دل ہی دل میں اطمینان محسوس کیا تھا۔

"امی چلیں۔" عاکف تیار کھڑا تھا۔

"عاکف تم واقعی چل رہے ہو؟" امی نے ایک مرتبہ پھر پوچھا تھا۔

"جی امی، میں چل رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو۔" امی نے بڑبڑاتے ہوئے بیرونی دروازہ عبور کیا تھا۔ رخسانہ بھابی کی ہمراہی میں وہ لوگ افشاں کے گھر پہنچ چکے تھے۔

"آنٹی، میں بے حد معذرت خواہ ہوں، میں نے آپ لوگوں کو زحمت دی اور خود چلا آیا۔" عاکف، افشاں کی امی سے مخاطب تھا۔

"لڑکا، لڑکی ایک دوسرے کو ایک نظر دیکھ لیں تو زیادہ بہتر ہے اور مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خواہ مخواہ آپ شرمندہ نہ ہوں۔" انہوں نے سادگی سے کہا تھا۔ امی جان عاکف کو مسلسل دیکھ رہی تھیں۔

"افشاں بیٹا چائے لے آؤ۔" افشاں کی امی نے کمرے سے باہر جھانک کر آواز دی۔ کچھ ہی دیر میں سانولی سلونی سی، پتلی دبلی لڑکی سر پر سلیقے سے دوپٹا جمائے ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی اور سب کو سلام کر کے چائے ٹیبل پر رکھ کر باہر چلی گئی تھی۔

عاکف زئی بس کالی چوڑیوں سے مزین کلائی ہی دیکھ پایا تھا۔

''آنٹی آپ کی بیٹی ہمیں پسند آئی ہے۔''

عاکف نے اتنا کہا تھا اور امی جان متحیر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ عفرا بھی حیران تھی اُدھر افشاں کے گھر والوں کو یہ صاف گولڑکا پسند آیا تھا، رشتہ پکا کیا جاچکا تھا۔

☆☆☆

گھر آکر وہی ہوا جس کا عاکف کو اندازہ تھا۔

امی جان نے خوب واویلا کیا۔

''تمہیں وہ لڑکی پسند کیسے آگئی؟ کالی ہے اور اس کی عمر بھی زیادہ ہے، تمہیں کس نے کہا تھا کہ کہہ دو لڑکی پسند ہے۔'' امی جان آگ بگولا تھیں۔

''میں نے ایسا کون سا گناہ کردیا ہے جو آپ اس قدر غصہ کررہی ہیں؟'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''جب تمہیں خود ہی لڑکی پسند کرنا تھا تو مجھے اور عفرا کو کیوں گھسیٹا؟ جاکر خود ہی پسند کرآتے۔'' وہ مزید گویا تھیں۔

''اوہ...... تو آپ کو اس بات کا غصہ ہے پچھلے چھ سالوں سے یہ اختیار آپ لوگوں کو سونپا تھا مگر آپ لوگ ان چھ سالوں کے طویل عرصے میں بے شمار لڑکیوں کو ریجیکٹ کرتی رہیں۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''ہاں تو ایسا کیا غلط کیا ہے۔ میں تو اپنے بیٹے کے لیے چاند جیسی بہو کا انتخاب کرنا چاہتی تھی۔ اس میں ایسا کیا برا کردیا میں نے۔'' انہوں نے تلخی سے کہا۔

''کیوں امی، چاند سی بہو کی خواہش کرنے سے پہلے آپ نے اپنے بیٹے کی واجبی سی شکل پر غور نہیں کیا تھا؟ کوئی چاند سی لڑکی کیوں آپ کے عام سے بیٹے سے شادی کرے گی۔ اس کے بھی کچھ ارمان ہوں گے، کچھ ڈیمانڈ ہوگی، آپ ماؤں کے ساتھ اللہ جانے کیا پرابلم ہوتی ہے، بہو کی تلاش میں نکلتے ہوئے لڑکیوں کو بے دردی سے ریجیکٹ کرتے ہوئے آپ مائیں یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ آپ بھی ایک عدد بیٹی کی ماں ہیں اور بیٹے کے ساتھ، ساتھ آپ کو بیٹی کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے۔ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ جب آپ کسی لڑکی کے عیب گنوا کر اسے ریجیکٹ کرتی ہوں گی تو کیا بیتتی ہوگی اس کے اور اس کے گھر والوں کے دل پر......؟ میں نے افشاں کو پسند کرکے آپ کو مزید لڑکیوں کی ... بددعاؤں سے بچالیا ہے، امی وہ اتنی بری نہیں ہے جتنا آپ اسے برا کہہ رہی ہیں، جہاں تک رنگت کی بات ہے تو میں کون سا گورا چٹا ہوں اور رہی بات عمر کی تو اس عمر میں مجھے اٹھارہ سالہ دوشیزہ تو ملنے سے رہی اور فرض کریں آپ میرے لیے اٹھارہ سالہ دوشیزہ ڈھونڈ بھی لیتی ہیں تو میں ہرگز بھی اس کے ارمانوں کا خون نہیں کروں گا، پلیز امی آپ سمجھنے کی کوشش کریں، بیٹے کی ماں بن کر لڑکیوں کو ریجیکٹ کرنا بہت آسان ہے مگر بیٹی کی ماں بن کر اپنی بیٹی کو ریجیکٹ ہوتا دیکھنا بہت مشکل اور میں یہ نہیں چاہتا کہ ہماری عفرا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو جو آپ بیشتر لڑکیوں کے ساتھ کرتی آئی ہیں۔'' وہ بہت جذباتی ہورہا تھا۔

''آپ ماؤں کو صرف بیٹے کی نہیں بیٹی کی ماں بن کر بھی سوچنے کی ضرورت ہے، امی آپ یہ بات تو جانتی ہیں ناں کہ زندگی مکافاتِ عمل کا دوسرا نام ہے، ہمیں یہ دنیا وہی کچھ لوٹائے گی جو کچھ ہم اس دنیا کو دیں گے، یہ وقت غصہ کرنے کا نہیں ہے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کا ہے۔'' عاکف کہہ رہا تھا اور امی جان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ شاید وہ اس کی باتوں سے دل ہی دل میں قائل ہورہی تھیں۔ کل کو ان کی بیٹی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوسکتا تھا۔

دستورِ وفا سمجھو یا اصولِ زمانہ
کچھ تم بدل رہے تھے کچھ ہم بدل گئے



''اور یہ کام تم ہی کرسکتے ہو مجھے مکمل اعتماد ہے تم پر، میں نے بہت افراد پر تمہیں ترجیح دی ہے اس لیے کہ تم بہت جینئس ہو۔'' بریگیڈیئر طارق نے اسے مشن کے متعلق تمام بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔ ان کے سامنے کھڑے میجر عمر ایان نے انہیں کامیابی کا یقین دلایا۔ دس منٹ پہلے وہ جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اسے چھوڑ کر دوسری طرف سے دیے گئے آپریشن کے متعلق ہدایات کے بارے میں سوچنے لگا۔

''سر......! رزلٹ ہنڈرڈ پرسنٹ ہوگا انشاءاللہ ...... میں پوری کوشش کروں گا۔''

''ہوں......'' انہوں نے مبہم سا مسکرا کر کہا اور وہ انہیں سلیوٹ مار کر چلا گیا۔ اس وقت وہ اپنے

سلسلے وفا کے

ارسلا رمسین



فلیٹ میں موجود پیکنگ کررہا تھا۔

''مل گئی چھٹی......؟'' ہاشم نے اسے پیکنگ کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

''مذاق مت کرو یار......'' اس نے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپریشن کے لیے جارہا ہوں۔''

''وہاٹ......!'' وہ اپنی جگہ سے اچھلا۔

''امپاسبل......تم نے بات ہی نہیں کی ہوگی۔''

''کیا بات کرتا، میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ مجھے بریفنگ دینے کے انتظار میں تھے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''عمر وہ کام زیادہ ضروری ہے۔'' اس نے فکر مندی سے کہا۔

''میں کیا کرسکتا ہوں۔'' اس نے بیگ میں سامان ٹھونستے ہوئے کہا۔

''تم کہو تو میں بات کروں۔''

''نہیں......''

''تو کیا اس کام کے لیے تم ہی بچے تھے۔''

''ہاں، میں ہی بچا تھا۔ ون اینڈ اونلی......'' اس نے بات ختم کرکے مسکرانے کی کوشش کی۔اس کی بات پر ہاشم کے چہرے پر کوئی تاثر نہ آیا۔

''عمر تم سمجھ کیوں نہیں رہے تمہاری ضرورت کسی اور کو......''

''شی......'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش کروادیا۔

''ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔'' ہاشم.../ زیرلب بڑبڑایا۔

''ہاشم تم خود سوچو اگر میں اپنی جاب سے زیادہ ذاتیات کو ترجیح دوں تو پھر میں منافق ہوا ناں......'' ہاشم نے اس کے چہرے پر تفاخر دیکھا تھا۔

''لگا دیا ہوگا سرکار نے تمہیں...... اسی لیے پھسل گئے ہو۔'' اس کی بات پر وہ ہلکے سے مسکرایا۔ معاملہ فہم تو وہ تھا ہی لیکن اپنا موقف وہ بہت نفاست سے بیان کرتا کہ سننے والے قائل ہوجاتے۔

☆☆☆

وہ اپنے مکمل یونیفارم میں موجود تھا آنکھوں پر سیاہ گلاسز لگائے اپنے چہرے کے تمام تاثرات چھپائے بریگیڈیئر طارق کے سامنے۔

''ویل ڈن میجر عمر ایان......تم ہماری توقعات پر پورا اترے۔'' وہ ان کے کمنٹس پر تھینکس بھی نہیں کررہا تھا بس سپاٹ انداز میں بیٹھا تھا۔ جبھی ان کے انٹرکام پر بیل ہوئی' ریسیور پر انہوں نے صرف ہوں کہا۔تھوڑی دیر بعد میجر ہاشم نے انٹری دی وہ عمر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''عمر......!'' گمبھیر خاموشی کے بعد اس نے اسے مخاطب کیا عمر نے سختی سے آنکھیں بھینچ کر چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ بریگیڈیئر طارق حیرانی سے ان کی سمت دیکھ رہے تھے۔

''میجر ہاشم آپ بتا سکتے ہیں بات کیا ہے؟''

''مائی مدر......از ڈیڈ......'' ہاشم کے بجائے عمر نے کہا۔

''اوہ...... وری سیڈ......'' انہیں اب یاد آیا جب تین روز پہلے وہ اپنے آفس میں اسے آپریشن کے متعلق بریفنگ دے رہے تھے تو وہ انہیں کچھ اپ سیٹ لگ رہا تھا جیسے ان سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ وہ ان کے آفس سے چلا گیا اس کے پیچھے ہاشم بھی نکل گیا۔ کمرے میں آکر وہ بیڈ پر نڈھال سے انداز میں بیٹھ گیا۔

''ہاشم میں نے سوچا تھا موت میری ماں کو مہلت دے گی پر یہاں تو الٹا ہوگیا سب کچھ...... میں آخری مرتبہ ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پایا۔'' اس کا گلا رُندھ گیا ہاشم کو وہ وقت یاد آگیا۔ جب وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

''میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے وہ کہہ رہی تھیں عمر تم آجاؤ، میں نے تمہیں دیکھنا ہے۔'' وہ اس وقت کتنا فکرمند تھا اس کی آنکھوں میں ماں کے لیے جذبات کے کتنے ہی رنگ تھے پھر بریگیڈیئر طارق کے آفس میں جاکر وہ پرمیشن کیوں نہیں مانگ سکا۔

''انہوں نے مجھ سے کہا بھی تھا بیٹا ایک مرتبہ مجھے اپنا چہرہ دکھادو۔ میں پھر بھی نہیں جاسکا وہ تڑپتی چلی گئیں۔''

''عمر بی بریو......'' ہاشم نے اپنے کندھے پر رکھے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''اب میں وہاں کس کے پاس جاؤں گا۔وہاں تو کوئی میرا انتظار کرنے والا بھی نہیں۔'' وہ آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا اس کے لہجے میں کتنا پچھتاوا تھا۔

''عمر میرے بھائی، مجھے معاف کردینا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکا۔'' ہاشم نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''نہیں ہاشم، تم میرے ساتھ بیٹھے کم از کم میرے زخموں کا مداوا تو کررہے ہو ناں...... وہاں تو کوئی یہ بھی نہیں کرسکے گا۔'' اس نے ہاشم کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا پھر وہ کافی دیر تک سر جھکائے بےآواز روتا رہا۔

''عمر بس بھی کرو۔'' ہاشم نے اس کا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاشم میرا جرم کتنا بڑا ہے انہوں نے مجھے بلایا میں ان کے پاس جا بھی نہیں سکا۔'' اس نے ٹشو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

''عمر خود کو بلیم مت کرو انہیں اس بات کا غم تو ہوگا، تم ان سے مل نہیں سکے لیکن انہیں تم پر کتنا فخر تھا ان کا لائق بیٹا کتنی جانوں کو بچارہا تھا۔'' ہاشم نے اسے دلاسا دیا اس کی ہچکیاں نہیں تھم رہی تھیں پھر وہ اٹھ کر سامان باندھنے لگا۔

''عمر تھوڑی دیر ریسٹ کرلو۔'' ہاشم نے اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں پہلے ہی بہت لیٹ ہوگیا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''لاؤ میں سارا سامان رکھ دیتا ہوں تم فریش ہو آؤ۔'' اس نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا اور ہاتھ میں پکڑا سامان اسے تھما کر وہ واش روم چلا گیا۔ وہاں سے نکل کر تھکن سے چور وہ کچھ دیر صوفے پر بیٹھ گیا وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ خود ڈرائیو کرتا اس لیے ہاشم نے اس کی بکنگ کروادی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے ان رشتے داروں کو دیکھنے نہیں گیا تھا جو برے وقتوں میں ان کے کام نہیں آئے تھے جب اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی تو انہوں نے اپنی خاندانی بہو کو چھوڑ کر اپنے بھائی کا ساتھ دیا تھا وہ تو صرف اپنی ماں کی قبر پر جانا چاہتا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے جانے سے کسی اور کو تو شاید کوئی فرق نہ پڑے لیکن ایک شخص کو بڑی شدت سے انتظار ہوگا اس کا...... اس کا باپ جس نے اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی اسے باپ کی شفقت سے محروم رکھا۔ اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ باپ کسے کہتے ہیں۔ کیسے ہوتے ہیں باپ...... وہ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود کبھی اس کے پاس نہیں آیا کبھی اسے پیار نہیں کیا تھا وہ اس لذت سے ہی محروم رہا جو ایک باپ اپنی اولاد کو پیار ومحبت کی صورت میں دیتا ہے۔ اس نے کبھی اپنے باپ کا کمایا ہوا نہیں کھایا تھا کبھی اس شخص کی کمائی سے پہنا اوڑھا نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ باپ کی کمائی میں کیا مزہ ہوتا ہے، وہ تو اپنی ماں کے حصے کی اس جاگیر پر پلا بڑھا تھا جو انہیں ننھیال کی طرف سے ملی تھی، وہ اپنی ماں ہی کی نہیں باپ کی بھی اکلوتی اولاد تھا۔ گھر میں داخل ہوتے اسے افشاں روتی دکھائی دی جو اس کی ماں کی خاص ملازمہ تھی وہی اسے فون پر پل، پل کی خبر دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر اس کا سر تھپک کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بورڈنگ میں ہی

پلا بڑھا تھا اس گھر میں تو وہ بہت کم آیا تھا۔

اس وقت وہ بیڈ پر دراز تھا کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی وہ بالکل اپنی ماں جیسا تھا۔ سیاہ آنکھیں، چمکتی پیشانی جس پر جیسے کوئی تحریر لکھی ہو سرخ و سپید رنگت، سیاہ گھنے بال اور دراز سراپا، اس وقت اسے یوں لگا جیسے کوئی ہے۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آن کی تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میں تمہارا باپ ہوں۔''

ایک زوردار بے آواز قہقہہ گونجا۔

''کچھ دن رہو گے؟'' وہ خاموش رہا......

''مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' بات کر کے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کمرے سے چلے گئے۔ وہ کچھ دیر یونہی ساکت کھڑا رہا پھر ماتھا سہلا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ واپس چلا گیا۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی جس کے لیے سارا خاندان اس کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

اس نے ثمن کو فون کیا وہ اسے ملی ہی اس وقت تھی جب وہ ائرپورٹ پر بہت اپ سیٹ بیٹھا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں خشک نہیں ہو رہی تھیں اس پر مستزاد اسے سیٹ نہیں مل رہی تھی۔

''یوں پریشان ہونے سے مسئلہ حل تو نہیں ہو جائے گا اس طرح تو کام بگڑ سکتا ہے۔'' یہ الفاظ اس کے لیے مسیحا تھے۔ اس نے آنکھوں کے کنارے صاف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا نام ثمن ہے، کراچی جا رہی ہوں ٹریننگ کے لیے ایکچویلی میں سائیکاٹرسٹ ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی پھر اس نے اسے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔ وہ پلین میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر ہی تھی، وہ دورانِ سفر بھی غیر محسوس طریقے سے اس کی مدد کرتی رہی۔ جب وہ سونے لگا تو اس کی سیٹ پر کشن رکھ دیا۔ کراچی ائرپورٹ پر اتر کر اس نے اس اجنبی لڑکی کا شکریہ ادا کیا جو اَب اجنبی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' ثمن نے اس کے قریب آ کر کہا۔

''سوچ رہا ہوں کچھ لوگ کتنے بدقسمت ہوتے ہیں جو دولت کے لیے پتا نہیں کیا، کیا کر جاتے ہیں۔ یہ انا، غرور ان کے لیے کتنا اہم ہوتا ہے۔'' وہ کتنے تاسف سے کہہ رہا تھا۔

''ہر کوئی اپنے اچھے برے فعل کا ذمّے دار ہوتا ہے۔'' ثمن بھی تو ان سب کے حالات سے آگاہ تھی۔ اس دولت و جائداد کے چکر میں وہ خدا سے کتنا دور ہو گئے تھے لیکن پھر بھی خالی ہاتھ تھے ان کی بدمزاجی عروج پر تھی۔

''شکر ہے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ورنہ وہ مجھے کبھی نہ چھوڑتے۔'' اس نے تشکر سے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو ان جاگیروں کی ضرورت بھی کیا تھی، خدا کا دیا سب کچھ تو ہے۔''

''ہاں۔'' اسے جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا۔

''میں تو بھول ہی گیا تھا تم میرے پاس ہو۔'' ثمن نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

ان کی شادی کو صرف چھ ماہ گزرے تھے وہ بہت خوش تھے۔ لگتا تھا وہ جنموں سے ساتھ ساتھ ہوں۔ زمانے کی گردش نے اس سے سگے رشتے چھین لیے تھے مگر اب شریکِ سفر بن کر ثمن اس کی زندگی میں شامل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی مادرِ وطن کا وفادار تھا تو کیوں نہ اسے بدلے میں وفا ملتی، چاہے جس روپ میں بھی وفا ملے وہ ان وفاؤں کا قدر دان تھا۔ عمرایان بہت پیار سے اپنی شریکِ سفر کو تک رہا تھا۔



وہ آئے ہیں بزم میں......

نزہت اصغر



قیصرہ حیات سے بھرپور نشست

اس خوب صورت بزم میں باقاعدگی سے شرکت کرنے والے تمام خوش ذوق قارئین کی خدمت میں خلوصِ دل سے سلام اور ڈھیروں دعائیں...... جی قارئین عیدالفطر کے مزے لینے کے بعد عیدالضحیٰ بھی اب آن پہنچی ہے...... جو ہماری مذہبی یگانگت، ایثار و قربانی اور بھائی چارے کی مظہر ہے۔ پروردگارِ عالم سے یہی دعا ہے کہ ہماری اس پیاری سرزمین میں بسنے والے تمام اہلِ وطن اور دیارِ

غیر میں بھی بسنے والے تمام اہلیانِ وطن کو قومی اور مذہبی تمام تہوار مبارک ہوں اور دعا ہے کہ ہم روایتی جوش وجذبے اور مذہبی تقدس اور رواداری سے باہم مل کر یہ عظیم الشان تہوار مناتے رہیں۔

تو بس اسی مناسبت سے ہم اپنی بہت پیاری اور گرامی قدر مصنفہ قیصرہ حیات کو اپنی اس بزم میں دعوت دے رہے ہیں۔ جو پاکیزہ کی پُرخلوص اور دیرینہ ہمدم ہیں۔ قیصرہ حیات کسی تعارف کی محتاج نہیں...... مگر پھر بھی ہم یہ چند جملے ضرور لکھنا چاہیں گے کہ قیصرہ حیات کے افسانے، ناولٹ اور ناول جو ابھی تک پاکیزہ کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں، نہایت متنوع موضوعات لیے اور سبق آموز متن کے ساتھ تادیر قارئین کے ذہن وقلب پر چھاتے رہے ہیں۔ ویسے قیصرہ ماہ نامہ دلکش میں بھی باقاعدگی سے لکھتی رہی تھیں۔

قیصرہ نے اخلاقیات اور حقوق العباد کے موضوع پر قرآنی حوالوں سے بے شمار لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ قیصرہ کا اسلوب اگرچہ مربیانہ مگر سہل انداز لیے ہوئے ہے تاکہ بات ہر عمر وطبقۂ فکر کے پڑھنے والوں تک بہ آسانی پہنچ جائے اور گراں بارِ خاطر بھی نہ ہو۔ یہ تو قیصرہ حیات کے افسانوی طرزِ تحریر کی بات تھی مگر مذہبی اعتبار سے بھی انہوں نے جو کام انوار اسما النبیؐ کی شکل میں کیا ہے وہ بلاشبہ ان کا زادِ راہ ہے۔ قارئینِ کرام ہماری نظر میں تو اچھی سوچ، مثبت اندازِ فکر اور قرآن وسنت کے مطابق تعلیمات کہ جس سے کردار سازی اور شخصیت سازی میں مدد ملے تو بے شک اس امر سے جہاد بالقلم کا فرض ادا ہو جاتا ہے جو کسی بھی سنجیدہ اور ذمے دار قلمکار کا مطمعِ نظر ہو سکتا ہے۔

قیصرہ حیات نے بلاشبہ اپنی تحریر نگاری میں ان سب باتوں کا خیال رکھا۔ آج اپنی سنجیدہ اور پسندیدہ رائٹر سے خوشگوار ملاقات آپ بھی کیجیے اور ان کی مربیانہ گفتگو کا لطف اٹھائیں۔ (ایک وضاحت کرتے چلیں کہ اس بزم میں مصنفہ سے تصویری ملاقات نہیں ہو پائے گی آپ صرف ان کے خیالات سے ہی محظوظ ہو پائیں گی)

پاکیزہ ﴾ جی قیصرہ حیات صاحبہ سب سے پہلے تو سلام اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اپنی شادی خانہ آبادی کی مبارک باد قبول فرمائیں، یہ خوب صورت دن آپ کی زندگی میں کب آیا؟

قیصرہ حیات ❖...... میری طرف سے بھی پاکیزہ کے تمام اسٹاف، قارئین اور رائٹرز کی خدمت میں پُرخلوص سلام اور دعائیں...... شادی کی مبارک باد کا شکریہ۔ شادی 2 مئی 2014ء کو انجام پائی۔ 11 اپریل کو چھوٹی سی منگنی کی رسم کے بعد چند دنوں کے اندر یہ سلسلہ طے پایا۔ (واہ بھئی واہ اچٹ منگنی پٹ بیاہ)

پاکیزہ ﴾ یہ شادی خالصتاً ارینجڈ ہے یا آپ کی پسند بھی شامل تھی نیز اپنے شوہر نامدار کا بھی مکمل تعارف کروائیں؟

قیصرہ حیات ❖...... جی ہاں، یہ شادی بالکل ارینجڈ ہے پہلے میرے والد صاحب، بھائی اور باجی نے منصور صاحب اور ان کی فیملی کو پسند کیا پھر وہ لوگ آئے اور تیسرے، چوتھے دن منگنی ہو گئی۔ شادی سے پہلے نہ میری ان سے بات ہوئی اور نہ ہی کوئی ملاقات۔ میرے شوہر والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں اور سول انجینئر ہیں۔ (ماشاء اللہ)

پاکیزہ ﴾ اپنے آبائی شہر سے دور جانا...... ایک لڑکی کے کیا احساسات ہوتے ہیں، آپ کی کیا فیلنگز تھیں؟

قیصرہ حیات ❖...... میری شادی سیالکوٹ سے ملحقہ علاقے کوٹلی لوہاراں میں ہوئی ہے اس لیے دوری کا احساس زیادہ شدت سے پیدا نہیں ہوا۔ ہاں اگر میں کسی دوسرے شہر یا دور دراز علاقے میں جاتی تو شاید احساسات مختلف ہوتے لیکن ابھی

میکے میں آنا جانا لگا رہتا ہے اس لیے کچھ خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔

پاکیزہ ﴾ شادی سے آپ کے لکھنے لکھانے کی مصروفیات میں کس حد تک کمی آئی یا آ سکتی ہے؟

قیصرہ حیات ❖...... شادی کے بعد شوہر اور گھر کی ذمے داریاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ گھریلو کاموں کو چھوڑ کر اپنے مشاغل کو وقت دینا ایک لڑکی کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے شادی کے بعد ابھی کچھ خاص نہیں لکھا اور خاص طور پر گھریلو کام... شوہر کی اور گھر کی دیگر مصروفیات میں لکھنا بہت مشکل ہے، آئندہ لکھنے کی کیا مصروفیات ہوں گی وقت اور حالات پر منحصر ہے۔

پاکیزہ ﴾ ایک لڑکی کس طرح نئے گھر میں بہت جلد ایڈجسٹ ہو سکتی ہے، کوئی ٹپ بتائیں؟

قیصرہ حیات ❖...... ہر گھر کا ماحول اور حالات مختلف ہوتے ہیں، جب لڑکی شادی کے بعد سسرال جاتی ہے تو ان کے طور طریقوں اور ماحول کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایڈجسٹمنٹ پرابلم یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ لڑکی کہتی ہے میرے میکے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہم یہ نہیں پکاتے تھے، یہ نہیں کھاتے تھے۔ ان باتوں سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں اس لیے صبر اور حوصلے سے ماحول اور حالات کو سمجھ کر ان کے مطابق چلنے کی کوشش کریں۔ جب وہ سسرال والوں کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ (یہ تو واقعی والدین کی تربیت پر منحصر ہے)

پاکیزہ ﴾ اچھا پاکیزہ سے آپ کے اولین رابطے کے متعلق ہمارے قارئین یقیناً جاننا چاہیں گے یہ سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

قیصرہ حیات ❖...... میں نے اپنے لکھنے کا آغاز فرسٹ ائیر سے کیا۔ گاہے بگاہے افسانے لکھتی لیکن میرے افسانے زیادہ تر ادبی ہوتے تھے اور پاکیزہ میں لکھنے سے پہلے میری تین ادبی کتابیں، بارش کے بعد (افسانوں کا مجموعہ) ذات کا سفر (روحانی ناول) اور وقت جو ٹھہر گیا (استعاراتی ناول) شائع ہو چکی تھیں۔ میں آرمی پبلک اسکول سیالکوٹ کینٹ میں جاب کرتی تھی وہیں میری دوستی عمیرہ احمد سے ہوئی اور عمیرہ مجھے اصرار کرنے لگی کہ میں ڈائجسٹ میں بھی لکھوں۔ اس سے قارئین بڑھتے ہیں پھر ایک روز 2000ء میں انجم باجی کو فون کیا تو انہوں نے بہت محبت بھرے انداز میں حوصلہ افزائی کی۔ بہت اچھا رسپانس ملا تو میں نے انہیں ایک افسانہ بھیجا جو تھوڑے عرصے بعد شائع ہو گیا اور یوں پاکیزہ میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آج ماشاء اللہ 14 سال ہو گئے ہیں، پاکیزہ میں لکھتے ہوئے، سفر اچھا جارہا ہے۔ (ماشاء اللہ آئندہ بھی اچھا ہی رہے گا)

پاکیزہ ﴾ آپ نے جب پہلی تحریر لکھی تو ذہن میں کیا تھا؟ کوئی خاص موضوع یا ہدف؟

قیصرہ حیات ❖...... میں بچپن میں جب چھوٹی، چھوٹی کہانیاں لے کر پڑھتی تھی تو ان پر رائٹرز کے نام کو بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھتی تھی اور اسکول میں، میں نے اپنی کلاس فیلوز کو کہنا شروع کر دیا کہ میں رائٹر بنوں گی حالانکہ اس وقت میں نے کبھی ایک کہانی بھی نہیں لکھی تھی۔ کالج میں آتے ہی ایسے ہی ایک خیال ذہن میں آیا میں نے کہانی لکھنی شروع کر دی۔ خود بخود کہانی بنتی گئی اور جو جنگ سنڈے میگزین میں وعدہ کے نام شائع ہوئی۔ آج اس کو نکال کر دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں یہ کیا لکھا تھا۔ ایک سماجی کہانی تھی جو جیسے لکھی ویسے ہی شائع ہو گئی۔

پاکیزہ ﴾ آج کی تحریروں اور بیس سال پہلے کی تحریروں میں موضوعات کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟

قیصرہ حیات ❖...... ظاہر ہے آج کی تحریروں میں اور بیس سال پہلے کی تحریروں میں فرق تو ہے جو

پختگی اور تجربہ آج ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ میں نے پہلا ناول' ذات کا سفر (روحانی ناول) لکھا اس میں روحانی اعتبار سے وہ پختگی نہیں جو الف اللہ اور انسان میں ہے جو 2011ء میں شائع ہوا۔ البتہ میرے موضوعات شروع سے ہی مذہبی اور روحانی رہے ہیں۔

پاکیزہ ﴿ آپ کا آج تک مرکزی موضوع کیا تھا؟ کیا ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریریں سبق آموز ہوسکتی ہیں؟

قیصرہ حیات ❖......میری تحریروں کے موضوعات زیادہ تر سماجی، معاشرتی، مذہبی اور روحانی رہے ہیں۔ البتہ پاکیزہ میں اکثر عید سے پہلے میں مزاحیہ تحریریں بھیجتی تھی جو عید نمبر میں شائع ہوتی تھیں۔ مزاح لکھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ لکھتے ہوئے آپ خود بھی انجوائے کرتے ہیں، یقیناً مزاحیہ اور ہلکی پھلکی تحریریں سبق آموز ہوسکتی ہیں اگر ان کو نبھانے کا فن آتا ہو۔ (یہ تو سو فیصد درست بات ہے)

پاکیزہ ﴿ اپنی تخلیقات کو کتابی شکل میں دیکھنا اور لوگوں کے ہاں بک شیلف کی زینت بنے دیکھنا کیسا لگتا ہے؟

قیصرہ حیات ❖......ظاہر ہے ایک تخلیق کار کے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہوتی ہے کہ اس کی تخلیقات کو سراہا جائے۔ اسے پزیرائی ملے۔ اسی طرح رائٹر کے لیے اپنی کتابوں کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے بھی اپنی کتابیں دیکھ کر اور خصوصی طور پر لوگوں کے بک شیلف میں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

پاکیزہ ﴿ کچھ اپنی تصانیف کا تعارف کروائیں نیز کن تصانیف کو آپ خصوصی اہمیت دیتی ہیں؟

قیصرہ حیات ❖......الحمدللہ اس وقت میری دس کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ بارش کے بعد (افسانے) ذات کا سفر، وقت جو ٹھہر گیا، سایۂ دیوار بھی نہیں، پل صراط، کہیں دیپ جلے کہیں دل، الف اللہ اور انسان، آخری امید یہ سب ناول ہیں۔ گلاب چاہتیں (ناولٹ) اور انوار اسما النبیؐ (حضورؐ کے اسمائے مبارکہ پر تحقیقی کتاب ہے) سب اپنے موضوعات کے لحاظ سے منفرد ہیں لیکن الف اللہ اور انسان، آخری امید اور انوار اسما النبیؐ کو میں خاص اہمیت دیتی ہوں۔

پاکیزہ ﴿ ان تین کتابوں کو اہمیت دینے کی خصوصی وجہ کیا ہے؟

قیصرہ حیات ❖......میں سمجھتی ہوں کہ ان تین کتابوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص پلاننگ سے مجھ سے لکھوایا ہے۔ مخصوص حالات، محرکات اور روحانی تجربات سے گزرنے کے بعد میں نے یہ کتابیں لکھی ہیں۔ انوار اسما النبیؐ میں حضورؐ کے 102 اسمائے مبارکہ پر بھرپور انداز میں ریسرچ کرکے یہ کتاب لکھی ہے۔ ریسرچ کے لحاظ سے یہ بہت منفرد تصنیف ہے۔ تمام قارئین سے گزارش کروں گی کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں کیونکہ اس میں ہادیِ برحقؐ کی ذات بابرکت کے تمام پہلوؤں کو بھرپور طریقے سے احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ دوسری تصنیف الف اللہ اور انسان ہے۔ جس میں انسان اور اللہ کے روحانی تعلق کو بہت خوب صورت انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ اللہ سے بہت محبت پیدا ہوتی ہے۔ تیسری کتاب آخری امید میں اسلام پر فوکس کیا گیا ہے کہ صرف اسلام ہی انسانیت کو بچانے کی آخری امید ہے نیز اس میں غیر مسلموں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ کس طرح اسلام، ہادیِ برحقؐ اور مسلمانوں کو گاہے بگاہے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور ہماری نئی نسل کس طرح اسلام کی حفاظت کرسکتی ہے۔

پاکیزہ ﴿ آپ کی فیملی میں کسی نے آپ کے اس شوق کی مخالفت کی؟

قیصرہ حیات ❖......الحمدللہ میری فیملی میں کسی نے بھی میرے لکھنے کی مخالفت نہیں کی۔ میرے

والدین اور بہن بھائیوں نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ خاص طور پر میرے والد صاحب نے ہر، ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ میرے ساتھ پبلشرز کے پاس جاتے تھے اکثر رائٹرز سے ملتے تھے۔ آج میں جو کچھ ہوں ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہوں اور میری سب سے چھوٹی بہن سنبل بہت ناقدانہ انداز میں میری تحریروں کو پڑھ کر اپنی رائے دیتی تھی اور کہتی تھی یہاں سے ٹھیک کرو...... یہ حصہ مناسب نہیں لگ رہا اور جب میں ویسے کرتی تھی تو تحریر کا حسن نمایاں ہوجاتا تھا اس لیے میں سب کی مشکور ہوں۔ اب میرے ساس، سسر اور شوہر میرے لکھنے کو بہت سراہتے ہیں۔ خاص طور پر میرے سسر انوار اسما النبی ﷺ کے بہت مداح ہیں۔

پاکیزہ ﴿ آج کی تحریریں کس حد تک معیاری ہیں؟ آپ کو کیا کمی لگتی ہے؟

قیصرہ حیات ❖...... ہر قلمکار کا اپنا اندازِ تحریر ہوتا ہے۔ اہم بات اپنی مخصوص سوچ اور نقطۂ نظر کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اور ہر وہ تحریر معیاری ہوگی جس کے قلم کی زبان قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ البتہ کہیں مشاہدے کی، تجربے کی یا اندازِ بیان میں بے ربطگی دیکھنے میں آتی ہے۔

پاکیزہ ﴿ کیا ہر تحریر قلمکار کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے؟

قیصرہ حیات ❖......جی ہاں...... بہت حد تک قلمکار کہیں نہ کہیں اپنی ذات، شخصیت اور پسند و ناپسند کی جھلک دکھا جاتا ہے اور یہ نیچرل ہے۔

پاکیزہ ﴿ کون سی چیز، واقعہ یا آپ بیتی آپ کو لکھنے کی طرف راغب کرسکتی ہے؟

قیصرہ حیات ❖...... کسی کی انوکھی بات، سوچ یا چونکا دینے والا واقعہ اور کبھی کبھار کسی کی ایسی آپ بیتی جو بہت منفرد لگے۔ وہ لکھنے کا باعث ضرور بنتی ہے لیکن زیادہ تر خیالات خود ہی ذہن میں آتے ہیں تو میں ان پر کام شروع کردیتی ہوں۔

پاکیزہ ﴿ زندگی کے متعلق آپ کی رائے؟ زندگی زندہ دلی کا نام ہے یا زندگی نام ہے مُر مر کے جیے جانے کا؟

قیصرہ حیات ❖......زندگی ایک بہت پیچیدہ اور مشکل پروسیس ہے، کوئی انسان نہ تو اسے مکمل طور پر خوشی سے گزار سکتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر دکھ اور تکلیف میں...... خوشی اور غم، دکھ اور سکھ ساتھ، ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں اس پروسیس کو کبھی مکمل طور پر منفی انداز میں نہیں لیتی۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے اس پروسیس میں امید کو اس انداز میں جوڑا ہے کہ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سب آزمائشیں ہوتی ہیں اور وہی ان سے نکلنے کے لیے اسباب بھی پیدا کرتا ہے اور حل بھی سمجھا دیتا ہے۔ اس لیے زندگی کو مثبت انداز میں لینا چاہیے اور ویسے بھی زندہ دل لوگ سب کو ہی اچھے لگتے ہیں۔

پاکیزہ ﴿ عام طور پر دوستوں اور رشتے داروں سے کس قسم کا برتاؤ رکھتی ہیں؟

قیصرہ حیات ❖......یہ تو دوست اور رشتے دار ہی بتا سکتے ہیں، خود بتاؤں گی تو میاں مٹھو یا پھر خود پسندی کے زمرے میں یہ بات آجائے گی۔ (ہاں یہ تو ہے)

پاکیزہ ﴿ اردگرد بسنے والوں کی کیا باتیں، عادات بری لگتی ہیں؟

قیصرہ حیات ❖......منافقت اور جھوٹ...... ایسے لوگ یوں دل سے اترتے ہیں کہ پھر کبھی دوبارہ دل میں سما نہیں پاتے۔

پاکیزہ ﴿ ہم کس طرح دوسروں کی بری اور ناپسندیدہ عادات سے بچ سکتے ہیں؟

قیصرہ حیات ❖...... یہ بہت مشکل کام ہے

کیونکہ اس دنیا کا ہر انسان اپنے آپ کو اچھا سمجھتا ہے۔ ان کی باتیں یا عادتیں ہمیں ناپسند ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی عادات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا جائے، خود کنارہ کش رہیں تو بہتر ہے۔

پاکیزہ: آپ کو اپنی کون سی عادت پسند کون سی ناپسند ہے؟

قیصرہ حیات: ...... اپنی ایک عادت اچھی لگتی ہے اور اس میں میرا کوئی کمال نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور وہ یہ کہ میرے دل میں کسی کے بارے میں برائی زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی۔ کوئی مجھے کتنا ہی ناپسند کیوں نہ ہو میرے سامنے آکر گھل مل جائے تو میں سب کچھ بھول جاتی ہوں اور دل صاف ہو جاتا ہے۔ بری عادت، جب بھی کوئی ڈپریشن، غصے یا ٹینشن کی بات ہو تو اس کے تاثرات فوراً میرے چہرے پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ جنہیں میں چھپانے کی کتنی بھی کوشش کروں مگر دوسرے بھانپ لیتے ہیں۔ اس عادت سے چھٹکارا نہیں مل رہا۔

پاکیزہ: انسانی رشتے کس حد تک مضبوط یا بودے ہوتے ہیں؟

قیصرہ حیات: ...... انسانی رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں، صرف احساس کی کمی انہیں بودا اور کمزور بناتی ہے۔ رشتوں کا نعم البدل کوئی نہیں ہوتا۔ انہیں سنبھالنے اور بچانے کی ضرورت ہے۔ (بالکل درست کہا)

پاکیزہ: قیصرہ آپ ایک مثبت اور تعمیری سوچ رکھتی ہیں کیا آپ اپنے خیالات دوسروں پر مسلط کرتی ہیں یا ان کی رائے اور مشوروں کا بھی احترام کرتی ہیں؟

قیصرہ حیات: ...... میں ہرگز اپنی سوچ کو دوسروں پر مسلط نہیں کرتی بلکہ ہر ایک کی رائے اور مشورے کا احترام کرتی ہوں جو رائے یا مشورہ مجھے ٹھیک لگتا ہے اس پر فوراً عمل کرتی ہوں خاص طور پر اپنی چھوٹی بہن سنبل اور دوست عمیرہ احمد کے مشوروں کو خصوصی اہمیت دیتی ہوں۔ (واقعی! کبھی کبھی ہم چھوٹوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اچھے دوست بھی عطیۂ خداوندی ہیں)

پاکیزہ: دوستی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، تین جملوں میں بیان کریں؟

قیصرہ حیات: ...... دوستی جیسا خوب صورت اور انمول رشتہ دنیا میں اور کوئی نہیں۔ اس کے دھارے صرف پُر خلوص محبت، وفا اور ایثار سے پھوٹتے ہیں اس کو ہمیشہ برقرار رکھنے کے لیے اس کی آبیاری بھی پُر خلوص جذبات سے کرنی چاہیے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ: جو توقعات دوسروں سے رکھتی ہیں خود کس حد تک ان پر عمل پیرا ہوتی ہیں؟

قیصرہ حیات: ...... اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کبھی کسی سے کوئی توقعات وابستہ نہیں رکھیں سوائے اللہ کے۔ انسان کی ساری خواہشات، امیدیں اور آرزوئیں وہی پوری کرتا ہے۔ البتہ میں اپنے طور پر کوشش کرتی ہوں کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ میرے پاس پُرامید ہو کر آیا ہے تو اسے مایوس نہیں لوٹاؤں۔

پاکیزہ: آج کے پاکستانی معاشرے کی سب سے بڑی برائی...... کیا یہ درست ہو سکتی ہے؟

قیصرہ حیات: ...... پاکستانی معاشرے کی سب سے بڑی برائی منافقت اور بد اعتمادی ہے۔ کوئی دوسرے پر آسانی سے اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور جو اعتماد کرتے ہیں انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ اتنی جلدی دوسروں پر اعتماد مت کریں۔ اگر سب لوگ اپنے، اپنے دلوں میں دوسروں کے لیے خلوص اور سچائی پیدا کرلیں تو یہ برائی درست ہو سکتی ہے۔ (یہ سب دین کی اصل تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے)

پاکیزہ: اپنا ملک کیسا لگتا ہے؟ اسے مزید کیسا دیکھنا چاہتی ہیں؟

قیصرہ حیات: ...... الحمدللہ اپنا ملک سب سے اچھا لگتا ہے۔ جب کبھی کسی غیر ملک میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں اجنبیت کے احساس نے بہت افسردہ کر دیا۔ اللہ ہمارے ملک کو بہت ترقی اور خوشحالی دے اور تمام آفتوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

پاکیزہ: دشمنی اور نفرت کیسے جذبے ہیں؟ ان پر قابو کیسے پایا جا سکتا ہے؟

قیصرہ حیات: ...... دشمنی اور نفرت فطری مگر منفی جذبے ہیں جو غیبت اور منافقت سے زیادہ پروان... چڑھتے ہیں اس لیے ان دونوں باتوں سے دور رہ کر اپنے دل کو صاف رکھنے کی کوشش کریں تو ان پر بہ آسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔

پاکیزہ: آپ اپنی نو عمری میں خواب بُنتی تھیں؟ اگر ہاں تو کیسے خواب......؟

قیصرہ حیات: ...... خوابوں کے بغیر زندگی ادھوری ہے اور ہر انسان خواب دیکھتا ہے، میں بھی دیکھتی تھی۔ اپنی زندگی، اپنے مستقبل، اپنے کیریئر کے متعلق ملے جلے خواب تھے۔ کچھ تو پورے ہو گئے اور کچھ ادھورے رہ گئے لیکن ملال کوئی نہیں۔

پاکیزہ: آپ کے خیال میں آج کی نوجوان نسل کیسے خواب دیکھتی ہے؟ یا وہ حقیقت پسند ہے؟

قیصرہ حیات: ...... آج کی نسل حقیقت پسند تو ہے ہی لیکن ان کے خواب ہم سے زیادہ متحرک اور ایکٹو ہیں جیسے راتوں رات امیر بننے کے خواب، جہدِ مسلسل کے بغیر فوراً کامیابی، وہ جو خواب بُنتے ہیں ان کی تعبیر بھی فوراً چاہتے ہیں۔ خواب کو حقیقت بننے میں یا بنانے میں وقت، محنت اور صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکیزہ: مگر خواب دیکھے بغیر اور مستقبل کا تعین کیے بغیر آگے کیسے بڑھا جائے...... اس کا مطلب ہے اپنے ہدف کو پانے کے لیے خواب ضرور دیکھنا چاہیے، آپ کا کیا خیال ہے؟

قیصرہ حیات: ...... جی، میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ ہر کام سے پہلے ہم پلاننگ کرتے ہیں اور ہمارے یہ خواب اسی پلاننگ کا حصہ ہوتے ہیں۔

امتِ مسلمہ

خاموش کیوں ہو جواب دو

فلسطین لہولہان ہے
غزہ کی وادی پر بموں کی برسات ہے
نہتے فلسطینیوں کا خون بہہ رہا ہے
امتِ مسلمہ خاموش کیوں ہو جواب دو؟
معصوم شیر خوار بچوں کا کیا جرم ہے
بے بس مظلوم خواتین و جوانوں کا کیا قصور ہے
کیا ماؤں کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں
امتِ مسلمہ خاموش کیوں ہو جواب دو
غزہ کی وادی میں
ماؤں بہنوں کی آہوں کی آوازیں ہیں
شیر خوار بچے بھوک پیاس سے بلک رہے ہیں
مسلمانوں کی غیرت و حمیت کہاں گئی ہے
امتِ مسلمہ خاموش کیوں جواب دو
غزہ کے معصوم بچوں کو سلام
جو تاریک راہوں کے مسافر بنے
جن کو غاصبوں کی گولیوں نے ختم کر دیا
اے ارضِ فلسطین تیرے جان نثاروں کو سلام
نہتے بے بس فلسطینیوں کے بلند حوصلوں کو سلام

شاعرہ: کشور سلطانہ، کراچی

نویں، دسویں کلاس میں رائٹر بننا میرا خواب تھا۔ اللہ کا شکر ہے اس نے میرا یہ خواب پورا کیا۔ اس لیے اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں اچھے، اچھے خواب ضرور دیکھنے چاہیے۔ اپنا ہدف مکمل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ (بشرطیکہ صرف خوابوں پر ہی نہ جیا جائے بلکہ عملی کام بھی کیا جائے)

پاکیزہ ❁ آپ کو اپنی تحریروں کے حوالے سے کیسا ردِعمل ملا؟

قیصرہ حیات ❖...... اللہ کا شکر ہے ہمیشہ بہت اچھا رسپانس ملا ہے اور ابھی تک مل رہا ہے۔ رسپانس اچھا ملنے پر ہی یہ تخلیقی سفر جاری ہے۔

پاکیزہ ❁ اب تو مختلف چینلز پر بھی آپ کے لکھے ڈرامے آچکے ہیں اور آرہے ہیں، یہ تجربہ کیسا رہا؟

قیصرہ حیات ❖...... ڈرامے لکھنے کا تجربہ بھی اچھا جا رہا ہے اور میں اس کو بھی بہت انجوائے کرتی ہوں۔ انسان ہر تجربے سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہے۔ اس میں یہ سیکھا ہے کہ دریا کو کس طرح کوزے میں بند کرنا ہے۔ لمبے چوڑے پیراگراف اور ڈائیلاگز کے بجائے ایک جاندار اور پُراثر جملہ کیسے لکھنا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں لیکن اچھا پروسیس ہے۔

پاکیزہ ❁ ڈائجسٹ میں چھپی تحریریں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں یا ڈرامے کی شکل میں؟

قیصرہ حیات ❖...... دونوں اپنے، اپنے سرکل میں بااثر ہوتے ہیں۔ ڈراما گھر، گھر دیکھا جاتا ہے اور ہر ایک کی زبان پر اس کا تذکرہ ہوتا ہے مگر جب ڈراما ختم ہوتا ہے تو لوگ تھوڑے عرصے کے بعد بھول جاتے ہیں لیکن چھپی ہوئی تحریر قارئین کے پاس محفوظ ہوتی ہے۔ جب کوئی چاہے نکال کر پڑھ سکتا ہے اور تحریر کے ساتھ قاری خود بھی سفر کرتا ہے۔

پاکیزہ ❁ کوئی ایسا موضوع جس پر آپ کھل کر لکھنا چاہتی ہوں اور نہ لکھ پائی ہوں؟

قیصرہ حیات ❖...... نہیں، ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر میں کھل کر نہیں لکھ سکی۔ اللہ کا شکر ہے جو بھی تھیم یا آئیڈیا میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اس کو بھرپور انداز میں لکھنے کی کوشش کی۔ اس لیے کوئی تشنگی باقی نہیں۔

پاکیزہ ❁ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ کوئی تازہ کہانی منظرِعام پر آرہی ہے یا نہیں؟

قیصرہ حیات ❖...... آج کل تو فی الحال گھریلو مصروفیات ہیں۔ لکھنے کا کام ابھی شروع نہیں کیا۔ شادی سے پہلے ایک اسلامی ناول آخری امید کے نام سے لکھا تھا۔ وہ زیرِ طبع ہے انشاء اللہ جلد منظرِ عام پر آجائے گا۔

پاکیزہ ❁ اچھا نظم کی طرف کبھی دھیان گیا؟ شاعری سے کس حد تک دلچسپی ہے، پسندیدہ شعر اور شاعر؟

قیصرہ حیات ❖...... اچھی شاعری پڑھنا بہت پسند ہے لیکن شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ پسندیدہ شاعر علامہ اقبال، احمد فراز، فیض احمد فیض، پروین شاکر، افتخار عارف اور اس کے علاوہ تمام نئے شعرا جن کی شاعری میں گہرائی ہوتی ہے۔ سب پسند ہیں۔ پسندیدہ شعر

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے ہیں
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

پاکیزہ ❁ اچھا کچھ ذاتی پسند و ناپسند بھی بتا دیں مثلاً! دل پسند کھانا، لباس، رنگ، موسم، تفریحی مقام، خوشبو، پھول؟

قیصرہ حیات ❖...... دل پسند کھانا آلو گوشت اور چائنیز، پسندیدہ لباس شلوار قمیص، رنگ وائٹ، بلیک، فیروزی اور پنک کے مختلف شیڈز۔ موسم، اکتوبر نومبر کا۔ ہلکی، ہلکی ٹھنڈک اور حرارت، تفریحی مقام پہاڑی علاقوں میں جانا اچھا لگتا ہے۔ خوشبو موتیے اور رات کی رانی کی۔ پھول گلاب اور موتیا۔

پاکیزہ ❁ اپنا پسندیدہ عمل، ناپسندیدہ عمل؟

قیصرہ حیات ❖...... پسندیدہ عمل دوسروں کے بارے میں بدگمانیوں کو بھلا کر دل کا صاف ہو جانا۔ ناپسندیدہ، جلدی غصہ آجانا۔

پاکیزہ ❁ اپنے شوہر کو کیسا پایا؟ کیا کوئی آئیڈیل تھا؟

قیصرہ حیات ❖...... اللہ کا شکر ہے میرے شوہر بہت اچھے، نیک انسان ہیں۔ میں لوگوں کی اچھی عادات کو آئیڈیل بناتی ہوں کیونکہ بہت کم انسان آئیڈیل بن کر دوسرں کی سوچ پر پورا اترتے ہیں۔ اس سلسلے میں، بہت پریکٹیکل رہی ہوں۔ شادی سے پہلے یہ ضرور سوچتی تھی کہ میرا شوہر نیک، شریف اور فیلنگز کی کیئر کرنے والا ہو۔ اللہ کا شکر ہے منصور ایسے ہی ہیں۔ (چلیں آپ کو اپنا آئیڈیل مبارک ہو)

پاکیزہ ❁ ویسے آئیڈیل سے ہے کیا مراد؟

قیصرہ حیات ❖...... اپنی خواہشات اور سوچوں کے خوب صورت تخیل کو ہم اپنا آئیڈیل کہتے ہیں۔

پاکیزہ ❁ اب آپ کی ذات کے ساتھ، ساتھ آپ کے ساتھی کی ترجیحات بھی شامل ہو گئیں تو اس حوالے سے روزمرہ امور میں کس حد تک تبدیلی آئی؟

قیصرہ حیات ❖...... ظاہر ہے شادی کے بعد عورت پر بہت بھاری ذمّے داریاں آجاتی ہیں اپنے ساتھ، ساتھ شوہر اور سسرال والوں کی ذمّے داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ شادی سے پہلے کچھ حد تک من مانیاں چل جاتی ہیں مگر شادی کے بعد نہیں۔ اب سب سے پہلے شوہر کے کھانے پینے، کپڑوں اور دوسری چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ روزمرہ امور میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ میں پہلے بھی بہت مصروف رہتی تھی اب اور زیادہ مصروف ہو گئی ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے میرے ساس سسر بہت اچھے ہیں وہ میرے ساتھ بہت تعاون کرتے ہیں۔ خاص طور پر میری ساس بہت اچھی اور نیک خاتون ہیں۔ ہر ممکن طریقے سے میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔

پاکیزہ ❁ پاکیزہ ڈائجسٹ کے ساتھ گزارے تمام ماہ و سال کیسے رہے؟

قیصرہ حیات ❖...... اللہ کا شکر ہے، پاکیزہ کے ساتھ چودہ سال سے وابستگی ہے اور یہ سفر بہت اچھا اور خوشگوار رہا ہے اور اس میں سب سے بڑا عمل دخل انجم باجی کا رہا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ بہت محبت اور خلوص سے گائڈ کیا۔ صرف مجھے ہی نہیں اور بھی نئی رائٹرز کو جب میں نے انجم باجی کا فون نمبر دیا تو انہوں نے سب کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر کسی سے معذرت بھی کی تو بہت اچھے طریقے سے کہ کوئی ہرٹ نہ ہو۔ اسی طرح عذرا رسول صاحبہ سے جب بھی بات ہوئی بہت محبت اور شفقت سے انہوں نے بات کی۔ اس سے ادارے کے ممبران، رائٹرز اور قارئین میں رشتہ مضبوط ہوتا ہے کہ ادارے کے لوگ اچھے انداز سے بات کریں اور دوسروں کو گائڈ کریں۔ (بالکل درست بات ہے)

پاکیزہ ❁ آج پاکیزہ میں کس تبدیلی، اضافے یا بہتری کی خواہش ہے؟

قیصرہ حیات ❖...... پاکیزہ میں تبدیلیاں ساتھ ساتھ آتی ہیں اور آ بھی رہی ہیں۔ مصنفات کے انٹرویوز پہلے بھی شائع ہوتے رہے ہیں مگر اب جس طرح بھرپور انداز میں ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جا رہا ہے یہ منفرد عمل ہے۔ نیز مذہبی، علمی و ادبی سلسلے بہت بہتر ہیں۔ میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ پاکیزہ ڈائجسٹ میں مایہ ناز ادیبوں کی ادبی کہانیوں میں سے ایک چھوٹی کہانی یا افسانہ شائع کیا جائے تو نوجوان نسل کو ادب اور ادیبوں سے بھی آشنائی ہو اس تجویز پر غور کریں تو اچھا ہے۔ (تجویز کافی اچھی اور قابلِ غور ہے)

پاکیزہ ❁ اچھا ہماری نوآموز رائٹرز کی تین... بھرپور جملوں میں رہنمائی فرما دیں؟

قیصرہ حیات ❖......اپنے اندر صبر و تحمل پیدا کریں۔ اچھی تحریر کو منظرِ عام پر آنے کے لیے بہت کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تجربے کے ساتھ ساتھ مشاہدے اور ریسرچ کو بھی اپنی تحریروں میں شامل کریں۔

پاکیزہ﴾ لکھنے لکھانے کے علاوہ اور کیا مصروفیات ودلچسپیاں ہیں؟

قیصرہ حیات ❖......لکھنے کے علاوہ مجھے خود کوکنگ کرنا بہت پسند ہے۔ نئی، نئی ڈشز بنانا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں کا مطالعہ اور شاپنگ کرنا خاص طور پر بہت پسند ہے۔

پاکیزہ﴾ امورِ خانہ داری میں کس حد تک دلچسپی ہے؟

قیصرہ حیات ❖......الحمدللہ گھر کے سارے کام کاج میڈز کے علاوہ میں خود بھی کرتی ہوں۔ گھر گندا ہو، کچن میں برتن گندے پڑے ہوں اور میں لکھنے بیٹھی ہوں یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ گھر میری پہلی ترجیح ہے باقی سرگرمیاں بعد کی۔

پاکیزہ﴾ کون سی ڈش اچھی پکاتی ہیں اور شوق سے؟

قیصرہ حیات ❖......پاکستانی کھانوں کے علاوہ چائنیز ڈشز اور سویٹ ڈشز سب اچھی پکاتی ہوں۔ دسویں کلاس سے میں نے کوکنگ شروع کی تھی اب تو ویسے بھی بہت تجربہ ہوگیا ہے۔

پاکیزہ﴾ اچھا آخر میں اپنے پیارے پڑھنے والوں سے کیا کہنا چاہیں گی؟

قیصرہ حیات ❖......سب پڑھنے والوں کے لیے نیک تمنائیں اور صرف یہ کہوں گی کہ دوسروں کے بارے میں بدگمانی سے بچیں۔ دوسرے آپ کے بارے میں کتنا منفی اور غلط سوچتے ہیں اس کے بارے میں مت سوچیں۔ آپ صرف اپنے دل اور ذہن کو صاف رکھیں۔ زندگی بہت پُرسکون گزرے گی اور اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں، خوش حال رہیں گے۔

پاکیزہ﴾ چلتے، چلتے یہ بھی بتادیں کہ ہماری اس بزم میں آنا خوش ذوق قارئین سے باتیں کرنا کیسا لگا؟

قیصرہ حیات ❖......میں انجم باجی...... نزہت اصغر صاحبہ آپ کا اور پاکیزہ ڈائجسٹ کے تمام اراکین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے اس بزم میں آنے کا موقع دیا اور اپنے بارے میں کھل کر اظہار کرنے کا موقع ملا ورنہ روزمرہ کی ملف روٹین میں اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں بھی سوچنے کا وقت نہیں ملتا لیکن اس انٹرویو میں خود اپنی ذات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کا بھی موقع ملا ہے اور ان کا ذکر کرتے ہوئے بہت اچھا لگا ہے۔ (چلیں یہ تو اچھا ہوا...... یہ انٹرویو تو تجزیہ نگار ہوگیا)

☆☆☆

جی قارئین اس بھرپور نشست سے آپ یقیناً لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ انشاء اللہ یہ سلسلہ اسی طرح پھلتا پھولتا رہے گا۔ آخر میں ہم قیصرہ حیات صاحبہ آپ کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اپنی نئی زندگی کی مصروفیات کے ساتھ، ساتھ آپ نے ہمیں بھی بھرپور وقت دیا۔ پروردگارِ عالم سے یہی دعا ہے کہ آپ کا نیا سفر آپ کو اور آپ کے ہم سفر اور دونوں خاندانوں کو بے حد مبارک ہو اور آپ پاکیزہ قارئین کو ایک کے بعد ایک حسین تحریروں سے نوازتی رہیں، انشاء اللہ تعالیٰ، انہی جملوں کے ساتھ آپ سے اگلی بزم تک کے لیے اجازت کہ بس یہ چھوٹی سی اچھی سی کام کی بات ضرور یاد رکھیں کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں۔ اللہ حافظ۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

میرا پیارا بھائی

غزالہ فرخ



دائیں سے مرحوم بھائی انجم، بڑے بھائی، غزالہ فرخ اور بڑی بہن

ننھی منھی ہتھیلیاں وا ہیں اور میری پیاری ماں ہمیں گنڈیریاں تقسیم کررہی ہیں۔ بڑی بہن کا حصہ...... پھر بھائی اور میری ہتھیلی پر گنڈیریاں رکھی گئیں...... اور اب سب سے چھوٹی اور گداز سی ہتھیلی ہمارا چھوٹا بھائی ہم سب کا لاڈلا انجم (ککو) امی نے اس کا حصہ دیا اور پھر پیار اور تفاخر بھری نظر ڈالی کہ ساری محبتیں اور سارا غرور اس ایک نگاہ میں سما گیا اور ایک زائد گنڈیری اس کے ہاتھ پر دھر دی۔

''یہ میرا سب سے پیارا اور فرمانبردار بچہ......'' ہم تینوں نے ہلکا سا احتجاج کیا مگر من ہی من میں اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ واقعی وہ ہم سب میں چھوٹا ہے مگر اس کی اچھائیاں اور نیکیاں سب سے بڑھ کر ہیں۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر......'' مؤذن کی آواز گونجی کسی کام میں مگن میرا پیارا بھائی یک دم چونکا۔

''کیا ہوا......؟''

''نماز......'' بس ایک لفظ اور یہی لفظ اور یہی امر اس کی ساری زیست پر محیط ہوگیا۔ میرا پیارا ککو بڑا ہوتا گیا، گول مٹول سا...... گوکہ قد ابھی نہیں نکالا تھا مگر نماز...... باجماعت نماز کو اپنی گھٹی میں ڈال لیا، ننھی سی عمر میں اہتمام سے وضو اور پھر نماز...... چہرے کے گرد نور کا ہالہ اور ہر وقت کھیلتی پیاری سی مسکراہٹ......

اب میرے سامنے کا منظر بڑا ہی دلکش ہے، ہمارا لاڈلا بھائی دولھا بنا ہے...... بھائی اور بہنوں کا پیارا...... سفید شیروانی میں ملکوتی مسکراہٹ والا چہرہ...... پیاری ماں کا ساتھ چھوٹ چکا ہے مگر دل میں قلق نہیں کہ ان کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

درست ہے نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں، آج اپنی دلکش اور خوش اطوار پھوپی زاد کو اس کی شریکِ حیات بنا کر لائے ہیں۔ اور پھر وہ خوب

صورت لمحے کہ پہلے اپنی آغوش میں اللہ کی رحمت کو سمیٹا اور پھر خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے ملنے والی انمول نعمت کو......زندگی تکمیل پائی ..... بچے کم خوشحال گھرانا گنگنا رہا ہے اور ان کے خوب صورت مستقبل کے لیے کوشاں......

اور اب میرا ماں جایا میرے سامنے ہے خوب صورت اور نیک خیالات کے حامل بیٹے (حارث) کے ساتھ اور بہترین تعلیمی زیور سے آراستہ بچی (اجالا) کے ساتھ اور اب پھر منظر بدل رہا ہے، میرا شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والا بھائی ہنس رہا ہے، شریر مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصاں ہے، پاس سے ہی کسی نے فقرہ کسا ہے۔ "بیٹا دولھا بنا ہے مگر خود اتنے اسمارٹ لگ رہے ہو کہ ابھی تمہارے رشتے آسکتے ہیں۔"

بیٹی کو پیا کے گھر سدھار چکا ہے اب اللہ کی پاک ذات نے سارے فرائض ادا کر دیے ہیں اور اب اگلا ہی خیال اور اگلا ہی منظر "عازمِ حج ہوں۔ بہت واک کی ہے، ایکسر سائز اور یوگا کیا ہے، اب اپنے رب کے گھر کے لیے سفر کروں گا بڑا مزہ آئے گا۔" بڑی ترنگ میں بڑی خوشی کے ساتھ کہہ رہا ہے...... مسرور ہے...... اللہ کے گھر کی حاضری کے لیے بڑا جذباتی ہو رہا ہے۔ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ حج کا قرعہ نکلا ہے۔ میرا فرشتہ صفت...... نیک صفت بھائی...... میرا پیارا بھائی......

ہاں وہ اب بھی میرے سامنے ہے، آج میٹھی عید کے اگلے روز مگر یہ منظر اتنا بھیانک اور دل شکن کیوں ہے...... اس کی پیاری ہم سفرؔ اسے ماؤں کی طرح چاہنے والی بہنیں اس کے جان و جگر اس کے بچے اس کا بھائی سب پچھاڑیں کھا کر کیوں گر رہے ہیں، سب رو رہے ہیں، میرے میاں کہہ رہے ہیں، "غزالہ آج بھائی کو اچھی طرح دیکھ لو پھر نہ دیکھ پاؤ گی......" وہ میرے سامنے ہے میرے بالکل قریب آنکھیں بند کیے چہرے پر ازلی مسکراہٹ سجائے۔

مگر وہ تو ساکت سا ہے وہ ایسا تو نہیں تھا مگر آج...... میں یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ کیوں رہ گئی۔ میری آنکھیں پتھرا کیوں نہ گئیں...... میرے حواس معطل کیوں نہیں ہو گئے۔ میرا بھائی میرے سامنے ہے مگر بے حس و حرکت......

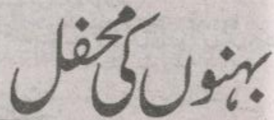
سب مجھے سمجھا رہے ہیں کہ وہ تو عشا کی نماز پڑھ کر باوضو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا ہے، وہ جنتی ہے، وہ تو بخشی ہوئی روح ہے مگر مجھے یہ باتیں سمجھ میں کیوں نہیں آ رہیں...... وہ ایک منظر، وہ ایک واقعہ میری آنکھوں میں میرے دل میں کیسے ثبت ہو گیا ہے کہ ہم سب میٹھی عید منانے کے بعد ملکۂ کوہسار مری میں خوشیاں سمیٹنے نکلے تھے اور پھر میرا پیارا بھائی جسدِ خاکی کی شکل میں ایمبولینس میں ہمارے ساتھ واپس آیا تھا۔ عشا کی نماز کی ادائیگی کے بعد اپنے ہوٹل تک پہنچنے سے پہلے ہی مسجد کے قریب ہی وہ دم توڑ گیا۔ مسجد ہمیشہ سے اس کا گھر تھی اور آخری آماجگاہ بھی بنی۔

ایسا ہمارے ساتھ کیوں ہوا...... شاید اللہ کی رحیم ذات کو بھی اپنے نیک اور اطاعت گزار بندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پیارے بھائی میرے لاڈلے کہ سب کہتے ہیں میں اب تمہیں دیکھ نہ پاؤں گی...... مگر میرے شہزادے تمہاری تصویر تو میری آنکھوں میں...... میرے دل میں ثبت ہے تمہیں دیکھنے کے لیے تو آنکھیں کھولنی بھی نہیں پڑتیں۔

تم اپنی اصلی منزل تک پہنچ گئے ہو، اپنی امی اور ڈیڈی کی قربت میں، تم تو واپس نہیں آؤ گے مگر ہم آئیں گے تمہارے پاس...... ہاں میں آؤں گی۔

یہ جہان فانی ہے اور ہم سب کو لوٹ کر وہیں جانا ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

٭ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ!

٭ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

٭ پیاری بہنو! آپ سب کو عید الضحیٰ مبارک ہو...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو خوشیوں کے دن دیکھنے نصیب کرے...... مگر اسی خوشی کے موقع پر دل میں جو دکھ ہے وہ کسی طرح زائل نہیں ہو رہا۔ پاکستان میں آنے والے سیلاب نے ہزاروں ایکڑ زمین کو تہ و بالا کیا وہاں انسانی جان و مال اور مویشیوں کی ہلاکت نے کتنے ہی گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی گو کہ قدرتی آفات کی ذمے داری کسی کے اوپر نہیں ڈالی جا سکتی مگر ان بے سروسامان لوگوں کے آنسو پونچھنے کی ذمے داری تو ہم سب کی ہے۔ یوں بھی اس وقت ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے اس کے لیے صرف آنکھیں ہی اشکبار نہیں بلکہ دل بھی رو رہا ہے۔ دھرنے صحیح ہیں یا غلط میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو بس صرف اتنا کہوں گی کہ اس وقت ہر محبِ وطن پاکستانی انتہائی ڈپریشن کا شکار ہے اور ٹینشن میں مبتلا ہے۔

یوں بھی یہ ہماری سب سے بڑی خامی ہے کہ ہم اپنی ہر بات صحیح اور دوسرے کی غلط سمجھا کرتے ہیں، ہم خود کو نہیں مگر دوسروں کو بدلنا چاہتے ہیں۔ بڑے، بڑے لیڈران اور سیاست دانوں کو تو چھوڑ دیجیے...... بس اپنے آپ کو اور اپنے آس پاس دیکھیے کہ کیا ہم اپنی روزی ایمانداری سے کما رہے ہیں؟ کیا ہم جھوٹ نہیں بول رہے! کیا ناپ تول کے پیمانے ہمارے ہاں صحیح ہیں...... ؟ کیا ہم ٹیکسوں سے بچاؤ کے لیے ماہرین کی مدد نہیں لیتے؟ کرپشن، بے ایمانی اور دھاندلیاں۔ چھوٹی، چھوٹی کاروباری ضروریات کی جہاں شکلیں اختیار کر چکی ہوں تو وہاں دوسروں پر انگلیاں اٹھانے کا ہمارا حق کہاں بنتا ہے۔ اگر ہم خود برے ہیں تو ہمیں اچھے حکمران کیسے مل سکتے ہیں؟ ہمیں اگر تبدیلی لانی ہے اور انقلاب بھی لانا چاہتے ہیں تو یہ عمل ہمیں اپنے گھر سے شروع کرنا ہوگا۔ جب میں خود جھوٹ بولوں اور ہر محاذ پر دھاندلی کروں تو دوسرے سے نیکی کی توقع کیسے کر سکتی ہوں۔ مجھے تو پھر اپنی اولاد سے بھی ایسی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جن بچوں کو اگر میں نے حرام کمائی سے پالا ہو تو وہ حلال آمدنی کیسے کما سکتے ہیں...... تو پلیز...... پلیز ذہن کے جالے صاف کر کے اس راستے کا انتخاب کیجیے جو سچائی کی طرف جاتا ہو اور جس پر جانے کی گواہی آپ کا دل اور دماغ دونوں دیں...... اور یہ سیلاب جس تیزی سے تباہیاں مچاتا ہوا سندھ کی جانب بڑھ رہا ہے اس کے آگے آنکھوں کے سیلاب کچھ معنی نہیں رکھتے۔ حکومت کے ساتھ، ساتھ اہلِ ثروت کو اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ ایک مسلمان کا دوسرے پر حق بھی ہے۔ دوسری باتیں بعد کی ہیں۔

اور آئیے اب اپنی سرگرمیوں کی جانب مگر اس سے قبل صرف ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا اِلٰہ الا اَنتَ سُبحانک اِنّی کُنت من الظّالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے ذرا آگاہ تو ہو جائیں کہ کون کیا کچھ کر رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

* پاکیزہ کی معروف شاعرہ شگفتہ شفیق، کراچی کی غزلیں......اب گلوکار گا رہے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

* معروف مصنفہ اور شاعرہ سیما رضا ردا، کراچی نے اپنی نئی رہائش گاہ پر مصنفات کے اعزاز میں لنچ دیا جس میں بہت سی مصنفات نے شرکت کی۔ (مبارک باد)

* معروف شاعر مشیر الحسن طالب اور ان کی اہلیہ آمنہ مشیر نیو یارک روانہ ہو گئے۔

* شاعرہ سیدہ جیا عباس کاظمی، چکوال کا پہلا شعری مجموعہ تیرے بعد شائع ہو گیا ہے جس میں ان کی نظمیں اور غزلیں ہیں، طرزِ تحریر میں سادگی اور برجستگی ہے اور کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی نئی شاعرہ کا کلام ہے۔ سرورق خوب صورت ہے اور کتاب سلیقے سے چھاپی گئی ہے۔ صفحات 160 ہیں اور قیمت صرف دو سو روپے ہے۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ روڈ، کمیٹی چوک راول پنڈی۔ فون نمبر 051.5551519

* پیاسی آنکھوں کے گلاب، یہ ہے ناول کا نام اور اس کی مصنفہ غزالہ جلیل راؤ ہیں۔ 400 صفحات پر محیط یہ خوب صورت ناول معاشرتی اور رومانی ہے۔ طرزِ تحریر میں کہیں ایسا نہیں لگتا کہ یہ کسی نئی مصنفہ کی تحریر ہو۔ ماہرانہ چابکدستی کے ساتھ لکھا گیا یہ ناول بہت اچھا ہے اور پڑھتے ہوئے رکنے کو دل نہیں چاہتا۔ ناول کی قیمت صرف 350 روپے ہے اور اسے خزینہ علم و ادب نے شائع کیا ہے جو الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

* شہر نارسا یہ ایک شعری مجموعہ ہے، جس کے شاعر طاہر حنفی ہیں۔ اس میں ان کی نظمیں، غزلیں مختلف موضوعات پر ہیں مگر ہر ایک میں فکر کی روح موجود ہے۔ کتاب کا انتساب اپنی مرحومہ بیگم ریحانہ طاہر کے نام ہے۔ اور کتاب کی قیمت 200 روپے ہے۔ یہ مجموعہ بیلا پبلی کیشنز اسلام آباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فون نمبرز 0300.13074..03335193454

* ہماری پیاری مصنفہ اختر شجاعت، کراچی کی دوسری کتاب، بہت جلد آنے والی ہے۔ (ماشاءاللہ)

* پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ افتخار، اسلام آباد کے بیٹے معظم کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

* گزشتہ دنوں جناب و بیگم سید طارق علی کے بیٹے سید تحسین کی شادی مدیحہ قریشی کے ساتھ ہوئی۔ (دلی مبارک باد)

* پاکیزہ کی تبصرہ نگار ناز گل، حیدر آباد چھوٹے پیمانے پر اپنا بیوٹی پارلر کھول رہی ہیں...... اللہ انہیں کامیابی عطا فرمائے۔

* پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق کے بیٹے اویس اور ان کی بیوی کومل بقر عید پاکستان میں منانے کے لیے امریکا سے کراچی آ گئے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

* پاکیزہ کی بے حد سینئر تبصرہ نگار اور شاعرہ تسنیم اکبر مجاہد، سیالکوٹ ان دنوں ایک انڈسٹریل ہوم چلا رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

* پاکیزہ کی تبصرہ نگار شہلا نواز، لاہور کی امی، بھائی اور بھابی حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب گئے ہوئے ہیں۔ (مبارک باد)

صحت یابی کی دعا کے لیے التماس ہے

* ہماری پیاری امینہ عندلیب ان دنوں شدید بیمار ہیں۔

* پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی شدید ڈپریشن میں مبتلا ہیں۔

* ہماری تبصرہ نگار اور مصنفہ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ شوگر کے مرض میں گرفتار ہو گئی ہیں۔

* معروف افسانہ نگار خالدہ نسیم، لندن کا بیٹا بسترِ علالت پر ہے۔

* پاکیزہ کی مستقل قاری مونا حفیظ کراچی کا چھ سالہ بیٹا حد سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہے۔ اس میں خود اعتمادی کی کمی ہے کہ لوگوں کو دیکھ کر چھپ جاتا ہے۔

انتقالِ پُر ملال

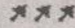
* ہماری پیاری شاعرہ شائلہ سہیل جاوید، کراچی کے والد جناب محمد نسیم قریشی انتقال کر گئے۔

* ہماری پیاری مصنفہ رابعہ رزاق، کراچی کے والد جناب عبدالرزاق، کراچی شہید کر دیے گئے۔

* ہماری پیاری تبصرہ نگار رفعیہ ابدالی، کراچی کی والدہ انتقال کر گئیں۔

* ہماری پیاری مصنفہ افسر سلطانہ، کراچی کے والد شاہ محمد صاحب کی اس ماہ برسی ہے۔

نوٹ: ان تمام مرحومین کے لیے صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔



* ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال کراچی سے۔ ”تمہارا اور ان تمام بہنوں کا بے حد شکریہ جنہوں نے میرے لیے دعائیں کیں اور میری کمی محسوس کی اللہ تعالیٰ ان سب کو اور کُل عالم کو اپنی پناہ میں رکھے اور اپنی نعمتوں سے نوازے، آمین۔ کچھ کہنا ہے میں حسبِ معمول بہت کچھ تھا میرا پہلے سے ہی اس بات پر یقینِ کامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ یقین عطا فرمائے۔ اختر شجاعت بہت دل پزیر انداز میں علم، معرفت الٰہی سے آگہی دے رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزا عطا کرے، آمین۔ سیما بہن کی اس بات سے میں بھی اتفاق کرتی ہوں کہ ان کا مضمون مکمل شائع ہو تو اچھا ہے۔ امانت کی تکمیل اتنی اچانک ہوئی ہے کہ لگتا ہے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے رفعت کو ٹارگٹ کیا ہو کہ وہ جلد اختتام لکھے۔ کرداروں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکا، تشنگی رہ گئی۔ بہر حال اگر کچھ لوگوں کو یہ تحریر رفعت کی سابقہ تحریروں کے مقابلے میں ہلکی لگی تو اس کو پسند کرنے والے بھی بہت ہیں۔ اب ہمیں ان کی نئی تحریر کا انتظار ہے۔ رفعت یہ فرمائش جلد پوری کریں۔ شکریہ! قول اور فعل حقیقت پر مبنی اچھی تحریر ہے۔ ترکِ وفا میں اگر مصنفہ جرمن ٹیچنگ بند کر دیں تو اس کی دلچسپی میں یقیناً اضافہ ہوگا بہر حال زیادہ متاثر نہیں کر رہی۔ ادب میں اب بہنیں سسپنس پر زیادہ زور دے رہی ہیں یہ جاسوسی ادب تو نہیں، نہیں کبھی نہیں جیسی معصوم محبتوں سے اب ہماری رائٹرز کو باہر نکل آنا چاہیے۔ شیریں حیدر کی اچھی سبق آموز تحریر ہے، مزہ آیا، دلشاد نسیم کی اچھی سبق آموز تحریر ہے۔ اعتبارِ وفا پر تبصرہ دو تین اقساط کے بعد کریں گے۔ دلدل نے دل کو چھو لیا، کاش لوگ اپنے رویّوں میں نارمل رہیں اور دوسروں کے جذبات کو بھی سمجھیں۔ جنگل کا پھول اور دیگر نئی مصنفات کی تحریروں کے بارے میں، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ پلیٹ فارم مہیا کریں... مگر پاکیزہ... معیار۔ جو شیریں ظفر سے اتفاق کر کے ہوئے میں بھی یہی کہوں گی کہ یہ اتنا اپ گریڈ ہو گیا۔ وہ متاثر نہ ہو... پہلے یہ لوگ چھوٹی، چھوٹی کہانیاں لکھیں (فاطمہ خان اور ہالہ احمد کی طرح) پھر ناول وغیرہ لکھیں۔ آئندہ نہیں ہوگا اور خسارہ اچھی تحریر ہے اور بس یونہی تو بس یونہی ہے۔ واؤ عظمیٰ اور سفرنامے کے ساتھ مزہ آ گیا۔ سادہ اور دلچسپ انداز میں لکھا گیا یہ سفرنامہ... بہت اچھا لگا۔ بس اب عظمیٰ کو غائب نہیں ہونا چاہیے۔ شمیم فضل خالق سے ملاقات بہت اچھی لگی اور ہاں غزالہ سے ملاقات کا تو جواب ہی نہیں۔ اب ان کو کسی نہ کسی طرح سے شامل رکھیں۔ شادی مبارک میں حمیرا کلیم کی شادی کا احوال بہت اچھا لگا۔ اب بہنوں کی محفل کی باری جن لوگوں کو دکھ ملے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صبر اور جزا دے، آمین جن کو خوشیاں ملی ہیں ان کو ڈھیروں مبارک باد، جو لوگ بیمار ہیں ان کے لیے اللہ سے صحتیابی کی دعا ہے۔ خاص کر امینہ کے لیے۔ امینہ کے حوصلے کو سلام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ سنبل ملک آپ کی دعوت کا شکریہ ہو سکتا ہے کبھی آ بھی جائیں۔ ڈاکٹر زاہدہ کے جائز اعتراض پر جس طرح تم نے فراخدلی سے معذرت کی ہے یہی تمہیں ممتاز کرتی ہے۔ عمیرہ کا انٹرویو ہم سب کی خواہش ہے، جلد پوری کریں۔ عذرا بی بی یاد کرنے کا شکریہ۔ پاکیزہ ڈائری اور دیگر سلسلے خوب ہیں۔ جلترنگ میں تو اس دفعہ تم نے کمال ہی کر دیا۔ دونوں خاکے انتہائی دلچسپ رہے......“ (تفصیلی تبصرے کا شکریہ، کئی ماہ کے بعد آئی ہو اب پھر غائب مت ہو جانا)

* افسر سلطانہ، کراچی سے۔ ”عنیزہ سید کا ناول اختتام کو پہنچا...... انجام تک خوب صورتی سے پہنچایا۔ عنیزہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر اور نگہت سیما لکھیں اور پسند نہ آئے۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ دونوں افسانہ اور ناولٹ بہترین رہے۔ ام ثمامہ، سمیرا احمید، شیریں حیدر، شائستہ عزیز، نیر رانی شفق نے بھی اچھے موضوعات چنے اور کامیاب رہیں۔ ام مریم کا افسانہ (معذرت کے ساتھ) کچھ حقیقت کے قریب محسوس نہ ہو سکا۔ عقیلہ حق کے افسانے میں شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ فیملی سے مُراد ان کے بیوی، بچے ہی ہوں گے اور عظمیٰ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ بس لگا ہم تمہارے ساتھ ہی محوِ سفر ہیں۔ (پیسوں کی بچت

★ پاکیزہ کی معروف شاعرہ شگفتہ شفیق، کراچی کی غزلیں......اب گلوکار گا رہے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

★ معروف مصنفہ اور شاعرہ سیمار ضا ردا، کراچی نے اپنی نئی رہائش گاہ پر مصنفات کے اعزاز میں لنچ دیا جس میں بہت سی مصنفات نے شرکت کی۔ (مبارک باد)

★ معروف شاعر مشیر الحسن طالب اور ان کی اہلیہ آمنہ مشیر نیو یارک روانہ ہو گئے۔

★ شاعرہ سیدہ جیا عباس کاظمی، چکوال کا پہلا شعری مجموعہ تیرے بعد شائع ہو گیا ہے جس میں ان کی نظمیں اور غزلیں ہیں، طرزِ تحریر میں سادگی اور برجستگی ہے اور کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی نئی شاعرہ کا کلام ہے۔ سرورق خوب صورت ہے اور کتاب سلیقے سے چھاپی گئی ہے۔ صفحات 160 ہیں اور قیمت صرف دو سو روپے ہے۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ روڈ، کمیٹی چوک راول پنڈی۔ فون نمبر 051.5551519

★ پیاسی آنکھوں کے گلاب، یہ ہے ناول کا نام اور اس کی مصنفہ غزالہ جلیل راؤ ہیں۔ 400 صفحات پر محیط یہ خوب صورت ناول معاشرتی اور رومانی ہے۔ طرزِ تحریر میں کہیں ایسا نہیں لگتا کہ یہ کسی نئی مصنفہ کی تحریر ہو۔ ماہرانہ چابکدستی کے ساتھ لکھا گیا یہ ناول بہت اچھا ہے اور پڑھتے ہوئے رکنے کو دل نہیں چاہتا۔ ناول کی قیمت صرف 350 روپے ہے اور اسے خزینہ علم و ادب نے شائع کیا ہے جو الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★ شہرِ نارسا یہ ایک شعری مجموعہ ہے، جس کے شاعر طاہر حنفی ہیں۔ اس میں ان کی نظمیں، غزلیں مختلف موضوعات پر ہیں مگر ہر ایک میں فکر کی روح موجود ہے۔ کتاب کا انتساب اپنی مرحومہ بیگم ریحانہ طاہر کے نام ہے۔ اور کتاب کی قیمت 200 روپے ہے۔ یہ مجموعہ بیلا پبلی کیشنز اسلام آباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فون نمبرز 0300.13074..03335193454

★ ہماری پیاری مصنفہ اختر شجاعت، کراچی کی دوسری کتاب بہت جلد آنے والی ہے۔ (ماشاءاللہ)

★ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ افتخار، اسلام آباد کے بیٹے معظم کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

★ گزشتہ دنوں جناب و بیگم سید طارق علی کے بیٹے سید تحسین کی شادی مدیحہ قریشی کے ساتھ ہوئی۔ (دلی مبارک باد)

★ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ناز گل، حیدر آباد چھوٹے پیمانے پر اپنا بیوٹی پارلر کھول رہی ہیں......اللہ انہیں کامیابی عطا فرمائے۔

★ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق کے بیٹے اویس اور ان کی بیوی کومل بقر عید پاکستان میں منانے کے لیے امریکا سے کراچی آ گئے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

★ پاکیزہ کی بے حد سینئر تبصرہ نگار اور شاعرہ تسنیم اکبر مجاہد، سیالکوٹ ان دنوں ایک انڈسٹریل ہوم چلا رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

★ پاکیزہ کی تبصرہ نگار شہلا نواز، لاہور کی امی، بھائی اور بھابی حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب گئے ہوئے ہیں۔ (مبارک باد)

صحت یابی کی دعا کے لیے التماس ہے

★ ہماری پیاری امینہ عندلیب ان دنوں شدید بیمار ہیں۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی شدید ڈپریشن میں مبتلا ہیں۔

★ ہماری تبصرہ نگار اور مصنفہ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ شوگر کے مرض میں گرفتار ہو گئی ہیں۔

★ معروف افسانہ نگار خالدہ نسیم، لندن کا بیٹا بسترِ علالت پر ہے۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری مونا حفیظ کراچی کا چھ سالہ بیٹا حد سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہے۔ اس میں خود اعتمادی کی کمی ہے کہ لوگوں کو دیکھ کر چھپ جاتا ہے۔

انتقالِ پُر ملال

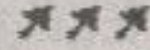
★ ہماری پیاری شاعرہ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی کے والد جناب محمد نسیم قریشی انتقال کر گئے۔

★ ہماری پیاری مصنفہ رابعہ رزاق، کراچی کے والد جناب عبدالرزاق، کراچی شہید کر دیے گئے۔

★ ہماری پیاری تبصرہ نگار رفعیہ ابدالی، کراچی کی والدہ انتقال کر گئیں۔

★ ہماری پیاری مصنفہ افسر سلطانہ، کراچی کے والد شاہ محمد صاحب کی اس ماہ برسی ہے۔

نوٹ: ان تمام مرحومین کے لیے صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔



ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال کراچی سے۔ ”تمہارا اور ان تمام بہنوں کا بے حد شکریہ جنہوں نے میرے لیے دعائیں کیں اور میری کمی محسوس کی اللہ تعالیٰ ان سب کو اور کُل عالم کو اپنی پناہ میں رکھے اور اپنی نعمتوں سے نوازے، آمین۔ کچھ کہنا ہے میں حسبِ معمول بہت کچھ تھا میرا پہلے سے ہی اس بات پر یقینِ کامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ یقین عطا فرمائے۔ اختر شجاعت بہت دل پزیر انداز میں علم، معرفت الہیٰ سے آگہی دے رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزا عطا کرے، آمین۔ سیما بہن کی اس بات سے میں بھی اتفاق کرتی ہوں کہ ان کا مضمون مکمل شائع ہوتا تو اچھا ہے۔ امانت کی تکمیل اتنی اچانک ہوئی ہے کہ لگتا ہے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے رفعت کو ٹارگٹ کیا ہو کہ وہ جلد اختتام لکھے۔ کرداروں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکا، تشنگی رہ گئی۔ بہر حال اگر کچھ لوگوں کو یہ تحریر رفعت کی سابقہ تحریروں کے مقابلے میں ہلکی لگی تو اس کو پسند کرنے والے بھی بہت ہیں۔ اب ہمیں ان کی نئی تحریر کا انتظار ہے۔ رفعت یہ فرمائش جلد پوری کریں۔ شکریہ! قول اور فعل حقیقت پر مبنی اچھی تحریر ہے۔ ترکِ وفا میں اگر مصنفہ جرمن ٹیچنگ بند کر دیں تو اس کی دلچسپی میں یقیناً اضافہ ہوگا بہر حال زیادہ متاثر نہیں کر رہی۔ ادب میں اب بہنیں سسپنس پر زیادہ زور دے رہی ہیں یہ جاسوسی ادب تو نہیں، نہیں کبھی نہیں جیسی معصوم محبتوں سے اب ہماری رائٹرز کو باہر نکل آنا چاہیے۔ شیریں حیدر کی اچھی سبق آموز تحریر ہے، مزہ آیا، دلشاد نسیم کی اچھی سبق آموز تحریر ہے۔ اعتبارِ وفا پر تبصرہ دو تین اقساط کے بعد کریں گے۔ دلدل نے دل کو چھو لیا، کاش لوگ اپنے رویّوں میں نارمل رہیں اور دوسروں کے جذبات کو بھی سمجھیں۔ جنگل کا پھول اور دیگر نئی مصنفات کی تحریروں کے بارے میں، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ پلیٹ فارم مہیا کریں.....مگر پاکیزہ... معیار... جو شیریں ظفر سے اتفاق کرتے ہوئے میں بھی یہی کہوں گی کہ یہ اتنا اپ گریڈ ہو گیا۔ وہ متاثر نہ ہو... پہلے یہ لوگ چھوٹی، چھوٹی کہانیاں لکھیں (فاطمہ خان اور ہالہ احمد کی طرح) پھر ناول وغیرہ لکھیں۔ آئندہ نہیں ہوگا اور خسارہ اچھی تحریر ہے اور بس یونہی تو بس یونہی ہے۔ واؤ عظمیٰ اور سفر نامے کے ساتھ مزہ آ گیا۔ سادہ اور دلچسپ انداز میں لکھا گیا یہ سفر نامہ.... بہت اچھا لگا۔ بس اب عظمیٰ کو غائب نہیں ہونا چاہیے۔ شمیم فضل خالق سے ملاقات بہت اچھی لگی اور ہاں غزالہ سے ملاقات کا تو جواب ہی نہیں۔ اب ان کو کسی نہ کسی طرح سے شامل رکھیں۔ شادی مبارک میں حمیرا کلیم کی شادی کا احوال بہت اچھا لگا۔ اب بہنوں کی محفل کی باری جن لوگوں کو دکھ ملے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صبر اور جزا دے، آمین جن کو خوشیاں ملی ہیں ان کو ڈھیروں مبارک باد، جو لوگ بیمار ہیں ان کے لیے اللہ سے صحتیابی کی دعا ہے۔ خاص کر امینہ کے لیے۔ امینہ کے حوصلے کو سلام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ سنبل ملک آپ کی دعوت کا شکریہ ہو سکتا ہے کبھی آ بھی جائیں۔ ڈاکٹر زاہدہ کے جائز اعتراض پر جس طرح تم نے فراخدلی سے معذرت کی ہے یہی تمہیں ممتاز کرتی ہے۔ عمیرہ کا انٹرویو ہم سب کی خواہش ہے، جلد پوری کریں۔ عذرا بی بی یاد کرنے کا شکریہ۔ پاکیزہ ڈائری اور دیگر سلسلے خوب ہیں۔ جلترنگ میں تو اس دفعہ تم نے کمال ہی کر دیا۔ دونوں خاکے انتہائی دلچسپ رہے......“ (تفصیلی تبصرے کا شکریہ، کئی ماہ کے بعد آئی ہو اب پھر غائب مت ہو جانا)

افسر سلطانہ، کراچی سے۔ ”عنیزہ سید کا ناول اختتام کو پہنچا......انجام تک خوب صورتی سے پہنچایا۔ عنیزہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر اور نگہت سیما لکھیں اور پسند نہ آئے۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ دونوں افسانہ اور ناولٹ بہترین رہے۔ ام ثمامہ، سمیرا حمید، شیریں حیدر، شائستہ عزیز، نیر رانی شفق نے بھی اچھے موضوعات چُنے اور کامیاب رہیں۔ ام مریم کا افسانہ (معذرت کے ساتھ) کچھ حقیقت کے قریب محسوس نہ ہو سکا۔ عقیلہ حق کے افسانے میں شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ فیملی سے مُراد ان کے بیوی، بچے ہی ہوں گے اور عظمیٰ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ بس لگا ہم تمہارے ساتھ ہی محوِ سفر ہیں۔ (پیسوں کی بچت

ہوگئی) پر ایک کمی رہی ہے تصویروں کی۔ نظر نہیں لگائیں گے، ہم نے تمہارے سفرنامے کو پڑھ کر بھی ماشاء اللہ کہا ہے اور انجم بالکل صحیح کہا...... مقدس مقامات پر موبائل کا استعمال ہرگز نہیں ہونا چاہیے پر کیا کریں یہاں بھی تو عجیب و غریب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میلاد شریف ہو رہی ہے اور خواتین کھانوں تک کی تراکیب موبائل کانوں سے لگائے، لگائے بتا دیتی ہیں...... قرآن خوانی میں بھی اکثر و بیشتر یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے...... نہ جانے ہم کہاں جا رہے ہیں...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہِ ہدایت عطا کرے، آمین۔ رفعت سراج کے ناول کی آخری قسط بہترین رہی پر کچھ جلدی میں اختتام پزیر ہوئی۔ رفعت مانی ہوئی رائٹر ہیں۔ انہوں نے یقیناً مجھ سے بہتر سوچا ہوگا۔ نگہت سیما بھی رنگ جمائیں گی۔ نایاب جیلانی آپ کے ناولٹ کا ٹیمپو سست ہو رہا ہے۔ اس کی خوب صورتی کو گہن لگ جائے گا توجہ فرمائیں۔ نگہت اعظمی کی دلدل ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس سے مرد حضرات نگاہیں چرانے کے بجائے دندناہی پسند کرتے ہیں۔ جنگل کا پھول باقی آئندہ تو رائے بھی آئندہ۔ آئندہ نہیں ہوگا اور خسارہ دونوں پسند آئے۔ سیما بنتِ عاصم کا افسانہ اچھا لگا اور اداس بھی کر گیا۔ ملائشیا یہ تو نے کیا، کیا؟ اس کی آخری قسط پڑھ کر صرف یہ کہوں گی انجم بہت سالوں پہلے یہ ایک جملہ سنا تھا...... گلاب کے پھولوں کی کیاریوں میں بھری مٹی بھی مہک زدہ ہوتی ہے تو عظمیٰ نہ چاہتے ہوئے بھی مزاحیہ جملے لکھ جاتی ہے...... یہ آپ کا اثر ہے اس میں۔ مزہ آیا پڑھ کر۔ شمیم فضل خالق سے گفتگو دلچسپ رہی۔ نزہت کو مبارک باد دی جائے۔ اختر شجاعت کے مضامین قسط وار نہیں ہوں گے یہ ایک اچھا فیصلہ ہے اور اس کی نیکی کا سہرا تو آپ کے سر...... دلہنیں سب کو پسند آئیں اور تمام خیالات پر واہ واہ بھی کی۔ سمجھ میں نہیں آتا...... دلہنوں کے خیالات اتنے اچھے ہونے کے باوجود طلاق کی شرح روز بروز بڑھتی کیوں جا رہی ہے؟ حمیرا کلیم کا طرزِ تحریر مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ صبیحہ شاہ، فصیحہ، امبر مسرت، نسرین شفیق، دلشاد نسیم، کرنل حکیم اختر، مسز نسرین کلیم، سعدیہ ہما شیخ، عالیہ بانو اور مسز زاہد کو مبارک باد پہنچا دیں۔ تمام بیمار بہنوں کی صحتیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

٭ نزہت اصغر، کراچی سے۔ "اب پچھلے دو شماروں کے لیے عرض ہے کہ عظمیٰ آفاق نے ملائشیا کی سیر مزیدار انداز میں کرائی۔ بس تھوڑی سی معلومات اور بھی ہوتی، ویسے مجموعی طور پر پُرلطف سفرنامہ تھا۔ مختلف ملکوں کے سفرنامے ضرور شامل ہونے چاہئیں تاکہ وہاں کا رہن، سہن بود و باش اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ہوتی رہے ہر کوئی تو نیٹ پر ہر وقت نہیں بیٹھتا ناں...... دلہن نمبر میں زیادہ دلہنیں لگانی چاہیے تھیں اگر ایک شمارہ رنگین تصویروں کا ہو تو مزہ آجائے۔ احوال بڑے دلچسپ تھے۔ (انشاء اللہ آئندہ سال ہر صفحے پر دلہن ہوگی) دین کے صفحات معلومات سے پُر تھے۔ اختر شجاعت تعریف کے لائق ہیں۔ روحانی مشورے مختصر ہونے چاہئیں جو آسانی سے وردِ زباں ہو جائیں اب جناب بہنوں کی محفل پر تبصرہ سرگرمیوں کے صفحات مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں۔ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور بیماروں کے لیے دعائے صحت کا سلسلہ اچھا ہے، نگہت سیما نے درست لکھا کہ ہما کوکب بخاری کی تحریریں ہم بھی پڑھنا چاہتے ہیں اور رفعت ناہید سجاد کو بھی ضرور واپس لائیں۔ (جی ضرور) موئل تنقید سے رضوانہ پرنس نے بہت اچھی ملاقات کروائی ان کے جوابات برجستہ اور سادگی سے پُر تھے۔ شائستہ زریں آپ کا بہت شکریہ کہ بڑے خوب صورت انداز میں آپ سراہتی ہیں۔ حیات ترمذی نے کاغان سے خط لکھا بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں تک ہمارا رسالہ پڑھا جاتا ہے ویسے میں جہاں بھی جاؤں بک شاپ پر پاکیزہ ضرور پوچھتی ہوں جو فوراً ہی مل جاتا ہے۔ ظلِ شاہین سے خاص طور پر عرض ہے کہ ہمیں خود بھی غزالہ سے گفتگو مختصر لگی انشاء اللہ زندگی رہی تو غزالہ جب پاکستان آئیں گی تو مزید باتیں ہوں گی۔ انٹرویو پسند کرنے کا شکریہ یہ انجم باجی اور عذرا رسول صاحبہ کی رہنمائی سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ اقبال بانو صاحبہ انٹرویو دینے کے بعد آپ خاموش ہوگئیں آپ کا افسانہ بھی ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ غزالہ آپا، آپ کی حوصلہ افزائی کا اور انٹرویو کی تعریف کا شکریہ۔ آپ نے جوابات ہی اتنے درست اور تفصیلی دیے ہیں کہ تمام پڑھنے والوں کو مزہ آیا اور جو قارئین آپ کو پڑھتے آئے ہیں۔ ان کے لیے تو نہایت مسرت کا مقام تھا کہ ایک عرصے بعد آپ پاکیزہ میں نظر آئیں۔ آپ کی دعاؤں اور نیک خواہشات کا بے حد شکریہ۔ ان تمام بہنوں کا بھی شکریہ کہ جنہیں وہ آئے بزم میں کا سلسلہ پسند آ رہا ہے۔ آخر میں دونوں ناولوں پر بات ایک تو عنیزہ سید نے بہت خوب صورت ناول لکھا، ان کی گرفت اول سے آخر تک مضبوط رہی اور تمام کرداروں کے نتائج سے بھی آگاہ کیا...... دوسرا ستمبر میں ختم ہونے والا رفعت سراج کا ناول جو آخری دو اقساط کو تیزی سے لے

گئیں مگر کہانی اپنے منطقی انجام کو ہی پہنچی۔ وہ الگ بات کہ کچھ باتیں قارئین کے ذہنوں میں کلبلاتی رہ گئیں مگر جملوں کے ذریعے آپ نے کافی حد تک وضاحت کر دی۔ ناولٹ ترکِ وفا میں نایاب جیلانی جس خوب صورتی سے منظر نگاری اور کردار نگاری کر رہی ہیں اس کا جواب نہیں۔ ذہن میں تصویر بنتی چلی جاتی ہے۔" (پیاری نزہت تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

٭ اختر شجاعت، کراچی سے۔ "سب سے پہلے اداریہ دیکھا دل کو چھو گیا...... یقین کرو آج کے لوگوں کا درست تجزیہ کیا ہے...... کاش ہمیں اپنے رب پر توکل کرنا آجائے۔ غزالہ نگار کا انٹرویو بہت ہی بھرپور تھا۔ ان کی تحریریں ہمیشہ ہی پسند رہی ہیں۔ شمیم فضل خالق سے بھی گفتگو دلچسپ رہی، نزہت صاحبہ آپ انٹرویو کے سلسلے بخوبی نبھا رہی ہیں۔ شائستہ زریں واقعی بہت محبت سے اپنا سروے مرتب کرتی ہیں اور بہت مزہ آتا ہے۔ ہاں عظمیٰ کا سفرنامہ پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ کراچی میں بیٹھ کر ملائشیا کی سیر کر لی...... بہت لطف آیا۔ پُرمزاح اور برجستہ جملے کمال کے تھے اور پھر دل کے اندر چھپی اپنے دیس کی محبت جگہ جگہ چھلک رہی تھی۔ اگر کبھی اپنے ایمان کو چیک کرنا ہو تو دیکھو کہ اپنے وطن سے کتنی محبت ہے۔ عظمیٰ بیٹا تم تو اپنے سفرناموں پر مشتمل دلچسپ ایک کتاب شائع کروالو۔ بہرحال دونوں اقساط بے حد دلچسپ تھیں۔ ہاں جلترنگ پر کچھ نہیں بولوں گی۔ یہ تحریر ایسی ہے جو تبصرے سے بہت آگے ہے۔ ہاں آپ کے عمرے کی تفصیلی روداد کی منتظر ہوں۔" (تبصرے کا شکریہ)

٭ ناہید فاطمہ حسنین، کراچی سے۔ "انجم باجی یوں تو ہمارا پورا وطن اور اہلِ وطن سب ہی مہمان نواز اور دل والے ہیں مگر یہاں آپ کو خاص طور پر اہلِ لاہور کے بارے میں بتاؤں کہ جہاں پچھلے دنوں کچھ ادبی اور نجی مصروفیت کے باعث جانا ہوا اور میں نے آپ کو ان سرگرمیوں کی اطلاع بھی دی تھی۔ میں نے کُل پانچ دنوں میں بھرپور لطف اٹھایا پہلے تو الحمرا کی ادبی بیٹھک میں شاعر اعتبار ساجد نے مدعو کیا ہوا تھا۔ الحبیب لٹریری فورم نے مجھے ادب کے عزیز نظامی ایوارڈ سے نوازا جو ادب کی سرو قد شخصیت بشریٰ رحمٰن کے ہاتھوں میں نے وصول کیا۔" کراچی والوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کمٹمنٹ کے بہت پکے ہوتے ہیں۔" ان تعریفی الفاظ کے ساتھ جب مجھے ایوارڈ کی دعوت دی گئی تو کراچی کے نام پر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا...... بشریٰ رحمٰن نے بڑی اپنائیت سے مصافحہ کیا گرم جوشی سے جھپی ڈالی۔ وہاں موجود ادب کی قد آور شخصیات نے ہمیں یعنی مجھے اور میرے بیٹے عُزیر کو فوری طور پر چائے اور کھانے کی دعوت دے ڈالی لیکن ہمارے پاس وہی وقت کی قلت...... سو سب سے معذرت کی۔ ایوب عافی صاحب جو BJB قوالی گروپ کے روحِ رواں ہیں نے بہت انکار کے باوجود ہمیں بہترین ریسٹورنٹ میں ڈنر کروا دیا...... رات گئے وہ ہمیں مختلف مقامات دکھاتے اور ان کے حوالے سے معلومات بہم پہنچاتے رہے۔ ایوب عافی انتہائی منکسر المزاج سادہ اور بہت عمدہ شاعر ہیں۔ میں نے لاہور پہنچنے کے اگلے روز ہی احباب اور رشتے داروں کو فون کھڑکھڑانے شروع کیے جس کے نتیجے میں کسی سے بات ہو پائی کسی سے نہیں۔ دُردانہ نوشین جو مظفر گڑھ میں رہتی ہیں ان سے فون پر بات چیت ہوئی۔ وہ اپنے ہاں بلانے پر اصرار کر رہی تھیں۔ بشریٰ مسرور جو اب اسلام آباد میں ہیں انہوں نے بھی اسلام آباد مدعو کیا۔ غرضیکہ اپنے دوست احباب، رشتے داروں سے بات چیت کرنے میں بہت لطف آیا۔ تیسرے دن ہم واہگہ بارڈر کے لیے روانہ ہوئے۔ واہگہ بارڈر پر شام پانچ بجے ایک پُروقار تقریب...... ہوتی ہے جو مغرب کے وقت اختتام پزیر ہوتی ہے۔ اس تقریب میں انڈیا اور پاکستان اپنے، اپنے جھنڈے اتارتے ہیں اور پھر اگلے دن علی الصباح دوبارہ لگائے جاتے ہیں۔ واہگہ بارڈر کا ماڈل ٹاؤن سے فاصلہ 32 کلومیٹر ہے۔ اس تقریب کی کوریج کے لیے کچھ غیر ملکی صحافی و سیاح بھی موجود تھے۔ دونوں طرف اپنے، اپنے ملک کے نغمے بھی نشر کیے جا رہے تھے۔ رینجرز کی پریڈ کے بعد جھنڈے کو بہت احترام سے اتار کر اس مقام کی تیسری منزل پر جہاں قائداعظم کی تصویر انلارج لگی ہوئی تھی جھنڈے کو رکھا گیا۔ یہ ایک انتہائی منظم و منفرد تقریب تھی۔ لاہور آئیں اور جناب شاپنگ نہ کی جائے یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہم نے انارکلی سے لے کر لبرٹی اور فورٹریس تک کے شاپنگ سینٹرز کی سیر کی۔ کچھ اشیا کراچی سے مہنگی اور جوتے، چپل، لیدر گڈز، بیگ، پرس وغیرہ اعلیٰ معیار کے اور نسبتاً سستے لگے۔ آخری دن ہمارے اعزاز میں ریاض رومانی صاحب نے ایک بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا جس کے صدر جناب معروف شاعر اعتبار ساجد صاحب اور مہمانِ اعزازی مجھ ناچیز کو بنایا گیا تھا۔ میں نے کراچی کے حوالے سے دو غزلیں سنائیں جن پر مجھے بھرپور داد ملی۔ بجا طور پر لاہور والے داد دینے میں بہت سخی ہیں۔ آخر میں صدر صاحب نے اپنی غزل

سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ ان کا ایک قطعہ جو مجھے بے پناہ پسند ہے، آپ بھی سنیے۔

رہا پا برہنہ وہ خود مگر نیا بوٹ مجھ کو دلا دیا
میرے باپ کے اسی ادب نے مجھے باپ جیسا بنا دیا
کبھی سردیوں میں ہوا چلی تو ٹھٹرتی رات کو فرش پر
میرا باپ چپکے سے سوگیا مجھے اپنا کھیس اوڑھا دیا

اگلا دن ہمارا پیکنگ میں گزرا اور ہم جانے سے چند گھنٹے قبل داتا دربار پر حاضر تھے کہ یہاں کی حاضری نہ کی تو کچھ نہ کیا۔ لاہور آئے تو ہم بائی ایئر تھے مگر ہماری کراچی واپسی بزنس ٹرین سے تھی۔ میں لاہور کے تیزی سے گزرتے مناظر نظروں میں جذب کرتی جارہی تھی۔ لاہور کا پانچ روزہ سفر شاید میں بھلا ہی نہیں پاؤں۔ جہاں زندگی کے ہر طبقے اور شعبے سے تعلق رکھنے والے فرد نے ہمیں عزت اور محبت دی۔ میں نے خاص طور پر یہ لکھ کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ شہر لاہور سے تعلق رکھنے والی رائٹرز اور قاری بہنوں کو میرا بہت بہت سلام۔" (شکریہ آپ کے سفر کی روداد پڑھ کر اچھا لگا)

☜ مہوش ہاشمی، موڑ کھنڈا سے۔ "دس سال سے پاکیزہ کی قاری ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ پاکیزہ سے میرا رشتہ تو لازم و ملزوم سا ہے۔ عنیزہ سید، عمیرہ احمد، فرحانہ ناز ملک، رفعت سراج کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ انجم آنٹی ایسی شخصیت ہیں جن کی تعریف میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ مجھے کچھ کہنا ہے، اور بہنوں کی محفل بہت پسند ہیں، کافی عرصے سے آپ کا کوئی ناول نہیں پڑھا۔ پلیز آنٹی آپ بھی لکھیں۔ امانت میں شبینہ اور احمر کی ایک ملاقات تو ہونی چاہیے۔ برہان کی شادی کا فیصلہ رابی کے لیے تو بہت بڑا صدمہ ہوگا۔ شام شہر یاراں میں مہر زاد کا کردار بہت زیادہ پسند آیا ہے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی ایسے سیاست دان ہوتے۔ باقی سب کے لیے قربانی دے کر شام تو بس مہر زاد کے حصے میں آئی ہے۔ ترک وفا میں تو مالا کی الجھنیں بڑھتی جارہی ہیں بہت ہی سنسنی خیز اسٹوری ہے۔ آنٹی میں بھی پاکیزہ میں اپنے افسانے بھیجنا چاہتی ہوں۔" (اس محفل میں خوش آمدید، بیٹی کے موضوع پر آپ کا افسانہ پڑھا۔ ابھی آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔ آپ مطالعہ کثرت سے کریں اور پھر اپنی کہانیاں ہمیں بھیجیں)

☜ امینہ عندلیب، سلانوالی سے "۔ ان دنوں میں پھر شدید بیمار ہوں۔ اپنی تمام بہنوں کے لیے میرے دل میں بے حد محبت اور احترام ہے۔ میری سب بہنیں دعاؤں میں ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو سلامت، خوش رکھے، آمین۔ مجھ سے اگر کوئی بہن خفا ہے تو پلیز فراغ دلی سے اپنی ناچیز بہن کو معاف کردیں اور باجی جان آپ پاکیزہ میں میرا تذکرہ پیار سے کرتی ہیں، کچھ بہنوں نے رابطہ ختم کردیا، وہ ان کی مرضی...... اللہ انہیں خوش رکھے۔ میں نے کئی بار ان بہنوں کو فون کیا، اٹینڈ نہیں کیا بذریعہ میسج بھی میں نے ان سے پوچھنے کی کوشش کی' جواب نہیں آیا مگر اللہ تعالیٰ سب بہنوں کو شاد و آباد رکھے۔" (پیاری بہنو...... امینہ سے رابطے میں رہو، یہ لڑکی ہر ایک سے سچی محبت کرتی ہے)

☜ تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ "دیپ دل کے جلنے میں بیٹی کی خوب صورتی نے باپ کو بالکل ہی سوچ سمجھ سے بالاتر کردیا اور دولت کی پٹی آنکھوں پر چڑھا دی جو سگے بھتیجے کو دھتکار دیتا ہے مگر ظرف ہو تو حفیظ الدین جیسا جو اپنے بھائی کی سب بے عزتی بھلا کر مشکل وقت میں پھر سے گلے لگا لیتا ہے۔ شام شہر یاراں میں کلیم اور سلیم بالکل کاروباری سوچ کے حامل نکلے بہن کے رشتے میں بھی اپنا ہی نفع سوچا۔ بہرحال دانیال کو اس طرح زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑیں گے۔ زوئی تو ہم پیدائشی مسلمانوں سے بھی زیادہ پکی نکلی جو مرغیاں بھی اپنی نگرانی میں ذبح کرواتی ہے۔ واہ زوئی واہ...... ویسے عنیزہ سید نے ہمیں نیا ادراک دیا۔ کیچڑ میں کنول، شہزادی کی شدید خواہش کے باوجود اسے یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ وہ واقعی جس باپ کی بیٹی ہے اس کا تعلق اس کوٹھے سے نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تو بہت برا ہوا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا اور کھجور میں اٹک کر جان ہی دے دی۔ ام ایمان کی دھوپ میں سائبان میں پہلی بات یہ کہ جس طرح مقبول احمد کی شادی اس کی رضا کے بغیر ہوئی اس طرح والدین کو نہیں کرنا چاہیے سعدیہ رئیس کی ماڈل گرل گو کہ پرانی بات مگر ہر دور میں یہی ہوتا آیا ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

☜ تسنیم قریشی، کوہاٹ سے۔ "پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا ہمیشہ کی طرح آپ نے موقع کی مناسبت سے بہت اچھا

لکھا۔ پھر اس کے بعد علم، معرفت الٰہی سے مستفید ہوئے۔ بہت ہی معلوماتی اور ایمان افروز سلسلہ ہے۔ نگہت سیما کی تحریر ایک عمر کے بعد شکر ہے سویرا اقبال کو ایک عمر کے بعد ہی سہی حقیقی رشتوں کی حقیقی محبت مل تو گئی۔ تحریر پسند آئی۔ نایاب جیلانی کا ناولٹ اچھا جارہا ہے۔ سمیرا حمید، ام ثمامہ، شیریں حیدر، ام مریم، عقیلہ حق وغیرہ سب نے اچھا لکھا۔ لیکن ایک تحریر جس نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کی دس نمبر کا سوال۔ حقیقت پر مبنی سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے والی عمدہ تحریر سارے پاکیزہ کی جان تھی۔ عظمیٰ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہم سب کی خواہش پر پاکیزہ کے لیے لکھا۔ آپ کے خوب صورت اندازِ تحریر کے ساتھ سفرنامے کا پہلا حصہ بہت پسند آیا اور دوسرے کا انتظار ہے۔ خاص کر انڈین عورت سے ملاقات کو تو ہم نے بھی بہت انجوائے کیا۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی پاکیزہ کے لیے ایسی خوب صورت تحریریں لکھتی رہیں گی۔ موئل شنید سے ملاقات اچھی لگی اور پلیز ناہید سلطانہ اختر، عنیزہ سید، عظمیٰ آفاق اور عمیرہ احمد سے بھی ملاقات کروائیں۔ نزہت اصغر صاحبہ کو سلام۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

☜ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔ "اپنی تمام تر توانائیوں سمیت آپ سے پھر مخاطب ہوں۔ اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے کہ کسی بھی حالت میں اپنے حوصلے کو مت گراؤ۔ سرورق پرانی فلموں کی ہیروئن جیسا لگا۔ سب سے پہلے تو بہنوں کی محفل میں آپ کا عمرے کا مختصر سا حال پڑھا جسے پڑھ کر جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میری آنکھوں میں بھی وہی مناظر گھوم گئے۔ جب ربِ کائنات نے مجھ عاصی کو بھی اپنے گھر اور اپنے حبیب کے روضے پر بلایا تھا۔ باجی میں بھی اپنے اس حسین سفر کا حال لکھنا چاہتی ہوں کیا لکھ کر بھیج دوں۔ عظمیٰ نے تو گھر بیٹھے ملائشیا کی سیر کروادی مزید مقامات دیکھنے اور جاننے کے لیے بے تاب ہوں۔" (مختصراً احوال بھیج دیں)

☜ سیدہ عطیہ زاہرہ، لاہور سے۔ "خوب صورت سرورق تھا۔ کہانیوں کا انتخاب بھی بہت اچھا تھا۔ دلہن نمبر کے لحاظ سے پرچہ بہت اچھا ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کے لیے میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں۔" (شکریہ)

☜ مہرین ہاشمی، ننکانہ صاحب سے۔ "تمام رائٹرز بھی اچھی ہیں اور عمیرہ احمد تو میری ہارٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ آنٹی آپ مجھے بہت، بہت اچھی لگتی ہیں۔ آنٹی ایک بات پوچھنی تھی کہ اگر کسی افسانے یا ناولٹ میں کوئی ورڈنگ اچھی لگے تو کیا ہم آپ کے رسالے یا کسی اور میگزین میں بھیج سکتے ہیں۔" (مگر اس میں رائٹر کا نام ضرور شامل کیجیے گا)

☜ سنبل ملک لاہور سے۔ "ملائشیا کی سیر، سفرنامہ بہت خوب صورت لکھا۔ آنٹی انجم کو عمرے کی دوبارہ سے بہت بہت مبارک۔ کچھ لوگ تو زندگی میں ایک بار ہی وہاں جانے کی حسرت کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے ہیں جبکہ آنٹی انجم جیسے خوش نصیب بار بار فیض یاب ہوتے ہیں۔ اجیہ جیسے بچے جو خاندان سمیت بیرونِ ملک سیر پر جاتے ہیں اور کچھ پاکستان کے اندر اپنے شہر کو ہی دیکھنے کی حسرت پوری نہیں کرپاتے۔ جانتی ہوں کہ میری رائے کی کیا اہمیت ہے پھر بھی قلم سچ اگلنے سے باز نہیں آتا۔ ایک اور سوال؟ آنٹی جی، ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو سچا ہو اسے ذلیل و خوار کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ اکیلا ہی سچ کی خاطر کھڑا ہوتا ہے۔ اگر اللہ کی مہربانی ہو تو وہ کوئی معجزہ کردے تو سچا شخص بری الذمہ ورنہ سزا کا مستحق...... آنٹی رفعت سراج کی امانت اس مرتبہ مزید عقل کی گرہیں کھول گیا۔ رابی کا ردِعمل کیا ہوگا جب اسے برہان اور کائناز کے رشتے کا پتا چلے گا یہ سسپنس باقی ہے اور جابر علی کا کیا بنتا ہے کیونکہ وارث علی تو فرار ہوگیا۔ جبکہ ایس پی شاہ زمان کو بھی سزا ملنی چاہیے۔ شام شہر یاراں کیا خوب صورت اینڈ کیا ہے، سلیوٹ پیش کرتے ہیں آنٹی عنیزہ سید کو...... میرال صلاح الدین واقعی ایک کنول تھی جبکہ حمزہ کو اس کے والد کی سپورٹ نے کامیاب کردیا اور عافیہ آنٹی نے بھی مصالحت اختیار کی جو ان کی ذہنی پختگی کا ثبوت ہے۔ دس نمبر کا سوال ایک تجزیہ ایک تجربہ جو ہم سب کو روزانہ ہوتا ہے مگر جس خوب صورتی سے لفظوں کی صورت میں ناہید سلطانہ اختر نے ڈھالا واقعی زبردست تھا مگر ساتھ ایک شکوہ بھی اگر نو وارد یا ہم جیسے نئے لوگ لکھ کر بھیجتے تو آپ کبھی شائع نہیں کرتیں۔" (ناہید سلطانہ جیسی رواں تحریر لکھنے کے لیے ایک تجربہ چاہیے۔ آپ کیا ناہید سلطانہ اختر جیسا میں نہیں لکھ سکتی)

☜ سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ سے۔ "سارے افسانے ہی زبردست رہے۔ پاکیزہ ڈائری، بہنوں کی محفل اور میں اکثر گنگناتی ہوں میرے موسٹ فیورٹ سلسلے ہیں۔ اپیا جی پچھلے سال بہت صبر آزما مراحل کے بعد ایک بک شائع ہوئی مگر حالات،

واقعات اور پے در پے حادثات نے اتنا موقع نہیں دیا کہ اس کی رونمائی یا ڈسٹری بیوشن کی طرف توجہ دے پاتی۔ اب ذرا سی سنبھلی ہوں تو سوچ رہی ہوں اس جانب توجہ دوں۔ دوسری بات میں افسانہ نگاری میں اور شاعری میں نام کمانا چاہتی ہوں۔ پلیز میری رہنمائی کریں۔" (آپ اپنی نظمیں، غزلیں مجھے ارسال کریں، میں انہیں ضرور شامل کروں گی)

✿ رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان سے۔ "عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ پڑھ کر اتنا مزہ آیا کہ کیا بتاؤں...... مومل شنید سے ملاقات خوب رہی۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر سبق آموز تھی۔ ام ثمامہ کی کرتار سنگھ بہت اچھی لگی۔ واقعی یہ بات بھی سچ ہے جیسے پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ویسے ہی سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کرتار سنگھ نے کتنی بڑی قربانی دی مگر آج کل نفسانفسی کے اس دور میں ایسی دوستیاں ایسا مخلص پن کم ہی ملتا ہے۔ شیریں حیدر کی تحریر بوجھ بیٹیوں کا بہترین تھی۔ مجھے بھی اللہ پاک نے 3 بیٹیاں دی ہیں اور میرے لیے وہ قیمتی ہیروں جیسی ہیں۔ سمیرا حمید بہت اعلیٰ، زبردست، بہت ہی اچھا لکھتی ہو۔ انجم آنٹی جلترنگ میں دیورانی کے نام عید کارڈ پڑھ کر میں اور میری جیٹھانی بہت ہنسے۔ ویسے آپ کو یہ دیورانیوں، جیٹھانیوں والے حالات کا کیسے پتا چل جاتا ہے۔ سچی قسم سے ایسا ہی ہوتا ہے ناں اکثر...... واہ، واہ...... بہت مزہ آیا اور بس اب آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔ دیکھوں گی مجھے آپ کی رنگین، دلکش سی محفل میں کتنی جگہ ملتی ہے۔" (تبصرے کا شکریہ، ہر ماہ اپنے تبصرے کے ساتھ شرکت کرو اور مجھے خوش رکھو)

✿ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ "ایک نشست میں اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر نگہت سیما کا ناولٹ پڑھا۔ اک عمر کے بعد۔ رومینٹک ٹائپ سے ہٹ کر انتہائی حساس اور بہترین موضوع ایک غیر معمولی حساس بچی اور بے پروا سنگدل والدین کے مابین جو رشتہ تھا جو واقعات کے اتار چڑھاؤ تھے ان کا ایک، ایک لفظ ہمیں رُلا دینے کے لیے کافی تھا۔ (نہ صرف میں بلکہ میری چھوٹی بہن گل بھی یہ ناولٹ پڑھ کر بہت روئی) مجھے ایک بات کچھ ہضم نہیں ہوئی کہ ایک گلی میں رہتے ہوئے کیا ماں، باپ اس قدر سنگدل ہو سکتے ہیں کہ اپنی ایک اولاد کو اتنے برے طریقے سے نظر انداز کر دیں کہ اس بچی کے دل میں زخم نہیں ناسور بن گئے۔ سویرا اقبال کے بچپن کے رویئے، اس قدر بے بسی، خاموشی، والدین اور بہن بھائیوں کی عدم توجہی، انسانی نفسیات کا اس قدر عمیق مشاہدہ...... نگہت آپا لگتا ہے کہ آپ کے قلم میں سیاہی کے بجائے نمکین پانی ہے اور آنسوؤں سے لکھے یہ الفاظ مسلسل ہمارے دل و نظر کو جل تھل کرتے رہے۔ گاؤں کا ماحول وہاں کا کلچر ایک کسان اور اس کی تمام فیملی ان کے عمومی رویئے سب حقائق پر مبنی تھے کردار نگاری بہت عمدہ اور فطری انداز میں کی گئی۔ آخر میں باری کے کردار نے سویرا اقبال کا دل صاف کرنے میں زخموں پر مرہم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تو کچھ ہمارے بھی آنسو تھمے اختتام خوشگوار رہا شکر ہے کہ والدین حیات تھے جو انہوں نے سویرا اقبال کو اپنے سینے سے لگا کر اس کی برسوں کی تشنگی مٹا دی۔ ویسے مجھے گلہ استانی جی کے کردار سے بھی ہے کہ انہوں نے قدم، قدم پر اس بچی کو یہ احساس کیوں دلایا کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہیں ہے وہ تمام ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے ساتھ، ساتھ اس کو ماں کی محبت بھی دیتیں تو بات تھی بہرحال نگہت آپا کی یہ یادگار تحریر تھی پھر ناہید سلطانہ اختر کی تحریر دس نمبر کا سوال پڑھی۔ جس نے ہلا کر رکھ دیا۔ ناہید آپا نے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ ہمارے گورنمنٹ اسپتالوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ غریب اور سادہ لوح لوگوں کے ساتھ ایسا ہی انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے ہاں جن کے سورسز اسپتالوں میں ہوتے ہیں ان کی شنوائی ہو جاتی ہے۔ ورنہ ڈاکٹرز اور نرسوں کی بے پروائی اور عدم توجہی سے کتنے ہی لوگ روزانہ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور اب ذکر ہو جائے عظمیٰ آفاق کے سفرنامے کا، ویلڈن عظمیٰ جی آپ نے ثابت کر دیا کہ انجم انصار کی بیٹی ہو، وہی باجی والا اسٹائل مگر نیا انداز نئے طرزِ تحریر کے ساتھ! عظمیٰ تم نے بھی لفظوں کے جلترنگ بجا ڈالے۔ کتنے ہی مقام پر پڑھتے، پڑھتے میں ہنسی نہ ضبط کر سکی بہت خوب صورت نیچرل اندازِ تحریر ہے۔ ہمیں بہت خوشگوار ماحول میں ملائشیا کی معلومات مل رہی ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار ہے ویسے باجی آپس کی بات ہے کیا اسکول ٹرپ آؤٹ آف کنٹری بھی جاتے ہیں۔" (جی ہاں، گزشتہ دنوں میرا ایک نواسا اپنے اسکول کا میچ کھیلنے دبئی گیا ہوا تھا اور ماشاءاللہ سب ہار کر بھی آئے تھے)

✿ یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور سے۔ "بہت شکریہ کہ آپ نے اگست کے شمارے میں میری نظم شائع کی جس کے لیے میں جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ مجھے ناول امانت اور ترکِ وفا بہت، بہت پسند ہے۔ جلترنگ تو بڑے مزے کا ہوتا ہے

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... آپی میری درخواست ہے فاطمہ زہرا جبیں کا انٹرویو ضرور شائع کریں، اب ان کا کوئی افسانہ نہ کوئی ذکر کبھی نظر سے گزرا۔ جولائی کی بہنوں کی محفل میں ان کا نام پڑھ کر دل بڑے خوشگوار انداز میں دھڑکا۔ آپ نے غالباً انہیں سالگرہ کی مبارک باد دی تھی۔ آپی فاطمہ زہرا جبیں ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ بڑی، بڑی خوب صورت سی آنکھوں والی ہم سب کی جبیں باجی جنہیں دیکھنے کے لیے میں گھنٹوں دروازے پر کھڑی رہتی تھی۔ بڑی پیاری اور بہت محبت کرنے والی ان کی سب سے چھوٹی بہن نگین میری دوست اور کلاس فیلو تھی۔ ہم نے سب سے پہلے پاکیزہ انہی کا چرا کر پڑھا تھا۔ بعد میں انہیں پتا چلا تو وہ محبت سے خود دے دیتی تھیں۔" (فاطمہ زہرا جبیں فیس بک پر موجود ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کر سکتی ہیں اور یہ ہماری بہت پرانی دوست بھی ہیں)

✿ شبنم کنول، پاپا نگری سے۔ "دین کی باتوں کا سلسلہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں پروین افضل، صبا کمال، زریں ارمان کے شعر بڑے پسند آئے پھر میں نے جلدی سے اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مجھے اپنا نام کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ بوجھل دل کے ساتھ بہنوں کی محفل میں قدم رکھا تو اپنا نام دیکھ کر دل باغ، باغ ہو گیا۔ پاکیزہ میں عنیزہ سید نے شام شہر یاراں کا اینڈ بالآخر کر ہی دیا آخری قسط بہت اچھی تھی۔ ویل ڈن عنیزہ آپ کو میری طرف سے ناول مکمل ہونے پر مبارک باد اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے بھی اچھا لکھنے کی توفیق دے۔ شیریں حیدر، ام مریم، شائستہ عزیز، حمیرا خان سب کے افسانے اچھے رہے۔" (شکریہ)

✿ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ "دلہن نمبر شاندار...... رفعت سراج کے ناول کی آخری قسط ٹھیک رہی۔ نگہت سیما کے ناول کا آغاز اچھا ہے۔ آگے، آگے دیکھتے ہیں زاہدہ پروین کے ناولٹ کے بارے میں رائے بعد میں دوں گی۔ شیریں حیدر کی تحریر مجھے ہمیشہ بہت پسند آتی ہیں۔ شائستہ زریں کا سروے بہت ہی اچھا تھا اور شمیم فضل خالق کتنی سادہ اور سوئٹ سی ہیں۔ اب سیما مناف، عنیزہ سید، قیصرہ حیات سے جلد ملاقات ہونی چاہیے۔ عظمیٰ آفاق کا یہ سفرنامہ بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہے اور اسے پڑھ کر مجھے بہت ہی لطف آیا۔ کیا یہ ان کا پہلا سفرنامہ ہے۔" (تبصرے کا شکریہ، یہ عظمیٰ کا چوتھا سفرنامہ ہے، پہلا امریکا کے بارے میں تھا، دوسرا پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے بارے میں تیسرا اس نے اپنے پہلے عمرے کے بارے میں لکھا تھا اور یہ تینوں سفرنامے دیگر رسائل میں شائع ہوئے تھے)

✿ آمنہ پرواعالیہ، جہانیاں سے۔ "پاکیزہ میں ایسی پزیرائی ہوئی کہ دل پھر سے شرکت کے لیے مچل اٹھا۔ ہمارا تبصرہ پاکیزہ میں شامل کرنے اور مصنفین تک پہنچانے کا بے حد شکریہ...... پاکیزہ ایک لاجواب پرچہ ہے۔ خصوصاً خطوط اور ان کے جوابات، لاجواب، باکمال، بے مثال ہوتے ہیں۔ سلسلے وار ناول ہمیشہ کی طرح بہترین لگے۔ اگرچہ ہم نے پہلی، پہلی اقساط نہیں پڑھیں پھر بھی مصنفین کا اندازِ تحریر دلچسپی لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ سکینہ فرخ کا کاشانۂ الفت دل گداز تحریر تھی۔ باقی تحریروں میں ترکِ وفا کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا...... ایک منجھا ہوا قلم کار جو اپنے اندازِ تحریر سے ساٹھ کی دہائی تک کا تجربہ رکھتا ہے۔ ترکِ وفا ایک ہی نشست میں مکمل کر لینے، پڑھ لینے پر اکسانے والی تحریر ہے۔ فرحانہ ناز صاحبہ کا اندازِ تحریر لاجواب ہے۔ یہ شگفتہ تحریروں کی قلم کار ہیں، جانے کیوں اس دفعہ متاثر نہیں کر سکیں۔ ہالا احمد نے یقینی طور پر تلوار سے تبصرہ لکھا تھا۔ پڑھ کر کڑواہٹ سی محسوس ہوئی۔ لکھنے والا بھی تو انسان ہے کوئی مشین نہیں...... محترمہ کا تبصرہ بہت بے رحمانہ تھا۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ باقی پاکیزہ اپنے دورِ عروج پر ہے اور پاکیزہ کی مصنفات اپنے فن کے کمال پر ہیں۔" (شکریہ)

✿ فرخین اشفاق، گگو منڈی سے۔ "سب سے پہلے ترکِ وفا پڑھی...... یہ قسط بھی سسپنس سے بھرپور تھی۔ شامِ شہر یاراں اور امانت کے بعد نگہت سیما کے مکمل ناول اک عمر کے بعد پر آئے، بہت زبردست ناول مزہ آ گیا پڑھ کر...... سمیرا حمید، پریم ریت لیے اپنے مخصوص انداز میں آئیں۔ افسانے بھی سب اچھے لگے لیکن تجدید وفا بس ٹھیک لگا (پسند اپنی اپنی) آپی عظمیٰ آفاق کے ساتھ ملائشیا کی سیر بھی مزے کی رہی۔ بہنوں کی محفل آج کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔" (آپ کا خط جو موجود تھا، دیگر تحریروں کو پسند کرنے کا شکریہ)

✿ حافظہ اقرار حمن، لاہور سے۔ "کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے۔ مجھے بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے کا

شوق تھا اور عمر کے ساتھ، ساتھ کہانیوں سے ناول، افسانے، ڈائجسٹ بھی پڑھنا شروع کردیے ہیں۔ میں نے پاکیزہ سے تعارف ایک سہیلی کے ذریعے کیا۔ بلاشبہ تمام رسالوں میں سب سے منفرد پاکیزہ ہے اور اس کی انفرادیت اس کی معیاری کہانیاں ہیں جو کہ ناول، ناولٹ، افسانے کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دین کی باتیں، اس کا مستقل سلسلہ ہے اور آج کے اس آشوب زدہ دور میں تو ایسی چیزوں کی ضرورت دگنی ہوگئی ہے، جنہیں ہم نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ جلترنگ ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ سندیسے، روحانی مشورے، ہومیو کلینک، پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں بھی بہترین سلسلے ہیں۔ پاکیزہ کا سلسلہ خوش ذائقہ کے لیے ریسیپی بھیج رہی ہوں، ضرور شامل کیجیے گا۔ ایک ناول لکھنے کا ارادہ ہے، ناول قسط وار بھیج سکتے ہیں یا نہیں۔'' (ناول بھیجنے سے پہلے اس کا ون لائنر بھیجا جاتا ہے تاکہ پسند آنے کی صورت میں لکھوایا جائے ورنہ نہیں)

٭ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''دلہن نمبر میں پیاری، پیاری دلہنوں کی تصویریں موجود ہیں۔ شائستہ زریں نے اپنے سروے میں اچھے سوالات کیے اور جواب بھی نصیحت آموز تھے۔ سب سے زیادہ خاموشی پر زور جو بہترین ہتھیار ہے گھر بسانے کے لیے۔ حمیرا کلیم نے شادی کا احوال بہت مزے کا لکھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان کی تصویر بھی ہوتی۔ رفعت سراج نے اپنا ناول بہت جلدی سمیٹ لیا۔ تشنگی تو رہی مگر مصنفہ بہتر جانتی ہیں۔ مگر کائناز کے ساتھ بہت برا ہوا۔ آگے بڑھے تو ترک وفا اور اعتبار وفا دو، دو ناول سوچ میں پڑ گئے کہ پہلے کس کو پڑھیں پھر نایاب ہی جیت گئیں۔ کہانی سلو ہونے کے باوجود جاسوسی انداز میں دلچسپ ہے۔ شیریں حیدر نے بھی دلہن نمبر کے حوالے سے بہت خوب صورت تحریر لکھی ہے۔ نگہت سیما کا آغاز تو بہت اچھا ہے امید ہے کہ آگے کی اقساط میں وفاؤں کا امتحان ہوگا۔ زاہدہ پروین کے ناول کی قسط بھی اچھی لگی اور دیسی مہینوں کا ذکر بھی اچھا ہے جو نئی لڑکیوں کو عجیب لگے گا۔ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ بہت ہی اچھی طرح سے ملائشیا کی سیر کروا گیا۔ بچوں کے ساتھ اتنی باریکی سے مشاہدہ کرنا اور پھر تفصیل سے لکھنا...... شاباش عظمیٰ...... ویسے تم نے دعا مانگنے کا طریقہ بھی اچھا بتایا ہے۔ بہت سے پڑھنے والے اس طریقے سے اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں۔ شمیم فضل خالق سے ملاقات اچھی رہی۔ واقعی بہت سادگی پسند اور سادہ سی خاتون ہیں۔ باقی کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ جلترنگ پڑھ کر ہم ٹینشن فری ہوجاتے ہیں۔''

٭ فرزانہ قادر، میانوالی سے۔ ''رفعت سراج کے ناول امانت کی آخری قسط بہت شوق سے پڑھی مگر کائناز کے ساتھ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہنوں کی محفل بھی بہت اچھی لگی مگر عظمیٰ کے سفرنامے نے زیادہ مزہ دیا۔ اب عظمیٰ کو ہر ماہ افسانہ یا ناولٹ ضرور دینا ہے۔ نگہت سیما کے ناول کی قسط ابھی پڑھی ہے جلد رائے دوں گی۔'' (جی ضرور)

٭ ثریا ناز، کراچی سے۔ ''باجی میرا گھر بکرا منڈی کے قریب ہے اور مجھے بکروں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس ماہ کی تحریریں سب پسند آئیں اور ساری دلہنیں تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ شمیم فضل خالق کی ساری تصویریں دھندلی سی تھیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ آپ مجھے اس محفل میں شامل کرتی ہیں کہ نہیں۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، گڑیا ہمیں تو بکروں سے نہیں ڈر لگتا...... مگر جب ان کی قیمت پوچھتے ہیں، تب واقعی ڈر جاتے ہیں۔ شمیم فضل خالق سے ہم کہہ رہے ہیں کہ جلدی سے خوب واضح تصویر ہمیں ارسال کیجیے گا تاکہ اسے ہم پاکیزہ میں لگاسکیں)

٭ مسز فرح امجد، لاہور سے۔ ''اس دفعہ کا دلہن نمبر اپنی مثال آپ تھا۔ حسب معمول ہماری رائٹرز بہنیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کررہی ہیں۔ ماشاءاللہ زور قلم اور زیادہ آپی آپ کے جلترنگ کی تو کیا ہی بات ہے، جتنا مرضی موڈ خراب ہو مگر جلترنگ پڑھتے ہی دل میں اور چہرے پر خوشی کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوجاتی ہیں۔ ''ویل ڈن'' آپی میں چھوٹی سی کہانی بھیجنا چاہتی ہوں امید کرتی ہوں کہ آپ اس کو پاکیزہ میں جگہ دیں گی اور پسند بھی کریں گی۔'' (پہلے تمہاری کہانی پڑھ لوں پھر ہی رائے دے سکوں گی)

٭ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''ٹائٹل دلہن نمبر کی مناسبت لیے ہوئے تھا۔ ہمیشہ کی طرح اداریہ ہیروں میں تولنے کے برابر تھا۔ یہ اعزاز بھی ہمارے پاکیزہ ڈائجسٹ کو جاتا ہے کہ اس کے اداریے ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ ہماری پیاری باجی انجم انصار کے مرہون منت ہے۔ سلسلے وار ناول کی آخری قسط نے بہت سی تشنگیوں کے پہلو چھوڑ دیے اور آخری قسط فوری طور پر لکھی گئی ہے۔ ساری قسطیں سلوموشن میں چل رہی تھیں۔ جبکہ آخری قسط 100 کی رفتار سے دوڑادی گئی۔ کہانی کا

اینڈ بالکل ٹھیک نہیں لگا۔ اعتبار وفا نگہت سیما کے نئے ناول کی پہلی قسط پڑھی ابھی رائے محفوظ ہے۔ اس شمارے کی سب سے خوب صورت، پُراثر اور جاندار تحریر...... دلہن وہی جو ساسو من بھائے۔ پڑھ کر بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ خوب صورت الفاظ، دلنشیں انداز اور متاثر کُن اندازِ بیاں...... جنگل کا پھول، بہترین الفاظ کا چناؤ منظر کشی لاجواب دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ثریا انجم کی آئندہ نہیں ہوگا میں انا پسند مردوں کی سوچ کی عکاسی کی مثال تھی۔ بس یونہی، بس یونہی سا تھا۔ عظمیٰ آفاق نے ہمیں فری میں ملائشیا کی سیر کروادی۔ ہزار روپے کا گنا ہاتھی کو کھلانا بہت دلچسپ اور مزیدار لگا۔ نزہت اصغر نے ہماری سینئر رائٹر شمیم فضل خالق سے ملاقات کرواکر دل کو گارڈن، گارڈن کردیا۔ ان کی سادگی لیکن محبت سے لبریز گفتگو دل کے اندر جاکر اتر گئی۔ نزہت کیپ اٹ اپ، شائستہ زریں کا سروے بھی بہت مفید اور کارآمد رہا۔ شادی مبارک دلہنوں کی تصویروں میں مجھے روبینہ حیات اور بینش ندیم کی تصاویر بہت اچھی لگیں۔ شادی کے احوال میں حمیرا کلیم کی شادی کا احوال کسی افسانے سے کم نہیں تھا۔ بہنوں کی محفل میں تمام بہنوں سے مل کر دل بہت شاد ہوا۔ بہن عالیہ بانو آپ کو آپ کے بیٹے کی بہت بہت مبارک باد ہو۔'' (شکریہ)

٭ نصرت جبیں ملک، لاہور سے۔ ''اگست کا شمارہ اس مرتبہ عید کے بعد ہاتھوں میں آیا۔ سرورق کی تصویر دیکھی تو فوراً ذہن میں آیا کہ یہ تو پاکستانی اداکارہ مونالیزا کی تصویر سے مشابہ ہے۔ مگر ہمارے ارمانوں کا خون ہونا تھا اور بھرم ٹوٹنا تھا۔ انڈیا میں جاکر انہوں نے جو کردار نبھائے اور نیم عریاں سین فلمبند کروائے تو ہم اب اپنا منہ شرم سے ہاتھوں میں چھپا لیتے ہیں۔ نہ جانے ہماری ان اداکاراؤں کی نظر میں شہرت کا معیار اتنا پست کیوں ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ یہ کر گزرتی ہیں اور سمجھتی ہیں اس طرح سے وہ درجہ اول کی ہیروئن بن جائیں گی مگر اپنی مشرقیت کو ان کے مقاصد کی بھینٹ چڑھا کر آخر انہیں نامراد لوٹنا پاکستان ہی پڑتا ہے۔ سوری باجی بات کچھ زیادہ لمبی ہوگئی مگر کیا کریں۔ دل کے پھپولوں سے خون رسنے لگا تھا۔ بہرحال اندر نام پڑھ کر اطمینان ہوا کہ یہ پیاری ماڈل رابعہ ہیں۔ سلسلے وار ناول میں آپی رفعت سراج اور عنیزہ سید ایک قدم کے فاصلے سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں۔ رفعت ڈائیلاگ ڈلیوری میں آگے ہیں تو عنیزہ سید کردار نگاری خوب کررہی ہیں کہ یہ کردار ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مرتبہ کرتار سنگھ، ام ثمامہ کا افسانہ نمبر لے گیا۔ ایک سکھ کے مثبت کردار کو وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔ امید کے جگنو میں نیر رانی ملکی حالات سے مایوس لوگوں کا احوال بتارہی تھیں۔ اس کے علاوہ شیریں حیدر، عقیلہ حق اور ناہید سلطانہ کی تحاریر بھی متاثر کُن اور سبق آموز تھیں۔ فسانہ نہیں حقیقت میں رضوانہ پرنس نے مول شنید سے ملاقات ہنستے کھیلتے ہوئے کروائی جو دلچسپی سے بھرپور تھی۔ عظمیٰ آفاق نے ملائشیا کی سیر اتنی باریک بینی سے کروائی کہ محسوس ہوا ہم بھی ان کی فیملی کے شانہ بشانہ سفر کررہے ہیں۔'' (شکریہ)

٭ ستارہ سینا، روہڑی سے۔ ''پاکیزہ پڑھنے کی عادت شادی سے پہلے کی ہے اور شادی کے بعد...... جبکہ اب بچے بھی ماشاءاللہ بڑے ہیں مگر میں پاکیزہ پڑھے بغیر سو نہیں سکتی۔ رات کو جب تک پاکیزہ نہ پڑھوں مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ مجھے پاکیزہ میں شائع ہونے والی سب کہانیاں بہت پسند آتی ہیں مگر جلترنگ کا تو جواب ہی نہیں ہے اور گزشتہ دو ماہ سے میں خاصی گھریلو پریشانیوں میں الجھی ہوئی تھی کہ میرے نندوئی بہت بیمار ہیں مگر عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ پڑھ کر میں واقعی پریشانیاں وقتی طور پر بھول کر مسکرانے لگی۔ ماشاءاللہ کیا اچھا لکھا ہے۔ مجھے تو مفت میں ملائشیا کی سیر کروادی۔ اب ان سے کہنا ہے کہ مزے، مزے کے افسانے بھی وہ لکھیں اور اپنے دوسرے سفرنامے بھی ضرور دیں۔'' (جی ضرور، خدا آپ کی پریشانیاں دور کرے)

٭ رابیل شاہ، ملائشیا سے۔ ''آنٹی بہت شکریہ کہ آپ پاکیزہ میں میرے بارے میں نیوز لگاتی رہتی ہیں۔ میں پاکستان سے شادی ہوکر یہاں آئی ہوں۔ میرے شوہر ڈاکٹر ہیں، عظمیٰ آفاق کی آمد کا پتا ہوتا تو میں ان سے ضرور ملتی۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ یہاں کے بارے میں انہوں نے ایک، ایک بات اتنی سچی اور اچھی لکھی ہے کہ پڑھ کر مزہ آگیا...... پلیز عظمیٰ پاکیزہ میں ہر ماہ اپنی تحریریں دیا کرو۔'' (عظمیٰ شکریہ کہتی ہیں)

٭ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے رفعت سراج کے ناول کی آخری قسط پڑھی۔ پڑھ کر مزہ آگیا۔ اور انہوں نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ سرورق اچھا تھا۔ دلہنوں کی تصویریں اور ان کے انٹرویو پسند آئے۔ شمیم فضل خالق کا انٹرویو پڑھ کر قدرے تشنگی رہی...... کچھ جوابات انہوں نے گول مول سے دیے۔ اب تک شائع ہونے والے تمام انٹرویوز میں سب سے اچھا انٹرویو

عذرا رسول کا تھا......انہوں نے سچائی سے اور خوب کھل کر جواب دیے تھے۔ ملائشیا کا سفرنامہ اچھا تھا۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ)

ﻫ روبی پیرزادہ، کریم پورہ پشاور سے۔ ’’اس دفعہ پاکیزہ تاخیر سے ملا سب سے پہلے ترک وفا پڑھا، مون کی شخصیت کے اسرار تو ابھی کھل کے نہیں دے رہے۔ یہ کھٹی میٹھی سوزن کتنی ہوشیار اور چالاک نکلی ہے۔ مون نے سچ ہی کہا تھا۔ عیسیٰ آستین میں سانپ پال رہا ہے۔ یعنی سوزن اور آفاق بھی گیم کا حصہ ہیں۔‘‘ (شکریہ)

ﻫ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ’’اس ماہ کا شمارہ خاصا لیٹ ملا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں مختصر پیراگراف میں ہی زندگی گزارنے کے کئی راز پوشیدہ تھے اگر سمجھ لیا جائے تو زندگی ہی سہل ہو جائے۔ دین کی باتیں دل و ذہن کو جلا بخشنے کا ایک خوب صورت سلسلہ ہے اس سے مستفید ہوتے ہوئے رفعت جی کے ناول تک پہنچی۔ ارے یہ کیا! اختتام کا پتا تو تھا کہ ہونے والا ہے پر اتنی جلدی سمیٹ دیا۔ رفعت سراج نے سالوں کے قصے ہی نپٹا ڈالے۔ ہالا احمد ایک ہلکے پھلکے مگر اہم موضوع کے ساتھ نظر آئیں کہ دوسروں کو تو ہم آرام سے نصیحت کر دیتے ہیں پر اپنی باری پر وہی چیز یا بات جو دوسرے کے لیے ٹھیک لگتی ہے غلط لگنے لگتی ہے۔ قول و فعل کے اس عمل میں ہم میں سے ہر ایک خود کو ٹھیک کر لے تو سب کچھ ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ نایاب جیلانی پہلی قسط سے ہی ہماری نبضوں کو پکڑ کے چل رہی ہیں اگلی ایک دو قسطوں میں شاید مالا کی زندگی کی الجھی ڈور کا سرا ملنے والا ہے۔ دلہن وہی جو ساسو من بھائے۔ شیریں حیدر نے ایک روایتی ماں کی بالکل حقیقی تصویر پیش کی جسے بیٹے کی بیوی آ جانے کے بعد اس کے چھن جانے کے وسوسے بہت دفعہ تکلیف دہ سوچ رکھنے اور عمل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آسیب بھی اچھی کوشش تھی۔ نگہت سیما سے امیدیں تو اچھی ہی وابستہ ہیں کہ ہمیشہ اچھی اور بہتر چیز ہی لاتی ہیں۔ ہاں اداسی کا عنصر بہت ہوتا ہے البتہ۔ ایک سوال، میں بہت خاص بات پوشیدہ تھی کہ واقعی اکیلی عورت کو اس مردوں کے معاشرے میں راہ میں پڑے ہوئے پتھر کی سی اہمیت دی جاتی ہے۔ دلدل ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ تھی۔ واقعی بعض دفعہ عورت اپنا گھر بچانے اور بنانے کی کوشش میں بہت کچھ گنوا دیتی ہے۔ اولاد کی محبت سے بھی کئی دفعہ ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ جنگل کا پھول پر تبصرہ مکمل ہونے کے بعد آئندہ نہیں ہوگا اچھی تھی۔ عظمیٰ جی کے سفرنامے کا آغاز اور احوال جتنا دلچسپ تھا اس کا اینڈ بھی اتنا ہی اچھا اور دلچسپ تھا۔ وہ آئے بزم میں رائٹرز سے ملاقات ہمیشہ مزہ دیتی ہے۔ شمیم فضل خالق صاحبہ سے ملاقات خوب رہی، شمارے کے خوب صورت سلسلے، بہنوں کی محفل، جسے میں ہمیشہ رات کو بچوں کو سلا کر سکون سے ایک ایک لفظ پڑھتی ہوں آپ سے اور قاری بہنوں سے آدھی ملاقات میں ہی پوری ملاقات کا مزہ آ جاتا ہے۔ اس بار جو آپ نے دعا یا آیت مجھے شوگر کے لیے بتائی تھی وہ دوبارہ دے دیجیے گا۔‘‘ (آپ فون کر کے پوچھ لیجیے گا، تبصرے کا شکریہ)

ﻫ شیریں ظفر، ملتان سے۔ ’’پاکیزہ کے سرورق پر دلہن نمبر کی دلہن دل کو کچھ خاص بھائی نہیں۔ انجم آنٹی کراچی میں ایک ہی طرح کی دلہنیں تیار کی جاتی ہیں۔ حالانکہ بہت ہی کم عمر دلہن کا چہرہ ہے مگر سرورق کے شایان نہیں۔ سب سے پہلے عظمیٰ آفاق صاحبہ کا سفرنامہ ملائشیا پڑھا کیونکہ لاسٹ ماہ سے ہی بقیہ پڑھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ بہت خوب، بہت شاندار، ہمیں بھی ملائشیا خوب پسند آیا۔ عظمیٰ جی آپ کی نیت صاف ہے۔ اللہ پاک آپ کو اور بھی نوازے۔ آپ نے بہت تفصیل سے لکھا۔ بہت باریکی سے بھی۔ اس کے بعد روانگی پکڑی اور پہنچ گئی بہنوں کی محفل میں۔ اپنا خط پا کر خوشی سے پھول گئی۔ محترمہ اختر شجاعت کا مضمون بہت شاندار ہے اس کے صفحات بڑھائیں، کم از کم ایک واقعہ تو مکمل شائع ہو سکے۔ تمام خطوط پڑھ ڈالے۔ یقین جانیں پاکیزہ وہ واحد ڈائجسٹ ہے جس کے تمام خطوط بھی کہانیوں کی طرح دلچسپ ہیں اور بہنوں کی محفل میں تو میری جان ہے۔ یہ واحد ڈائجسٹ ہے کہ جس میں رائٹرز کے ساتھ قارئین کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے۔ انجم آنٹی اس کا سارا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ آپ نے ہم سب کو ایک لڑی میں پرو کر ہار بنا دیا ہے۔ اس ڈائجسٹ کا معیار اسی لیے باقی سب سے الگ ہے۔ نایاب جیلانی کا ترکِ وفا، مون حسیب نے کس بات کا حساب لیا معصوم صفت مالا سے۔ اپنے بھائی عیسیٰ سے، آفاق سے......اور اب یہ قسط کا اینڈ پڑھ کر تو لگا مون کا ٹاکرا ہو گیا ہے ذی شاہ سے کیونکہ اس کے دماغ کی شعاعیں اتنی تیز ہیں کہ پاکستان تک ذی شاہ کے دماغ کو جرمنی آنے کے سگنل دیے ہیں۔ اور رفعت سراج نے امانت کے ساتھ کیا کیا؟ اتنا پٹا ہوا ناول لکھ رہی تھیں۔ ٹکے مار مار کر جیسے میں بڑا سا تکیہ چھوٹے سے غلاف میں ڈالتی ہوں ناں ایسے ہی اس کا اینڈ کر دیا۔ ناقابلِ یقین......تمام حالات و واقعات کو اتنی جلدی لپیٹنا

جیسے گرمیوں میں چھت پر سوئے بے سُدھ لوگوں پر ساون کی برسات ہو اور وہ جیسے تیزی سے بستر لے کر بھاگتے ہیں۔ ایسے ہی سرپٹ......تمام کردار جاگ کر بھاگ پڑے۔ کائناز اور برہان کی شادی پہلے دادا کی ڈیتھ کے سین بعد میں۔ یا اللہ انتہائی وحشت ناک انجام تھا۔ انتہائی بوریت کے ساتھ انتہائی، انتہائی معذرت کے ساتھ اس ناول کی تمام اقساط پڑھیں۔ (یہ آپ کی اپنی رائے ہو سکتی ہے) غزالہ رشید نے نہیں ابھی نہیں لکھا مجھے سمجھ بھی مشکل سے آیا اور پسند بھی نہیں آیا۔ کیا تھا یہ؟ شیریں حیدر جیسی منجھی ہوئی لکھاری نے دلہن وہی جو ساسو من بھائے لکھا خوب اچھا لکھا، لائٹ اور ہلکا پھلکا مزیدار سبق آموز......اور اسی جگہ آپ نے انجم وقار، لاہور کے کالم کو بھی جگہ دے دی۔ سونے پر سہاگا سسرال ایک عذاب، سسرال میں آپ کو سمجھنے کا جھنجٹ کون پالتا ہے۔ آپ ہی سمجھتے پھر دمیاں جی دیور جی......! ساسو جی کا مزاج۔ واہ رے اللہ تیری جو مرضی۔ ایک سوال اور دلدل اچھے افسانے تھے۔ زاہدہ پروین کا جنگل کا پھول اور سیما بنت عاصم کا بس یونہی دونوں نارمل سی تحریریں تھیں۔ کچھ خاص اثر نہ چھوڑ سکیں۔ شمیم فضل خالق کا انٹرویو اچھا تھا۔ ان کی پرسنالٹی کی سادگی اور ان کی ذہنی پختگی مجھے بہت پسند آئی شمیم فضل خالق آپ سے مل کر بہت اچھا لگا، نزہت جی آپ کا بے حد شکریہ......آپ سب کو عیدالاضحیٰ کی مبارک باد۔‘‘ (شکریہ)

ﻫ فرحت احمد، کراچی سے۔ ’’کافی عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں اور اس کی پہلی وجہ تو عظمیٰ کا سفرنامہ ہے۔ جس نے دل موہ لیا۔ کچھ معلوماتی اور مزاحیہ انداز لیے ہوئے یہ سفر ہم نے بھی عظمیٰ کے ساتھ بہت انجوائے کیا۔ کہیں تصنع یا بناوٹ محسوس نہیں ہوئی بلکہ یہ لگتا تھا کہ سچ ہی تو کہہ رہی ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی جب اپنی فیملی کے ساتھ خصوصاً ماشاء اللہ اتنے لوگوں کے ساتھ جس میں بچے بھی شامل ہوں تو ایسے مواقع تو اکثر آتے ہیں مگر کسی کے سامنے کوئی، کوئی ہی بیان کرتا ہے۔ بلکہ سچ چھپا کر جھوٹ بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے مگر یہ تو اپنی عظمیٰ ہی کا ظرف ہے جو بالکل سچی اور حقیقی عکاسی کرتی ہے اور اس پر اندازِ بیاں کا اپنا ایک الگ ہی رنگ ہے جو خوب مزہ دیتا ہے۔ (ماشاء اللہ) اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ دوسری وجہ امانت کی آخری قسط ہے۔ باجی میں امانت کو پہلی قسط سے ہی بہت پسند کر رہی تھی منفرد اندازِ بیان اور تجسس لیے ہوئے یہ قسط وار ناول ہر قسط میں ہی مجھے بہت متاثر کر رہا تھا اور اس کے انجام کا بھی بڑی بے چینی سے انتظار تھا مگر یہ کیسا انجام پڑھا تو پچھلی تمام قسطوں کا اثر زائل ہوتا محسوس ہوا ہو سکتا ہے شاید مجھے ہی یہ محسوس ہوا ہو۔ افسانے سارے ہی اچھے رہے، شمیم فضل خالق سے ملاقات بہت اچھی لگی۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ ویسے بہت ساری بہنوں کا یہ پسندیدہ ناول رہا اور انجام بھی منطقی)

☆ بہنوں کے خطوط کے جوابات اب ختم ہوئے۔ اب آیئے دعا مانگنے سے قبل درودِ ابراہیمؑ پڑھ لیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم۔ میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے......یا رب العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو

آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا
مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

اے ربِ کریم اے ربِ ذوالجلال
تیری ذات و صفات ہیں باکمال
بیاں ہو نہ سکے تعریف تیری
تو وحدہٗ لاشریک تو بے مثال
تو رگِ جاں سے میرے قریب تر
ذرا دور تجھ سے، شروع میرا زوال
تو نور ہی نور ارض و سما کا
بے مثل تیرا حُسن و جمال
سکوں میرا تیرے نام میں پوشیدہ
مٹائے ذکر تیرا میرے رنج وملال
تو رؤف ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے
نہ تجھ سا کوئی، نہ کوئی تیری مثال

از: فصیحہ آصف خان، ملتان

نعتِ رسول مقبول ﷺ

انؐ ہی کو دل میں بسا کے جی لوں اسی تمنا میں جی رہا ہوں
ہزار ٹکڑے ہوئے تھے دل کے ہزار ٹکڑوں کو سی رہا ہوں
میں جامِ الفت بھروں گا اِک دن میری تمنا نے یہ کہا ہے
وہ عالم خواب ہی میں دیکھا کہ جامِ کوثر میں پی رہا ہوں
مچل رہا ہوں تڑپ رہا ہوں جدائی میرا نصیب کیوں ہے
نوید وصلِ نبیؐ ملی ہے تو اشک آنکھوں کے پی رہا ہوں
خیال انؐ کا ہے خواب انؐ کا تو کیوں نہ میں اس طرح سے سوچوں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ساتھ انؐ کے بھی رہا ہوں
گناہوں سے یوں بھرا ہے دامن کہ دل ہے بوجھل نگاہ بوجھل
شفاعتوں کی طلب ہے مجھ کو اسی بھروسے پہ جی رہا ہوں
میں دیوانہ انؐ کا ہنسو نہ مجھ پر، ہنسو گے گر پھر نہ رو سکو گے
انؐ ہی کے در پر پڑا ہوا ہوں، ملی اجازت تب ہی رہا ہوں

شاعرہ: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

فریضۂ حج

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اے لوگو! اگر تم پر حج فرض ہو چکا ہو تو اس کی ادائی میں جلدی کرو اس لیے تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ کب کیا رکاوٹ پیش آجائے۔“

اہلِ عرفات پر خدا کی نظرِ کرم

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”جب حاجی لوگ عرفات میں ٹھہر کر دعا اور گریہ وزاری میں مشغول ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا تک آجاتے ہیں اور فرشتوں سے کہتے ہیں۔

”میرے ان بندوں کو دیکھو، بال بکھرے ہوئے، غبارے سے اَٹے ہوئے، دیکھو میرے پاس یہ اس حالت میں آئے ہیں۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفات میں جب لوگ پہنچتے ہیں اور گریہ وزاری میں مشغول ہوتے ہیں تو اس موقع پر ان کی طرف اللہ کی رحمت خصوصی طور پر متوجہ ہوتی ہے۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

میں اداس ہوں

ذی الحج کا ہے مہینہ اور میں اداس ہوں
نہ جا سکی اس بار بھی، میں اداس ہوں
آجاتا کاش میرا بلاوا بھی حرم سے
جا نہ سکی جو بیت اللہ، میں اداس ہوں

حج کا ہو دن اور میں کعبہ کے سامنے
یہ خواب پورا ہو نہ سکا، میں اداس ہوں
بخشش کرالوں گی جا کر وہاں اِک بار
آیا بھی حج اور گزر بھی گیا، میں اداس ہوں
کردے تو کرم اپنا کہ جاؤں میں اگلے سال
کعبہ مجھے بلالے خدا، میں اداس ہوں

شاعرہ: عالیہ ضیا، کراچی

آیت الکرسی کے فوائد

☆اگر گھر سے نکلتے وقت پڑھی جائے تو ستر ہزار فرشتے دائیں، بائیں آپ کی حفاظت کریں گے۔

☆اگر گھر میں داخل ہوتے وقت پڑھیں تو غریبی گھر میں نہیں ہوگی۔

☆اگر وضو کرنے کے بعد پڑھیں تو آپ کا مرتبہ ستر مرتبہ بلند کرے گی۔

☆اگر سوتے وقت پڑھیں تو اِک فرشتہ پوری رات آپ کی حفاظت کرے گا۔

☆ہر فرض نماز کے بعد بیٹھے، بیٹھے آیت الکرسی پڑھیں، بے حد ثواب ہے۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

سنہری باتیں

☆اللہ کی رضا پر راضی ہونا ہی اصل ایمان ہے۔

☆اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جو زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے۔

☆شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔

☆تکبر اور غصہ عقل کا دشمن ہے۔

☆علم سے بڑا کوئی خزانہ نہیں، بری عادت سے زیادہ کوئی دشمن نہیں، شرم سے بہتر کوئی لباس نہیں۔

☆جو لوگ زندگی کو ایک فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

☆خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

☆کسی کو اپنے سے کمتر سمجھنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔

☆لالچ ساری برائیوں کی جڑ ہے اور علم تمام خوبیوں کا سرچشمہ......

☆اگر بڑا بننے کی خواہش ہے تو پہلے چھوٹا بنو۔

مرسلہ: نگہت غفار، کراچی

ہنر

کلاس روم میں سناٹا طاری تھا، طلبا کی نظریں کبھی استاد کی طرف اٹھتیں اور کبھی بورڈ کی طرف۔ استاد کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سوال تھا ہی ایسا۔ استاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بغیر ایک لفظ کہے، بلیک بورڈ پر ایک لمبی لکیر کھینچ دی پھر اپنا رخ طلبا کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میں سے کون ہے جو اس لکیر کو چھوئے بغیر چھوٹا کردے۔“ ”یہ ناممکن ہے۔“ کلاس کے سب سے ذہین طالب علم نے آخر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے جواب دیا۔

”لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے مٹانا پڑے گا اور آپ چھونے سے بھی منع کر رہے ہیں۔“ استاد نے گہری نظروں سے اُن سب کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر بورڈ پر پہلی لکیر کے متوازی مگر اس سے بڑی ایک اور لکیر کھینچ دی۔ جس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ استاد نے پہلی لکیر کو چھوئے بغیر اسے چھوٹا کر دیا تھا۔ طلبا نے آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا سبق سیکھ لیا تھا۔ دوسروں کو بدنام کیے بغیر انہیں نقصان پہنچائے بغیر ان سے حسد کیے بغیر ان سے الجھے بغیر ان سے آگے نکلنے کا ہنر چند منٹ میں سیکھ لیا تھا۔

از: لاریب ماہ زیب، چونیاں

غزل

اب آئے ہو تو پھر وہی تکرار نہ کرنا
پھر ذکر سیاست کا گناہ گار نہ کرنا

خود ہی مجھے احساس ہے اپنی غلطی کا
تم اپنی شکایت سے شرمسار نہ کرنا
دیکھو مجھے ڈر لگتا ہے غصے سے تمہارے
تم مجھ سے خفا ہو بھی تو اظہار نہ کرنا
جاتے ہو سنو، کار کو آہستہ چلانا
پھر تیز خدا کے لیے رفتار نہ کرنا

شاعرہ: غزالہ نگار اورکزئی
مرسلہ: ظل شاہین...... رحیم یار خان

پیشگی اطلاع

ایک دولت مند شخص نے قیمتی ہار اپنی سیکریٹری کو بطور تحفہ پیش کیا اور ایک پارک میں سیر کا پروگرام بنایا۔ جب وہ سیکرٹری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہا تھا تو اچانک وہاں اس کی بیوی آ پہنچی اور دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر غصے میں واپس چلی گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے مقامی اخبار کے ایڈیٹر کو فون کیا۔

''کل کے اخبار میں میرے شوہر کے انتقال کی خبر شائع فرمادیں۔''

''ان کا انتقال کب ہوا؟'' ایڈیٹر نے اظہارِ غم کرتے ہوئے پوچھا۔

''آج شام کو ہوگا۔'' بیوی نے جواب دیا۔

از: رابعہ عمران، رحیم یار خان

بکرا نامہ

بکرا تلاش کر نہ قسائی کو کال کر
اس بار ہلکا جیب کو تو حسبِ حال کر
انگلی کٹا کے نام شہیدوں میں کر عطش
بکرا عید پر ایک تو مرغی حلال کر

☆☆☆

ایک بکرے نے کہا بکری سے اے جانِ عزیز
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبابوں میں ملیں

☆☆☆

کھال فوراً اتار دی اس نے
ہاتھ میں کس قدر صفائی ہے
حقیقت میں تھا وہ پولیس والا
ہم سمجھتے رہے قسائی ہے

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

میرے مہتاب سن

ہم بھی ہیں تیرے ہم سفر
ہم سے بھی کوئی بات کر
ہم تو تیرے رفیق ہیں
ہم سے نہ اجتناب کر
دشتِ فراقِ یار میں
ازلوں کے ہمرکاب سن
ہجر کے مہتاب سن
کبھی ہمارے ساتھ چل
ہم سے کبھی حساب سن

شاعر: امجد اسلام امجد
مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

ہری مرچیں

1۔ انسان اپنی غلطیوں کا بہترین وکیل اور دوسروں کی غلطیوں کا بہترین جج ہوتا ہے۔

2۔ زندگی میں دو لوگوں کا بہت خیال رکھنا۔ پہلا وہ جس نے تمہاری جیت کے لیے اپنا سب کچھ ہار دیا...... باپ اور دوسرا وہ جس کی دعاؤں سے تم نے سب کچھ جیت لیا...... ماں۔

3۔ اخلاق سے بات کرنے سے کچھ خرچ نہیں ہوتا کیونکہ انسان پر سب سے زیادہ مصیبتیں اس کی اپنی زبان کی وجہ سے ہی آتی ہیں۔

4۔ زبان کا وزن بہت ہلکا ہوتا ہے لیکن بہت کم لوگ ہی ہوتے ہیں جو اس وزن کو سنبھال پاتے ہیں۔

5۔ کوشش کرو کہ زندگی کا ہر لمحہ اپنی طرف سے ہر کسی کے ساتھ اچھے سے اچھا گزار سکو کیونکہ...... زندگی نہیں رہتی پر اچھی یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

وہ

یہ حقیقت ہے کوئی خواب تھا وہ
دل کی دھرتی پہ آسماں کی طرح
صورتِ سایہ و سحاب تھا وہ
اپنی نیندیں اسی کی نذر ہوئیں
میں نے پایا تھا رتجگوں میں اسے
میں نے دیکھا تھا ان دنوں میں اسے
جب وہ ہنس، ہنس کے بات کرتا تھا
دل کے خیمے میں رات کرتا تھا
رنگ پڑھتے تھے آنچلوں میں اسے
میں نے دیکھا تھا ان دنوں میں اسے
یہ مگر دیر کی کہانی ہے
یہ مگر دور کا فسانہ ہے
اس کے میرے ملاپ میں حائل
اب تو صدیوں بھرا زمانہ ہے
اب تو یوں ہے کہ حال اپنا بھی
دشتِ ہجراں کی شام جیسا ہے
کیا خبر ان دنوں وہ کیسا تھا
میں نے دیکھا تھا اُن دنوں میں اسے

شاعر: محسن نقوی
مرسلہ: نسیم گوندل، تحصیل کوٹ مومن

زیور

ٹیچر نے لڑکے سے پوچھا۔ ''تمہاری تعلیم کیا ہے......؟''

لڑکے نے کہا۔ ''تعلیم ایک زیور ہے مگر زیور مردوں پر حرام ہے۔''

فرمائش

ہزبینڈ...... ''میں تمہاری روز، روز کی ...... فرمائشوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے جا رہا ہوں۔''

وائف...... ''دو چار لان کے سوٹ بنوا کے دے جائیں۔ اب میں عدت میں کیا پہنوں گی۔''

مرسلہ: مدیحہ نورین مہک، برنالی

غزل

وصل ہوا ہے برسوں بعد
ہجر کی اب تو بات نہ کر
ترسے تیرے پیار کو ہیں
اب جانے کی فریاد نہ کر
نام تیرا میرا نام بنا ہے
چھین کے تو گمنام نہ کر
قطرہ، قطرہ پگھلے تیرے لیے ہم
اب خود کو تو چٹان نہ کر
دم سے تیرے شام گئی ہے مہک
تو سحر کو اب یاد نہ کر
شاد ہوئی ہوں تیرے دم سے
مہک کو اب ناشاد نہ کر

شاعرہ: مدیحہ نورین مہک، برنالی

غزل

ٹھوکریں کھا کے وہ خود ہی سنبھل جائے گا
راستہ اس کا آگے نکل جائے گا
کیا خبر تھی وہ اتنا بدل جائے گا
وقت کا وار اس پر بھی چل جائے گا
اِک خلش اس کو تڑپائے گی عمر بھر
وہ سمجھتا ہے کانٹا نکل جائے گا
ریت کی تہ میں چہرہ چھپائے رکھو
آفتوں کا یہ طوفان ٹل جائے گا
آپ کب تک سناتے رہیں گے مجھے
کیا فسانوں سے یہ دل بہل جائے گا؟
عکسِ آئینہ پر ناز اتنا نہ کر
دوپہر کا یہ سورج بھی ڈھل جائے گا
اس کی بستی میں کیسی کشش ہے فرح
دل ٹھہرنے کو خود ہی مچل جائے گا

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، سڈنی

☆☆☆



جلترنگ

انجم انصار

باتاں دل کی

سطوت کے گھر میں امیرانہ ٹھاٹ اور اسلامی رنگ یوں ملے ہوئے تھے جیسے نارنگی میں کھٹاس اور مٹھاس برابر کی رچی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خاندان کے لوگ جب بھی کوئی اچھی مثال دینا چاہتے تو سطوت کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے۔

مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب ان کے بیٹے چھوٹے تھے اور وہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی تھیں...... اس سسٹم میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں وہ بڑے سے بڑے ریلے کے اوپر بند باندھے رکھتا ہے۔

اکیلے گھر میں رہنے کا خمار جب چڑھا...... تو ان کے میاں علیحدہ کوٹھی لے کر شفٹ ہو گئے اور سطوت نے اپنے حساب سے فرینڈ شپ کے تحت سوشل ورک کرنے کی ٹھانی۔ بہت سے لڑکے لڑکیوں کے رشتے انہوں نے طے کروائے۔

مظلوم خواتین پر ڈھیر سارے فیچرز لکھے...... ان کو سلائی کی مشینیں دیتے ہوئے اپنی بڑی، بڑی تصاویر اخبارات میں لگوائیں۔

اب ان کے گھر کے ماحول سے اسلامی رنگ اڑ چکا تھا...... اور امیرانہ ٹھاٹ پر دکھاوے اور مکاری کے ساتھ، ساتھ چھچھورپن کی چھاپ علیحدہ لگ چکی تھی۔

جب ان کے بیٹے فرحان کی شادی کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے احباب میں سے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا...... جس کی فیملی کی اتنی دولت اور جائداد تھی کہ ان کا بیٹا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بھی بیٹھا رہتا تو اس کی کئی نسلیں پرورش پا جاتیں اور جب انہوں نے اپنے لاڈلے سپوت سے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

''بیٹے سونے کا چمچہ تو لے کر تم ضرور پیدا ہوئے ہو مگر میری یہ خواہش ہے کہ تمہاری زندگی سونے کی کان میں گزرے...... اس لیے میں نے تمہارے لیے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا ہے کہ تم اپنی ماں کی پسند پر داد دو گے۔''

''ماما...... میری پسند آپ کی پسند سے میل نہیں کھاتی...... میں نے اپنا جیون ساتھی چن لیا۔'' وہ ببل گم چباتا ہوا بے پروائی سے بولا جیسے کہہ رہا ہو...... آج موسم میں خنکی زیادہ ہے۔

''چن لیا ہے؟'' انہیں غصہ ہی تو آ گیا۔

''فرحان تم اپنی منجھلی پھپو...... نسیم بیگم کے ہاں بہت جاتے ہو...... ان کی موٹو سی خالدہ کو پسند کر لیا ہو گا جو اپنے باپ کے کیٹرنگ کے کاروبار کی نگرانی کر رہی ہے اور خوب مزے، مزے کے کھانے پکانا بھی سیکھ گئی ہے...... اسی نے حلق سے دل تک کا راستہ طے کیا ہو گا......'' سطوت نے زہر اگلا۔

''جی نہیں...... آپ یوں پھپو پر بہتان مت دھریں۔''

''اچھا تو...... پھر تمہارے باپ کی سوتیلی بہن ناصرہ کی سوتھی زرینہ نے تمہیں شیشے میں اتارا ہو گا۔ جب سے وہ ستار بجانا سیکھی ہے...... ہاکی کی طرح کلیجے سے لگا کے تاروں پر ٹن، ٹن کرنا ہی جانتی ہے اور جب کسی کو متاثر کرنا ہوتا ہے بھرے ہوئے کیسٹ کا بٹن دبا دیتی ہے...... تب تو اس کے ستار سے ایسے، ایسے جھرنے بہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو میں بھی مدہوش ہو گئی تھی۔ وہ تو اس کی ایک سہیلی نے مجھے سرگوشی میں بتایا...... کہ ایسا اس نے آپ کو متاثر کرنے کے لیے کیا ہے ورنہ زرینہ کو کچھ بجانا نہیں آتا ورنہ میں تو زرینہ پر اچھی خاصی ریجھ سی گئی تھی۔ وہ تو اس کی سہیلی کو مجھ پر رحم آ گیا ورنہ میری آنکھیں تو اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ اس کی سہیلی کی بات سن کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ حد ہو گئی ہے...... لوگ جوان بیٹوں کی ماؤں کو کس، کس انداز سے گھیرا کرتے ہیں۔ پتا نہیں ناصرہ کو کیسے یہ پتا چلا کہ کسی زمانے میں مجھے ستار بجانے سے دیوانگی کی حد تک رغبت رہی تھی۔ اس نے وہی داؤ مجھ پر بھی آزما لیا۔''

''اُف ماما...... آپ تو پریشان ہونے میں کمال رکھتی ہیں۔''

''بیٹا کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اپنا جیون ساتھی منتخب کر لیا ہے اور میں اس کے بارے میں جانتی تک نہیں ہوں۔''

''ماما آپ جس انداز سے زرینہ کے بارے میں سوچ رہی ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ بلیو می...... زرینہ کے بارے میں تو میں نے کبھی نہیں سوچا، خواب تک میں نہیں لایا اس کو اور سب سے بڑی بات وہ پڑھی لکھی جاہل ہے...... کوئی بات بھی اس سے کروں تو پہلے وہ شرماتی ہے اور پھر کہتی ہے۔ امی سے پوچھ کر بتاؤں گی، پاگل کہیں کی۔ اس پر اس کے بال کتنے لمبے ہیں...... بالکل چڑیل سی لگتی ہے...... وحشت ہوتی ہے جب اس کا آدھا چہرہ بالوں سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہوں...... بے وقوف کو پتا ہی نہیں کہ آج کل لمبے بالوں کا فیشن نہیں ہے۔''

''پھر کون ہے وہ کلموہی......'' سطوت کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ بیٹے کی بے وقوفی کی وجہ سے ہاتھ سے کروڑوں روپے جانے کا نقصان علیحدہ دکھ دے رہا تھا۔

''سوئیٹی ذی آپ کو بے حد پسند آئے گی ماما...... وہ جب سے مجھے ملی ہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ ذی بھلا کیا نام ہوا......؟'' وہ غصے سے بولیں۔

''نام تو اس کا ذکیہ ہے مگر گھر میں اس کو سب ذی کہتے ہیں...... اور وہ ہے بھی تو اے ٹو ذی ماہر...... تیراکی بھی جانتی ہے اور گھڑسواری بھی۔''

''ہم دونوں جیمنائی ہیں، دونوں کے اسٹار، کلرز، سیزن، ڈشز سب ایک جیسی ہیں اور میری بات اتنی مانتی ہے کہ اسے نیوزی لینڈ پسند نہیں...... مگر جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے نیوزی لینڈ پسند ہے تو اس نے کہا اب یہ کنٹری مجھے بھی پسند ہے۔ وہ بینگلز سے نفرت کرتی ہے مگر جب میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں اپنی ماما کا خاندانی بریسلیٹ شادی میں دوں گا تو اس نے کہا فرحان اب میں چوڑیوں سے کبھی نفرت نہیں کروں گی...... ماما اس کو کہتے ہیں ذہنی ہم آہنگی...... اب شادی کے لیے اس سے زیادہ ہم آہنگی بھلا کہیں ہو سکتی ہے۔''

فرحان سرشار سے لہجے میں ماں سے پوچھ رہا تھا۔

''مگر یہ پگلو تمہیں ملی کہاں......؟ کس نے تمہارا تعارف کروایا اس منحوس سے۔''

''ماما...... اسے لک کہتے ہیں...... ایک دن میں اپنے دوست کی آئی ڈی پر چیٹنگ کر رہا تھا...... تو ذی سے میری دوستی ہو گئی...... حالانکہ اس وقت وہ لڑکے کے نام سے چیٹ کر رہی تھی اور میں لڑکی بنا ہوا تھا۔''

اور سطوت آرا اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے اب اس تصویر کو دیکھ رہی تھیں جس میں فرحان اپنے کندھے پر ذی کو بٹھائے کھڑا تھا۔

''اچھی ہے ناں...... ذی......'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''میرے دوست کہتے ہیں ایشوریا اور ابھیشک کی جوڑی ہے...... ایک فلم میں ابھیشک کا بھی ایسا ہی پوز تھا ایش کے ساتھ......'' فرحان ہنستے ہوئے ماں کو بتا رہا تھا۔

اور سطوت کی اس وقت اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کو کھری، کھری سنا سکیں کہ بعض اوقات

دل کی باتیں دل ہی میں داب لینی پڑتی ہیں کہ اس میں ہی فریقین کا بھلا ہوتا ہے۔

سزاوار

مارکیٹ اور اسٹیشن کے پاس خدا دشمن کو بھی گھر نہ دے کہ ہر وقت مہمان دماغ پر چڑھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور پھر فیروزہ پھپو جن کے بیٹے ریلوے میں کیا ملازم ہوگئے تھے کہ ہر دوسرے مہینے پاس لے کر ہمارے بجٹ کو فیل کرنے آپہنچتی تھیں۔ (اماں کے زیرِ لب کو سنے، بلندی کی طرف چڑھنے لگتے)

''ارے میں نے سوچا آنے جانے پر دھیلا خرچ ہوگا نہیں چلو اپنے بچوں کو ہی دیکھ آؤں۔'' وہ اپنی ممتا دکھاتیں اور کنجوسی کی انتہا کہ راستے میں سے کسی جعلی حافظ تک کا حلوا بھی خرید کر نہ لاتیں۔ (جس کا ہم سب کو ملال بلکہ صدمہ ہوتا)

''پھپو حیدر آباد کی ربڑی اچھی ہوتی ہے ناں......'' میں منہ میں پانی بھر کر ان سے کہتی۔ (کہ شاید کان پر جوں رینگ جائے)

''اتنی گرمی میں کھویا سڑ جاتا ہے، کل کلاں کو کچھ ہو جائے تو......'' وہ چہرے پر خطرات کے سگنل آویزاں کر کے از خود پیلی پڑ جاتیں جیسے ہمارے پورے خاندان کو فوڈ پوائزن ان کی نادیدہ ربڑی کی وجہ سے ہو جائے گا۔

''کچھ نہیں ہوتا ہمیں، ہمارا معدہ سڑی بسی چیزیں کھانے کا عادی ہوچکا ہے۔'' (میں تمام خطرات کو دھکے دینے کی اپنی سی سعی کرتی)

''رضیہ تم ہمارے ہاں لاہور آؤ پھر ہم تمہیں مزے، مزے کی چیزیں کھلائیں گے اور خوب گھمائیں گے۔'' پھوپی زاد سلمیٰ لہجے میں چسکے بھر کر کہتی۔

''ہم لاہور کیسے جاسکتے ہیں؟ ابا کوئی ریلوے میں تھوڑی ملازم ہیں۔'' میں دکھ سے کہتی۔

''ہاں، یہ بات تو ہے، کرایہ بھاڑا اچھا خاصا لگتا ہے۔ جہاز کے آدھے ٹکٹ کے برابر ایک آدمی کا کرایہ لگتا ہے۔ واقعی بھائی جان اتنے سارے پیسے کہاں خرچ کر سکتے ہیں۔ ماشاء اللہ اتنی بچیوں کا ساتھ ہے۔ خواہ مخواہ کا خرچہ کیوں کریں......'' وہ دلی اطمینان سے خود ہی تاویلیں گھڑتیں اور میں سوچتی رہتی کہ ہمارے نصیب میں سوائے میزبانی کے کچھ لکھا ہی نہیں ہے۔ پھپو کو یقین تھا کہ ہم کراچی سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ اس لیے وہ ہمیشہ سنہرے، سنہرے وعدے کرتیں...... ''کبھی تم لوگ ہمارے گھر آؤ تو ہم مری لے کر چلیں گے، ہوٹل میں ٹھہرائیں گے، مال سے شاپنگ بھی کروائیں گے۔''

''ایمان سے۔'' میں رال بہاتے ہوئے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے خیالوں کا سفر طے کرنا شروع کر دیتی، فلموں کے سین آنکھوں میں رنگ تو کیا بھنگ بھرنے لگے تھے۔ میں سرسبز مرغزاروں میں اپنے کزن راحیل کا ہاتھ پکڑے دوڑتی چلی جاتی اور وہ میری ایک، ایک ادا پر خوش ہوتا رہتا۔ پھپو اور سلمیٰ سیر کے دوران ڈھلان سے کہیں نیچے کسی گہری کھائی میں گر جاتیں اور میں راحیل کے سینے سے سر لگا کر خوب آنسو بہاتی۔ راحیل میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہتے۔ ''رانو جو ہونا تھا وہ ہوچکا مگر تم اپنے قیمتی آنسو مت بہاؤ۔''

''اے لو، تمہیں یقین نہیں آرہا کہ ہم تمہیں کتنی سیر کروائیں گے۔'' پھپو میری ہونق سی شکل دیکھ کر ایک دھموکا جڑ کر کہتیں۔

''مجھے تو وہ یقین آگیا ہے جو کسی صورت میں یقین کرنے کے قابل نہیں ہے۔'' (مجھے پھر خوب صورت کھائی یاد آنے لگتی)

اور پھر یوں ہوا کہ چھوٹے چچا کی ساس کا انتقال ہوگیا، وہ مارے خوشی کے ہم سب بہنوں کو (اپنے پاس سے) لاہور لے گئے۔ (سسرال کی جائداد میں ایک لمبا حصہ بھی ملنا تھا) ظاہر ہے کہ ہمارا قیام پھپو کے گھر ہی ہوا۔

''ارے، تم سب لوگ لاہور کیسے آگئے؟'' پہلا جملہ ادا کرنے کے بعد پھپو کو پہلا دورہ پڑا (بیچارے پھوپا خفت مٹانے کے لیے اسے مرگی کے دورے کا نام دے رہے تھے)

''لاہور میں تو دیکھنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔'' سلمیٰ انتہائی نروٹھے پن سے کہتی۔

''اچھا پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا نہیں ہوا۔'' میں تاویلیں دیتی۔

''غلط کہتے ہیں، جس نے لاہور دیکھ لیا وہ خواہ مخواہ میں ہی پیدا ہوگیا۔'' سلمیٰ ایک پکی منطق بگھارتی اور آنکھوں کنایوں سے ماں کے اشارے وصول کرتی۔

''راحیل بھائی ہمیں مری دکھلائیں ناں۔'' (مجھے مری کی کھائی یاد آجاتی)

''میرے پاس کہاں فرصت ہے۔'' وہ انتہائی نروٹھے پن سے کہتے۔

''کیا آپ نے بھی مری نہیں دیکھا؟'' میں آنکھوں میں خواب بھر کر پوچھتی۔

''ہاں، دیکھا ہے مگر دوستوں کے ساتھ۔'' لفظ دوستوں پر ان کی آنکھوں میں ...... دھنک رنگ لہرا جاتے۔

''پھپو آپ ہی کہیں لے چلیے ناں۔'' میں ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی۔

''ارے میں کہاں جاؤں گی اس گرمی میں۔ مٹاپے میں میرا چلنا کوئی آسان ہے بھلا۔'' وہ انتہائی آلکس سے کہتیں۔

تب ان کی پرانی باتیں دل جلا کر خاک کر دیتیں اور پھر جب جانے کا دن آگیا تو پھپو اسی عالمانہ انداز میں باتیں بھگار رہی تھیں۔ ''اب بھی

ہم

ہم اکثر دکھ میں رہتے ہیں
کبھی ساون کبھی برسات
کبھی آتش میں رہتے ہیں
آغازِ ہجرِ سفر میں
اِک سوگ سا رہتا ہے
مگر ماتم نہیں ہوتے
خوشیوں کی گھڑیوں میں
طبیعت بین کرتی ہے
بڑے بے چین رہتے ہیں
مگر ہم ہنس کے کہتے ہیں
منظر دھندلا سا دِکھتا ہے
ذرا سا آنکھ میں کچھ ہے
کوئی بھی یاد ٹھہر جائے
ہم اسی یاد میں رہتے ہیں

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

آؤ گی تو لاہور خوب گھمائیں گے، مری بھی لے کر چلیں گے، مال روڈ سے خوب شاپنگ بھی کروائیں گے۔''

''امی ہم لوگ سوات بھی جائیں گے اور اسکردو بھی۔'' سلمیٰ گپ بازی میں ان کی سپہ سالاری کر رہی تھی۔

''اب کے لاہور آئیں تو میں لاہور گھمانے کے علاوہ مری، ایوبیہ اور پتریاٹہ بھی لے کر جاؤں گا۔'' راحیل بھائی نے پھپو کے پروگرام پر مزید گلکاریاں کیں۔

تب نہ جانے کیوں، میرا دل چاہا کہ سب کو چھت پر لے جا کر نیچے دھکا دے کر کہوں......

''جھوٹے لوگو! تم سب نے میرے خوابوں کو بھسم کیا ہے۔ میری کھائی تک چھینی ہے۔ تمہاری یہی سزا ہے، ہاں یہی سزا......!''



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ
دل کی بستی میں تیری یادوں کی کلیاں چٹکیں
جب فلک پر عید کا چاند نظر آیا
کچھ اور ہی تھا تیری آنکھوں کا رنگ جو
ہمیں ساری دنیا کا روپ ماند نظر آیا

☆عروبہ ناز......کوٹلی
ہر نظر بس اپنی، اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

☆مسز تسنیم......جہلم
یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی

☆ممتاز خانم......کراچی
ہم سے کیا ہوسکا محبت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

☆جبیں نیاز......ملتان
بے کسی پر طنز کے پتھر تو بھاری چیز ہیں
ٹھیس پہنچ جاتی ہے پھولوں سے احساسات کو

☆فرحت احمد......کراچی
وہ مجھ کو بھول بیٹھا ہے نہیں حیرت ہوئی سن کر
وہ اپنی عام سی چیزوں کو اکثر بھول جاتا ہے

☆ارم کمال......فیصل آباد
جو سود و زیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مزدوری ہے
میں تجھ کو کتنا چاہتا ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے

☆نفیسہ نہال......لاہور
بچوں کی طرح دوڑتی پھرتی ہیں نگاہیں
پھولوں سے بھرے باغ میں تتلی کی لپک ہے
ہاتھ آئے گی میرے بھی کسی روز یقیناً
سنتی ہوں تری شاخِ محبت میں لچک ہے

☆نگہت زیدی......اسلام آباد
ستارے پھول جگنو دھنک، ہر اک شے ہے بے معنی
تمہارے ہجر کی شب، میں رخِ مہتاب کیا دیکھوں
سحر معلوم ہے مجھ کو نتیجہ دل لگانے کا
محبت کے صحیفے میں وفا کے باب کیا دیکھوں

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر
وہ ایک خط جو تو نے کبھی لکھا ہی نہیں
میں روز بیٹھ کر اس کا جواب لکھتی ہوں

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
بچھڑتے وقت جانے کیسے ٹھہر گیا تھا میں
غضب کا حسن تھا اس کی اداس آنکھوں میں

☆کوثر خالد......جڑانوالہ
ایسی ہر سال آئے، خوشی میسر تجھ کو
تیری ہر سانس کہے عید مبارک تجھ کو

☆ماہ زیب......چونیاں
مجھے یقیں ہے وہ تھام لے گا، بھرم رکھے گا
یہ مان ہے تو دیے جلائے ہیں آندھیوں میں
ہر ایک موسم میں روشنی سی بکھیرتے ہیں
تمہارے غم کے چراغ میری اداسیوں میں

☆نیلوفر حسین......بھارہ کہو
کوئی میرے لبوں پر بھی لا دے
جو دعائیں قبول ہوتی ہیں

☆فصیحہ آصف خان......ملتان
وہی عید کی خوشیاں ہیں
وہی رنگ برنگے میلے ہیں
مقدر کا چاند ہے گہنایا ہوا
وہی تنہائی اور ہم اکیلے ہیں

☆فرحین اشفاق......گگو منڈی
محبت کے ہمیں بھی آداب سکھا دو
وفا کے بھی کچھ حساب بتا دو
بیچ راہ میں چھوڑ جانے والوں
بدلنے کے ہمیں بھی انداز سکھا دو

☆مہرین ہاشمی......موڑ کھنڈا
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

☆مدیحہ نورین ملک......برنالی
اس بار میری جنگ ہے خود اپنی ذات سے
اس بار ہار جانے کا امکان بہت ہے

☆اقبال ناز......دبئی
فقط اتنا کہا تھا ناں ہمیں تم سے محبت ہے
ہماری جان لو گے کیا اب اتنی بات کے پیچھے

☆نورین ولی......ملتان
کئی اگ چل سے جائیں گے مرے قاتلوں کی تلاش میں
مرے قتل میں مرا ہاتھ تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
وہ تمام دنیا کے واسطے جو محبتوں کی مثال تھا
وہی اپنے گھر میں تھا بے وفا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

☆غزالہ طارق......سرگودھا
ان کی نظر میں پیار گناہِ عظیم ہے
توفیق دے خدا انہیں ایسے گناہ کی
اپنے کو رشکِ میرؔ سمجھتے ہیں بدرؔ جی
گمراہ کر گئی ہے صدا واہ، واہ کی

☆مہوش جواد......لیہ
اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے

☆خدیجہ حسین......لاہور
اشک نکلا ہے کوئی ہاتھ میں پتھر لے کر
مجھ سے کہتا ہے تیرے ضبط کا سر پھوڑوں گا

☆نسیم نیازی......لاہور
دل فسردہ تو ہوا دیکھ کر اس کو محسنؔ
عمر بھر کون جواں، کون حسیں رہتا ہے

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص
میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں
اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا
تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

☆زریں زبیر......کراچی
کبھی آسماں کی بلندیوں سے اتر کر خاک پر آئیں گے
ابھی پنچھیوں کو خبر نہیں یہ زمین والوں کا جال ہے

☆امینہ مشیر......نئی دہلی
مسرت کی طلب غم کا گلہ کیا
کہ دونوں کی حقیقت عارضی ہے

☆کوثر خورشید......یو کے
میں فقیروں سے بھی کرتی ہوں تجارت محسنؔ
جو ایک پیسے میں لاکھوں کی دعا دیتے ہیں

☆مہا سجاد......دبئی
میں ٹھہرا مٹی کا مادھو، جا دیوانی راہ لے اپنی
تو سونے چاندی کی مورت خود کو کیوں کرتی ہے مٹی

☆رابعہ عمران......رحیم یار خان
عالم میں انتخاب تھے کچھ لوگ شہر میں
کوئی تو کچھ بتائے کہاں جا کے بس گئے

☆فائزہ شاہ......چکوال
اس کی یادوں کی یہ بھی تو اک کرامت ہے
ہزار میل پہ ہو کر بھی ساتھ ہو جیسے
ہمارے دل کو کوئی مانگنے نہ آیا محسنؔ
کسی غریب کی بیٹی کا ہاتھ ہو جیسے

☆☆☆



تکہ بوٹی

اشیا: بون لیس گوشت (گائے، بکرا، مرغی) ایک کلو۔ نمک۔ حسبِ ذائقہ۔ ادرک، لہسن، تین کھانے کے چمچ۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ، تین کھانے کے چمچ۔ لال مرچ، (پسی ہوئی) تین کھانے کے چمچ۔ سفید زیرہ، (بھون کر پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ (جائفل، جاوتری، گرم مسالا (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ کچا پپیتا، (پسا ہوا) دو کھانے کے چمچ۔ لیموں کا رس، دو کھانے کے چمچ۔ کوکنگ آئل حسبِ ضرورت۔

ترکیب: گوشت کی بوٹیوں میں نمک، دہی، لیموں کا رس اور تمام مسالا جات لگا کر تین گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ ایک پتیلے میں تھوڑا سا تیل ڈال کر مسالا لگی بوٹیوں کو بھون لیں اور آنچ تیز رکھیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو آنچ آہستہ کر دیں اور بوٹیوں کو گلنے تک پکائیں اور جب اچھی طرح گل جائیں اور بھن جائے تو ایک کوئلہ دہکا لیں جب کوئلہ اچھی طرح دہک جائے تو ایک چھوٹی سی اسٹیل کی کٹوری لے لیں اور اس میں کوئلہ رکھ کر بھنی ہوئی تکہ بوٹیوں پر ایک چائے کا چمچ تیل ڈال کر ڈھکن اچھی طرح بند کر دیں اور جب اچھی طرح کوئلے کی خوشبو بوٹیوں میں رچ جائے تو کوئلے والی کٹوری کو بوٹیوں کے اوپر سے نکال لیں۔ گرما گرم تکہ بوٹیاں تیار ہیں۔

مرسلہ: حافظہ اقرار حسن، لاہور

مسالے دار ران

اشیا: بکرے کی ران، ڈیڑھ کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک، لہسن پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ تلی ہوئی پیاز، آدھی پیالی۔ ثابت لال مرچ، دس سے بارہ عدد۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ ثابت دھنیا، دو کھانے کے چمچ۔ پسا ہوا ناریل، چار کھانے کے چمچ۔ پسا ہوا گرم مسالا، دو کھانے کے چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ کوکنگ آئل، آدھی پیالی۔

ترکیب: بکرے کی ران کو درمیان سے توڑ کر گہرے کٹ لگوالیں۔ لال مرچ، دھنیا، زیرہ اور ناریل توے پر بھون لیں اور پیس لیں۔ دہی میں پیاز ڈال کر پیس لیں۔ اب ساتھ کے ساتھ یہ تمام مسالا، نمک، گرم مسالا اور پسا ہوا لہسن ادرک ملا کر اچھی طرح سے ران پر لگا دیں اور چار سے چھ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اگر چاہیں تو تھوڑا سا سرکہ بھی لگا دیں۔ بڑے سائز کی دیگچی میں آئل ڈال کر گرم کر کے اس میں ران کو ڈال دیں۔ درمیانی آنچ پر پانچ منٹ پکانے کے بعد چولھے کی آنچ ہلکی کر دیں۔ اگر ران اچھی طرح سے نہ گلے تو حسبِ ضرورت پانی بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

ملائی کباب

اشیا: قیمہ، ایک کلو۔ فریش کریم، آدھی پیالی۔ ادرک لہسن پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ کوکنگ آئل، تلنے کے لیے۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پیاز لچھے دار کٹی ہوئی، سجانے کے لیے۔ لال مرچ پسی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ دودھ، ایک پیالی۔ پسا ہوا گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ کچا پپیتا پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ ہرا دھنیا، آدھی گٹھی۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔ ڈبل روٹی کے سلائس، چار عدد۔ انڈے، دو عدد۔

ترکیب: ڈبل روٹی کو ایک پیالی دودھ میں دس سے بارہ منٹ تک بھگو دیں پھر دودھ سے نکال کر لکڑی کے چمچے سے دبا دبا کر اچھی طرح نچوڑ لیں۔ اب یہ سلائس اور ادرک، لہسن، مرچ، گرم مسالا، پپیتا، ہری مرچ اور باریک کٹا ہوا پودینہ اور ہرا دھنیا، قیمے میں ملا دیں۔ قیمے میں فریش کریم ملا کر سیخ کباب کی طرح بنا کر لکڑی کی سیخوں پر لگا کر کچھ دیر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کڑاہی میں آئل ڈال کر درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ تک گرم کریں اور کبابوں کو پھینٹے ہوئے انڈوں میں ڈبو کر گولڈن فرائی کر لیں۔ کبابوں کو انڈوں میں ڈبوئے بغیر اوون میں بھی گرل کیا اور کوئلوں پر بھی سینکا جا سکتا ہے۔ سینکتے ہوئے وقفے وقفے سے آئل لگاتے رہیں۔

مرسلہ: عروبہ ناز، کوٹلی

ہرے مسالے کی بریانی

اشیا: گوشت، ایک کلو۔ چاول، ایک کلو۔ ادرک، لہسن پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پیاز درمیانی، چار عدد۔ ہری مرچ، حسبِ ذائقہ۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔ کالی مرچ، (کٹی ہوئی) ایک کھانے کا چمچ۔ ثابت گرم مسالا، دو کھانے کے چمچ۔ دہی پھینٹا ہوا، دو پیالی۔ زردے کا رنگ، حسبِ ضرورت۔ دودھ، آدھی پیالی۔ کیوڑہ، چند قطرے۔ گھی، ایک پیالی۔

ترکیب: دیگچی میں گوشت ڈال کر اس میں پیاز باریک کاٹ کر پسا ہوا لہسن، ادرک، ہری مرچ باریک کاٹ کر ہرا دھنیا اور پودینہ اور حسبِ ضرورت پانی ڈال کر پکنے کو رکھ دیں۔ دہی میں نمک اور کالی مرچ ملا لیں۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں گھی اور دہی ڈال دیں اور چولھے سے اتار لیں۔ چاولوں میں نمک اور ثابت گرم مسالا ڈال کر ابال لیں۔ ایک کنی رہ جانے پر پانی نتھار لیں۔ بڑے سائز کی دیگچی میں گوشت پھیلا کر رکھ دیں اور اوپر سے ابلے ہوئے چاول ڈال دیں۔ زردے کا رنگ، کیوڑہ اور دودھ ملا کر چاولوں پر چھڑک دیں۔ چاولوں کو ڈھانک کر دم پر رکھ دیں۔ چاول پک جانے کی صورت میں اچھی طرح سے ملا کر ڈش میں نکال لیں اور سلاد، رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: شہوار علی، لالہ موسیٰ

کھانے پینے کی اشیا محفوظ رکھیں

1۔ اگر دالیں مہینے بھر کی ضرورت سے زیادہ آگئی ہوں تو انہیں فریج یا فریزر میں تھیلیوں میں کس کر بند کر کے رکھ دیں یا پھر خشک دیگچی میں چولھے پر اچھی طرح کلہار لیں یعنی جس طرح زیرہ یا سونف خشک بھونتے ہیں پھر ٹھنڈا کر کے ائیر ٹائٹ جاروں میں رکھیں ویسے ہفتے میں دالیں ہوں مسالے ہوں یا فریج میں رکھی سبزیاں ان چیزوں کو الٹ پلٹ کر ضرور دیکھتے رہنا چاہیے۔ ورنہ کبھی کبھی ٹماٹر یا پیاز سڑ جاتے ہیں اور خاتونِ خانہ اوپر ہی اوپر سے اٹھا کر کام نمٹاتی رہتی ہیں۔ ساری بات دلچسپی کی ہے۔ اگر کام میں دلچسپی ہو اور اپنے شوہر یا باپ، بھائی کے پیسے کا درد ہو تو کبھی چیزیں ضائع نہ ہوں۔

2۔ ہرا دھنیا، پودینہ، سلاد پتا یا اور کوئی سبز پتے فریج میں محفوظ کرنا مقصود ہو تو پہلے انہیں صاف کریں کہ کوئی گلا سڑا پتا نہ ہو پھر ایلومینیم فوائل یا ٹن فوائل کے علیٰحدہ، علیٰحدہ پیکٹ بنا کر اس میں یہ پتے محفوظ کر لیں اور فریج میں سبزی کے خانے میں رکھ لیں۔

3۔ مندرجہ ذیل سبزیاں دھو کر اور کاٹ کر فریزر میں رکھی جا سکتی ہیں مثلاً بھنڈی، توری، کدو، ٹنڈے، چقندر، میتھی اور پالک وغیرہ بھی۔ لیموں کو ثابت رکھ سکتی ہیں یا رس نچوڑ کر رس محفوظ کر لیں۔ ثابت لیموں جب استعمال کرنا ہو تو پندرہ منٹ پہلے گرم پانی میں ڈال دیں پھر استعمال کریں۔ لہسن، ادرک پیسٹ بنا کر فریزر میں رکھ سکتی ہیں۔ چھلے ہوئے لہسن بھی محفوظ کر سکتی ہیں اور ثابت ادرک فریزر سے نکالنے کے بعد گھل جاتی ہے۔ ثابت ادرک کو زیادہ محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک گملے میں مٹی بھر کے ادرک دبا دیں جب ضرورت ہو نکال لیں۔ مٹی صاف ستھری ہونی چاہیے۔ اس طرح ادرک بھی اُگ آئے گی۔

ناہید انجم، لاہور

گلاوٹ کے کباب

اشیا: قیمہ، ایک کلو۔ کچا پپیتا (پسا ہوا)، دو چائے کے چمچ۔ ادرک کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، حسبِ پسند۔ سفید زیرہ، دو چائے کے چمچ۔ پسا ہوا کھوپرا، چار چائے کے چمچ۔ خشخاش، دو چائے کے چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ جائفل، ایک چوتھائی ٹکڑا۔ جاوتری، ایک چائے کا چمچ۔ دارچینی، دو انچ کا ٹکڑا۔ بیسن، (بھون کر چھان لیں) چار کھانے کے چمچ۔ پیاز درمیانی، ایک عدد۔ (کتر کے سنہری کرلیں اور پیس لیں) دہی، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ضرورت۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: سب سے پہلے سفید زیرہ پسا ہوا، کھوپرا اور خشخاش بھون کر پیس لیں پھر گرم مسالا پاؤڈر، جائفل، جاوتری اور دارچینی بھی باریک پیس لیں۔ قیمے میں کچا پپیتا، نمک اور ادرک لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب اس میں باقی سارے مسالے اور دہی وغیرہ کو اچھی طرح ملا کر مزید آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب اس آمیزے کے گول یا کسی بھی شکل کے کباب بنالیں۔ ایک فرائنگ پین میں آئل ڈالیں اور گرم ہونے پر اس میں یہ کباب فرائی کرلیں۔ نہایت مزیدار لکھنوی گلاوٹ کے کباب تیار ہیں۔

مرسلہ: جمیلہ لوہی، بلوچستان

بیسن کا مقوی حلوا

اشیا: بیسن، سو گرام۔ انڈے، چھ عدد۔ سخت ابلے ہوئے۔ اصلی دیسی گھی، سو گرام۔ چینی، دو سو گرام بادام، پچاس گرام۔ (چھلے باریک کٹے ہوئے) پستہ، پچاس گرام (باریک کٹا ہوا) اخروٹ، بیس گرام (باریک کٹے ہوئے) چلغوزہ، بیس گرام۔ سبز الائچی، 1/4 چائے کا چمچ۔ (پاؤڈر پسی ہوئی) دودھ، 1/2 کپ۔

ترکیب: دودھ میں چینی ڈال کر حل کرلیں۔ سخت ابلے ہوئے انڈوں کی زردی اور سفیدی علیحدہ علیحدہ کرلیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی پگھلائیں اس میں بیسن ڈال کر بھونیں۔ خوشبو آنے لگے تو اس میں انڈوں کی زردیاں کچل کر ڈال دیں۔ جب اچھی طرح بھن جائے تو اس میں چینی اور دودھ کا آمیزہ شامل کرلیں۔ ساتھ الائچی پاؤڈر بھی ڈال دیں اب مغزیات بھی شامل کردیں آخر میں انڈوں کی سفیدی بھی مناسب مقدار میں شامل کی جاسکتی ہے۔ مزے دار بیسن کا حلوا انڈوں کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: مدیحہ نورین مہک، برنالی

چھوئی موئی کوفتے

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ (باریک پسا ہوا) نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک پسا ہوا، ایک چمچ۔ لہسن پسا ہوا، ایک چمچ۔ پسی لال مرچ، آدھا چمچ۔ کالی مرچ پسی، ایک چٹکی۔ ٹماٹر کا پیسٹ، ڈیڑھ پیالی۔ خشک آلو بخارے، چھ عدد۔ فریش کریم، آدھی پیالی۔ ڈبل روٹی سلائس، دو عدد (چورا کیے)۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: بقرعید ہے تو گوشت تو سبھی کے گھر میں ہوگا لہٰذا چھوئی موئی کوفتے بنائیے۔ قیمے کو دھو کر خشک کرلیں۔ اس میں نمک، مرچ، لہسن، ادرک کا پیسٹ، ڈبل روٹی کا چورا، کالی مرچ، دو کھانے کے چمچ فریش کریم ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب گولے بناتے وقت درمیان میں آلو بخارا (جو دھو کر خشک کیا ہو) رکھتے جائیں اور آدھے گھنٹے کے لیے انہیں ٹھنڈا کرنے کو فریج میں رکھ دیں۔ فرائی پین میں کوکنگ آئل ڈال کر ٹماٹر پیسٹ کو پانچ منٹ کے لیے پکائیں پھر اس میں لال مرچ اور نمک ڈال کر گریوی گاڑھی ہونے دیں پھر اس میں کوفتے ڈال دیں اور ڈھکن رکھ کر پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر پکائیں یعنی (دم دے دیں) اس سادہ سی اور منفرد ڈش کو ابلے ہوئے سفید چاولوں اور تنور کی روٹی کے ساتھ تناول فرمائیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ

(ستمبر کے مہینے میں شائع ہونے والی مرغ چاٹ کی ترکیب سنبل ملک کی تھی جس پر غلطی سے کسی اور کا نام شائع ہوگیا ہے۔)



علینہ، مائرہ، کنزیٰ، ہاجرہ، زینب، ماہ نور اور ماجدہ کے نام

ان کالج کی چھٹیوں میں، میں نے تم سب کو بہت مس کیا۔ تمہاری وہ مضحکہ خیز حرکتیں بہت یاد آئیں اور وہ بات بے بات ہنسنا بھی لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ......

دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں
دور رہ کر بھی قریب ہوتے ہیں

از: حافظہ اقرار رحمٰن نور، لاہور

ماں

وہ اکثر خواب میں آکر میری حالت پہ روتی ہے
کہ زیرِ خاک بھی ماں کی پریشانی ختم نہیں ہوتی۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

بڑا دل

پیاری بہنو......! قربانی کا گوشت بانٹتے ہوئے اپنا دل بڑا رکھیں۔ سب سے پہلے اپنی سسرال کے لوگوں میں قربانی کا گوشت بانٹیے، ہڈی والا مزے دار گوشت، چکنائی والی لذیذ بوٹیاں حد تو یہ کہ تمام ترچھیچھڑے بھی سارے کے سارے سسرال میں جانے دیں پھر اس کے بعد روکھا اور بہترین گوشت اپنے فریج اور ڈیپ فریزر میں رکھ لیں اور اپنے آپ کو حاتم طائی سے کم نہ سمجھیں۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟

از: عرشیہ جنید، کراچی

دوستی

دوستی کسی وجہ یا کسی مقصد کے لیے نہیں کی جاتی مگر جب یہ ہوتی ہے تو زندگی کا مقصد اور جینے کی وجہ بن جاتی ہے۔

مشکل وقت

بے شک مشکل وقت بتا کر نہیں آتا مگر جاتا بہت کچھ سکھا کر اور سمجھا کر ہے۔

از: مدیحہ نورین مہک، برنالی

اصل وجہ

دونوں کی ایک سی عادت
ایک سی فطرت
جانتے تھے کہ
اِک بار جو کوئی روٹھا
انا قدم روک لے گی
منانے نہ دے گی
سو اسی انا نے کر دیا یکجا
نہ کبھی میں روٹھی
نہ وہ بگڑا

شاعرہ، حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

خالی کرو

آنکھ خالی کرنی ہے
آنکھ کا کرایہ ہم
اب نہیں دے سکتے
خواب نوچنے ہوں گے
سپنے نکالنے ہوں گے

ان خواب اور
سپنوں کو
کیا کوئی اور اپنا لے گا؟
شاعرہ: شہزادی کائنات، کراچی

غیر ذمے دار

"میرا دھوبی بہت ہی غیر ذمّے دار ہے، میری قمیص دھو کر لاتا ہے تو ان پر دوسری قمیصوں کے بٹن لگے ہوتے ہیں۔" ایک صاحب اپنے دوست سے شکوہ کر رہے تھے۔

"ارے بھائی شکر کرو...... تمہارا دھوبی پھر بھی غنیمت ہے، میرا دھوبی میرے بٹن تو ضرور واپس لاتا ہے مگر ان پر دوسری قمیصیں لگی ہوتی ہیں۔" دوست نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

باذوق

ایک سولہ سالہ لڑکے نے نئی نسل کے نمائندہ گلوکاروں کی ایک کیسٹ لگا کر جھومتے ہوئے اپنے باپ سے پوچھا۔ "ڈیڈی آپ نے اس سے پہلے زندگی میں کبھی ایسی موسیقی سنی ہے؟"

"موسیقی کا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "البتہ ایک بار میں نے ایسی آوازیں ضرور سنی تھیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب دو ٹرک بڑے زور سے آپس میں ٹکرا گئے تھے۔ ایک ٹرک پر دودھ کے خالی ڈرم لدے ہوئے تھے اور دوسرے پر مویشی۔"

از: ممتاز خانم، کراچی

لاحول پڑھتا ہوں

پرکھ لیتا ہوں قبلِ لب کشائی اہلِ محفل کو
کتابِ انجمن کا بعد میں ماحول پڑھتا ہوں
تمہارے سامنے کہتا ہوں تم جانِ تمنا ہو
اکیلے میں تمہاری شکل پر لاحول پڑھتا ہوں
از: صبا نور، لیہ

دریا میں

زندگی ہے یا کوئی ناؤ کاغذ کی
ڈول رہی ہے اشکوں کے دریا میں
از: فصیحہ آصف خان، ملتان

مخلص لوگ

جب غرض ہوئی تب پیار کیا
جب وقت ملا تب یاد کیا
اب اور حقیقت کیا لکھوں
اس دور کے مخلص لوگوں کی
فرحین اشفاق، گگو منڈی

ناراض شوہر کے نام
مس خان کا پیغام

تجھ سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا
بھری دنیا میں بھی تنہائی ہے
سکوں دن میں ہے نہ راتوں کو قرار
کیسی جاں لیوا یہ جدائی ہے
دل میں ہر وقت خیالوں کا بسیرا ہے
حقیقت سے نہیں اپنی شناسائی ہے
لب ہیں خاموش، اداس ہیں آنکھیں
میرے انگ انگ پہ خزاں چھائی ہے
لمحات خوشیوں کے کھو چکے سارے
غم کی لذت سے آشنائی ہے
اب تو آجا کہ تجھے دیکھ کے جی لوں
بہت عرصہ بنا جرم سزا پائی ہے
آس خوشیوں کی کوثر نے پال رکھی ہے
اور دل میں شمعِ انتظار جلائی ہے
شاعرہ: کوثر خالد، جڑانو

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ



آسیب اور جادو کا علاج

جادو ایک حقیقت ہے اور اس کے بارے میں قرآن و حدیث میں تفصیل موجود ہے۔ جادو، بُرے اور غلط قسم کے تعویذ، منتر، سفلی اعمال، نظرِ بد وغیرہ یہ وہ اہم امور ہیں جن کے ذریعے شیطان انسانوں کو صراطِ مستقیم سے بہکا کر فساد و بگاڑ بلکہ کفر و شرک کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ وہ لوگ جو ان چیزوں کے ذریعے انسانوں کو تکلیف و اذیت پہنچاتے ہیں، گھروں کو اجاڑتے ہیں اور ان کا سکون درہم برہم کر دیتے ہیں، میاں بیوی میں نفرتیں پیدا کرتے ہیں، تجارت و کاروبار و ملازمت میں نقصان و خسارے کے لیے یہ برے عمل کرتے کرواتے ہیں، سب کے سب اللہ کی رحمت سے دور ہیں اور لعنت و عذاب کے مستحق ہیں۔

جادو کا اثر ختم کرنے، اسے توڑنے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے قرآنی آیات سے بہتر علاج دوسری کسی چیز میں نہیں ہے۔ تابعین اور سلف صالحین کے ہاں قرآنی آیات ہی ہر قسم کی بیماری کے علاج اور ہر قسم کی تکلیف و پریشانی سے بچاؤ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں یعنی ان کی تلاوت کی جاتی تھی، ان کے ذریعے دم کیا جاتا اور انہیں لکھ کر مریض کو یہ پانی پلایا جاتا تھا۔

☆ سب سے پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقینِ کامل ہو کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ ساری مخلوق اور جنّ و انس مل کر بھی کسی کے نفع و نقصان پر قدرت و تصرف نہیں رکھتے نیز یہ کہ اللہ کے ہر کام میں حکمت و مصلحت ہوتی ہے۔ ہر حال میں صبر و شکر سے اسی سے دنیا و آخرت کی خیر مانگتے رہیں۔

☆ جادو اور تعویذ کے برے اثر سے یا نظرِ بد سے حفاظت کے لیے سورۂ بقرہ کا پڑھنا مفید نسخہ ہے۔ اگر سورۂ بقرہ ایک نشست (یعنی ایک وقت) میں نہ پڑھی جا سکے تو اسے کئی دن میں مکمل کر لیا جائے۔ پانی پر دم کر کے پیا جائے اور مکان میں چھڑکا جائے۔ سورۂ بقرہ مسلسل پڑھی جاتی رہے کوئی بھی فرد روزانہ ایک صفحہ یا دو صفحہ یا کم و بیش پڑھ لیا کرے۔ کوشش یہ ہو کہ ہر ہفتے یا ہر ماہ ایک بار سورۂ بقرہ ضرور ختم ہو جایا کرے پھر دوبارہ شروع کر دیا کریں لیکن اس کام کے لیے اجرت دے کر کسی قاری، حافظ کو مقرر نہ کیا جائے کہ اس سے نہ پڑھنے والے کو فائدہ ہوتا ہے اور نہ پڑھوانے والے کو، آپ خود قرآن پڑھیں دوسروں سے نہ پڑھوائیں۔

☆ نمازوں کی پابندی رکھیں۔ کوشش کریں کہ نوافل اور سنتیں گھر میں پڑھیں، نیز اس بات کی کوشش بھی کی جائے کہ مکان، دکان یا جہاں بھی انسان برکت چاہتا ہو وہاں نوافل اور ذکر و اذکار کا مسلسل اہتمام کیا جائے۔ جب بھی موقع ملے دو چار رکعت نفل پڑھ لی جائیں تھوڑی دیر ذکر کر لیا جائے۔

☆ صبح شام کی دعائیں، داخل ہوتے اور نکلتے وقت کی دعائیں اور بسم اللہ پڑھی جائے۔

☆ روزانہ حسبِ استطاعت (خواہ ایک روپیہ ہو یا اس سے بھی کم) یا اس سے زیادہ کچھ نہ کچھ صدقہ کرتے رہیں کہ صدقہ ہر آنے والی بلا کو ٹالتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے۔

☆ تمام کبیرہ گناہوں سے بچتے رہیں۔ جھوٹ، جھوٹی قسم، غیبت اور زبان کے دوسرے گناہوں سے پرہیز کریں۔ یاد رکھیں کہ ہر کبیرہ گناہ کا اثر انسان کے رزق کی برکت پر پڑتا ہے اور

گناہوں سے نحوست پھیلتی ہے۔

☆ نظرِ بد سے محفوظ رہنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کمرے میں یا مکان کے باہر کارخانہ یا فیکٹری میں کسی ایسی جگہ **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** لکھ کر لگا دیا جائے۔ جسے ہر آنے جانے والا شخص پڑھے۔ اس طرح انشاء اللہ جادو یا نظرِ بد کے اثرات سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

☆ دورانِ خرید و فروخت یا دورانِ ملازمت و تجارت کسی مخلوق پر ظلم نہ کریں کہ مظلوم کی بددعا قبول ہوتی ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

☆ رزقِ حلال میں برکت ہوتی ہے خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو جبکہ حرام اور ناجائز مال میں برکت نہیں ہوتی خواہ وہ مقدار میں زیادہ ہو۔ اپنے حق سے زیادہ پیسے لینا اور جھوٹ اور دھوکا دہی سے تنخواہ بڑھوا لینا یا دورانِ ملازمت کام سے غائب رہنا یا کام صحیح طریقے پر امانت و اخلاص سے انجام نہ دینا سب گناہ کے کام ہیں جو آپ کی تنخواہ کو حرام بنا دیتے ہیں جس کا اثر آپ کی ساری عبادتوں اور آپ کے اہل و عیال پر بھی پڑتا ہے۔

پہلا علاج

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے..... وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس تھا کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہ اے اللہ کے نبیؐ میرا ایک بھائی ہے اور وہ تکلیف و مصیبت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اس کو میرے پاس لاؤ۔“ انہیں لاکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے بٹھایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ آیاتِ مبارکہ پڑھ کر دم کیا تو وہ اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے اس کو کبھی شکایت تھی ہی نہیں۔ وہ آیات یہ ہیں۔

(1) سورۂ فاتحہ
(2) سورۂ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیات
(3) سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۳
(4) سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵ (آیت الکرسی)
(5) سورۂ بقرہ کی آخری تین آیات
(6) سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸
(7) سورۂ اعراف کی آیت ۵۴
(8) سورۂ مومنون کی آیت ۱۱۶
(9) سورۂ صافات کی ابتدائی دس آیتیں
(10) سورۂ حشر کی آخری چار آیتیں
(11) سورۂ جن کی آیت ۳
(12) سورۂ اخلاص اور معوذتین

(اخرجہ: عبداللہ بن احمد فی زیادات المسند)

جس شخص پر جن ہو یا جادو کیا گیا ہے تو عامل کو چاہیے کہ مذکورہ بالا آیات کو اول و آخر درود شریف پڑھ کر پانی پر دم کردے اور مریض کو وہ پانی پلادے اور مریض صرف اسی پانی کو استعمال کرے اور اس پانی کا ایک آدھ گھونٹ سارے پانی میں ڈال کر... بلاناغہ نہائے اور اس عمل کو اس وقت تک کرے جب تک مرض دور نہ ہو جائے۔

دوسرا علاج

حضرت شاہ احمد سعید صاحب مدنی قدس سرہ الاقدس فرماتے ہیں کہ جو شخص ایک بار صبح کی نماز کے بعد اور ایک بار مغرب کی نماز کے بعد یہ تمام آیات پڑھے گا وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و امان میں رہے گا۔ بحکمِ الٰہی اس پر زہر اور بددعا کا اثر نہیں ہوگا۔ شیاطین اور دشمنوں کے شر سے محفوظ و مامون رہے گا۔

(مناقب شریف)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آیات مع سورۂ فاتحہ و چہار قل ردِّ سحر میں بہت حد مفید ہیں، شیاطین، چوروں اور درندوں سے پناہ ہو جاتی ہے (القول الجمیل) دفع امراض و سحر کے لیے پانی پر دم کر کے پئیں۔

(از حکیم الامت، بہشتی زیور)

تیسرا علاج

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہود نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تکلیف میں مبتلا کرنے کے لیے کچھ ایسا کر دیا۔ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سخت تکلیف پہنچی چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام معوذتین لے کر تشریف لائے اور یہ دعا (جس سے سحر و کرتب کا اثر دور ہو جائے)

بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُّوْذِیْکَ مِنْ کُلِّ عَیْنٍ وَّنَفْسٍ حَاسِدٍ اَللّٰہُ یُشْفِیْکَ

ترجمہ: اللہ کے نام سے ہر تکلیف دہ چیزوں سے تجھ کو جھاڑتا ہوں، ہر نظر سے اور حاسد سے اللہ تم کو شفا دے۔

(الدعاء ۳/۱۳۱۳)

چوتھا علاج

حدیث میں ہے کہ لبید بن عاصم یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جادو کیا تھا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیمار ہو گئے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تقریباً چھ ماہ بیمار رہے جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بہت کمزور ہو گئے۔ ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اتفاقاً خواب میں دو فرشتوں کو دیکھا کہ ایک فرشتہ دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کیا بیماری ہے؟“ دوسرے نے جواب دیا کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جادو کیا گیا ہے۔“ اس نے پھر سوال کیا کہ۔ ”کس نے جادو کیا ہے؟“ دوسرے نے جواب دیا کہ ”لبید بن عاصم نے۔“ اس نے پھر سوال کیا کہ ”جادو کا اثر کس چیز پر ہے؟“ دوسرے نے جواب دیا کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سر کے بالوں میں اور کنگھی کے دندانوں میں کمان کی زرہ جیسی بارہ گرہ دے کر کھجور کے غلاف میں رکھ کر روزران کے کنویں پر پتھر کے نیچے دفن کیا ہے۔“ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صبح بیدار ہوئے تو کنویں پر تشریف لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دو اصحاب کنویں کے اندر گئے اور وہ جادو نکال لائے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دو اصحاب حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عمارؓ تھے۔ فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس جادو کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مومی صورت بنی ہوئی تھی اور اس میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ اس مومی پتلے سے جوں، جوں سوئیاں نکالی گئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سکون و آرام ہونا شروع ہو گیا اور جو بارہ گرہیں اس میں لگی ہوئی تھیں وہ کھل نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے حضرت جبرائیل علیہ السلام.... معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس لے کر نازل ہوئے اور کہا کہ دو سورتوں کی بارہ آیتیں ہیں ان کو پڑھ کر اس پر دم کرو ان کی برکت سے یہ گرہیں کھل جائیں گی۔

پانچواں علاج

کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ ”اگر میں صبح شام کچھ کلمات نہ پڑھتا تو یہود مجھے جادو کے ذریعے بھونکنے والا کتا یا ڈھینچنے والا گدھا بنا لیتے۔ میں کچھ کلمات پڑھتا ہوں اور ان کے جادو کے اثرات سے محفوظ رہتا ہوں۔ وہ کلمات یہ ہیں۔

اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَّاَعُوْذُ بِوَجْھِہِ الْعَظِیْمِ الْجَلِیْلِ الَّذِیْ لَا یَخْتَصِرُ جَارُہٗ الَّذِیْ یُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ مِنْ شَرِّ التَّامَّتِہٖ وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَاَ فِی الْاَرْضِ وَمِنْ شَرِّ مَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمِنْ شَرِّ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا وَمِنْ شَرِّ کُلِّ دَآبَّۃٍ اَنْتَ اٰخِذٌم بِنَاصِیَتِھَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔“

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بیٹے کی نظر، قد، وزن، یادداشت

مسز احسان۔ لاہور

پہلا مسئلہ بیٹے کا ہے جس کی عمر 13-12 سال

ہے۔ اس کی نظر کمزور ہوگئی ہے۔ دو سال سے اسے نظر کی عینک لگی ہے جس کا نمبر 2 ہے۔ نویں کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے۔ صحت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کافی کمزور سا ہے۔ جلد تھک جاتا ہے۔ جو بھی دیکھتا ہے اس کی صحت کے بارے میں پوچھتا ہے کہ یہ اتنا کمزور کیوں ہے؟ قد بھی عمر کے لحاظ سے چھوٹا ہے۔ اس کے ہم عمر بچے اس سے بڑے ہیں۔ کھانا عموماً وہی کھاتا ہے جو عام مڈل کلاس گھرانوں میں سادہ سا ہوتا ہے یعنی ریگولر دودھ پھل وغیرہ نہیں کھائے جا سکتے۔ سب پڑھا ہوا جلد بھول جاتا ہے۔ اکثر چڑچڑا رہتا ہے۔ غصہ جلد آجاتا ہے۔

جواب: (1) بیٹے کا وزن اور قد نہیں لکھا جس سے ہم اندازہ کرتے۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ کا بچہ (1 کمزور ہے۔ (2 نظر کمزور ہے۔ (3 قد چھوٹا ہے۔ (4 چڑچڑا پن ہے۔ (5 یادداشت کمزور ہے۔ غذا پر توجہ دیں، متوازن غذا کا لازمی استعمال آپ سب کے لیے ضروری ہے۔

آیوڈین ملا نمک ضرور استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc phos-6، Calc flour-30، Baryta carb-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت پئیں جبکہ Alfalfa-Ø کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر کھانے کے بعد پئیں۔

فیملی پلاننگ کے مُضر اثرات

دوسرا مسئلہ میرا اپنا ہے۔ چھوٹی بیٹی کی پیدائش کے بعد میں نے وقفے کے کچھ انجکشن لگوائے جس سے میرے وزن میں اضافہ ہوگیا اور پیریڈ بہت دیر سے آنے لگے۔ انجکشن لگوانے تو چھوڑ دیے لیکن وزن کافی بڑھ گیا ہے اور پیٹ بھی بہت بڑھا ہوا ہے۔ حافظہ کمزور ہوگیا ہے اور نظر بھی کمزور ہوگئی ہے بلکہ روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے۔

جواب: (2) عمر، قد، وزن، نہیں لکھا۔ فیملی پلاننگ کی دواؤں کے استعمال سے خطرناک سائیڈ افیکٹ بھی ہوتے ہیں۔ میٹھی و مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں، ایک میل پیدل چلا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Pulsatilla 30,Calc. Carb 30 ایک ماہ تک استعمال کرکے اپنا تمام حال تفصیل سے لکھیں۔

لیکوریا

حرا امجد۔ چکوال

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تقریباً تین سال سے لیکوریا کی شکایت ہے۔ اب تقریباً ایک سال سے مجھے ماہانہ ایام سے آٹھ دن پہلے لیکوریا شروع ہو جاتا ہے۔ میری کمر اور ٹانگوں میں درد رہتا ہے اور کمزوری بھی بہت ہے۔ رنگ بھی پیلا ہے۔ مجبور ہو کر خط لکھ رہی ہوں۔ میں ہر مہینے پاکیزہ رسالے میں



شوابے کلینک بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب آپ بہت اچھے طریقے سے سمجھا کر جواب دیتے ہیں۔ برائے مہربانی میری مدد فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

جواب: بی بی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ آپ لوگوں کی رہنمائی ایک کوشش ہے اللہ قبول کرے، آمین۔ اچھی سوچ اور خیالات رکھیں۔ متوازن غذا کا خاص خیال رکھیں۔ وزن کو کنٹرول میں رکھیں نہ کم نہ زیادہ۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bovista-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ایچ پائیلوری بیکٹیریا

محمود حسن۔ کراچی

تقریباً دو سال سے میرے معدے میں خرابی ہے جس کی وجہ سے میں جب بھی کچھ کھاتا ہوں پیٹ پھول جاتا ہے اور گیس بن جاتی ہے جو سر کی طرف چلی جاتی ہے۔ پھر شدید گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ پسینے آنے لگتے ہیں اور سر میں شدید بھاری پن ہو جاتا ہے۔ گھبراہٹ اتنی شدید ہوتی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اس مرض کا تین بار ٹیسٹ کروا چکا ہوں جس میں معدے میں H. Pylori آیا جس کا میں نے ایلوپیتھک علاج کروایا۔ ڈاکٹر نے اینٹی بائیٹک ادویات استعمال کروائیں۔ ایلوپیتھک علاج سے مجھے وقتی طور پر فائدہ ہوا مگر مرض مکمل طور پر ختم نہیں ہوا اور پھر شروع ہوگیا۔ اینٹی بائیٹک ادویات سے سائڈ افیکٹ کا خطرہ ہوتا ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر کوئی ایسی ہومیو پیتھک دوا تجویز کریں جس کے استعمال سے مرض مکمل طور پر ختم ہو جائے۔ مجھے قبض کی شکایت نہیں ہے اور میں بادی اشیا بھی



استعمال نہیں کرتا۔ رپورٹس ارسال کررہا ہوں۔ مہربانی فرما کر جواب ضرور دیجئے گا۔ شکریہ۔

جواب: کھانا پیٹ بھر کر نہ کھائیں اور نہ پیٹ کو خالی رکھیں، وقفے وقفے سے تھوڑا تھوڑا کھائیں، اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ کھانے کے بعد پانی نہ پئیں۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے پئیں اور کھانے کے کم از کم دو گھنٹے بعد پئیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Veratrum alb -30 کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 4 مرتبہ پئیں۔ اچھا ہوگا کہ آپ آ کر ملیں۔

والدہ کا مسئلہ

عذرا آفرین۔ کراچی

ڈاکٹر صاحب میں پاکیزہ میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں میں اپنی والدہ کا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میری والدہ تقریباً 4 سال سے بیمار ہیں۔ 4 سال پہلے ان کی یہ بیماری ظاہر ہونا شروع ہوئی مگر ڈاکٹرز نے سمجھنے میں بہت وقت لگا دیا۔ مہنگے سے مہنگے اسپیشلسٹ کو دکھایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ میری والدہ کو سانس کی بیماری ہے۔ انہیں یہ بیماری اتنی شدید ہو چکی ہے کہ محض چند قدم چلنے پر ہی سانس پھول جاتی ہے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ کھانسی بھی تقریباً مستقل رہتی ہے اور ساتھ بلغم بھی آتا ہے، ہر تھوڑے دن بعد بخار اور نزلہ ہونا معمول ہو گیا ہے۔ دراصل 4 سال پہلے انہیں یہ سب ظاہر ہونا شروع ہوا تو ڈاکٹرز نے کہا کہ TB کی شکایت ہے اور TB کا علاج شروع کر دیا چونکہ میری امی کو جوانی میں بھی TB ہوئی تھی اس لیے دوبارہ ہونے پر دو ماہ تک انجکشن بھی لگے مگر حالت بہتر ہونے کے بجائے مزید بگڑتی گئی۔ پھر ہم انہیں ڈاؤ یونیورسٹی ہسپتال لے گئے۔ وہاں انہیں ایڈمٹ کرلیا گیا اور مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے مگر ڈاکٹرز نے کوئی تسلی بخش علاج شروع نہیں کیا۔ بہرحال ڈاکٹرز نے کہا کہ انہیں TB نہیں ہے۔ اسی دوران ہمیں کسی نے پنجاب کے ایک ڈاکٹر کا پتا بتایا۔ ہم نے انہیں رپورٹس بھیجیں کیونکہ والدہ کی طبیعت ایسی نہیں تھی کہ وہ سفر کرسکتیں۔ انہوں نے یہاں کے ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو ریفر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بیماری انہیں پالتو پرندوں سے لگی ہے اور ان کے پھیپھڑے بہت زیادہ متاثر ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے آکسیجن کی کمی ہونے سے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی ہے۔ انہوں نے دوائیاں بھی تجویز کیں جنہیں استعمال کرتے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ ان کی تجویز کردہ ایک دوا Deltacortrill Tablet کے بہت زیادہ سائڈ افیکٹ ہیں جو اب ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ انہیں جسم کے مختلف حصوں میں شدید درد ہوتا ہے اور بخار کے ساتھ بلغمی کھانسی بھی ہوتی ہے اور اکثر کھانسی کا دورہ بھی پڑتا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ یہ ان کی لاسٹ اسٹیج ہے۔ اب حالیہ رپورٹس میں ان کے دل کا سائز بھی بڑھا ہوا ہے۔ ہم اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہیں۔ میں ان کی تین سال پرانی اور حالیہ رپورٹس کی کاپیاں بھیج رہی ہوں۔ ان رپورٹس کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں۔ اگر ہومیوپیتھک طریقہ علاج سے ان کا علاج ممکن ہے تو پلیز ہمیں کوئی اچھی سی دوا تجویز کردیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمیں آپ کے کلینک پر آ کر ڈسکس کرنا چاہیے تو پلیز آپ کلینک ایڈریس بھی بتایئے گا۔ پلیز پلیز خط کا

جواب جلدی دیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ درازیٔ عمر عطا فرمائے، آمین۔

جواب: یہ کیس ایسا ہے کہ ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ مریض کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ مسئلہ ٹی بی، سانس اور دل کا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علاج صحیح نہیں ہوا۔ جب دل کا درد ہو تو Arnica-200 کی ایک خوراک دے دیا کریں۔ Cactus-Ø کے 3-3 قطرے اور Craetegus-Ø کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہی استعمال کریں۔ پتا وغیرہ ادارے سے لے لیں۔

تل و دانوں کے نشان

مسز خان۔ انگلینڈ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر براؤن تل اور Acne کے داغ ہیں۔ میں نے Acne کے لیے کئی بار اینٹی بایوٹک کورس کیے ہیں۔ پہلے سے کافی بہتر ہے۔ اب دانے پورے منہ کے بجائے ٹھوڑی پر نکلتے ہیں اور 3-4 دانے نکلتے ہیں۔ براؤن تل منہ کے علاوہ باقی جسم پر بھی ہیں لیکن منہ پر زیادہ ہیں۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sabina-30، Graphites-30 اور Thuja-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ چار ماہ تک پئیں، اس کے بعد دوبارہ کیفیت بتائیں۔

آسٹیو آرتھرائٹس

مسز مریم اقبال۔ کراچی

بہت احترام کے ساتھ گزارش ہے کہ میں ہر ماہ پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور صحت کے متعلق



شوابے ہومیو کلینک بھی خاص طور پر پڑھتی ہوں۔ ماہ فروری میں صحت کے متعلق آخری صفحہ پر Osteo Arthritis کے بارے میں مضمون پڑھا تو مجھے بھی کچھ حوصلہ ملا۔ میرے شوہر اقبال مسیح عمر 77 سال، جون 2012ء میں گرنے کی وجہ سے کمر میں کچھ چوٹ آئی تھی۔ پہلے تو بالکل چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔ ایلوپیتھک اور ہومیو پیتھک دونوں طرح کے علاج کرائے تو کچھ معمولی سا افاقہ ہوا۔ Stick کے ساتھ تھوڑا چل لیتے ہیں۔ جب چلتے ہیں تو سیدھی ٹانگ کو جھٹکا سا لگتا ہے اور وہ چند سیکنڈ قدم نہیں اٹھا پاتے۔ ایکسرے رپورٹ کی فوٹو کاپی بھی بھیج رہی ہوں۔ اگر کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہوں تو برائے مہربانی بتا دیجئے۔

جواب: بی بی، آپ ادارے سے فون نمبر لے لیں۔ پھر اس پر رابطہ کرلیں۔ اس دوران ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Arnica-1M کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر پلائیں۔ اس کے ایک دن بعد Calc carb-30 اور Rhustox-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

ہڈیوں کی کمزوری

شہر بانو اختر۔ کراچی

میں ریٹائرڈ ٹیچر ہوں۔ ایک دفعہ گر گئی تھی۔ تب کولہے کی ہڈی میں ذرا سا بال آ گیا۔ آپریشن کے بعد پیر بالکل صحیح نہیں ہوا اور میں اسٹک لے کر یا واکر سے چلتی ہوں۔ اس وجہ سے زیادہ آرام کرتی ہوں، رسالے پڑھتی ہوں، قرآن شریف پڑھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ گھرداری سے فرصت ہے۔ اب بہوئیں سنبھالتی ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ

میرے سر میں گھوں گھوں ہوتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ زیادہ تر صبح کے وقت محسوس ہوتا ہے۔ ایلوپیتھک ڈاکٹر کا علاج کیا۔ انہوں نے Serc، Stomatil دی مگر بالکل ختم نہیں ہوا۔ پچھلے سال رمضان میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ان ہی دواؤں سے ٹھیک ہوگیا تھا۔ اب ہومیو پیتھک کی کوئی دوا بتائیں۔ بعض وقت بہت بے چینی ہوتی ہے۔ میری عمر 72 سال ہے۔ ویسے اللہ کا شکر ہے ٹھیک رہتی ہوں۔ حج بھی کر آئی ہوں۔

جواب: X-Ray Cervical Ap+Lateral View کرائیں۔ بہتر ہوتا کہ آکر چیک کرائیں۔ بلڈ پریشر اور شوگر چیک کرائیں۔ Arnica-cm کی ایک خوراک لیں اس کے بعد Calc carb-30، Rhustox-30 اور Gelsemium-30 کے 5-5 قطرے ہر 3 گھنٹے بعد آدھے کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں۔

جوانی کی لغزش

ارسلان طالب۔ راولپنڈی

میں غیر شادی شدہ ہوں۔ محترم ڈاکٹر صاحب میں نے اپنی جوانی اپنے ہاتھوں برباد کی ہے۔ میری ٹانگوں میں بھی بہت درد رہتا ہے۔ شرم کے مارے کسی کو بتا نہیں سکتا۔ میرے گھر والے میری شادی کے لیئے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ آپ کوئی دوا اور مشورہ تجویز کردیں۔

جواب: آپ نے مکمل تفصیل نہیں لکھی۔ یاد رکھیں بینک میں جتنی رقم ہو اسی حساب سے چیک کاٹنے چاہئیں ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ چیک باؤنس ہوجاتا ہے۔ شرم ہمیشہ غلط کام کرنے میں آنی چاہیے۔ معالج کو حال بتانے میں پوری ایمانداری برتنی چاہیے تاکہ صحیح تشخیص، علاج اور رہنمائی کی جاسکے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Alfalfa-Ø کے 15 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ ہر کھانے کے 2 گھنٹے بعد پئیں تین ماہ تک۔

ڈینگی کا ہومیو پیتھک علاج ہے!

آج کل کراچی میں ڈینگی فیور کی وبا پھر عود آئی ہے۔ لہٰذا ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ اس کے متعلق اہم معلومات آپ کو فراہم کریں، تاکہ بوقتِ ضرورت مشکل نہ ہو۔

الحمدللہ ہومیو پیتھی میں ڈینگی فیور کا مکمل شافی علاج موجود ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ ایک خاص قسم کے مچھر کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ یہ پاکستان میں کچھ سالوں سے پھیلا ہے ورنہ یہ بہت پرانا ہے اس کو ہڈی توڑ بخار بھی کہتے ہیں۔ ہڈیوں میں درد اور تیز بخار گھبراہٹ متلی اور لال نشان اس کی خاص الخاص علامات ہیں۔ خون میں پلیٹیلیٹس کی کمی اور پازیٹو آنا اس کی حتمی تشخیص ہے۔ مریض کو مکمل آرام کرائیں۔ پانی اور تازہ پھلوں کا جوس پلائیں۔ بالعموم Eupatorium Perf 30 کو جلدی جلدی دینے سے مریض کی تمام علامات، بخار اور پلیٹیلیٹس نارمل ہوجاتے ہیں اور مریض بھی جلدی بھلا چنگا ہوجاتا ہے۔ ابتدائی حالت میں ایک سے دو دن اور دیگر میں ایک سے دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔ لیکن مریض مکمل ٹھیک ہوجاتا ہے۔